

دلچسپ آنرشی فیز کہا نیوں کا مجموعہ

ماہنامہ مجاسوسی ڈائجسٹ کراچی

ستمبر 2017

معراج ڈول

Pakistanipoint

Waqar
Fizeem



07

چینی ناکہ چینی

مدیا اعلیٰ

قائیں کی کمر فرمایا کج ادائیج
نامہ کیا، مجتبیٰ عاتیں اور کاتیں

14

قصہ ابلیس

ڈاکٹر سلیم عادل

ول تمام لینے والی ساتوں سے لبریز
ایک شعلہ و شبنم کہانی کے اتار چڑھاؤ

65

دور کی آواز

تمکین رضا

ڈاکٹر اور مسریض کی
ملاقاتوں کا پریشان کن احوال

79

جال

تنویر ریاض

ماں اور بیٹے کی محبت میں لالچ
کی دراڑ ڈالنے والے مجرما کا قصہ



71

قصہ جدید

منظر امام

تاریخ کے لیے مفرد
ذائقے کی ایک یارگار کہانی

90

انگارے

طاہر جاوید مغل

بہتر بہتر رنگ بدلتی...
ایک پورنگ اور دل گداز داستان

146

دامِ صیاد

سلیم انور

اپنے ہی جال میں الجھ کر گر
جائے والے۔ سیاہ دلدل دوز انجیا

131

قاتل تکون

محمد یاسر اعوان

سفاک قاتلوں کی تکون..... جو
معنا کی ڈور سے بندھے تھے

جلد 47 • شمارہ 09 • ستمبر 2017 • زر سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) نیکس 35802551 (021) E-mail: jdpgrp@hotmai.com

149

پہچان

جمال دستی

اپنی ذات کے اسرار کھوج لینے
والے فوجی کا ماحبر.....

160

سہ ماہ گزرا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تخیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

195

پیرستار

سیریناراض

جسرم کی انوکھی کہانیوں میں
سے ایک منفرد سوغات

218

وہ ایک لمحہ

ارشاد بیگ

درندہ مفت سفاک
فحش کا ایک یادگار پل.....

258

خود کزنہرا

سید شکیل کاظمی

چند ایسے کڑاؤں کی کہانی جو ہماری
حقیقی زندگی سے مستعار لی گئی ہیں

221

سویرا

سرور اکرام

دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے
والی اثر انگیز داستان

20:

کھوٹ

تنویر واسطی

سٹراڈے باز نے
آنے والوں کا الیہ.....

229

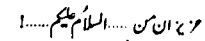
لہو کا کھیل

روبینہ رشید

معاشرے کے ان سیاہ چروں کے گھٹاؤ نے
عکس جو زندگی کو دھندلا دیا ہے



پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول، مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمربل ایریا، امین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



لاہور سے اشفاق شاہ کی دلچسپ باتیں "جاسوسی حسب معمول بر وقت نقل کیا گیا۔ عینے نوش فیض حسینہ ورق کے خیالوں میں گہما گہما جیکہ کسی سوچ میں گم تھی۔ 14 اگست کے حوالے سے نوی پریم سے بھی سرورق چکر رہا تھا۔ یعنی ٹیکنیکی پہنچے۔ کوثر اسلام ابتدائی صفحے پر براہمان تھے۔ اپنا خط طراش میں ملا، اپنی عبت سے لکھا تھا جانے کس دیس چلا گیا، حدیہ کی قادری، خلعت سحر، ایمانے زارا شاہ، انیل ظفر، وصلی برادران، رانا بشیر، حفصہ طارق کے خط و کتابت کی ٹیکنیکی کا خاصہ تھے۔ شاہد اور افتخار، نور علی، آصف محمود، اور یس خاں، دشت دل، بھرا اقبال اور صفدر معاویہ کے خوب صورت نامے بھی محفل میں رونق بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ انتم فاروق ساحلی کی محتایہ مختصری بھی اور انور یوسف صاحب مرحوم کے لیے پتول سے نیک دعائیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے چلتے ہیں تمہارے کس طرف سب سے پہلے انکار سے کس طرف لکھے، تاجور کویف کا کھسپا بڑا۔ حافظ ذکری کا نظری ہوئی، شاہ زیب انتہائی بیماری میں بھی سرورق کی بازی لگا کر دہاں کے باشندوں کی سچائی کے لیے ڈی ویس پر چڑھائی کے لیے کوشاں، بہت دلچسپ قطاری۔ آدراہ مر پر پہنچے۔ پرمل زندہ دل کیا کتوں سے بچنے پہنچے لیکن ایک اور خطے میں وہ دلیر بھی جائزہ ہو سکا۔ شاہنواز کی حولی پر حملے کے بجائے تھانے پر حملہ ہنگامہ بڑا، اول خیر اور کھیل داوت اول گئے۔ پرمل جان سے گیا، اچھی بات یہ ہوئی کہ شہری محب وطن دوستوں کے ہاتھ لگ گیا جن کو اس نے مطمئن کر دیا، حولی پر دوبارہ ریڈ بھی نام پر ادوار ادوار دوبارہ وہ حولی کی بھول بھلیوں میں گم، جانے اب کیا نکل پاتا وہ کتنے سے، دورا نے، بیر عباسی صاحب نے خوب کھم کی باتیں سر سے گزر گئیں چونکہ 2040 کا سن تھا اس لیے کیا پتا کر دوائی اتنی یا اس سے زیادہ ترتی ہو جائے، حالات حاضرہ کو مد نظر رکھ کر سیاسی اتار چڑھاؤ کو احسن طریقے سے دلچسپ اعزاز میں بیان کیا۔ سرورق کی پہلی کہانی اساقادری کی ظالم مظالم زبردست اور بہترین تحریر تھی۔ تو قیصر نے بہن کی زندگی کو ستوار سے ستوار تے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا لیا۔ عورت وفا کی صورتی سے جو ثابت بھی ہو گیا۔ احمد جاوید بھی جاسوسی میں سرورق کی تحریر کے ساتھ تشریف لائے۔ بہت خوشی ہوئی کیا یاد دہی کا کردار افسانوی سالگہ اور نارائن کا کردار بھی زبردست رہا۔ انفسوس کہ نارائن سمیت کوئی نوجوان پایا بہر حال تحریر نے مزہ دیا، بہترین اور مختصر کہانیوں میں بڑا اکھاڑ پایا بی عمران قریشی اور مہتاب خاں کی فیصلہ پسند آئیں۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی تیسرہ نگاری ”جاسوسی اس بار“ 29 تاریخ کو بذریعہ ڈاک مل گیا تھا۔ اپنے پرانے تیسرے ہی کوشاں اشاعت کرنے کا ٹکڑیہ۔ اور ادارے کا میری البیہ کی وفات پر بڑھتی اور دعائے مغفرت کا بھی ٹکڑیہ۔ مختل میں اب زیادہ تر سننے لگنے والے آگے ہیں۔ جہاں سید، ماما البیہ اور دوسرے شاہ جی کو اب قصہ پارینہ میں جکے الف لیلٰی کی طرز کے طویل تیسرے والی بی بی علیہ غفر اراں اس بار غائب ہیں۔ انہوں نے کسی راسلے میں لکھا تھا کہ تعلیمات کی تواب کدہ میں ہیں تو ایسا فرصت ہی فرصت میں بھیج تیسرہ نہیں؟ ماما البیہ فضل کے ساسی زویا اگلا اور میری مہاشی تو اب ترقی کے مصطفیٰ کی صف میں آگئے ہیں۔ اللہ کرے تو قلم اور زیادہ۔ میں اپنی مہاشی سیدہ ایمانہ زاراشاہ سے شفق ہوں کہ تعلیمات میں اسلام آباد ویران ہو جاتا ہے گو کہ کل سیاسی احوال سے خوب گراہی ہے۔ اللہ کے فضل سے ہاں میں بھی خوب ہو رہی ہیں۔ اس اشارے کی پہلی کاپی کہاں کیبہ عاصی کی دوسرے بس ٹھیک ہی تھی کہ یوم آزادی کی تقریبات پر واحد کاپی تھی۔ ابھی عاصی صاحبہ کاپی لکھنے کے لیے مزید مت درکار ہے۔

سورق کی دونوں کہانیاں معلوم اور شجر کیف اس ماہ کی بہترین کہانیاں تھیں۔ سحر امام کی کوہِ عمارتی لطف دے گئی۔ بدیسی کہانیوں میں تجویر ریاض کی آتشِ زن اچھی تھی۔ اس ماہ کاغذوں کی بہتات بھی اور بہترین تھے۔ سلسلے دار کہانی انکارے کی اس بار قسط طویل اور بارگشتی سے مبر پوری۔ دیکھیں شاہ زیب، تاجور کوئے کرب یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ دوسری کہانی آوارہ گرد میں شہزی آؤ کوؤں کے بعد اب رجب رجب زورس کے لئے چڑھ چکا تھا اور وہاں سے بھی فرار ہو کر شاہِ نو اڑی چلی پہنچ چکا ہے۔

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی گیلی گیلی باتیں ”اس بارڈا کر صاحب نے سرفی مائل بائسل دیا اور باقی رنگوں سے اجتناب کیا۔ ہبز حروف خوب پکے معلوم ہوئے۔ جن قارئین نے تجربے کی ذہانت کو سراہا، ان کا بے حد مشکور ہوں۔ اس میں شہنشاہ کی جاسوسی ڈائجسٹ نے کہانیوں کے سب سے زیادہ متنوع زاویے شائع کیے۔ فیصلہ اور انداز کا سائز اس ماہ کی بہترین کہانیاں تھیں۔ فہرست کا فی جائزہ بنظرِ نغمی۔ انکارے اور آوارہ گرد کا میانی کے جھنڈے گاڑتی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ کوہِ عمارت کا اختتام خوب تھا۔ دوسرا چہرہ، آتشِ زن، بڑا کھلاڑی بھی خوب تھیں۔ دورا سے کافی منفرد کاوش ہے۔ آخری دونوں رنگ ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ ہر رات قلم بھیج رہی ہے، ایک نئی ترجمہ کہانی لکھوں گا مکمل مکمل ہو رہی ہے، جلد ہی روانہ کر دی جائے گی۔“ (بہی بے حد شکر ہے!)

بمکر سے قدیر شاہ کی پہلی دفعہ آمد ”ماہ گاہت کا جاسوسی ایک دن کی تاریخ کے ساتھ 30 کولا۔ پیم آزادی کے حوالے سے جاسورق پسند آیا۔ ہاتھوں میں دگر سگریٹ اور سوچوں میں یلغار لیے آدی پر نظر سے بے ساختہ ٹھہر گئیں، لڑکی البتہ پسند نہیں آئی۔ چینی کتہ چینی کا مطلب ہے شیعہ یعنی بائیں مکر یہاں اکثر لوگ لگتے ہیں کوئین کی گولیاں چپا کر آتے ہیں۔ سوامی کی کوڑا اسلام پہلے نمبر پر نہیں، مہارک باوقول کریں ویسے دوشیزہ ہونے کے باوجود دوشیزاؤں سے الفت نہیں ہے تو کمال ہو گیا۔ سحر قادی کا تفتیشی چہرہ سرا ہے جانے کے قابل تھا۔ ایمانے زارا شاہ اور طلعت مسعود نے خوب کتہ چینی کی۔ انیل ظفر کا تیز ترین چہرہ سر سے کر گیا۔ نو اڑ کر مکمل کا تیز بہت پسند آیا یا سب کے تیز بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں ابتدا انکارے سے کی لیکن معذرت کہانی پور کر رہی ہے۔ تاجور اور شاہ زیب پنڈو کی طرح حکوم رہے ہیں۔ آوارہ گرد کی تیزی اور رفتار سے جاری ہے، شہزی کے ایکشن پسند آتے ہیں، عابدی کی رہائی کب ہوگی، نوشا اور شاہزی کا ٹکڑا کیا رنگ لائے گا۔ کیرمہا جاسوسی کی فہرست میں اچھا اضافہ ہیں۔ دورا سے کہانی کا مضبوط پلاٹ اور الفاظ کا پختہ و بہتر تھا۔ وارث علی عیسیٰ لوگ ہمارے ملک کا فخر ہیں۔ پہلا رنگ اس قادی کے قلم کا نم پورا ثبوت تھا۔ ناکہ بے وفا ہو کر بھی وقار دار بن گئی۔ علی کی موت پر بہت رنج ہوا، امجد جاوید کچھ خاص سٹاٹس نہیں کر پائے۔ چوٹی کہانیوں میں مہتاب خان کی کہانی اچھی تھی۔ جیسی کرنی دیکھیں برائی۔ پہلی دفعہ لکھنے کی جسارت کی ہے، امید ہے جگہ ملے گی۔“

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی اداسی ”زندگی ایک سڑ ہے اور ہر سب مسافر اور مسافر ایک جگہ رکتا نہیں۔ جاسوسی سے ہمیں بہت محبت ہے اس بات کا آپ کو اعزاز ہوگا۔ 2010ء سے 2017ء تک جاسوسی کا ہمارا سچا ہاتھو سوا لوداوی خطا تو لکھا جا رہا ہے۔ 31 جولائی کو مری سے واپسی پر جاسوسی خرید، حیدر نہیں اداس نظر دے کر کہہ رہی تھی۔“ (بہی نہ جاؤ چھوڑ کر۔“ سگریٹ سے مجھے سخت چڑ ہے اس لیے اسد مہاس کو میں نے نظر اعزاز کر دیا۔ کوڑا اسلام کا جامع اور عمدہ چہرہ تھا۔ سحر قادی کی امیدوں کو امید سے دیکھ کر طلعت مسعود کے مشورہ کو اداس میں بٹھا کر ایمانے زارا کی تنقید کو بشت انداز میں طے سے اتار کر شاید واقعات کے پراخوں کی داستان بخوریں۔ انیل ظفر کے تیز سے پرکری نظر ڈال کر نو اڑ کر، آصف محمود سے سلام دعا کے بعد رانا شیر احمد کی محبت پر پیار آنے لگا یا سب کی تجویز نگاری خوب رہی۔ انکارے میں حد سے زیادہ ایکشن کہانی کو کٹا کر کر رہا ہے۔ شاہ زیب کا تاجور کوئی اعزاز میں سیف کی موت کی اطلاع فراہم کرنا بالکل سٹاٹس نہ کر پایا۔ پال کی وفاداری شاہ زیب کو مشکل سے نکالنے میں مدد کر سکتی ہے۔ عبدالرب بھی کہانی کو دلچسپی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ نوشا کی دھنی شہزی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ابتدا میں صفحات پر مصنف اپنی جگہ خود بنا لیتا ہے۔ سیاست اور ملکی حالات کی خرابی کا حال بیان کرتی کہانی نے سٹاٹس کیا۔ اس قادی نے ناکہ کوڑا نہیں دی تھی وہ عالمِ عمومی مظلوم بھی ٹھہری۔ امجد جاوید بھی اچھا لکھتے ہیں۔ کافی عرصے کے بعد ان کی کوئی تحریر پڑی۔ نارائن پرتس آیا، خالی ہاتھ رہ گیا۔ بڑا کھلاڑی، اندی سائز، کوہِ عمارت کچھ مزہ دیا۔ جب آپ کو میرا یہ خط لے گا شاید میں آپ کے شہر کرچی میں ہوں اور مجھے آری میں انظرک جابل گئی ہے۔ میں بہت اداس بھی ہوں، خط لکھتے وقت آنسو بھی پھٹکے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کچھ عرصے کے لیے الوداع کہتا ہے۔“ (الوداع کیوں کہتا ہے) امید تو نہیں ہے کوئی بارے کا پھر بھی درخواست ہے، مجھے آپ سب سے پیار ہے۔ دعا کریں کا میا ب رہوں اور خط پرا شامل بھیجے گا آخری خط اپنے محبوب ڈائجسٹ کے لیے۔“

دراپن کلاں ڈی آئی خان سے شاہد رزاق خان کا آغازِ محبت ”ڈائجسٹ پڑھنے کا چکا تو ہمیں دسویں جماعت سے لگا تھا جو آج اب اے کے بیچ دینے کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ براہِ و ڈائجسٹ خریدنا اور مہر لگے ماہ کا بے مہری سے انتظار کرنا اس کا پتا ہی مزہ ہے۔ مجھے تھوڑا کتہ تو نہیں آتا مگر کوشش ضرور کر رہا ہوں قلم شاعر..... بہت مہر داس مدد خواستہ مں نے بھی کاغذ قلم سہیل کر تیرہ لکھنے کی شان لی ہے۔ بائسل مجھے ہمیشہ سے منور دیکھتے ہیں۔ ہر دفعہ الگ اسٹائل البتہ ہر مرتبہ سورق کی دوشیزہ کا اعزاز ملتا جلتا ہے، بہیروں کی غفلت میں پڑانے تیرہ نگاروں کی بہت کی محسوس ہوتی ہے جن میں تصور اکین، عقیس خان، بابر مہاس، قاسم رحمان، زو یا اعجاز اور بھی بہت سے ہیں ویسے یہ جو زو یا اعجاز کہانیاں لکھتی ہیں کہیں وہی تیرہ نگار تو نہیں ہیں۔ (بالکل، یہ وہی زو یا ہیں) میں جاسوسی کی ابتدا اولین کہانی سے ہی کرتا ہوں ترتیب وار چلتا اچھا لگتا ہے۔ دورا سے ایک بہترین اور مکمل گرفت میں پکڑنے والی کہانی۔ ملکی حالات کی بہترین عکاسی اور سب مسائل کا بہترین حل۔ واقعی نظام کی تبدیلی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مصنف کیرمہا جاسوسی نام بہتر کام، شاندار کہانی لکھنے پر مہارک باد۔ ممکن رسالہ لکھ کے ساتھ اچھی رہیں۔ شرمین کی ذہانت پر رنگ آیا۔ بے قصور عکس قادی کی کہانی پسند نہیں آئی مجھے۔“

جو جس کا کردار پسند آیا۔ خوریر ریاض کے سوا نے تو گھما کر رکھ دیا۔ بولی تو نہایت بے وقوف لکھا ایک عورت سے دھوکا کھا گیا۔ منظر امام کی کہانیاں بہت دلچسپ ہوتی ہیں اس لیے نظر بھی کرانگا۔ اس کے لیے طرف بڑھے۔ ابراہیم اور زینب کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اتنی ہی غائب تھا۔ کہانی کچھ پھینکی ہوتی جا رہی ہے۔ خیر ابھی سناروں کے جہاں اور بھی ہیں۔ شہزادی کوئی چھلا دے۔ بھی صاحب! خیر سے اب میڈم زہرہ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ شہزادی نے آری کے چنگل سے بھاگنے کی حثایت ہی کی ہے۔ سند کا مخصوص ٹیچ اس کہانی میں اچھا لگتا ہے۔ ویسے کیا رازنک کا تعلق سندھ سے ہے۔ (جی ہاں) اس کا دوری مظلوم ظالم کی کہانی بیان کرتی نظر آگئی۔ خدا کے ہاں انصاف ہوتا ہے۔ ناکہ کے بعد دو کشتیوں پر تھے لیکن آخر غصہ آگئی۔ اچھا جاوید کارنگ اچھا منظر لگا لیکن برا بھی نہیں تھا۔ اہم نے زاراشاہ، رانا شہر، سعد یہ قادری اور دشت دل کے تہرے اچھے دیے ایک بات پوچھنی تھی، کیا انجم فاروقی ساحلی اور فاروقی انجم ایک ہیں؟ (جی ہاں)

اولیٰ باب: رومانی، اہل شرافت میں جاسوسی ڈائجسٹ میں بلکہ کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ (خوش آمدید) میں اور اس نے پڑھا، رومانی بھی ایک دن ایک انشال سے سسٹمز اور جاسوسی ڈائجسٹ لے آئی۔ پڑھ کر احساس ہوا کہ میں اسے عرصے تک اسٹوڈیو میں لپٹا ہوا ہوں۔ (پلوٹیو دیر آید درست آید) میں اب باقاعدگی کے ساتھ دونوں ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔ اس میں لکھنے کا بھی شوق ہے۔ لیکن ڈائجسٹ جاسوسی ڈائجسٹ ہے۔ ماما جانی نے مجھے متغیہ کیا کہ یہ مردوں والا ڈائجسٹ ہے لیکن میں اپنی فہرست رازنکس قاطعہ، مریم کے خاں، رازنک، جینکین وضا اور اس کا دوری کی بدولت ڈیڑھ رے کی خواہشیں بھی تو جاسوسی ڈائجسٹ میں لکھتی ہیں تو میں پڑھ نہیں سکتی، خیر اس سے پہلے کہ آپ ہر ہوں، میں آتی ہوں تبصرے کی جانب۔ اگست کا شمارہ ملا۔ سردی پر فیضان اور ناکہ تھے۔ اب چلے ہیں کہانیوں کی طرف کیریماس کی دورانیہ: شہن آزاری پر اچھا حوصلہ بھی۔ جینکین رضا کی لکھا اچھی کاوش تھی۔ سرفراں شرمین کی ذہانت پر دماغش آتش کر اٹھا، ویسے حڑے کی بات ہے کہ کھٹک تو مجھے بھی کارل ہی پر ہوا تھا کسی قاطعہ کی بے قصورگی کا کافی اچھی رہی۔ طاہر جاوید محل کی انکوائری ابھی آپ داب کے ساتھ جا رہی ہے۔ مہتاب خان کی فیصلہ پسند آئی۔ ماں باپ کے کیسے کی سزا اور دو کوئی بھتیجی پڑتی ہے۔ سلیم انور کی قاتلانہ حمل بھی اچھی رہی۔ عمران قریشی کی بڑا مکھڑا ڈیڑھ اچھی لگی۔ سیریل کی۔ جمال دتی کی دوسرا چہرہ بھی بہت پسند آئی۔ امریکا میں اس طرح ہی ہوتا ہے مجھے شروع سے ہی مارکس پر کھٹک تھا۔ مجھے یا سراموں کی انعامی سازش نے جاسوسی کے صفحات کا حق ادا کر دیا۔ میرے خیال سے اسے آخری صفحات میں جگہ ملنی چاہیے مگر ایڈیٹر نے سسٹمز پر قرار رکھا۔ اس کا دوری کی مظلوم اچھی کاوش تھی لیکن پوری کہانی میں فیضان اور ناکہ پر کھٹک کر داکے رازنکے آخر میں تو قیر کو بھرم ڈالا۔ ہمارے معاشرے میں بھائی غیرت کے نام پر بہن کو قتل تو کر سکتا ہے کیا کہ بہن کو اس کے عاشق سے ملوانے کے لیے بہن کو قتل کرنا چاہے۔ بہر حال اچھی کہانی تھی۔ اچھا جاوید کی ترجمان کھٹک اچھی کہانی تھی۔ ویسے تو میں انڈین کہانی پڑھتی نہیں ہوں لیکن آخری صفحات پر ہونے کی وجہ سے پڑھ لی۔ نارائن نے سنیٹا کو یاد دہان کر رکھا، یہ اس کی سیسیت تھی اس لیے آخر میں جی داناں رہ گیا۔ اس دفعہ کا جاسوسی ایڈیٹرنگ تھا۔

اسلام آباد سے آگئی محفل کا انداز: اگست کے سہینے میں گری مروج پر ہوتی ہے ایسے میں بازار جا کر خریدنا دل گردے کا کام ہے لیکن ہماری جاسوسی سے محبت ہی ایسی ہے کہ نہ پڑھیں تو کھانا نہیں کھاتے۔ ہمیں ہوتا چاہیے پند نہیں اس لیے نوکٹ البتہ تبصرے سب کے میں شوق سے پڑھتی ہوں مجھے سید عبادت کاظمی اور مرزا محفل کے تبصرے پسند ہیں لیکن آج کل یہ دونوں کہیں کی یا تار پر لٹکے ہوئے ہیں۔ اس دفعہ محفل میں بکھٹے نے مانتظر اس کو شرف اسلام نے خوب تبصرہ کیا، سعد یہ قادری اچھی رہی۔ طلعت مسعود چھوڑے گھبرائے لگے البتہ اہم نے زاراشاہ نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انیلا ظفر، شاہد صاحب، بلوا، ارنگ، راجہ راجہ بھائی کے تبصروں نے چار چاند چمکانے۔ انکوائری نے ہوتی تو جاسوسی پڑھنے کا حوصلہ نہ آتا۔ مجھے تاجدار اور شاہ زب پر نوکٹ لگتے ہیں۔ ویسے اب لڑائیاں ختم کر کے شاہ زب پر ان دشمنوں کی طرف لوٹنے جو پاکستان میں تھے۔ آوارہ گرد نہیں پڑھتی کیونکہ اس کی اقتضا کا کافی ہو چکی ہیں۔ ابتدائی صفحات پر کیریماس کی کہانی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کا ایک رنگ خوبی رات مجھے بعد پند آیا تھا۔ سیاست کے پیچ داؤد سلطانی خور ہمارے نظر میں ستمبر تھی۔ پاکستان میں بھی اسے لوگ ہیں جو جان بھری کر لے کر چلتے ہیں۔ مجھے ان کا انداز خیر اچھا لگتا ہے اور ذرا اعجاز بھی زبردست لکھتی ہیں۔ گرداب کے بعد اس کا دوری غائب تھی۔ مظلوم ظالم میں ناکہ بیک وقت ظالم تھی مگر اور مظلوم کہانی اچھا تاثر چھوڑی۔ اچھا جاوید نے بھی اچھا لکھا۔

کوند سے سیف خان کی چمن آرائی: ایک عرصے کے بعد مبدولت دیدہ دور نے محفل بکھٹ چینی میں جلوہ افروز ہونے کی سعی کر لی لیکن محفل اپنی بے لوری، پے دازیں مارنے کی والی تھی (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) بومل پکوں اور نرنگوں والی حسینہ سردی کی بے رخی کا وار عہدے لیے جب محفل کا دور وازہ کھڑا کیا تو کوثر اسلام ریش مبارک میں خلال کرتے ہوئے باہر نکلے۔ انہوں نے دو شیراؤں کی طرف نظر التفات نہ رکھنے پر کیا جھاڑ پلائی ہمارے دل کے حریف کوٹے ہوئے لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے سعد یہ قادری نے آکر ذرا شخصی دی اور جب یہ بتایا کہ اور اب کے کوایم اسے راحت، جی الدین نواب اور کاشف زہیر صاحب کے حوالے سے خصوصی تبصرہ لگانے چاہئیں تو طبیعت باغ باغ ہونے لگی۔ دینی والے طلعت سسٹمز کی طرز پر جاسوسی میں بھی پرانی قبول کہانیوں کے دوبارہ اشاعت کی فرمائش کر رہے تھے۔ واقعی ایسا ہو جائے تو مزہ آجائے۔ شندوالی ریاض جینر کر لی اہم نے اسلام آباد کی عید کا خوب احوال بتایا۔ بڑے بڑوں کے تبصروں کے پیچ نوارنگل پیچ کی انٹری دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ذرا بے وصلی پر اردو ان بھی خوب اٹھیلیاں کر رہے تھے۔ محفل کی کھڑی دشت دل زور شور سے اپنا تازہ باغ ناکہ کلام سنا رہے تھے۔ غرض ہر طرف جی ہو ہوا کہ نکر دور کیا اور ہم دور اسے پہنچے۔ جاسوسی کے چٹوے پر دھک کے کئی رنگ تبصیر نے کے بعد کیریماس ابتدائی صفحات پہ ایک حیرت رازنہ خبر کے ساتھ موجود تھے جس کا موضوع ہمارے روایتی سیاسی نظام کی تبدیلی کے گرد گھوم رہا تھا۔ کہانی کا بیانیہ ذرا خشک اور جگمگ آمیز سا لگا۔ البتہ تنقید انتہائی جائد تھا۔ ہمارے فرسودہ سیاسی نظام کو بدلنے کے دعوے تو بہت کیے جاتے ہیں لیکن مصلحت کی سیاست اور دیانت کی کمی ہمیشہ آڑے آ جاتی ہے۔ مستقبل میں کیریماس سے بہت

امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ دراجی اعزاز سے ہٹ کر کھڑے ہیں اور دینی مفسران کی تحریروں کو کفر اور بدعت دیتا ہے۔ اس بار تو مثل صاحب نے انگڑے سے پا دیے۔ شاہ زہیب کا مسخا آرام سے تاجور کے ساتھ کھانا پیتے پڑتے ہے، ہم جیسے قسطیہ فقیر کے سینوں پر بس مونگ ہی دیتی رہی۔ جامانی میں تاجور کی اعتراضیں ایک آنکھ نہیں بھاری۔ بانی کہانی اپنے عروج پر ہے۔ ایک طویل عرصے بعد جاسوسی کے صفحات پر امجد جاوید صاحب کو فخر بکف دیکھ کر ارد گرد خوش ہوئی۔ مہندی میں منظر نے کہانی کو یونیک ساٹھ دیا۔ مایا دوی کے کردار کو خوب بنایا تھا جس سے قاری کی دلچسپی آخری پیر اگراف تک کھتی رہی۔ اس قدر نے خواہر اے تادان کے کیس میں عالم تو قیر کو غلام دکھانے کی کوشش کی۔ کہانی کے رواں اور بہل اعزاز نے سادہ سے کیس میں جان ڈال دی اور آخری پیر اگراف تک انوکھا کہانی کی پچان کی گرفت میں نہ آ سکے۔ تحریروں میں ممکن صاحب کی لگا کر میں شرمین کی باریک بینی نے دل چھو لیا۔ منظر امام صاحب ایک بار پھر حاکم طائی کو عہد حاضر میں لے آئے لیکن کہانی کا اعزاز یاں بچکا ناسا گیا۔ فیصلہ میں انوکھا مظلوم بہ بچے کے بجائے مجرم کا پتا ہی بچہ انوکھا لیتے ہیں۔ یہ فارمولہ لکھی بار بار چاہا جا سکے اس لیے بھی تحریر خاص تاثر چھوڑ نہ سکی۔“

اسلام آباد سے زارِ شاہ کی سواری ”یہ جوڑا بجٹ کا ٹائٹل ہوتا ہے یہ مجھے سائیکالوجی کی کلاس یاد کرادیتا ہے جس میں تصویر دیکھ کر رائے بتائی ہوتی تھی اس لیے ہم کوئی کیمیا رس نہیں دیتے کیونکہ کلاس میں بھی ہمارے ریمارکس سب سے زرا لے ہوتے تھے۔ ادارہ یہ بات کروں تو ستر سال آزادی کے سن کر بس ہنسی آتی ہے۔ آزادی فقط ایک لفظ تو نہیں ہے، دوقوموں سے آزاد ہونے کو مگر سائیدانوں کی غلامی میں چلے گئے۔

[illegible]

صوفی سے کوثر اسلام کی آمد، اس بار جاسوی دیوتا نے معمول سے ہٹ کر ذرا جلدی اپنے ورثن کرائے۔ برسات کے پیکھے موسم میں چائے پیتے ہوئے جاسوی کا آنا زکیا۔ تبصرے پر آتی خوش ملی گریا بہت اچھل گئی ہو۔ دل سے بے ساختہ ادا رہے لیے دعا میں نکلیں۔ سرودق پر فیضان کی تصویر سے کسی طرح نہیں گہرا کہ وہ عامل ہے۔ وہ جنوینی دیتا تھا اس پر چاند تارنا ہوتا آپ نے اسے پا کستان کا محض ابنا دیا۔ توفیق کے ساتھ پہنچی ہے۔ جیسے جادوگر جادو نے ہیں۔ اس انتظار کے میں حالانکہ فیضان شاعر تھا صرف توفیق نے دیا تھا۔ جادو کر نہیں تھا۔ سب سے پہلے اداری نوٹ پڑھا تو اچھی آزادی کے 70 برس بعد بھی حالات ہیں کہ توں میں خراب کی زندگی ہے جو بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ انڈیا کو کل کا حامی و مددگار ہے۔ پہلی کہانی کا حق خوب ادا کر دیا۔ حقیقت کی عکاسی کرتی ہوئی لکھا کہانی تھی۔ ایک مدت کے بعد اسی کہانی پڑھنے کے لیے وارث علی وسمی اور مفتی توصیف نے مسلسل محنت اور ان تھک جدوجہد سے نامکمل کو ممکن بنایا۔ کاش ہماری زندگی میں ملک میں ایسی تبدیلی آجائے، آمین۔ جزیل آزاد کے ساتھ پہلی ملاقات میں وسم کے ساتھ دواور شاعر علی اور مفتی توصیف کیوں نہیں تھے۔ غیر معروف شاعر اور ادیب تھور کے مقابلے میں عالم دین اور قلم

رقصِ ابلیس

ڈاکٹر سکیم عادل

ایسے لوگ جن کے پاس کوئی خاص صلاحیت نہیں ہوتی... بڑی آن بان کے ساتھ سر اٹھا کر اکڑ کے چلتے ہیں... جمیکا کی سرزمین پر سیاحت کے لیے آنے والے چند ایسے ہی کرداروں کا ملاپ... واقعات کی اپنی منطق ہوتی ہے... مستی و مسرت کے لمحات میں اچانک ہی ایک ایسا تنوع آیا کہ ہر چیز تلپٹ ہو کر رہ گئی... وہ جو اپنی زندگی کے بقوں کو خوشیوں سے بالادگار بنانے آئے تھے... خوف... دہشت اور لہجے کے چوہنتوں سے رنگتے چلے گئے۔ دولت کا لالچ... جو انسان کے دل سے ہر جذبہ اور ہر احساس کو فنا کر دیتا ہے... زر کے حصول نے اسے بھی پاگل کر دیا تھا... وہ ہر ایک کا دشمن بن چکا تھا... اس کی دہشت و بربریت کی لپیٹ میں وہ عورت بھی آگئی جو زندگی کی پریشانیوں سے فرار حاصل کرتے اس سرزمین پر آئی تھی... زندگی کے دن لمحہ بہ لمحہ ختم ہو رہے تھے... قاتل کی تیز نگاہیں اس کی تلاش میں مسلسل گردش میں تھیں... سنسنی... ایڈونچر... اور تجسس سے بھرپور شاہکار...

دل تھام لیے دلائی سائمن اسٹریٹز ایک شعور و سیم کہانی کے اتار چڑھاؤ

وہ ایک ماہر تیراک کی طرح تیر رہا تھا۔ اس کے مضبوط بازو دھوپ کی تھامت میں دک رہے تھے۔ میں عام طور پر مردوں کا اس طرح مشاہدہ نہیں کرتی مگر شاید کچھ بیزاری کی اور کچھ شروب کا اثر اور پھر وہاں کچھ دیکھنے کے لائق تھا بھی نہیں۔ میں کنکشن جیک کا مونیٹنگ بے نامی ایک گھنٹیا سے ہوئی کے سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی تھی۔ ایک ہفتے پر محیط تعطیلات کا یہ تیسرا دن تھا۔ تنہائی اور مایوسی کاٹنے کو آرہی تھی۔ مجھے یہاں اور امریکا میں اپنے شہر نیوآرک میں کچھ خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں وہاں پر ایک پرائیویٹ سرائے رساں کمپنی چلاتی ہوں۔ رہ رہ کر مجھے انفس ہو رہا تھا کہ کاش اگر میں نے کچھ اور پیسے پس انداز کر لیے ہوتے تو شاید اپنے تیرہ سالہ بیٹے جمال کو بھی ساتھ لے آتی۔ اس بات سے آپ کو میرے مالی حالات کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔

اس سفر کے آغاز میں تو سب کچھ ٹھیک ہی تھا۔ یہاں تک آنے کا ایک طرف ٹکٹ مجھے مفت میں مل گیا تھا۔ چند ماہ قبل میں نے دائوٹیا گرین نامی اپنی زلف تراش کی چھوٹی بہن کو نیوجرسی کے بے رحم قانونی چنگل سے رہائی دلائی تھی۔ اب اس غریب کے پاس بھی میری فیس ادا کرنے کے لیے پورے پیسے نہیں تھے تو اس نے جزدی معاوضے کے طور پر مجھے کنکشن تک کا یہ ٹکٹ دے دیا تھا جو اس نے شاید کسی



کہلوانا پسند ہے۔“
میں نے اب تک اس کی باتوں کا صرف سر ہلا کر ہی جواب دیا تھا۔
”کیا تم اس سے ملنا چاہو گی؟“ اس کے سوال نے مجھے حیران کر دیا۔

”نہیں۔“ میں نے قدرے ناگواری سے جواب دیا اور قریب پڑی میز سے رسالہ اٹھا کر الٹ پلٹ کر نا شروع کر دیا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر جلدی سے بولی۔ ”اوہو! معاف کرنا شاید میں نے آپ کو پریشان کیا۔ میرا شوہر کہتا ہے کہ میں بعض اوقات بہت ہی نامقول اور بے گنجی باتیں کرتی ہوں۔“

یہ بات اس نے اس قدر معصومیت سے کی تھی کہ مجھے لگا کہ شاید وہ میرے اندازے سے بھی زیادہ کم سن اور نادان تھی۔

”نہیں، کوئی بات نہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ میں نے تمہاری بات کا برا نہیں منایا۔“ میں نے رسی خوش خلقی سے کہا۔ یہ سنتے ہی وہ کسی بچے کی طرح کھل اٹھی۔

”چلو تو بہت اچھی بات ہے۔ میرا نام لائلہ ہے۔ لائلہ لو۔“ پھر کھٹکھٹا کر ہنسنے ہوئے بولی۔ ”وہی میرا اصلی نام تو ڈیلا لائلہ ہے مگر مجھے لائلہ کہلانا زیادہ پسند ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کی کسی بہت مشہور اداکارہ کا نام ہو۔ لائلہ لو۔“ وہ ہوا میں بازو لہرا کر بولی۔ میں پھر رسماً مسکرا دی۔

”اور تم؟“
”تمہارا نہیں۔“ میں نے کچھ ہنچکپاتے ہوئے جواب دیا۔

”ارے یہ تو بہت ہی خوب صورت نام ہے۔ عجیب سی نفسی ہے تمہارے نام میں۔“ پھر ارگردو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں تمہاری ایک تصویر کھینچ سکتی ہوں؟“ شاید اسے کوئی اور بات نہ سمجھی تھی۔
”میری تصویر؟“

”ہاں مجھے تمہارا چہرہ بہت ہی اچھا لگا ہے۔ اب اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکالنا۔ دراصل ہم دونوں کی پسند بھی ایک جیسی ہے اور ہم دونوں ویسے بھی اسٹائلش ہیں تو جو لوگ مجھے پسند آتے ہیں میں ان کی تصویر کھینچ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہوں شاید اپنے پچھلے جنم میں، میں کوئی فوٹو گرافر رہی ہوں گی۔“

میں نے ایک لمحے اس کی طرف دیکھا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے

لاٹری میں جیتا تھا۔ واپسی کا کرایہ اور ہوٹل کا خرچہ چونکہ میرے ذمے تھا اس لیے میں نے سستی ترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ شروع شروع میں تو یہاں کی مصوٰر کی آب و ہوا جس میں کیلے اور مختلف مسالا جات کے درختوں کی خوشبو رہتی بسی ہوئی تھی بہت ہی بھلی لگتی۔ پھر اگلے دن میں نے وہاں کے تمام مشہور مقامات مثلاً ڈیون ہاؤس، باب مارلی میوزیم اور ہوپ گارڈنز کی سیر کر ڈالی۔ کچھ یہاں کی دست کاریوں کے بازار میں دکان دار عورتوں سے بھاؤ تاؤ کرنے میں بھی اچھا وقت گزرا۔

مگر آج صبح میں سو کر ابھی تو گردن میں شدید اکڑاؤ تھا جس کی وجہ سے میں نے کافی وقت اپنے کمرے میں ہی گزارا۔ کمرے کا انٹرکنٹینر جواب دے گیا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد ٹیلی وژن بھی۔ میں ہوٹل کے ریسٹوران میں چلی آئی اور ناشتا منگوا یا۔ انڈے کچے تھے، توس ٹھنڈے اور کافی! خیر اس کے بارے میں تو کچھ نہ ہی کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ سو میں نے تھوڑا سا پکھنے کے بعد ڈرنک کا گلاس اٹھ میں پکڑا اور سوئٹنگ پول کے کنارے بیٹھ کر اس باہر تیراک کو دیکھنے لگی۔

مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کب ایک عورت میرے ساتھ والی دراز کر سی پر آ کر لیٹ گئی اور مجھ سے بات چیت کی کوشش کرنے لگی۔

”اوہ، لگتا ہے آپ نے مجھے دیکھا نہیں۔ دیکھو تو کپڑوں میں ہماری پسند کئی ملتی چلتی ہے۔“ اس نے اپنے گلابی شیشوں والے چشمے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو اس نے بھی میرے ہی جیسا سرخ رنگ کا مختصر ساتیرا کی کا لباس پہن رکھا تھا مگر اس کا وزن مجھ سے لگ بھگ بیس پاؤنڈ کم اور عمر تقریباً پندرہ سال کم تھی۔ وہ کافی خوب صورت تھی اور اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ بال سرخی مائل سمورے تھے جو اس کی جلد سے تقریباً ہم رنگ تھے۔ اس کی آواز بھی بچوں جیسی ہی تھی۔ ایک چھوٹا سا مگر مہنگا کیرا اس کے سینے کے بچوں جیچ جھول رہا تھا۔

”آپ بھی اعلیٰ ذوق والی لگتی ہیں۔“ اور پھر وہ میری نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ میرے شوہر کا دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہمارے کاروباری مراسم ہیں۔“ پھر کچھ رکتے رکتے بولی۔ ”ڈیلاویر۔ یہی ہے اس کا نام۔ حالانکہ وہ ہم سب کی طرح جرسی کی کارنئے والا ہے۔ ڈیلاویر براؤن۔ سوچو بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا؟ مگر اسے یہی

”اچھا وقت گزر رہا ہے؟“

”ہاں! کہہ سکتے ہیں۔“

”کیا کافی ون رہنے کا پروگرام ہے؟“

”نہیں کچھ زیادہ نہیں۔“

”بہت خوب! مجھے کم کوعورتیں اچھی لگتی ہیں۔ بس اتنی ہی بات کریں جتنی کہ ضرورت ہو۔“ اس نے لائلہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کھسپانے انداز میں نیچے دیکھنے لگی پھر وہ تیراک کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہے! براؤن! کیا پول کو تو ذکر ہی باہر آؤ گے؟ وہ ڈیلاویر براؤن ہے۔ میرا دوست۔“

تیرا کہ اس کی صدا سن کر پول سے باہر آیا اور قریب بڑا ٹولیا اپنے ارد گرد لپیٹ کر ہماری طرف چلنے لگے۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ سڈول کسریٰ کی جسم۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کافی عرصہ باکنگ رنگ میں بھی گزار چکا ہو۔ اس کی چال سے لگتا تھا جیسے اسے اپنے ذیل ڈول پر بڑا ناز ہے۔

ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کہا۔

”بسی بڑی گرمی لگ رہی ہے یار، میں ایک ڈرنک لینے جا رہا ہوں۔“

”چلو لائلہ، میں بھی براؤن کے ساتھ ایک ڈرنک پینا چاہتا ہوں۔“ یہی اپنا آہنی ہاتھ لائلہ کے نازک کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ لائلہ نے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو وہ اکیلائی باریک طرف چل دیا۔ پھر کچھ سوچ کر لائلہ بھی مڑی اور جاتے جاتے بولی۔

”تم سے مل کر خوشی ہوئی تمہارا اہل۔“

”مجھے بھی۔“ میں نے بھی اسی خوش دلی سے جواب

وہ

اب سوچا جائے تو اس قصبے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ کسی بھی ہوش مند اور سمجھ دار عورت کو کسی لی، لالکھ لو اور براؤن جیسے مشکوک کرداروں سے بچ کر ہی رہنا چاہیے تھا مگر میں تو ہمیشہ سے ہی اپنی حماقتوں کی وجہ سے مصیبت میں پھنسنے کی عادی تھی۔ جب کچھ دیر بعد لالکھ واہس آئی اور پھر بے ٹکانہ نہ کہنے لگی تو میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہی اور میں سوچ رہے تھے کہ تم نے غالباً کنگسٹن کا وہی حصہ دیکھا ہے جو کہ گائڈ بکس میں چھپتا ہے مگر ہمیں جیسا آئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ ہمیں ”اصلی جیسا“ کا پتا ہے

بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

اس نے کھڑے ہو کر میری چند تصویریں کھینچ لیں پھر ایک ویٹر کو قریب آتا دیکھ کر دوبارہ بیٹھ گئی اور اپنے لیے جام کا آرڈر دیا پھر مجھ سے پوچھا تو میں نے معذرت کر لی۔
"کچھ تو ہے۔" اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو مجھے بھی
"ہاں ہاں" "نہیگا"

”یہاں میں ہوں، یہاں اہل اوس کی تعداد ہے لیکن
 اوس جو باغی ہیں“ میں نے یہی اصرار دلاتے ہوئے کہا۔

”تم امر یہاں میں کہاں سے؟“ لاکھ نے پھر سلسلہ
نام پھیرا

”جری۔۔۔“
”جری سنی! ارے دیکھو تو تم بھی ہمارے شہر کی
”الہیں۔۔۔“

”نہیں میں نیوآرک میں رہتی ہوں۔“ میں نے صبح کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ نیو آرک۔ میرے ابا نیو آرک سے تھے مگر
 میری پیدائش کے بعد وہ جری سٹی منتقل ہو گئے تھے۔ کیا
 تمہاری پیدائش بھی وہیں کی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے رسالہ دوبارہ اٹھاتے ہوئے
واپس دیکھا۔ شاید اس کا شوہر ٹھیک ہی کہتا تھا۔

”اہم! میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ میرے بازو کو ہلکے سے چھو کر بولی۔

میں سوچنے لگی کہ شاید میرے کمرے کا انٹرکنڈیشنز
بیک ٹیک ٹھیک ہو گیا ہو مگر قبل اس کے کہ میں اپنے کمرے
پر واپس جانے کا سوچتی، وہ ایک آدمی کا ہاتھ تھامے واپس
گئی۔

”تمارا اہل! یہ میرے شوہر ہیں سبکی لی لو۔“ اس نے نارف کراتے ہوئے کہا۔

یہی لی نے اس کے سر پر ہلکی سی چٹ لگائی جیسے وہ
 کوئی نٹ کھٹ سی بچی ہو وہ اس سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ کافی
 باجاڑ اور بھاری بھر کم سا۔ اس کی آنکھوں سے عجیب سی
 پیرچی جھلکتی تھی۔

”میری بیوی ڈیلا لکھتا رہی تھی کہ آپ بھی ہمارے
 ارے ہیں۔“ اس نے اپنی بیوی کا ذکر ایسے کیا جیسے وہ
 اپنے سے کم تر سمجھتا ہو مگر لالکھ کا اس کی کوئی فکر نہ تھی وہ
 سب سے اعلیٰ انداز میں ہنسی رہی۔

”اچھی جگہ ہے۔ تو یہاں تفریح کی غرض سے آئی
”میں نیو آرک سے ہوں۔“

جو کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔ ہم تینوں شام کو کچھ سیر سائے کے لیے نکلیں گے۔ کیا تم ہمارے ساتھ آنا پسند کرو گی؟ براؤن اپنے ہونٹ سے گاڑی لے آئے گا پھر ہم جہاں چاہے گھوم پھر سکیں گے۔ تمہیں ضرور اچھا لگے گا۔ کلبوں میں ساری رات موج مستی کریں گے۔ آج رات تم ہماری مہمان ہو گی اور تمہارا سارا خرچہ ہم اٹھائیں گے۔“ وہ بچوں کی طرح حذر کر رہی تھی۔ میں نے جب کوئی جواب نہ دیا تو کہنے لگی۔ ”دیکھو تمہارا انگنکشن جیسا شہر اکیلے سیاح کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ پھر جب تم ہمارے ساتھ آؤ گی تو مجھے بھی تمہارا ساتھ مل جائے گا۔ چلو نا پلیز۔“

اس کے لہجے میں کچھ ایسی الجا جت تھی کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر بیٹھی۔

”ہم کرنا نمبر 314 میں ہیں۔ یا پھر بہتر رہے گا اگر ہم اسی جگہ پر دس بجے ملیں۔“ وہ اپنے تئیں تمام پروگرام طے کر چکی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے پھکی سی ہنسی ہنسنے ہوئے کہا مگر میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوئی تھیں۔

اس رات جب ہم اسٹیپ اینڈ گونا می کلب میں داخل ہوئے تو وہاں موجود تین نوجوان ایسے تھے جنہیں دیکھتے ہی مجھے خطرے کی بو آئی تھی۔ وہ تینوں بار کے پاس بیٹھے تھے۔ اسٹیپ اینڈ کلب ایک چھوٹا سا کلب تھا جو شہر کے انتہائی غیر معروف علاقے میں واقع تھا۔ وہ تینوں تقریباً ہم عمر تھے اور کپڑے بھی ایک ہی طرح کے پہنے ہوئے تھے۔ ہوڈ والی بنٹلیس اور ڈھیلی ڈھالی جینز۔ ان کے چہروں پر عجیب سی کرفٹنگ تھی جیسے اتنی کم عمری ہی میں انہوں نے دنیا کی کتنی حقیقتوں سے واقفیت حاصل کر لی ہو۔ غربت کی گود میں پلے یہ نوجوان خواہ نیوارک کی کسی جیل میں ہوں یا پھر انگلینڈ کے اس گھٹیا سے بار میں، ان کے چہروں پر ایک ہی طرح کی بے خوفی پائی جاتی ہے مگر میں ان پر زیادہ دھیان نہ دے پائی تھی کیونکہ تمام راستے سبکی کی غلط گفتگو سن کر میرے کان پر چکے چکے تھے۔ کلب کی تنگ و تاریک راہداری سے گزر کر ہم ایک غار نما کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں چار بڑے بڑے سرخ بلب دھول اور مٹی سے انی دیواروں پر عجیب سے لہو رنگ ڈیزائن بنا رہے تھے۔ ایک کونے سے اونچے میوزک کا شور اٹھ رہا تھا۔ پرانے گیسے پنے گانے جو شاید میں نے اپنی نوجوانی میں سنے تھے پھر ایک ایسا ہی گانا سنتے ہی مجھے اپنے بھائی جونی

کی یاد آگئی جسے اس جہان فانی سے گزرے پندرہ برس ہو گئے تھے۔ پچیس سال کی عمر میں ہی جونی نے خودکشی کر لی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کے صدمے نے ایک ایک کر کے میرے والدین کی بھی جان لے لی اور میں اس دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ اس وقت وہ گانا جو جونی کو بہت پسند تھا، سنتے ہی اس کی یاد نے اداس کر دیا تھا۔

کلب میں داخل ہوتے ہی وہاں موجود لوگوں نے ہماری جانب مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کچھ تیز میک اپ کیے اور چست اور باریک لباس زیب تن کیے غالباً پیشہ ور عورتیں تھیں جبکہ کچھ مزدور پیشہ مرد بار کے پاس بیٹھے جام پر جام چڑھا رہے تھے۔ ان عورتوں نے میری اور لائلہ کی طرف زہر آلود نظروں سے گھورا مگر لائلہ ان کے سامنے سے سر کو بے رخی سے جھک کر گزر گئی۔ اس رات میں نے سفید رنگ کا ڈریس پہنا ہوا تھا جبکہ لائلہ گہرے سرخ رنگ کی نہایت چست اور مختصر اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس نے اپنے کمرے پر ایک چھوٹا سا فلیش بھی لگا رکھا تھا۔

سیکی لی نٹے میں دھت تھا اور مزید پیتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی غلیظ سے غلیظ تر ہونی جاری تھی۔ اس کا ایک نشانہ تو لائلہ ہی تھی جسے وہ بری طرح ذلیل کر رہا تھا۔ سبھی اس کے لباس پر اعتراض تو کبھی اس کی چال ڈھال پر۔ براؤن خاموش تھا۔ کلب میں داخل ہوتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

ان تین نوجوانوں کے مقب میں وہاں پر دو غیر ملکی بھی موجود تھے جو غالباً سیاح تھے۔ ان میں سے ایک سنہری بالوں والا ایسے قامت گورا تھا جس کی پتلی بسی ناک اور پتلی پتلی مونچھیں تھیں۔ اس کے قدموں کے پاس ہی ایک سیاہ رنگ کا ڈفل بیگ پڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ ہوائی جہاز پر میرے ساتھ ہی جیکا آیا تھا۔ فرسٹ کلاس میں۔ بات چیت سے جرمن لگتا تھا۔

پھر ایک سیاہ فام شخص اس گورے کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی سفید جیکٹ کے ہوڈ کو ماتھے تک کھینچ رکھا تھا۔ وہ ایک لمبا ترنگا اور خوب نمٹزا نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں غلائی اور خوابیدہ سی تھیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس جرمن گورے کے دوسری جانب ایک دبلا پتلا لمبا سیاہ فام آدمی کھڑا تھا جس کے چہرے پر چمک کے داغ نمایاں تھے۔ براؤن کا چہرہ اس چمک زدہ شخص کو دیکھتے ہی

کتیوں آدمیوں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ اپنا کیمرا سیٹ کرتی رہی۔

”ارے رے..... یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ لیسی نے اپنا ہاتھ چمڑا کر دور ہونا چاہا۔

”اس فضول چیز کو دور کرو! یہاں کوئی اپنی تصویریں نہیں اترانا چاہتا۔ یہ ایسی جگہ ہی نہیں ہے۔“ سبکی غصے سے غراتے ہوئے بولا۔

”میں تو بس اس پل کی یادوں کو محفوظ کرنا چاہتی ہوں۔“ لائلہ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ ”سیسی پلیز مجھے تصویریں کھینچنے دونا۔“ وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔ سبکی نے کوئی جواب نہ دیا مگر اس کی آنکھیں شعلہ باریں۔

”ارے اس پھنچر جگہ میں ایسی کون سی یادگار چیز ہے؟ بس میں اور لیسی بہت عرصے بعد مل رہے ہیں اور ہمیں بھی اس ”یادگار“ لمحے کی کوئی تصویر نہیں چاہیے۔“ براؤن نے آہستہ سے لائلہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”چلو چھوڑو لائلہ، ضد مت کرو، رہنے دو۔“

مگر لائلہ پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”چلو چلو سب قریب قریب ہو جاؤ مجھے تم سب کو ایک ہی فریم میں لانا ہے۔“

سیسی لی اس سے بے نیاز اپنا جام اٹھانے اس جرمن گورے اور سفید جینٹ والے کے درمیان پہنچ گیا۔ جام اٹھاتے ہی وہ پھر غرایا۔ ”اس فضول چیز کو دور کرو لائلہ۔“

مگر لائلہ پر تو تصویر کھینچنے کا بھوت سوار تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کیمرے کے ذریعے اپنے شوہر کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہی تھی۔ کھلم کھلا اس کی قسم عدولی کر رہی تھی پھر سیسی لی غصے میں مڑا اور اس جرمن شخص سے ٹکرا گیا۔ اس کا جام اس کے کپڑوں پر گر گیا۔ وہ بھی کچھ غصے میں آ گیا۔

”اوہ بھاڑ میں جاؤ تم سب۔“ وہ غصے سے بڑبڑایا۔ اور پھر لائلہ نے ایسی حالت میں اس کی تصویر کھینچی۔ اس نے فوراً اپنے ہاتھ سے چہرے کو ڈھانپنا چاہا مگر دیر ہو چکی تھی۔

”کیا کہا تم نے۔“ سیسی لی اچانک اپنی بیوی کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس آدمی نے سیسی کو اوپر سے نیچے دیکھا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”کچھ نہیں، بس کچھ نہیں چلو جانے دو۔“

”دیکھا تم نے اس آدمی کے ساتھ کیا کیا؟ باز نہیں

کھل اٹھا اور وہ اس سے ملنے کے لیے بڑھا۔

”ارے لیسی! کیسے ہوتی ہے، مجھے امید تھی کہ آج تم سے یہاں ضرور ملاقات ہو جائے گی۔“

لیسی، براؤن کو دیکھتے ہی غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے ایسے کندھے اچکائے جیسے کہنا چاہتا ہو کہ اب ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ لیسی بولا۔ اس کی آواز قدرے باریک اور تیزی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ براؤن نے جواب دیا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے جیسے کوئی پرانی یاد اس بات سے جڑی ہو۔

”چلو تم سب جا کر بیٹھو، میں ابھی اپنے دوست سے بات کر کے آتا ہوں۔“ براؤن نے سیسی سے کہا۔ سیسی، لیسی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہم پہلے نہیں مل چکے ہیں؟“

”نہیں نہیں، شاید میں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ لیسی نے براؤن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”در اصل جب سے ہماری دوستی ہوئی ہے، سب لوگوں کا ہی خیال ہے کہ ہماری شکلیں ایک دوسرے سے بہت ملتی ہیں۔“

”ہاں ہاں، اصل میں ہم بھائی ہیں کیونکہ میرے ابا جان اس کی ماں سے ملنے اس کے گھر جاتے تھے جب اس کا

باپ گھر پر نہیں ہوتا تھا۔“ براؤن قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”دیکھو اپنی اس نیکو اس میں ماں باپ کو کوچ میں مت لاؤ۔“ لیسی نے برامتاہے ہوئے کہا مگر براؤن ہنستا ہوا۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ سیسی لی کی نظریں ابھی تک لیسی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ”میں جو چہرہ ایک

بار دیکھ لوں بھی بھولتا نہیں ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا ہے، خیر چلو تم دونوں اپنی باتیں کرو اور ہم پھر ملتے ہیں۔“

سیسی کے چہرے پر ایک تلخی مسکراہٹ تھی جس نے میرے اندر چھپی پولیس والی کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اسے لائلہ نے

بھی محسوس کیا تھا مگر وہ جھنجھتے ہوئے سیسی لی اور براؤن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر یکایک وہ کچھ یاد کر کے بولی۔ ”میں

کچھ تصویریں کھینچتا چاہتی ہوں۔“ وہ بچوں کے سے جوش و خروش سے بولی۔ ”چلو براؤن تمہاری اور تمہارے دوست

کی کچھ تصویریں ہو جائیں۔“

وقصص ابلیس

کرتے ہو۔ تمہاری شراب اور اس سے ہونے والے حادثات کی ذمہ دار ہمیشہ میں ہی ہوتی ہوں۔“ لائلہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا اور اپنے جھوٹے سے پرس سے رومال نکال کر اپنے لباس کو صاف کرنے لگی۔ میں نے بھی اپنے ہینڈ بیگ سے کچھ نشوونما نکال کر اس کی مدد کی۔ مجھے اس کے بازو پر پڑنے والے نشان نظر آئے۔ یہ یقیناً کسی لی کے دیے ہوئے تھے۔ مجھے اس بے چاری لڑکی سے ہمدردی ہونے لگی۔

”لائلہ تم ٹھیک تو ہو؟“ میں نے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں محض اس کے لباس پر مگر شراب کے بارے میں نہیں پوچھ رہی ہوں۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ پلیز ڈرامیری ان چیزوں کو سنبھالنا۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ بھی بیگ کر خراب ہو جائیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا چھوٹا سا پرس اور کمرہ مجھے تمنا دیا۔ میں نے دونوں چیزیں اپنے کافی بڑے سائز کے ہینڈ بیگ میں ڈال لیں۔

”تم بہت گھٹیا آدمی ہو۔ اپنی غلطیوں کو ہمیشہ اپنی بیوی پر قہقہے ہو۔ آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔“ براؤن، لائلہ کی حمایت میں بولا مگر کسی لی پر کچھ اثر نہ ہوا۔

”میں نے اس بے وقوف عورت سے کہا بھی تھا کہ ایسا لباس نہ پہنے۔ خاص طور پر ایسی جگہ پر۔ ہر کوئی اسے بازاری عورت ہی سمجھ رہا ہوگا۔“

”بس بھی کرو۔ کسی۔ تم سب کے بارے میں غلط ہی کیوں سوچتے ہو۔“ لائلہ کھانسی لہجے میں بولی۔

”میں یہاں کسی کہنے سے نہیں ڈرتا۔“ کسی لی چنگھاڑتے ہوئے بولا۔

میں اس دوران اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سوچ رہی تھی اب اگر میں اس جگہ سے نکلنا چاہوں تو اپنے ہونٹ تک کیسے پہنچوں گی؟ براؤن نے یہاں آتے وقت اپنی تیزی سے گاڑی دوڑائی تھی کہ مجھے کچھ اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ ہم کہاں پہنچ گئے تھے اور اب میں اپنے اوپر لعنت ملامت کر رہی تھی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ آئی ہی کیوں۔

میں لائلہ کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے اور کسی کے تعلقات مجھے اپنے سابقہ شوہر ڈیوین کرس کی یاد دلا رہے تھے۔ اگرچہ ڈیوین نے بھی مجھ پر ہاتھ تو نہیں اٹھایا تھا مگر کسی لی طرح اس کی رعب ڈالنے کی عادت تھی۔ اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات، بے رحمی اور جھوٹ بولنے کی

آئی بے وقوف عورت۔“ کسی کا غصہ ایک بار پھر لائلہ پر مرکوز ہو چکا تھا۔

”اچھا چلو میں تم سے پھر بعد میں بات کروں گا۔“ براؤن نے کسی سے کہا۔

”تم غصہ سے ۱۰۰ لگاؤ۔“ مجھے بتاؤ میں تمہیں

”میں نے لگائے میں تیل ایئر نامی ہونٹ میں ٹھہرا ۱۱۔ روم نمبر 207 فون ضرور کرتا۔ روم نمبر 207۔“

براؤن نے ہمدردی سے جواب دیا۔

”پلو۔ کسی اب کہیں جا کر بیٹھے ہیں۔“ براؤن، کسی لی کا بازو قریب ہی ایک ٹیکل کی طرف لے چلا۔ اس نے گرد چار کرسیاں لگی تھیں۔ پھر ہم چاروں ٹیکل کے ارد گرد بیٹھ گئے اور کسی لی نے یہ آواز بلند سب کے لیے شراب کا آرڈر دیا۔

کسی لی ان لوگوں میں سے تھا جو بی کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کا نشہ بڑھتا ہے ویسے ویسے ان کی بد اخلاقی بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

”دیکھا تم نے اس شخص کے ساتھ کتنی بری حرکت کی؟ اسے اس بے ہودہ شوق کی خاطر۔ کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ تم ہمارے نہیں آؤ گے۔“ کسی لی پھر لائلہ کو اٹلے لگا۔

”پپ بھی کرو کسی تمہیں تو بس رعب جھاڑنا آتا ہے۔“ لائلہ نے آہستہ سے کہا۔

”دیکھا براؤن! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ کتنا کبھی میرا کہنا نہیں مانتی۔“ کسی لی زور سے لائلہ کی کلائی پکڑتے ہوئے بولا۔ لائلہ کے ہاتھ سے جام کر گیا اور اس کا سرخ لباس بیگ گیا۔

”ارے جانے بھی دوسری۔ آج کس کس کو شراب میں نہلاؤ گے۔“ براؤن نے مسکراتے ہوئے لائلہ کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ وہ بھی مسکرانے لگی مگر کسی لی کا غصہ کم نہ ہوا۔

”نہیں براؤن یہ ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہے۔ میں تو اس سے تنگ آچکا ہوں۔“

براؤن نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور خاموشی سے کسی لی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری نمایاں تھی۔

”ہاں سب میرا ہی قصور ہے۔ میں نے ہی اس آدمی کے اوپر شراب گرائی اور اپنے اوپر بھی۔ تم ہمیشہ ایسا ہی

”اور کس چیز کی اپورٹ اور ایکسپورٹ کرتے ہو تم
یسی لی؟ گوکہ یہ سمجھنے کے لیے راکٹ سائنس میں پی ایچ ڈی
ہونا ضروری نہیں۔“ میری تفتیش جاری تھی۔ اگرچہ میں سمجھ
چکی تھی کہ اس کا وعدہ کیا تھا۔ کوئین، چرس، انیم اور دیگر
منشیات۔ یہ سب جیکا کی سرزمین میں خوب آگتی تھیں اور
یہاں سے غیر قانونی طور پر باہر ایکسپورٹ کی جاتی تھیں۔
ان کی منزل عام طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکا ہی ہوا
کرتی تھی۔

یسی میرے لہجے میں چھاپنظر محسوس کر چکا تھا۔ ”اگر
تم اتنی بڑی عمر کی اور تھکی ہوئی نہ ہو تیں تو میں تمہارے ساتھ
کافی کچھ کر سکتا تھا۔“ وہ خبیث انداز میں مسکراتے ہوئے
بولا۔

”اوہ یسی، تم ہر کسی کے ساتھ ایسی ہنک آمیز گفتگو ہی
کیوں کرتے ہو؟“ لائلہ شکایتی انداز میں بولی۔

”اگر میں اتنا برلہ ہوں تو تم اب تک میرے ساتھ
کیوں چپکی ہوئی ہو؟ ویسے بھی مجھے سب پتا ہے تمہارے اور
اس کے سچ جو چکر چل رہا ہے۔“ یسی لی نے براؤن کی
جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اگرچہ یہ بات اس نے تقریباً مذاق میں کہی تھی مگر
لائلہ اور براؤن ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جھینپ سے
گئے۔

”میں تو اب اور زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔“
میں نے کھڑے ہو کر اپنے پیئڈ بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر
کسی نے میری طرف دھیان دیا نہ ہی میری بات پر توجہ
دی۔

”یسی لی تم مجھے اور براؤن کو جانتے ہو۔ تم نے ایسی
بات سوچی بھی کیسے؟“ لائلہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
یسی یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور نہایت سرعت کے ساتھ دوپٹر
لائلہ کے منہ پر جڑ دیے۔ لگتا تھا اسے اس کام میں کافی
مہارت حاصل تھی۔ لائلہ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

”چلو لائلہ میرے ساتھ ہوئی واپس چلو۔“ میں نے
اس کو ڈھارس دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”تم بھی مصوم
اور پیاری لڑکی کو یہ سب کچھ برداشت کرنے کی کوئی
ضرورت نہیں۔“

یسی واپس بیٹھ کر گھٹاؤنے انداز میں ہنسنے لگا پھر
براؤن کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم سمجھتے تھے کہ تم اس طرح
میری بیوی سے ملتے رہو گے اور مجھے خبر تک نہ ہوگی۔ میں

عادت نے میری عزت نفس کو بری طرح مجروح کیا تھا۔ اُن
دنوں میں بھی لائلہ کی طرح خود کو بے بس اور مجبور محسوس کرتی
تھی اور کسی طرح بھی اس گھٹیا آدمی کے چنگل سے لٹکنا چاہتی
تھی۔

لائلہ نے ڈرنک کے لیے پوچھا تو میں نے معذرت
کر لی۔ میں اس کے بازو پر پڑے نیلوں کے بارے میں
سوچنے لگی۔ نجانے ایسے کتنے اور نشان اس کے بدن پر ہوں
گے۔ نہ جانے یسی لی اس پر کتنا تشدد کرتا ہوگا۔ مجھے اس
سے ایک بڑی بہن کی طرح ہوردی ہونے لگی۔ میں نے
سوچا کہ ہوئی واپس جا کر اس سے اس بارے میں ضرور
بات کروں گی مگر اس سے پہلے زیادہ ضروری تھا اس گھٹیا جگہ
سے لٹکنا!

میں نے سوچا کہ یہاں کے کسی وائر سے واپس جانے
کا راستہ معلوم کر لوں گی۔

”تم رات تم کرتی کیا ہو؟ شکل سے تو تم اسکول ٹیچر ہی لگتی
ہو۔“ لائلہ نے اپنی بچوں جیسی آواز میں پوچھا۔

عموماً میں کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں
سمجھتی تھی مگر اس دن بتا دیا۔ ”میں ایک پرائیویٹ سرائف
رساں ہوں۔ پہلے میں کافی عرصے پولیس سے وابستہ رہی
ہوں۔“

”تم پولیس والی ہو؟“ یسی زور سے چچکا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم اب تک ایک پولیس والی
کے ساتھ بیٹھے ڈرنک کر رہے تھے۔“ یسی کو شاید اب تک
اس بات کا یقین نہیں ہو رہا تھا۔

براؤن قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ ”یسی! یار تم بھی پولیس
والوں کو ڈھونڈ ہی نکالتے ہو۔“

”یسی لی کی باتوں کا برا مت منانا۔ اسے ایسے ہی
فضول بکواس کرنے کی عادت ہے۔“ لائلہ لجاجت سے
بولی۔

”اور تم تینوں کیا کام کرتے ہو؟“ میں نے پولیس
والوں کی طرح تفتیشی انداز میں سوال کیا۔

”براؤن یہاں پر کاروبار کرتا ہے۔ وہ ایک تاجر
ہے۔ ڈیلا لائلہ میری بیوی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام
نہیں کرتی۔ اور میں..... میں اپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس
کرتا ہوں۔“

”تو تم اس اپورٹ ایکسپورٹ بزنس کے توسط سے
ہی ملے؟“
تینوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

قصہ ابلیس

پر پھیل رہا تھا۔ کرا ابھی تک تاریکی میں تھا جس باہری دروازے سے تھوڑی سی روشنی آرہی تھی۔ سب لوگ اسی راستے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ارے کوئی ہے! مجھے یہاں پر مدد کی ضرورت ہے۔“ مجھے اپنی آواز سن کر خود ہی تعجب ہو رہا تھا۔ میں نے پولیس والوں جیسے بارعب آواز میں صدا دی۔ ”یہاں ایک آدمی شدید زخمی ہے۔ مدد چاہیے۔“ مگر حیرت انگیز طور پر میری آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ نہ جانے کتنے لوگ زخمی ہوئے تھے؟ نہ جانے کسی نے پولیس یا ایبولینس کو فون بھی کیا تھا یا نہیں؟

ایک عورت نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے جلدی باہر بھاگو! تمہاری بہتری اسی میں ہے۔“ میں نے غور سے دیکھا تو یہ دبی عورت مگی جیسے میں نے اندر داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ اب یہاں رہتا ٹھیک نہیں۔ ادھر ایک گورا آدمی بھی خون ٹھوک رہا ہے۔ یہاں رکو گی تو پھنس جاؤ گی۔ جو ہوتا تھا، ہو چکا۔ اب یہاں سے بھاگو۔“ اس نے خود بھی تقریباً بھاگتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ مجھے کسی کی لاش سے وحشت ہو رہی تھی۔ میں نے براؤن اور لائلہ کو ڈھونڈنے کی ایک بار پھر کوشش کی مگر ان کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ شاید کسی لی جیسے گھنٹا آدمی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا چاہیے تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کس بے رحمی کے ساتھ اس نے لائلہ کو پھنسا دیا تھا۔ کسی نے میرے ساتھ ایسا کیا ہوتا تو میں اس کا خون کر دیتی تو کیا لائلہ نے ہی کسی کی کاتل کیا تھا؟ کیا وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی وہ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں۔ کیا وہ کسی کی جان لے سکتی تھی؟

پھر میں نے سوچا کہ میں اس کے بارے میں جانتی ہی کیا تھی۔ بس وہی جو اس نے مجھ سے کہا یا پھر مجھے دکھایا۔ شاید میں اسے ضرورت سے زیادہ ہی معصوم اور مظلوم سمجھ رہی تھی۔

ایک موقع سامنے آیا اور انہی دونوں میں سے کسی ایک نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا یا پھر وہ دونوں ہی آپس میں لے ہوئے تھے۔ میں نے اس ٹیبل کی جانب دیکھا جس کے اطراف ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ براؤن مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے لیے کسی لی کو دھکا دے کر گرانا اور پھر چاقو اس کے سینے میں اتار دینا کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا۔

جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ میری چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی جس نے مجھے بتایا کہ

سب جانتا ہوں تم دونوں کے بیچ جو معاشرۂ چل رہا ہے اور سوچو کہ میں تمہیں اپنا دوست مانتا تھا۔ تم تو آئین کے سانپ نکلے کہینے!.....“ وہ ابھی اپنی بات مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ گولیاں چلنے لگیں۔ ترتر ترتر ترتر..... پھر کچھ گولیاں اوپر لگے لمبوں پر لگیں اور پورا کمر اتار کی میں ڈوب گیا۔ گولیاں لگتی رہیں۔ ابھی بے چل رہی تھیں۔ میں فوراً اپنے آپ کو ہال لائیو مائل لے کر پلوں پہ کئی۔

میں اس روم کے بیلی روم اور پینٹے سے میرا لباس تیز ہو گیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد گولیاں دوبارہ چلنی شروع ہو گئیں۔ یہ انہی تین نوجوان لڑکوں کا کام لگتا تھا۔ اگرچہ میں انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ یہ وہی تھے جو اپنی جوانی کے جوش میں ایسی واہیات حرکات کو بھی مردانگی کا ثبوت سمجھتے تھے۔ خواہ اس کی زد میں آکر کوئی زخمی ہو یا جان سے جائے۔

میرا جھمکنا بے چل رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے اوپر ٹیبل بھی لڑنے لگی۔ جیسے کوئی بھاری چیز اس سے ٹکرائی ہو۔ میں کچھ دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہاں پر بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی اور وہ سب نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ پھر اچانک گولیوں کی آواز بند ہو گئی اور خاموشی چھا گئی پھر ”لی“ نے فنی ماری۔ میں کمرے میں پھیلے خوف کو سوجھ سکتی تھی۔ ”لائلہ“ لائلہ.....“ میں نے اسے پکارا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔

پھر مجھے خون کی بو آئی۔ تازہ خون کی بو۔ میں نے اندر چہرے میں یہاں وہاں ٹولنا شروع کیا۔ کیا مجھے کوئی لگ گئی تھی؟ مگر مجھے کوئی ایسی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر میں نے باہری دروازے سے آتی مدھم سی روشنی میں دیکھا کہ خون میرے اوپر کی ٹیبل سے ٹپک رہا تھا پھر مجھے اس کا جوتا نظر آیا۔ اس کا بے جان ہاتھ ڈرا اور لنگ رہا تھا۔ موٹی بھدی انگلیاں اور ان میں پھنسی تین انگٹھیاں۔ میں نے اس کا ہیکر پرے کیا اور آہستہ سے میز کے نیچے سے باہر آئی۔ اس کے سینے میں ایک بڑا سا گھاؤ تھا جس سے خون بہہ رہا تھا پھر میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ کسی لی، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھلی تھیں مگر سانس اور بے جان۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی بیوی اور دوست وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کسی لی کی کسی گولی کا نشانہ نہیں بنا تھا۔ اسے چاقو کے وارے قتل کیا گیا تھا۔

”کسی لی“ میں نے آہستہ سے پکارا جیسے اب بھی امید ہو کہ وہ جواب میں اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس کا خون بہہ کر فرش

وہ عورت بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ ”یہاں سے بھاگو۔“
میں نے سوچا کہ وقت آنے پر اس تمام واقعے سے متعلق جو
معادلات میرے پاس تھے وہ میں ایک گم نام فون کال کے
ذریعے جیسا کہ پولیس ڈپارٹمنٹ کو فراہم کر سکتی تھی۔ یہ کام
تو میں امریکا اپنے گھر واپس پہنچ کر بھی کر سکتی تھی یا پھر اپنے
وکیل دوست جیک کی مدد بھی حاصل کر سکتی تھی۔ وہ پہلے بھی
کئی بار بغیر فیس لیے مجھے اپنی خدمات فراہم کر چکا تھا۔ میں
نے سوچا کہ جیک کے ذریعے ہی یہ کہلا بھیجوں گی کہ میں تو
ایک بے ضرری امریکی سیاح تھی جو ان لوگوں کو پہلے سے
جانتی بھی نہیں تھی بس سیر و تفریح کی خاطر ان کے ساتھ چلی
گئی تھی۔ اس تمام واقعے سے میرا کچھ اور لینا دینا نہیں تھا
بلکہ میں نے توکل ہوتے دیکھا بھی نہیں تھا۔

مگر اس وقت تو اصل مسئلہ ہوٹل واپس پہنچنا تھا۔ صبح
ہوتے ہی میں پہلی فلائٹ پکڑ کر یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا
چاہتی تھی۔ ہوٹل میں کچھ اضافی دنوں کی بکنگ کے پیسے ہیں
وہ ضرور ضائع ہو جائیں گے۔ تو چلو کوئی بات نہیں زندگی میں
ایسے چھوٹے موٹ نقصانات تو ہوتے ہی رہتے ہیں پھر مجھے
فکر لاحق ہوئی کہ ہوٹل سے نکلنے وقت کسی نے مجھے ان لوگوں
کے ساتھ نہ دیکھ لیا ہو مگر پھر سوچا کہ اگر ایسا ہوا بھی تو جو بھی
استقبالیہ پر اس وقت موجود ہوگا وہ اگلے دن شام کے وقت
ہی اپنی شفٹ پر دوبارہ آنے گا اور اس وقت تک تو میں
امریکا میں بیٹھی ہوں گی۔

میں سی سی لی کی لاش کے آس پاس ٹیبل کے اوپر بیچے
اپنا ونڈ بیگ تلاش کرنے لگی۔ یہاں سے نکلنے اور کچھ بھی
کرنے کے لیے مجھے اپنے پاسپورٹ اور پیسوں کی ضرورت
تھی جو دونوں ہی اس بیگ میں تھے۔ میں نے میز اور
کرسیوں کے آس پاس اوپر نیچے ہر جگہ ٹھولا۔ نیچے فرش پر
ایک سخت اور ٹھیکلی چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی۔ یہ ایک چاقو
تھا۔ انتہائی تیز دھار جو استراغما ہوتا ہے اور درمیان سے
دہرا کیا جاسکتا ہے۔ اسے جیکٹ یا پتلون کی چپ میں
آسانی سے چھپایا جاسکتا ہے۔ یقیناً اسی سے سی سی کو قتل کیا گیا
تھا۔ میں نے کراہیت کے ساتھ اسے پرے کیا۔ مگر میرا ونڈ
بیگ بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی نہ ملا۔ اس بیگ میں میرا
سب کچھ تھا یعنی پاسپورٹ، پیسے، کریڈٹ کارڈ یہاں تک
کہ ہوٹل کے کمرے کی چابی تک اسی بیگ میں تھی۔ مجھے
اپنے ونڈ بیگ کے بغیر اپنا آپ عجیب بے لباس سامعوس
ہورہا تھا۔ اب میں جیسا کہ باہر کیسے جاؤں گی۔ میرا ونڈ
بیگ کہیں لائلہ نے تو نہیں اٹھا لیا؟

یقیناً یہ اسی کا کام ہو سکتا تھا پھر مجھے یاد آیا کہ اس کا
پرس میرے ونڈ بیگ میں تھا۔ شاید بھاگتے ہوئے اس نے
جلدی میں اپنا پرس نکالنے کی زحمت کیے بغیر میرا ونڈ بیگ
ہی اٹھا لیا ہو۔ ”اس نے میرا ونڈ بیگ چوری کر لیا۔“
میں نے تقریباً بے آواز بلند کہا۔ ”خدا تمہیں غارت کرے
سکینی، بے ایمان، چور لڑکی۔“ میں نے دل ہی دل میں
لائلہ کو ڈھیروں گالیوں دے ڈالیں۔

پھر مجھے سی سی کی وہ بات یاد آئی جس میں اس نے لائلہ
اور براؤن کے چکر کا ذکر کیا تھا اور وہ دونوں ہی جینپ گئے
تھے۔ ویسے بھی اگر براؤن نے سی سی کی کا خون کیا تھا تو
لازمی طور پر لائلہ نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔
اگر وہ چپ چاپ اپنے شوہر کا قتل ہوتے دیکھ سکتی تھی تو یقیناً
میرا ونڈ بیگ بھی چھاسکتی تھی۔

پولیس سائرن کی آواز دینا بھر میں ایک جیسی ہی ہوتی
ہے اور اب مجھے یہ سائرن کافی قریب آتے سنائی دے
رہے تھے۔ ”اوه میرے خدا! اب میں کیا کروں۔“ گھبرا
کر میں نے دل ہی دل میں دعا میں دعا میں مانگی شروع کر دیں۔
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں ایک گندے بے فرش پر ایک لاش کے قریب
بیٹھی تھی اور شاید اب تو آلہ قتل پر میری آنکھوں کے نشان بھی
آگئے تھے۔ متوّل کے خون کے دھبے میرے سفید ڈریس
پر لگ گئے تھے۔ میرے پاس اپنی شناخت کے لیے کچھ بھی
نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کوئی ثبوت کہ میں یہاں پر سی سی کے
ہمراہ نہیں آئی تھی۔ میری جان پہچان کے جو دو افراد تھے وہ
یہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ میں بری طرح پھنسنے والی
تھی۔

میں سوچنے لگی کہ کون میری بات کا یقین کرے گا کہ
قتل میں نے نہیں کیا۔ اگر میں پولیس میں ہوتی تو ایسے شواہد
کی موجودگی میں شاید میں بھی نہ گرتی۔ کوئی بھلا مانس پولیس
شریف مجھے شک کا فائدہ دے بھی دیتا مگر اس کے لیے بھی
مجھے اپنی شناخت کا کوئی ثبوت تو فراہم کرنا پڑتا اور یہ ثبوت
اب حاصل کرنے میں کافی وقت لگ سکتا تھا۔

میں حسرت و دیاس کی تصویر بنی فرش پر بیٹھی یہ سوچ ہی
رہی تھی کہ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”تمارا۔۔۔“

میں حیرت سے اچھل پڑی۔ یہ آواز تو کافی جانی
پہچانی معلوم ہوتی تھی۔

”تمارا میرے ساتھ چلو۔“

”کنکشن سے دور موراٹھ بے کے قریب۔“ اس نے بھی اسی طرح چلاتے ہوئے جواب دیا۔
میں نے سوچا کہ یہ موراٹھ بے اب خدا جانے کس جگہ کا نام ہے۔

”فکر نہ کرو۔ اب تم پر کوئی آج نہیں آسکتی۔“ اس نے کاندھے سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہر گزرتے میل کے ساتھ نیسی کی موت کا خوفناک منظر میری آنکھوں سے دور ہوتا جا رہا تھا مگر میرے حواس ابھی تک پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔

”کیا وقت ہو گیا ہو گا؟“ میں نے پھر چلا کر سوال کیا۔

”غالباً تین یا چار بجے ہوں گے۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔“ وہ جواب میں چلا پایا۔

میں اس کی کمر کے گرد بائیس ڈالے اس کے چوڑے
پشتانے پر سر رکھنے بیٹھی رہی پھر یکایک مجھے خیال آیا کہ آخر
بازل وہاں پر کیا کر رہا تھا؟

”میرے خیال میں ہمیں کہیں رک کر بات کرنی چاہیے۔“ میں نے اپنے ٹک کو آواز دیتے ہوئے کہا۔
”بس ذرا انتظار کرو۔ ہمیں تھوڑی دور اور جانا ہے۔“

”میں اپنے ہوٹل واپس جانا چاہتی ہوں۔“
 ”کون سے ہوٹل؟ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟“
 ”مونٹینگو بے ہوٹل۔“

”اچھا اچھا مونٹو ہے۔ وہاں تو میری ایک دور کی
 نزن کام کرتی ہے اس کا نام میوس ہے۔“
 ”ہم وہاں سے کتنی دور ہیں؟“
 ”بہت دور۔“

”مگر میں واپس جانا چاہتی ہوں، ابھی اسی وقت۔“

اور کچھ سوچے بغیر میں نے اپنی طرف بڑھا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ کلب سے باہر نکل آئی۔ میرے ذہن پر خوف کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت تو اگر سلطان بھی مجھے اپنا ہاتھ تھامتا نہ کہہ لیتا تو میں اس جگہ سے نکلنے کی خاطر تیار ہو جاتی۔

کہ وہ سلطان نہ تھا۔ وہ بازل ڈیویری تھا۔

☆☆☆
 "میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا مگر پہلے ہمیں وہاں
 پہنچنے دو جہاں میں تمہیں لے جانا چاہ رہا ہوں۔"

بازل میرے پوچھنے سے پہلے ہی میرے ذہن میں
 اپنے والے سوالوں کا جواب دیے دے گا، یہ سیدھا جانتی
 تھی۔ جس دن سے میں اس سے ملی تھی، وہ میری زندگی میں
 آکر سب کچھ اٹھل پھٹل کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ
 ان لوگوں میں سے تھا جن سے ملتے ہی آپ ان کی طرف
 کھنچے چلے جاتے ہیں اور ان کا خیال آپ کے چہرے پر
 مسکراہٹ کھینچنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ خواہ آپ کہیں
 بھی ہوں اور کیسے ہی حالات میں کیوں نہ ہوں۔

اس کی رنگت پہلے گہرے سافولی تھی مگر اس کے
 ہاتھوں کی رنگت کا جابل انسان تھا۔ اس کی
 آنکھوں میں پھر ایسی نئی نئی باتیں تھیں جن میں اس کے
 ہاتھوں کی رنگت کا جابل انسان تھا۔ اس کی
 آنکھوں میں پھر ایسی نئی نئی باتیں تھیں جن میں اس کے

اگرچہ ہم بھی بھی رومانوی طور پر لوٹ نہیں ہوئے تھے مگر نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ اس کے لیے میرے بے بنیاد بات اور احساسات یک طرفہ نہ تھے۔ میں جب پہلی مرتبہ اس سے ملی تو اس وقت میں اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ بھی تھی۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں بھی کبھار ہی ہوئیں۔ ساواوقات تو سالوں کے وقفے کے بعد۔

اس دن بھی میں اس کے ساتھ چل تو دی مگر مجھے رہ رہ کر اس ہولناک واقعات کا خیال آتا رہا مگر ساتھ ہی بازل سے ملنے کی خوشی بھی تھی۔ ہم بھاگتے ہوئے کچھ تنگ و تاریک گلیوں سے گزر کر اس کی بیوی موٹر سائیکل تک پہنچ گئے۔ اس نے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر مجھے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں لپک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس کی پشت دو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ بازل کے کک لگاتے ہی موٹر سائیکل ہوا سے تاتیں کرنے لگی۔

کچھ دیر تک تو میں دم سادھے خاموشی کے ساتھ اس کے ساتھ سفر کرتی رہی پھر میں نے آنکھیں کھولیں اور ارد گرد

ساتھ چلے آتا میری غلطی تو نہ تھی۔ کیا میں نے فراہمی پین سے نکل کر سیدھے آگ میں تو جھلانگ نہیں لگا دی تھی؟
 ”میں تمہیں یہاں صرف اس لیے لایا ہوں تاکہ تمہارے لیے موقع واردات سے عدم موجودگی کا کوئی عذر پیدا کیا جاسکے۔ جیسا کہ وہاں پر موجود ہر شخص کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو پولیس تم سے اس بارے میں ضرور سوال کرے گی۔ بہتر ہوگا اگر تم یہی کہو کہ تم میرے ساتھ تھیں۔ اگر وہ مزید پوچھنا چھو کر میں تو تم سب کچھ بچ بچ ویسے ہی بتا سکتی ہو جیسا کہ تم نے وہاں دیکھا۔ آدھا جھوٹ بولنا پورے جھوٹ سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔“
 میری آنکھوں میں ابھی تک خشک کے گہرے سائے موجود تھے۔

”کیا تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے؟ اتنے عرصے بعد بھی۔ تمہیں ابھی تک مجھ پر شک ہے؟“
 ”میں نے یہ تو نہیں کہا بازل۔“ میں نے آہستہ سے کہا مگر دراصل اس نے میرے دل کی بات جان لی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ میں اس وقت عمل طور پر بازل کے دم و کرم پر تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سے اتر کر اپنا لباس درست کیا اور سوچنے لگی کہ آخر بازل کے دل و دماغ میں اس وقت کیا چل رہا تھا مگر ہمیشہ کی طرح بازل کے خیالات میرے فہم و ادراک سے باہر تھے۔

”میں نے تو ہمیشہ تمہارا بھلائی چاہا ہے تمہارا۔ اپنے سالوں سے ہماری واقفیت ہے اور اس دوران میں نے کبھی کچھ ایسا کیا کہ جس کی وجہ سے تم مجھ پر شک کرتیں؟ شاید تم ایسا اس لیے سوچ رہی ہو کیونکہ تمہیں اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ تمہیں لوگوں کی نہیں بلکہ اپنے دل کی آواز سننی چاہیے۔“

”میں نے تو تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

درحقیقت میرے سابقہ شوہر سے لے کر میری دوست اپنی تک بازل کے بارے میں عدم اعتماد کا شکار رہے تھے۔ اب سچ کیا تھا، میں یہ نہیں جانتی تھی۔ میں نے تو یہ بھی سن رکھا تھا کہ بازل نے جیسا کہ میں نے غیرت کے نام پر ایک شخص کا قتل کر دیا تھا اپنے باپ کے خون کا حساب چکانے کے لیے۔ مگر اس وقت تو اسے دیکھ کر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ قاتلون سے بھاگا ہو کوئی مجرم ہو۔

میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ بازل بہت ہی ذہین اور محنتی انسان تھا۔ اس نے خود اپنے مل بوتے پر تعلیم حاصل

کی تھی اور پھر کاروبار شروع کیا۔ میرے سابق شوہر کے بازل کے ساتھ کچھ کاروباری مراسم تھے۔ اس کے خیال میں بازل ایک چور اور تھگ سے زیادہ کچھ نہ تھا مگر میرا سابق شوہر ڈیوین خود کو دن سادو دھکا دھلا ہوا تھا جس قدر جھوٹ وہ بولتا تھا اس حساب سے تو اگر وہ کسی کے بارے میں برا کہتا تو اس انسان کا نہایت نیک اور پاراسا ہونا لازمی تھا۔

مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ بازل کی دنیا جھوٹ اور مکاری سے بھری ہوئی تھی مگر اس نے ایک مرتبہ خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس دنیا کا سایہ بھی مجھ پر پڑنے نہیں دے گا اب یہ بات جھوٹ تھی یا سچ اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا مگر اس نے جانے وقوعہ سے عذر عدم موجودگی سے متعلق جوابات کہی تھی اس میں بہر حال دم تھا۔ مجھے ایسا کوئی عذر تو پولیس کو مہیا کرنا ہی تھا مگر میں کچھ اور معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

”آج وہاں کلب میں جو فائرنگ ہوئی تھی، اس کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ وہ لڑکے کون تھے اور تم یہاں کنکشن میں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”آخر ہونا پولیس والی۔ تفتیش کی عادت نہیں مئی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں کا رہنے والا ہوں تمہارا۔ میرا سارا خاندان یہیں پر ہے خیر اب جو بھی کچھ باقی بچا ہے، یہیں پر ہے۔ میری جڑیں اسی مٹی میں گڑی ہیں۔“
 ”مگر تم اس جگہ پر کیسے چلے آئے؟“

”تمہارا میں جانتا ہوں کہ تم نے میرے بارے میں بہت کچھ انا سیدھا سن رکھا ہے مگر یقیناً بانو اس میں سب سچ نہیں ہے شاید کچھ تھوڑا سا سچ بھی ہو مگر عمل طور پر نہیں۔ میں تم سے کچھ اور ضروری باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے سڑک کا یہ کنارہ کچھ مناسب جگہ نہیں ہے۔“
 اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

”چلو میں تمہیں وہیں لے چلتا ہوں جہاں تم جانا چاہتی ہو مگر میرا خیال ہے کہ ابھی جانا ٹھیک نہیں ہے، کچھ دیر انتظار کر لو۔ کم از کم صبح ہونے تک۔“

میں نے بھی سوچا کہ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا ویسے بھی میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ میں اس کی بیوی موٹر سائیکل پر سوار ہوئی اور ہم سمندر کے کنارے تل کھاتی سڑک پر رواں دواں ہو گئے۔

گواہ ہی نہیں تھی بلکہ اس قتل کے الزام میں ملوث بھی کی جا سکتی تھی۔ اپنے خون آلود کپڑوں کی وجہ سے۔

”کسی نے اس کے سینے میں چاقو گھونپ دیا تھا۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔

”اور وہ سرخ منی اسکرٹ والی خوب صورت لڑکی؟

میں نے اسے ایک باکس ٹائپ ہٹے کٹے آدمی کے ساتھ

بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ تمہیں لگتا ہے کہ یہ ان دونوں کی ملی

بھگت تھی؟“

”ہاں مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔“

”اودہ تو وہ کافر حسینہ ہی اس آٹو کے پٹے کے قتل کی وجہ

بنی۔“ بازل نے پھر میرے دل کی بات کہہ دی تو میں ہنس

پڑی مگر پھر ایک دم میرے اندر کی پولیس والی بیدار ہوئی۔

”کسی کی موت پر ہنسنا کوئی اچھی بات نہیں۔ آخر

انسانی قتل کوئی معمولی چیز تو نہیں۔“

”تم ہمیشہ پولیس والی ہی رہو گی۔ میں تو صرف کڑی

سے کڑی جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر تیار تم ان لوگوں کے

ساتھ اس اٹھنا جگہ پر کیا کر رہی تھیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے

بولاً۔

”بس بیکاری اور بیزاری..... کچھ مفت کی ڈرنک کا

لاٹچ۔“ میں نے بہت ایمان داری سے جواب دیا۔ پھر میں

نے اسے اپنے جیکا آئے، ان لوگوں سے ملنے اور کلب

جانے کی پوری روداوستائی جس کے دوران میں وہ سرزنش

کرنے کے انداز میں سر ہلاتا رہا۔

”اصلی جیکا؟“ وہ چوکا۔ ”اس کے لیے تو تمہیں کسی

اصلی جیکسن کی خدمات حاصل کرنی چاہیے تھیں۔“

”ہاں مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ آج کل یہاں پائے

جاتے ہو۔“ میں نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

”تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم جیکا کب اور کیوں آئے؟“

”میں اپنی ماں کو دیکھنے آیا تھا۔ وہ بہت بیمار تھیں۔

گزشتہ ہفتے ان کا انتقال ہو گیا تین روز قبل ہی تدفین ہوئی

ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے بازل کے خاندان کے بارے میں کچھ خاص

معلومات نہیں تھیں۔ میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ مغربی

مکتشفن کے ایک کافی غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا پھر

ایک روز اس نے بتایا تھا کہ اس کی بہن پینینا مر گئی۔

”اودہ مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔ کیا بیماری تھی ان

کو؟“

”بس ان کے کام کرنے کی لگن نے ہی ان کی جان

موراٹ بے پہنچے ہی ہم میں سڑک سے اتر کر ایک

چھوٹی سڑک پر رکے۔ یہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس

کے نیچے کچھ خورد و پودے اور جھاڑیاں اکی ہوئی تھیں۔

پورے چاند کی چاندنی کے سوا یہاں کوئی اور روشنی نہ تھی۔

میں نے نیچے سے ریت اور سمندر سے آتی ہوا تازگی اور

سازش کا احساس دیا۔ بازل نے بالآخر میرے سوال کا

جواب دیا۔

”میں ان کے ساتھ کلب کے قریب ہی رہتا تھا۔

میں نے ان کے ساتھ ان کے ہمراہ کار سے اترتے

دیکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

کا ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے ساتھ

لے لی۔ ایک بہت امیر کبیر گھرانے میں کام کرتی تھیں۔ صبح سے لے کر شام تک کسی غلام کی طرح۔“ اس کی آواز میں کٹی کھلی ہوئی تھی۔ ”جب وہ بیمار ہوئیں اور کام کرنے کے قابل نہ رہیں تو انہوں نے نکال باہر کیا۔ برسوں کی محنت کا یہ صلہ دیا کہ پھر پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔ بس ایک ماہ بیمار رہیں اور پھر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔“

”اور تم ان کی بیمار داری کر رہے تھے، ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح۔ بہت اچھے آدمی ہوئے۔“

”پتا نہیں کتنا اچھا ہوں مگر چلو میں تمہیں واپس لے چلتا ہوں۔ آج تم بہت مشکل حالات سے گزری ہو۔“

”ہاں وہ تو ہے مگر اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری بہنیں؟ وہ کہاں ہیں؟ کیا کوئی اور عورت بھی ہے تمہاری زندگی میں؟“ میں نے ہمت کر کے پوچھ لی۔

”میں عموماً عورتوں کے آگے اپنے دکھ بے نہیں روتا۔ تمہارے امریکی مردوں کی طرح۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے والدین کا اکوٹا بیٹا ہوں۔ میری تین بہنیں ہیں جن میں سے دو تو اپنے اپنے گھروں میں بال بچوں کے ساتھ گمن ہیں مگر تیسری! ہاں میری تیسری بہن بیٹیاں الگ ہی مزاج کی ہے۔ بہت خود غرض اور مطلبی لڑکی ہے۔ بس صرف اپنے بارے میں ہی سوچتی ہے اور کسی دوسرے کی اسے کوئی پروا نہیں۔“

اس ایک بات کے ساتھ ہی ہمارے بیچ سب کچھ جیسے بدل سا گیا۔ میں اپنے سابق شوہر کے منہ سے سفید جھوٹ سن سن کر ایسی بیزار ہو گئی تھی کہ اب مجھے جھوٹ اور جھوٹ بولنے والوں سے شدید نفرت تھی۔ میں کچھ بھی معاف کر سکتی تھی مگر جھوٹ نہیں۔ ڈیوین کرکس نے تو جیسے میری جھوٹ برداشت کرنے کی ساری قوت کو ختم ہی کر دیا تھا۔ اب میں لوگوں پر کم ہی بھروسہ کرتی تھی اور وہ بھی بڑی مشکل ہے اور بازل نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک مرتبہ اس نے میرے گھر پر مجھے بتایا تھا کہ اس کی بہن بیٹیاں مر چکی ہے۔ میرے سابق شوہر نے اسے نشے کی لت لگا لی اور پھر اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ یہ بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے تھے۔ اس دن مجھے اس کے ساتھ بہت ہمدردی اور اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

آخر اس نے اپنی بہن کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا تھا؟ کیا صرف میرے قریب آنے کے لیے میں ہمیشہ ہی

ایسے جھوٹے فریبیوں کا شکار ہو جاتی ہوں۔ خواہ وہ ڈیوین کرکس ہو، لائلہ ہو یا پھر اب بازل۔

میں خاموشی سے اس سے دور سمندر کی جانب چل دی۔ پھر میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی۔ میں نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو بہت اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے کہا تھا کہ بیٹیاں مر چکی ہے۔ یاد آیا۔ جرسی میں تم نے ہی مجھے بتایا تھا۔“ پھر میں نے ذرا لہجے میں کہا۔ ”میری سمجھ نہیں آتا کہ تم نے آخر اس بارے میں مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ اپنی جیتی جاگتی بہن کو مردہ قرار دے دیا۔“

”اوہ بیٹیاں!“ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں مانتا ہوں کہ مجھے تم سے حقیقت چھپانی چاہیے تھی مگر میں اس وقت بے حد ذہنی کشاکش کا شکار تھا۔ دراصل میرے والد کی وفات کے بعد میں نے بیٹیاں کی پرورش اپنی چھوٹی بہن نہیں بلکہ بیٹی کی طرح کی تھی مگر پھر امریکا میں تمہارے سابقہ شوہر ڈیوین کے اس کے ساتھ تعلقات قائم ہو گئے اور اس نے بیٹیاں کو نشے کا عادی بنا دیا۔ وہ اس کی عزت سے کھیتا رہا اور پھر جب دل بھر گیا تو اسے مڑک پر پھینک دیا۔ بیٹیاں نے جسم فروشی شروع کر دی۔ پہلے پہل تو منشیات کی طلب کو پورا کرنے کے لیے اور بعد میں صرف پیسوں کے لیے عادتاً۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے نظریں جھکا لیں پھر کچھ توقف کے بعد یولا۔

”تم نہیں جانتیں کہ مجھے بیٹیاں سے کتنی محبت تھی۔ میں اس سے بہت امیدیں رکھتا تھا مگر اس کے ایسے چال چلن کی وجہ سے ان سب پر پانی پھر گیا تھا۔ اس کے جسم فروشی کے دھندے نے اسے میری نظروں سے گرا دیا تھا۔ وہ میرے لیے مری گئی تھی۔ میں اسے کسی طور بھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی نہیں..... تم شاید اس بات کو نہ سمجھ پاؤ لیکن میری غیرت اسے بہن ماننے کو تیار نہیں کی۔“

”اور اب وہ دوبارہ زندہ ہو گئی ہے؟“ میرے لہجے میں اب بھی کٹی تھی۔

”تم کچھ بھی کہو مگر جو جگہ تھا، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”دنیا میں سب کچھ صرف سیاہ اور سفید نہیں ہوا کرتا۔ درمیان میں سرمئی اور سلٹی رنگ کے ہزاروں شیفہ ہوتے ہیں۔ چلو اب صبح ہونے کو ہے اور سورج نکلنے والا ہے۔ میں تمہیں تمہارے ہوٹل چھوڑ آتا ہوں۔“

”چلو۔“ میں نے نئے تے انداز میں جواب دیا۔ میں ابھی تک اس کی باتوں پر گھل نہیں کرنے کو تیار نہ تھی۔

قصہ ابلیس

ابھی وہ اپنی بات مکمل نہ کر پایا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا واقعی تمہاری ماں فوت ہو چکی ہے یا پھر کسی دن وہ بھی زندہ نکل آئے گی۔“ یہ کہتے ہی مجھے احساس ہوا کہ شاید میں نے کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے بات کہہ دی تھی مگر تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ بازل یہ سنتے ہی مڑا اور پھر بغیر کچھ اور کہے سنے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

میسوں بھی میری بات سن کر گنگ سی ہو گئی۔ وہ خاموشی سے مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آئی اور دروازہ اپنی چابی سے کھول کر چلی گئی۔

اپنے کمرے میں داخل ہونے کے فوراً بعد ہی میں نے اپنا خون آلود لباس تبدیل کیا۔ ساری رات کے واقعات ایک فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے پر چلنے لگے اور پھر آخر میں بازل سے کہے الفاظ میرے ضمیر پر کچھ لگانے لگے۔ آخر اس نے میری اتنی مدد کی تھی، مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا جوڑ جوڑ ٹھکن سے چور تھا۔ میں نے اپنے بیٹے جمال کے بارے میں سوچا اور پھر انہی خیالوں میں کھوئی میں خوابوں کی دلدلیوں میں پھنس گئی پھر اچانک میرے خوابوں میں گولیاں چلتی شروع ہو گئیں۔ شاہ، امشاہ! میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میرا سارا جسم سینے میں شراور تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ میرے کمرے کا ائر کنڈیشن چلتا بند ہو گیا تھا۔ جلد ہی مجھے ان ”گولیوں“ کی حقیقت کا بھی اندازہ ہو گیا جب میرے دروازے پر پھر کسی نے زور سے دسک دی۔ میں نے ایک لمحے کو اپنے حواس کو جمع کیا اور سوچا کہ یہ یقیناً پولیس والے ہوں گے۔ مجھے زمین پر پڑے اپنے خون آلود لباس کا خیال آیا اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

میں نے بازل کی بتائی ہوئی جگہ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر بدحواسی میں کچھ یاد نہ آیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر اینڈرٹیس فرنیچر سے اٹھایا اور تریب پڑی لائٹری کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ابھی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”تمارا! اس نے تقریباً سرکشی میں کہا۔“

”تمارا! میں ہوں لالک۔ دروازہ کھولو۔“

”لالک؟“

”ہاں، تمہیں پتا ہے کسی لی مرچا ہے۔“

”ہاں جانتی ہوں۔“ میں نے بیزار سی کہا۔ آخر

اب وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی؟

”برادون نے اس کا قتل کر دیا ہے۔ اُس نے میرے

شوہر کا خون کر دیا ہے۔“ لالکہ ہڈیانی انداز میں بولی۔

شاید وہ میرے اعتماد کے قابل تھا ہی نہیں۔

کوئی اور بات کیے بغیر ہم موٹر سائیکل تک واپس آئے اور اسی خاموشی کی چادر اوڑھے نکلتش کی جانب روانہ ہو گئے۔ شہر کی حدود میں داخل ہونے تک سورج پوری آہستہ آہستہ چمکنے لگا تھا اور ساتھ ہی موسم کی حدت بھی ہلکی سی ہوا لایا۔ ابھی لکڑسوار تھی کہ موٹر سائیکل پر اچانک ایک لالکہ اٹھ اٹھا۔ اس نے اپنے پاس سے ایک گولی نکالی اور اس کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ میرے پاس سے گزرتی ہوئی اپنے پاسپورٹ کے گم ہو جانے کی اطلاع دیتی تھی پھر اپنی دوست اپنی کونون کرنا تھا اور اس سے کچھ رقم ادھار مانگتی تھی اور پھر واپس گھر جاتا تھا۔

ہوٹل واپس پہنچنے پر میں نے بازل کا رسا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے مرکز ہوٹل کی جانب چلنے لگی۔ اچانک مجھے ہوٹل کے کمرے کی چابی کا خیال آیا تو میں چلتے چلتے رک گئی۔ ”اوہ میرے خدا!“ میں نے بے اختیار کہا۔

”کیا ہوا؟“ بازل ابھی تک وہیں موجود تھا۔

”میرے کمرے کی چابی! وہ میرے پیٹ بیگ میں تھی جو۔۔۔۔۔“

”چلو میں تمہیں اپنی کزن میسوں سے ملواتا ہوں۔“

”اوہ تمہاری مدد مکمل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔“

میں نے اس سے شکریہ ادا کیا اور وہاں کے ملازمین اور محلے کے لوگوں سے ملنے لگا۔ وہاں دیر بعد ہی ایک دہلیپتی سی لڑکی ہمارے ساتھ تھی۔ بازل نے میرا تعارف کرایا اور پھر اسے میری مشکل کے بارے میں بتایا۔ میسوں نے میری طرف دیکھا اور میرے لباس پر لگے خون کے دھبوں کی طرف میرا دھیان دلایا۔ ”سامنے کی طرف سے جانا مناسب نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ چلیے میں آپ کو ایک دوسرے راستے سے آپ کے کمرے تک پہنچا دیتی ہوں۔“ اس نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم خواہ میرے بارے میں کچھ بھی سوچو مگر پھر بھی یہ میرا فون نمبر ہے۔ اگر کبھی بھی ضرورت پڑے تو کال کر لیتا۔“ یہ کہتے ہوئے بازل نے ہوٹل کے کارڈ پر اپنا فون نمبر لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔

”مجھے یقین ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے سردہری سے جواب دیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ ہمارے درمیان خواہواہ ایسی بدگمانی پیدا ہو گئی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مرنے سے پہلے میری ماں نے۔۔۔۔۔“

میں نے دروازے کے قریب جا کر محتاط انداز میں کہا۔ ”لائڈل تم ٹھیک تو ہو؟“
میں نے سوچا کہ اگر اپنے شوہر کے قتل میں اس کا ہاتھ ہوتا تو اب اس وقت اسے یہاں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ لائڈل کی دوبارہ آواز سنائی دی۔

”ہاں، ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دروازہ کھولو۔“
اب اس کی آواز نارتل لگ رہی تھی۔

”میرا اینڈ بیگ کہاں ہے؟“
”تمہیں بس اپنے اینڈ بیگ ہی کی فکر ہے۔ وہ وہاں ہے۔ براؤن کے ہوٹل کے کمرے میں۔“
”تم نے ایک شخص کو اپنے شوہر کا قتل کرتے دیکھا اور پھر تم نے میرا اینڈ بیگ چوری کر لیا۔ غیبت لڑکی! میں نے تقریباً چیتے ہوئے کہا۔

”چپ کرو اور میری بات غور سے سنو۔“ لائڈل آہستہ سے بولی۔

”تمارا! مجھے تم سے براؤن کے متعلق بات کرنی ہے۔ پلیز دروازہ کھولو۔“

اس کا نام سننے ہی میرے اندر ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ کیا وہ ابھی ایکلی ٹھی یا براؤن اس کے ساتھ ہی پیچھے چھپا کھڑا تھا تاکہ میرے دروازہ کھولتے ہی مجھ پر نوٹ پڑے آخر میں بھی اس قتل کی ایک گواہ تھی۔ وہ یہی جان چکا تھا کہ میرا تعلق پولیس سے رہ چکا ہے تو کیا اب ان دونوں کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا تھا؟

میں نے دروازے کی سیٹھی زنجیر کو ذرا سا ڈھیلا کر کے باہر جھانکنے کی کوشش کی، باہر صرف لائڈل دکھائی دی۔ اس نے وہی رات والا سرخ لباس پہنا ہوا تھا مگر وہ شکن آلود ہو چکا تھا جیسے وہ اسے پہنے ہی سو گئی ہو۔ اس کے بال پھولے ہوئے تھے۔ میک اپ چہرے پر پھیلا ہوا تھا اور آنکھیں سو جی ہوئی تھیں جیسے کہ وہ روتی رہی ہو۔

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز دروازہ کھولو اور مجھے اندر آنے دو۔“ وہ پھر سے گڑ گڑائی۔

”میرا اینڈ بیگ دروازے کے پاس رکھ دو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔“ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں حکم دیا۔

”تمارا ہوش کی بات کرو۔ پولیس کی ضرورت اس وقت تمہیں ہے اور نہ ہی مجھے۔ تمہارا اینڈ بیگ میرے پاس نہیں ہے۔ وہ براؤن کے کمرے میں ہے۔ میری بات سنو

تمارا! مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ تم نے دیکھا تھا نا اس نے سبکی کے ساتھ کیا کیا۔ تم بھی تو وہیں تھیں۔“ یہ کہتے کہتے وہ بلک بلک کر رونے لگی۔
”کیا تم اس وقت اکیلی ہو؟“

”تم دروازے سے جھانک کر دیکھ سکتی ہو کہ میں بالکل اکیلی ہوں۔“

میں نے دوبارہ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ صرف وہی دکھائی دی۔

”پلیز میری مدد کرو۔“ وہ پھر گڑ گڑائی۔
”میں بہت خطرناک پولیس والی ہوں اور میرے پاس گن بھی ہے اس لیے کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر تم نے یا تمہارے دوست نے کوئی بھی حرکت کرنے کی غلطی کی تو میں تم دونوں کی کھوپڑیاں اڑا دوں گی۔“ میں نے فراتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر ہچکچائی پھر یک دم بولی۔ ”تمہارے پاس گن ہے! خدا کا شکر ہے کہ تمہارے پاس ہتھیار ہے تمہارا۔ تم بہت ہی اچھی اور سمجھ دار خاتون ہو۔ تمہیں کبھی نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔“ وہ پھر بے تکی ہانکنے لگی۔

”اب مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہو تم؟“ میں نے پھر بیزار سی پوچھا۔

”وہ تمہیں معلوم ہے نارات جو کچھ ہوا تھا تو بس میں تمہاری چیز تمہیں واپس کرنا چاہتی ہوں اور کچھ ایسا ہے جسے میرے پاس ہونا چاہیے سو وہ میں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ میں نے اس بات کا یقین کرنے کے بعد کہ وہ ایکلی ہی تھی آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

وہ تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہوئی اور ارد گرد نظر دوڑا کر بولی۔ ”تمہاری گن کہاں ہے؟“

”وہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرے پاس کوئی گن شن نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہو..... تمہارا تمہیں اس طرح جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ میں تو ایسے ہی خوش ہوئی تھی کہ شکر ہے تم سچ ہو۔ اب ہم کیا کریں گے؟“

”اب ہم کچھ نہیں کریں گے۔ پہلے ہی تمہاری بات مان کر تمہارے ساتھ جانے کی غلطی کر چکی ہوں اور ابھی تک اس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔“ میں نے قدرے ناگوار سی سے جواب دیا۔

”ایک اور بات بتا دوں تمہیں کہ تم اپنے شوہر کے قتل کی چشم دید گواہ ہی نہیں ہو بلکہ تم پر بھی اس قتل کا شک کیا جا

سے سبکی لی سے بہتر سلوک کرے گا؟ تم بری لڑکی نہیں ہو مگر اب تمہیں اپنے بارے میں سوچنا ہوگا۔ سبکی لی اور براؤن جیسے آدمیوں سے تمہیں کوئی خوشی حاصل نہ ہوگی۔“ میں نے ایک بڑی بہن کی طرح اسے ناصحانہ انداز میں پکچروے ڈالا۔

”تم جانا چاہتی ہو کہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دراصل میرا تعلق ایک بہت ہی غریب خاندان سے ہے۔ مگر میں ایک اچھی اور پُر آسائش زندگی گزارنا چاہتی تھی، اپنی ماں کی طرح مزدوروں والی زندگی نہیں۔ میں اچھی شکل صورت کی تھی اور سبکی لی میرے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس وقت اس کے پاس کافی پیسہ تھا، بڑی گاڑی تھی اور وہ میرا بہت خیال بھی رکھتا تھا۔ سو میں نے بڑی عمر کے باوجود اس سے شادی کر لی۔ مگر پھر وہ جوئے میں اپنا پیسہ ہارنا چلا گیا۔ اس نے اسی وجہ سے شراب بھی زیادہ پینی شروع کر دی اور مجھ پر ہاتھ بھی اٹھانا شروع کر دیا۔ پھر تو جیسے اسے اس میں مزہ آنے لگا۔ سبکی لی براؤن سے میری ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں سبکی لی کے توسط سے ہی ملے تھے مگر براؤن اس سے بہت مختلف تھا۔ میری ماں بھی کہہ سکتی ہو کہ بس براؤن نے ہمدردی کے دو بول کیا کیسے میں خود ہی اس کی باتوں میں آ گئی۔ وہ مجھے اپنا نجات دہندہ نظر آنے لگا مگر مجھے یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے سبکی لی کی جان لے لے گا۔ اُس کا ایسے قتل کر ڈالے گا، میں تو بس یونہی اس سارے جھیلے میں پھنس گئی۔“

”اس سارے جھیلے میں تم نہیں بلکہ میں پھنس گئی ہوں لائلہ۔“ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں مگر دراصل یہ سبکی لی کا ہی پلان تھا۔ وہی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر تم بھی بڑی کانیاں نکلیں۔ فٹ پہچان گئیں کہ معاملہ کیا ہے۔“

”اور اصل معاملہ نشت کا دھندہ ہی تھا، بے نا اچرس اور کوکین، بہت چھوٹے پٹانے پر؟“ میں نے پھر تحقیقی انداز میں پوچھا۔

”ہاں عتریب ہی یہ بہت بڑے پٹانے پر پھیلنے والا تھا۔ سبکی کہتا تھا کہ ہمارے دن بدلنے والے ہیں۔ اس نے دو روز سے تم پر نظر رکھی ہوئی تھی جب سے تم اس ہوٹل میں آ کر ٹھہری تھیں۔ سبکی نے تمہیں دیکھ کر کہا تھا کہ ہمیں تمہارے جیسی ہی شریف اور معزز نظر آنے والی عورت کی ضرورت پڑے گی۔“

”میری ضرورت؟ وہ کس لیے؟“ میں نے حیرت

”لگتا ہے۔“

”میں! ارے نہیں نہیں اس قتل سے میرا کچھ لینا دینا نہیں۔۔۔۔۔۔ تمہارا کیا تم سوچ سکتی ہو کہ میں خود اپنے شوہر کے قتل کا منصوبہ بناؤں گی، کیا میں تمہیں ایسی لڑکی کہتی ہوں؟“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ براؤن ایسے سبکی کا خون کر دگا، یہ بھی کہ اس کے پاس چاقو ہے۔“

”لائلہ! کو اس بند کر دو اور مجھے ساری بات سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم کہاں سے آ رہی ہو؟“

”وہ۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ میں براؤن کے ہوٹل سے آ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ میں نے رکتے رکتے جواب دیا۔ لیکر ایک اس کا ہاتھ لٹایا۔ ”دیکھو تمہارا مجھے بھی ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سبکی کا قتل ہو چکا ہے۔ میرے شوہر کا قتل۔ وہ بھی میری آنکھوں کے سامنے۔“ وہ پھر جھوٹ موٹ رونے کا ناکگ کرنے لگی۔

”مجھے براؤن سے ڈر لگنے لگا ہے۔“

”تم براؤن کے پاس کیا کرنے گئی تھیں؟“ مجھ پر اب اس کے ناکگ کا کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا مگر اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا اور ناکگ جاری رکھا۔

”کیا واقعی تمہارا اور براؤن کا معاشرہ چل رہا تھا؟ اور پھر جب سبکی لی کو اس بات کا پتا چل گیا تو تم دونوں نے اس کے قتل کا منصوبہ بنایا؟“ میں نے بازل کا تجزیہ دہرایا۔

”نہیں، نہیں ہمارا ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔“ لائلہ ایک دم چلائی پھر ذرا ٹھہر کر بولی۔ ”میں مانتی ہوں کہ کچھ دنوں سے براؤن اور میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے مگر وہ اس طرح سبکی کا خون کر دے گا، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا مگر وہ بھی تو دیکھو کس طرح کی اتنی سیدھی باتیں کر رہا تھا۔ تم نے خود ہی دیکھا تو تھا۔“ پھر وہ اپنے بازوؤں پر پڑے سیل کے نشان دکھانے لگی۔ ”ایسے ہی اور نشان بھی ہیں میرے جسم پر۔ چاہو تو تم خود دیکھ سکتی ہو تمہارا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ زور زور سے کانپنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور پانی پلایا۔

”مگر اب وہ مر چکا ہے لائلہ۔ اب وہ تم پر کبھی تشدد نہیں کر پائے گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہیں اب اپنے ہمارے میں بہتر فیصلے کرنے ہوں گے لائلہ۔ ذرا سوچو۔ اہم! ابھی اپنے شوہر کے قاتل کے ساتھ رات بسر کر کے ارا۔۔۔۔۔۔ ایک قاتل کے ساتھ۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ وہ تم

سے پوچھا۔
 ”تا کہ تمہارے ذریعے وہ اپنا سامان امریکا پہنچا سکے۔ میں نے بتایا تا کہ ہمارا کاروبار کافی وسیع ہونے والا تھا۔“ وہ اسی مصیبت سے بولی۔
 ”جب اس نے تمہیں براؤن کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تبھی اس نے مجھ سے کہا کہ تم سے راہ و دم پیدا کروں۔ تمہارے جیسا تیرا کی کا لباس بھی مجھے اسی نے لا کر دیا تھا۔“
 ”اور میں بے وقوفوں کی طرح تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں میں آگئی۔“ اب مجھے رہ رہ کر اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔

”مگر جب تم نے بتایا کہ تم پولیس والی ہو تو ہمارا سارا پلان چھوٹ ہو گیا۔“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے پوچھا۔
 ”تو پھر سبکی کو قتل کرنے کے بعد براؤن نے کیا کیا؟“

”بس اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں بھی کچھ سوچے کچھ بغیر ہی اس کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میرا پرس تمہارے ہینڈ بیگ میں ہے تو جلدی میں، میں نے تمہارا بیگ ہی اٹھالیا۔ تم اس وقت کہاں تھیں؟“

”مکمل کے نیچے۔“ میں نے کچھ غصے کے ساتھ جواب دیا۔

”پھر ہم اس کے ہوٹل پہنچ گئے۔ سارا راستہ وہ بڑبڑاتا رہا۔ میں نے تو بس اپنا منہ بند ہی رکھا۔ دراصل مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں اسے ایسا پُر تشدد آدمی نہیں سمجھتی تھی۔ قریباً آدھی رات کو وہاں ایک اور آدمی آیا۔ براؤن اور وہ کچھ دیر تک ساتھ ساتھ کھڑے رہے اور پھر وہ آدمی چلا گیا۔ اس کے بعد براؤن کا حراج بگڑ گیا اور وہ بہت غصے میں آ گیا۔ اور اول فول پٹنے لگا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر سچا کر اس کے والد سے کچھ رقم نکالی اور ٹیکسی بگڑ کر سیدھی یہاں آ گئی۔“ اس نے مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی بات مکمل کی۔

”وہاں کون آیا تھا؟“

”مجھے کیا معلوم۔ میں تو بیڈ روم میں تھی۔ وہ آدمی براؤن کے ساتھ شنگ روم میں بیٹھا تھا۔ پتا ہے براؤن کا ہوٹل بہت ہی شاندار ہے۔ کمرے بھی بہت بڑے بڑے ہیں۔ ساتھ میں شنگ روم بھی ہیں۔ اس موقع پر وہ ہوٹل سے تو ہزار گنا بہتر ہے۔“

”تو تم نے اس آدمی کو دیکھا ہی نہیں؟“
 ”تمہارا مجھ پر شک کرنا بند کرو۔ تمہیں اپنا ہینڈ بیگ چاہیے نا۔ تو کیا تم میرے ساتھ براؤن کے ہوٹل تک چلو گی۔ مجھے وہ پیسا بھی چاہیے وہاں سے۔“
 ”پیسا؟ کیسا پیسا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”وہ پیسا جو براؤن نے اپنے کمرے میں چھپایا ہوا ہے۔ اس پر میرا بھی حق ہے۔ میرا بھی حصہ جتا ہے اس سارے پیسے میں۔ تم نے کہا تھا تا کہ تم پرائیویٹ سرائف رساں ہو؟“

”ہاں ہوں تو سہی۔“
 ”تو پھر تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا چاہیے تا کہ جب تک میں رقم ڈھونڈوں، تم اتنی دیر دروازے پر نظر رکھے رہو۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ براؤن نے وہ سارا مال کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ میں تو بس تھوڑی ہی دیر میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔“ وہ پھر بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

”میں اس قسم کا کام نہیں کرتی۔“ میں نے دامن چھڑانے کی کوشش کی۔

”دیکھو تمہارا میں کوئی نشیات کی اسمگلر نہیں ہوں۔ اسرٹائک کا دھندلہ دولوں کیا کرتے تھے، میں نہیں بھرتم بھی تو یہاں سے لٹکنا چاہتی ہو پولیس کی نظروں میں آئے بغیر۔ دیکھو تمہارا میں بھی کیسی چاہتی ہوں اس لیے ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے اور ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ ہم دولوں اگر ساتھ میں ہوں گے تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ چلو نا میرے ساتھ پلیز.....“

”کتنی رقم ہوگی وہاں اس کے کمرے میں؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”تم ازم دس لاکھ ڈالر۔“ لائلہ کی بات نے میرے ہوش اُڑا دیے۔

”کیا تمہیں یقین ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں میرے خیال میں اتنے تو ضرور ہونے چاہئیں۔ شاید کچھ زیادہ ہی ہوں مگر مجھے پوری رقم تھوڑی لگتی ہے۔ میں تو بس اپنے حصے کی رقم نکالوں گی اور بس۔ آخر میں سبکی کی بیوی تھی۔ اس کی کمائی ہوئی رقم پر میرا حق جتا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چلو گی تو میں اس کے لیے تمہیں پچاس ہزار ڈالر دے سکتی ہوں۔“ لائلہ نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔
 ”اس پیسے سے میری زندگی بدل جائے گی تمہارا اور

کریڈٹ کارڈ

کریڈٹ کارڈ کمپنی سے فون آیا۔ ”کیا آپ

ٹام بول رہے ہیں؟“

”جی ہاں، فرمائیے؟“

”میں کریڈٹ کارڈ کمپنی سے بول رہا ہوں۔

دراصل آپ کے کارڈ پر روزانہ دو تین سو ڈالر کی

خریداری ہو رہی ہے میں جانتا چاہ رہا تھا کہ اس میں

کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو رہی؟“

ٹام نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”میرا کارڈ تو ایک ہفتے

سے کم ہے!“

”لیکن سہ! آپ نے اس کی رپورٹ تو نہیں

کی۔“

”ضرورت ہی نہیں تھی!“

”سہ! آپ کی رقم مسلسل ضائع ہو رہی ہے!“

حیرت سے کہا گیا۔

”ہوئے دو۔۔۔۔۔ وہ جو کوئی بھی ہے، بہت کم

خرچ کر رہا ہے۔ میری بیوی میرا کریڈٹ کارڈ لے کر

جب بھی بازار جاتی ہے، میرا دیوالیہ لال دیتی

ہے۔۔۔۔۔“

ترکیب

”کمال ہے، تمہارا اسٹاف ہمیشہ وقت پر بلکہ

وقت سے پہلے دفتر آ جاتا ہے!“

”اس کی ایک بڑک ہے۔“ مورگن نے فخر

سے کہا۔ ”دفتر میں دس کا اسٹاف ہے، سب کے پاس

اپنی گاڑیاں ہیں۔ میں نے نوکڑیوں کی فری پارکنگ

رکھی ہے۔ دیر سے آنے والے کو پبلک پارکنگ کا رخ

کرنا پڑتا ہے جس کی یومیہ فیس دس ڈالر ہے۔۔۔۔۔

روزانہ کے دس ڈالر کے خرچ سے بیچنے کے لیے ان

سب میں پہلے بیچنے کی دوڑ لگی رہتی ہے۔“ اپنی بڑک

بتاتے ہوئے مالک کے ہونٹوں پر بڑی مسی خیر

مکراہٹ تھی۔

امریکا سے جاوید کاظمی کا تعاون

”اے تمہاری بھی۔ ذرا سوچو جس ایک دو گھنٹے کا کام ہے اور
پہنچاؤ بی بی بی۔ میں تو تمہارا تھا آتے ہی یہاں سے کہیں دور
جاک ہاؤں گی۔ خوب سیر سپاٹا کروں گی۔ بلیز میرے ساتھ
جائے گا۔“ اس نے مندر کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی کاروباری پیشکش پر غور کیا۔ اگر واقعی

”اے اے اے!“ مال موجود تھا اور بات صرف ایک دو گھنٹوں کی

تھی تو اس میں خرچ ہی کیا تھا۔ پچاس ہزار ڈالر میری زندگی

میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ اس سے کم از کم ایک سال تو

میں آرام سے گزار سکتی تھی اور شاید کچھ رقم اپنے بیٹے کے

فانے کے اخراجات کے لیے بھی بچا کر رکھ سکتی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں مگر

ایک بات پہلے ہی بتانے دیتی ہوں کہ مجھے کوئی نظر نہیں

چاہیے لالک۔“ میں نے بالآخر اس کے ساتھ چلنے کے لیے

ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

”ارے فکر ہی نہ کرو۔ براؤن ہمیں پریشان نہیں

کرے گا ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ اب تک تو وہ باہر جا چکا ہوگا

میں تو بس جنہیں اپنے ساتھ اپنی حفاظت اور نگرانی کے لیے

لے جاتا چاہتی ہوں اور کچھ نہیں۔“ وہ پھر مسلسل بول رہی

تھی۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور پھر ہم

دو دو پہلوں سے باہر نکل آئے۔

”ایسی کے ذریعے ہم براؤن کے ہوٹل تک پہنچے۔

لالک نے دوسری منزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”براؤن کا کمرہ اوپر ہے۔“

میں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا تو اس کمرے

کی بالکنی میں لگا شیشے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اندر

رہنمائی پر دے لہر رہے تھے۔

”جنہیں نہیں لگتا کہ شاید وہ ابھی یہیں موجود ہوگا۔“

میں نے احتیاطاً پوچھا مگر لالک نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس

پردوں کی جانب دیکھتی رہی۔ جیسے دل ہی دل میں کوئی

منصوبہ بنا رہی ہو۔ پھر وہ ہوٹل کے سامنے والے داخلی

راستے کی طرف چل پڑی۔ وہاں پر کالج کے کچھ نوجوان

لڑکے اور لڑکیاں خوش گپیاں کرتے جا رہے تھے۔ لالک اور

میں بھی ان کے ساتھ ہی ہو لیے جیسے ہم اسی گروپ کا حصہ

ہوں پھر انہوں نے دروازہ کھولا اور لفٹ کی طرف بڑھے۔

ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں نے بڑا سا ہیٹ پہن رکھا

تھا اور آنکھوں پر بڑے بڑے گاگڑ لگائے ہوئے تھے جن

سے میرا چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا۔ وہ گروپ ٹولفٹ میں سوار

ہو گیا مگر ہم سبڑھوں کی طرف مڑ گئے۔ اوپر روم سروں والی ملازمہ ایک بڑی سی ٹرائی کو دھکیل رہی تھی۔ ٹرائی میں جھاڑو اور برش وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ لائلہ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ”اوہو! دیکھو تو ذرا میری بے وقوفی۔ میں ابھی ابھی یہ دروازہ کھلا چھوڑ کر گئی تھی اور اب یہ بند ہے۔“ وہ براؤن کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اب میرے پاس چابی بھی نہیں ہے۔ اب کیا کروں؟“

”اچھا! مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بوائے فرینڈ باہر جاتے وقت دروازہ بند کر گیا ہوگا۔“ روم سروں والی نے خوش خلقی سے جواب دیا اور ایک دوسرے کمرے کی جانب مڑ گئی۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ جیسے اس نے لائلہ کو پہلے بھی وہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔

لائلہ نے اپنے بلاؤز کے اندر سے بیس بیس ڈالر کے دو نوٹ نکالے اور دروازہ اندر اندر انداز میں روم سروں والی سے کچھ کھسک پھسکی۔ اگلے ہی لمحے اس نے براؤن کے کمرے کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا۔ اس کی منہی میں لائلہ کے نوٹ دبے ہوئے تھے۔ لائلہ نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

”تمہیں پورا یقین ہے کہ براؤن اس بارے میں کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔“ مجھے ابھی تک اس سارے پلان کے بارے میں کافی شکوک و شبہات تھے۔

”ارے نہیں، اس بات کی بالکل فکر نہ کرو۔ اسے جب تک پتا چلے گا کہ کچھ رقم غائب ہے تو اس وقت تک ہم اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔“ لائلہ نے پھر مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ”ویسے میں بھی کون سا ساری رقم ہضم کرنے جا رہی ہوں۔ بس اپنے حصے کی رقم ہی نکالوں گی جن پر کہ میں جانتی ہوں کہ میرا حق بنتا ہے۔ تم اس بارے میں فکر مند نہ ہو۔ ویسے بھی اگر براؤن نے کچھ کہا بھی تو اس سے میں خود بات کر لوں گی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟“

پھر آہستہ سے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”چلو جلدی کرو۔ اس سے پہلے کہ براؤن یا کوئی اور یہاں آ جائے۔“

کمرہ ادھائی کافی کشادہ تھا۔ یہ ایک سوئٹ تھا جس میں بیڈ روم اور باہر روم کے ساتھ ایک سٹنگ روم بھی تھا جیسا کہ لائلہ نے بتایا تھا۔ فرنچیز تھوڑا پرانا معلوم ہوتا تھا۔ بیڈ روم اور سٹنگ روم کے درمیان شیڈ کا سلائیڈ ٹیک دروازہ ادھ کھلا

تھا۔ کمرے کا سامان بے ترتیب اور بکھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا ابھی کمرے کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔

ایک سائز نیبل پر گاڑی کی چابیاں پڑی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ براؤن باہر جاتے وقت گاڑی کی چابیاں ساتھ لے کر کیوں نہیں گیا۔ سارے کمرے میں عجیب سی بو رہی ہوئی تھی پھر مجھے براؤن کے جوتے بھی صوفے کے پاس پڑے دکھائی دیے۔

”شاید وہ ابھی نہیں ہو اور اندر بیڈ روم میں سو رہا ہو؟“ مجھے پھر خشک ہوا۔

”شش..... چپ کرو..... وہ یہاں نہیں ہے۔“ وہ بیڈ روم میں جھانک کر بولی۔

”بہتر ہوگا اگر ہم الگ الگ تلاش کریں۔ تم اس طرف بیڈ روم کی طرف جاؤ اور میں یہاں سٹنگ روم میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اس طرح بولی جیسے اس کام کا کافی تجربہ ہو۔

”آخر وہ رقم ہے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اسے ساری رقم ایک بڑے سے خاکی لفافے میں ڈالتے دیکھا تھا۔ اب اس نے وہ رکھا کس جگہ ہے، یہ میں نہیں جانتی مگر وہ ہے یہیں کہیں۔“

”لائلہ مجھے تو اپنا ہینڈ بیگ بھی یہاں کہیں نظر نہیں آ رہا۔ رقم چھوڑو مجھے تو بس اپنا بیگ واپس مل جائے تو میرے لیے یہی کافی ہوگا۔“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تمہاری مرضی مگر تم بہت پچھتاؤ گی جب تم وہ سارا مال دیکھو گی۔“ لائلہ نے سٹنگ روم سے آواز لگائی۔

بیڈ روم میں داخل ہو کر میں نے ایک ایک جگہ کو اچھی طرح تلاشی کے انداز میں دیکھنا شروع کیا۔ ڈریسنگ نیبل، اس کے ساتھ درازیں، بیڈ، سائز نیبل اور تقریباً ہر اس جگہ جہاں پر ایک خاکی لفافے نو رکھا جاسکتا تھا۔ بیڈ کی حالت بتا رہی تھی کہ ابھی اسے ٹھیک نہیں کیا گیا۔ چادریں اوپر نیچے بے ترتیب تھیں۔ میں نے اوپر نیچے ہر جگہ دیکھا مگر رقم کا لفافہ کہیں نہیں ملا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے لائلہ کے ساتھ آکر بڑی غلطی کی۔ اس جگہ کی بات مان کر میں پہلے بھی کافی خوار ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ کوئی بھی ڈی ہوٹل انسان آخر اتنی بڑی رقم دراز میں یا بیڈ کے گدے تلے تھوڑی رکھے گا۔ براؤن نے رقم ضرور کسی سیف ڈپازٹ باکس میں رکھی ہوگی۔ بیڈ کے پاس رکھی نیبل کی دراز میں کچھ رقم ضرور پڑی ہوئی تھی مگر یہ وہ خزانہ ہرگز نہیں تھا جس

کے بارے میں جانتی تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ جلد ہی مجھے بھی اس بات کا پتا چلے والا ہے مگر وہ بھی کہاں؟ کیا وہ ابھی تک یہیں موجود تھی؟ کیا وہ اب مجھے نشانہ بنانے کے لیے گھات لگائے بیٹھی تھی؟ شاید تم کا لالچ دے کر وہ مجھے یہاں اسی مقصد کے لیے لائی تھی کیونکہ ایک میں ہی تھی جسے اس کے ان دو متولین کے ساتھ تعلقات کا علم تھا اور شاید وہ اپنے جرم کا کوئی ثبوت اور گواہ باقی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں ٹائلٹ سیٹ پر دوبارہ بیٹھ گئی اور اپنے منہ دفاع کے بارے میں سوچنے لگی۔ نجائے میں وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی۔ پانچ منٹ یا شاید دس منٹ۔ مگر پھر ایک باریک اور اونچی سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ گیا۔

”روم سروس! میں آپ کے کمرے کی صفائی کے لیے آئی ہوں۔“

وہ ہوئی کل ملازمہ تھی جو اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ اب میں کیا کروں؟ اسے اندر آنے کا کہوں یا خاموش رہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پھر میں اپنے اوسان جمع کرتے ہوئے اٹھی اور بالکل خاموشی کے ساتھ ہاتھ بپ کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی اور شادو کا پردہ آہستہ سے اٹکے کھینچ لیا۔

ملازمہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد خود ہی اندر آ گئی تھی۔ مجھے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اب وہ اپنے دھیان میں کام کر رہی تھی۔ اس کے گانوں کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی پھر اس نے ویکیم کلیئر مشین چلائی اور شاید قاتلین صاف کرنا شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ کمرہ صاف کرنے کے بعد وہ ہاتھ روم کی طرف آئے گی اور پھر اور پھر..... میں اس سے آگے نہ سوچ سکی۔

میں کسی طور بھی لاش کے قریب نہیں رہ سکتی تھی مگر جاتی تو کہاں جاتی؟ مجھے جلد ہی یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب لڑائی تھی مگر کیا؟ میں سوچ سوچ کر بڑھال ہو رہی تھی۔ ملازمہ کسی بھی وقت ہاتھ روم میں داخل ہو سکتی تھی۔ وقت کی ریت میرے ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب وہ ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئے گی اور یہاں کا منظر دیکھے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ یقیناً چلائے گی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس نے ہاتھ روم کا دروازہ کھولا اور براؤن کی لاش کو دیکھتے ہی زور زور سے چلاتے لگی پھر اسی طرح ہڈیاں انداز میں چلاتے ہوئے وہ کمرے سے

لی ٹلاش میں ہم یہاں آئے تھے پھر براؤن کا والد بھی وہیں پڑا نظر آیا تو میرا ہاتھ ٹھکا۔ بھلا کوئی باہر جاتے وقت اپنا والد ہوئے کے کمرے میں کیوں چھوڑ کر جائے گا اور اس کی گاڑی کی چابیاں بھی وہیں پڑی تھیں۔ یہ بات مجھے پتہ پریشان کر رہی تھی۔ کمرے میں مجھے ایک کالے رنگ کا ہگ، بھی ملا۔ یہ خیالی تھا۔ ہر چیز اچھی طرح چیک کر لینے کے بعد میں نے لائلہ کو آواز دی۔ ”لائلہ! یہاں پر تو کچھ نہیں ہے۔“ مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر میں بیڈ روم سے متصل ہاتھ روم کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہاتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ کیا معلوم وہ ہاتھ روم میں ہی موجود ہو؟ یہ خیال آتے ہی میرے پسینے چھوٹنے لگے مگر میں نے ہمت کر کے دروازے پر ہلکے سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں آہستہ سے اندر داخل ہوئی۔

ہاتھ روم کے اندر کا منظر میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہاں براؤن برہنہ حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سر کے ایک جانب سے کھوپڑی ٹوٹ کر اندر دھنسن چکی تھی اور اس کے سر سے بہت مقدار میں خون بہہ رہا تھا۔ غسل خانہ اس کے خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ٹائلٹ اور دروازے کے درمیان جس طرح پڑا ہوا تھا اس سے لگتا تھا کہ چپری ڈھل کر کے نکلا ہوگا اور بھی کسی نے اس کے سر پر وار کر دیا..... ضرب اتنی کاری تھی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کی سائیکو و جامد آنکھوں میں زندگی کی کوئی رقیق تک باقی نہ بچی تھی۔ وہ یقیناً مر چکا تھا۔ اسے مرے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس کا بدن ٹپا پڑنا شروع ہو چکا تھا۔ میں نے ٹائلٹ سیٹ پر بیٹھ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ”وہ خدا یا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔“

براؤن کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کے سر کے دائیں جانب سے یا پیچھے سے کسی نے کسی کند آ لے سے وار کیا تھا جو اس قدر زوردار تھا کہ وہ یقیناً ضرب لگتے ہی ہلاک ہو گیا ہو گا۔ میں نے ٹائلٹ سیٹ سے اتر کر اس کے بازو کو آہستہ سے چھوا۔ وہ بالکل اکڑ چکا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی موت چار یا پانچ گھنٹے قبل ہوئی ہوگی۔

”اوہ لائلہ! تجھ پر خدا کی مار! یہ تو نے کیا کیا؟“ میں زیر لب بڑبڑائی۔ یہ اسی کا کام لگتا تھا پھر مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے اسے آواز دی تھی تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس لیے کیونکہ وہ براؤن کی موت

باہر بھاگ گئی۔ میرے لیے یہاں سے نکلنے کا یہی موقع تھا۔ میں نے بیس تک گنتی گئی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ کمرے سے باہر جا چکی ہے تو میں آہستہ سے ہاتھ روم سے باہر نکل آئی۔

سامان ٹیبل پر سے براؤن کی کار کی چابیاں غائب تھیں اور بالکونی کا دروازہ پہلے سے کچھ زیادہ کھلا ہوا تھا۔ شاید لائلہ نے باہر جانے کے لیے اسی راستے کا انتخاب کیا تھا۔ بالکونی کے باہر ایک چھچھا تھا اور اس کے تقریباً آٹھ دس فٹ پیچھے نرم زمین تھی۔ لائلہ اتنی اونچائی سے بہ آسانی کود سکتی تھی اور شاید اس نے ایسا ہی کیا تھا اور اب میرے فرار کا یہی یہی راستہ تھا۔

میری جینز کی جیب میں تقریباً دو ڈالر کی ریڑ گاری تھی جس کی مدد سے میں نے مونٹیکو بے واپس جانے کا بس کا ٹکٹ خریدا۔ میرے پیٹ اور گالھن کی وجہ سے میں کسی کی توجہ کا مرکز نہ بن پائی تھی اور شاید کسی نے میرا چہرہ بھی ٹھیک سے نہ دیکھا ہوگا۔

☆☆☆

مونٹیکو بے میں اپنے کمرے میں واپس پہنچنے ہی میں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ میں لائلہ کی سی لی اور براؤن کی تمام یادوں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ میرے کمرے کا ائیر کنڈیشنر پھر بند ہو گیا تھا۔ تھکان اور گرمی سے میرے سر میں شدید درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سردرد کی دو گولیاں کھائیں اور ایک ایچے سے تسکین بخش غسل کے لیے ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔ ہاتھ ٹب میں لیٹے ہوئے بیل ہاتھ کے نرم نرم جھاگ سے میری طبیعت کافی حد تک بحال ہوئی۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ دو آدمیوں کا قتل ہو چکا تھا اور ان دونوں کے بیچ میں ایک ہی مشترک کڑی تھی اور وہ تھی لائلہ۔

کیا سیسی لی کا قتل کسی سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا یا کہ قاتل نے اسی وقت موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا کام تمام کر دیا تھا؟ کسی حد تک تو یہ سوچا جاسکتا تھا کہ قاتل کیونکہ قاتل آگ لگنے سے پہلے وہ چاقو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ پھر یہ بھی بات قابل غور تھی کہ قاتل کی جیسے جیسے ہماری ہمت کم ہوتی جاوے اس کے لیے قاتل کا کافی طاقت ور ہونا ضروری تھا۔ یہ لائلہ جیسی دھان یاں لڑکی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ لائلہ کا کہنا

تھا کہ سیسی لی کو براؤن نے قتل کیا تھا۔ ہاں وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ شاید گولیاں چلنے کے فوراً بعد ہی اس نے مجھے ٹیبل کے پیچھے چھپتے دیکھ لیا ہو اور لائلہ کو تو وہ جانتا ہی تھا کہ وہ اس کے ایسا کرنے پر نہ کوئی مزاحمت کرے گی اور نہ ہی شور مچائے گی۔ شاید لائلہ نے ہی اسے ایسا کرنے پر اکسایا ہو۔ اب اس بات کی تو میں بھی قائل ہو چکی تھی کہ جب لائلہ کسی سے کوئی بات سنانا چاہتی تو منوا کر ہی دم لیتی تھی مگر پھر براؤن کا قتل کس نے کیا؟

میں نے ہاتھ ٹب میں لیٹے لیٹے تمام ممکنہ زاویوں سے صورت حال کا تجزیہ کرنا شروع کیا پہلا سوال تو یہ تھا کہ کیا لائلہ کی کبھی ہوئی تمام باتیں سچ تھیں؟ اور اگر نہیں تو ان میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔ وہ براؤن کو اپنا نجات دہندہ تو مانتی تھی مگر جب اس نے اس کے شوہر کو قتل کیا تو اس سے وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ خوف زدہ ہو گئی تھی مگر کیا وہ سب اس کا ناک تو نہیں تھا؟ لائلہ نے بتایا تھا کہ براؤن کے کمرے میں اس رات کوئی ملے آیا تھا جس کے بعد اس کا مزاج بگڑ گیا تھا۔ آخر اس سے کون ملے آیا تھا اور وہ بھی اتنی رات گئے؟ پھر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ براؤن کے والٹ سے پیسے نکال کر بھاگ گئی تھی۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا جس نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ اگر اسی نے براؤن کا خون کیا تھا تو پھر اسے میرے ساتھ دوبارہ وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ براؤن کا کام تمام کر کے اطمینان سے پیسے ڈھونڈ سکتی تھی اور پھر وہیں سے رنو چکر ہو جاتی۔ ہاں یہ بات ٹھیک لگتی تھی۔ لائلہ وہاں کسی چیز سے بہت ہی زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی جس نے اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو لائلہ جیسی دیلی پٹلی لڑکی براؤن جیسے ذلیل ڈول والے آدمی کو کیسے مار سکتی تھی؟

مجھے یاد آیا کہ اہل رام کہانی سناتے وقت لائلہ نے کچھ ہی دیر بعد محمد اطمینان پرانی شروع کر دی تھیں مگر وہ کیا بات تھی؟ محمد اطمینان چارہاں ہی تھی۔ اگر وہ اس شخص کو جو براؤن سے لڑا تھا، پہلے سے جانتی تھی اور اس بات کو مجھ سے چھپا رہا تھا، اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر اس نے کیا چھپا تھا؟

اب مجھ کو یاد آتا ہے۔ میری پہلی مرتبہ سوئٹنگ پول کے کنارے لائے ہوئے تھی اور جو مجھے بے بسی باتیں کرنے والی لگتی تھی اور وہ لائلہ جس کے ساتھ میں چند گھنٹے قبل براؤن کے کمرے میں گئی تھی جو مجھے اب معصوم شہل الی الی اور طرار عورت لگ رہی تھی، ان

رقص ابلیس

بتانا مناسب نہیں سمجھا بس یہی کہا کہ میرا ہینڈ بیگ کہیں کم ہو گیا ہے اس لیے مجھے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ میں اس کی آواز سن کر ہی اندازہ کر سکتی تھی کہ یہ سنتے ہی وہ کافی پریشان ہو گئی تھی۔

”تمارا! تم ٹھیک تو ہو؟ آخر اتنے پیسوں کی تمہیں کیوں ضرورت پڑ گئی؟ کیا تم کسی مصیبت میں تو نہیں جھنس گئی ہو؟“ اپنی نے ایک ساتھ ہی سوال کر دیے تھے جن کو نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا اور یہی کہا کہ اگر ہو سکے تو وہ یہ رقم مجھے جلد از جلد بھیج دے اور میرے بارے میں فکر مند نہ ہو۔

پھر جمال سے بات ہوئی۔ وہ تو جیسے میری آواز سنتے ہی جان گیا کہ میں کسی بڑی مشکل سے دوچار ہوں۔ میں نے اسے بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں ٹھیک ہوں اور جلد ہی گھر واپس آ جاؤں گی مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میری بات سے کتنا قائل ہوا تھا۔ اس کے سوال ابھی جاری تھے مگر میں نے جلد ہی بات ختم کر کے خدا حافظ کہہ دیا۔

اپنی اور جمال سے بات کر کے میرے دل کو کافی سکون ملا اور پھر میں انہی کے بارے میں سوچتے ہوئے سو گئی۔

صبح میں کافی دیر تک سوتی رہی۔ جب اٹھی تو فون بج کر بند ہو چکا تھا۔ ٹھوڑی دیر بعد فون کی کھنٹی دوبارہ بجی تو میں نے لپک کر اٹھایا۔ دوسری طرف اپنی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس کی ماں کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہو گئی تھی اور اسے اسپتال لے جانا پڑ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا کافی خرچہ بھی ہو گیا اور پھر اس نے آہستہ سے کہا کہ اسے پیسے بھیجنے میں کچھ تاخیر ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر مجھے مایوسی تو ہوئی مگر میں گریہ کیا سکتی تھی سو میں نے کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں جب سہولت ہو تو پیسے بھجوا دے۔

میں نے کچھ دیر بیوی دیکھا اور پھر محسوس ہوا کہ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک اور سوال بھی گردش کر رہا تھا اور وہ یہ کہ پہلی دفعہ جب فون کی کھنٹی بجی تو کیا اس وقت بھی دوسری طرف اپنی ہی تھی یا کوئی اور؟ یہ جاننے کے لیے میں نے فرنٹ ڈیسک سے رابطہ کیا تو انہوں نے یہی بتایا کہ فون کال کہیں ہوئی کے باہر سے آئی تھی۔ کنکشن میں تو صرف لائلہ اور بازل ہی میری جان پہچان کے تھے۔ بازل تو اب شاید دوبارہ بھی مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرے۔ تو رہ گئی لائلہ..... مگر اب وہ مجھے کیوں فون کر رہی تھی؟ خیر میں نے یہ سب سوال ذہن میں

دلوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا تھا مگر اس کا اصل چہرہ کون سا تھا؟ اور اس سے بھی زیادہ قابل غور بات یہ تھی کہ اب اس صورت حال کے پیش نظر میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا میری جان کو اب بھی خطرہ تھا؟

اوہ میرے خدا! میری مدد کر۔ یہ میں کس جہال میں پھنس گئی ہوں۔ میں نے ہاتھ بپ میں لینے ہی دعا مانگی تھی۔ اہلدی جلدی میں نے غسل کیا اور بپ سے غسل کر لیا۔ ہینڈ بیگ کے ساتھ ہی میری نظر لائڈری کی باسکٹ میں پڑے اپنے خون آلود ڈیس پر پڑی۔ میں نے فوراً اسے وہاں سے نکال کر ایک پرانے اخبار کے کاغذ میں لپیٹا اور چاکر میں یہاں سے باہر جاتے ہی اسے کسی کوڑے دان میں پھینک دوں گی۔ مجھے اس کو ہوئی سے کافی دور ہار لپیٹنا تھا اور اس کے لیے مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ مجھے یاد تھا کہ ہوئی میں کہیں نہ کہیں میں نے دس ڈالر رکھے تھے جو ٹھوڑی سی تلاش کے بعد ہی مجھ مل گئے۔ چلو بس کا کرایہ تو ہو گیا مگر جہاز کے کرائے کا کیا ہو گا؟ اگر پاسپورٹ کا بندوبست ہو بھی جاتا تب بھی جہاز کا ایک طرفہ کرایہ تو بھی لانا کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنی دوست اپنی کو فون لے آں اسے کچھ پیسے ادھار مانگ لوں گی۔ میرا بیٹا جمال ہی ان دنوں اپنی کے پاس ہی رہ رہا تھا تو اسی بہانے اس سے بھی بات ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر ہی میرے چہرے پر کان کھلنے لگی۔

اپنے خون آلود کپڑوں کو ٹھکانے لگا کر جب میں ہوئی واپس پہنچی تو شام ہو چکی تھی۔ رات کو تقریباً نو بجے میں نے اپنی کو فون کیا۔ وہ میری قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ میں جیسا کہ میں مزے کر رہی تھی اور اس کو روزِ صبح سویرے اٹھ کر کام پر جانا پڑنا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں کی بیماری بھی بڑھ گئی تھی اور کام سے واپس آ کر اسے اپنی کی ماں کی تیمارداری بھی کرنی پڑنی تھی۔ میں نے کچھ سمجھتے ہوئے اس سے پانچ سو ڈالر بھیجنے کی درخواست کی۔ میرا خیال تھا کہ یہ رقم میرے جہاز کے ایک طرفہ کرائے اور دیگر چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے کافی ہوگی۔ ہوئی کے بل کی مجھے فکر نہ تھی، کیونکہ میرے کریڈٹ کارڈ کا نقش چیک این کرتے وقت ہی ہوئی والوں نے لے لیا تھا اور بل چکانے کے لیے اس کا استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اپنی سے پیسے مانگتے ہوئے مجھے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ میں اس کے مالی حالات جانتی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اتنی رقم کا انتظام کرنا اس کے لیے آسان کام نہیں تھا مگر میں مجبور تھی۔ میں نے فون پر اس کو ساری بات

میں پشت ڈالتے ہوئے امریکن ایمپیس فون کیا۔ وہاں کافی انتظار کے بعد مطلوبہ افسر سے میری بات ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا پاسپورٹ کم ہو گیا ہے تو اس نے کہا کہ اس کے لیے مجھے خود ایمپیس آنا ہوگا۔ وہاں وہ میرے سوشل سکیورٹی نمبر سے میرے نام اور شہریت کی تصدیق کریں گے اور اس کے بعد میرے لیے ایک عارضی سفری اجازت نامہ جاری کر دیں گے جس کی بدولت میں امریکا تک سفر کرنے کے قابل ہو جاؤں گی۔

اس اہم کام سے فارغ ہوئی تو بھوک نے پھر ستانا شروع کیا۔ میرے پاس نکل پانچ ڈالر اور کچھ ریڑ گاری تھی۔ میں نے سوچا کہ ابھی ایک کپ سوپ لی لیتی ہوں پھر جب شام تک اپنی پیسے بیچ دے گی تو ڈٹ کر کھانا کھاؤں گی۔

یہی سوچتے ہوئے میں نے کپڑے تبدیل کیے اور باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ میں ہوٹل کے چھوٹے سے ریسٹوران میں داخل ہوئی اور ایک کپ سوپ منگوایا۔ سوپ بہت لذیذ تھا۔ اسے ختم کرنے کے بعد میں نے قریب پڑے اخبار کو اٹھایا اور الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اچانک دوسرے صفحے پر چھپی ایک خبر پر میری نظر پڑی۔

”دہرے قتل کی تحقیقات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔“

ویسٹ کنکشن میں واقع اسٹیپ اینڈ گو کلب میں ہوئے دہرے قتل کی واردات میں آخری خبریں آنے تک کوئی پیش رفت نہ ہونے پائی ہے۔ اس بدنام زمانہ کلب میں گزشتہ شب دو نامعلوم افراد کا قتل ہو گیا تھا۔ ابھی تک قتل کے محرکات کا پتا نہیں چل سکا۔ پولیس اس بارے میں چھان بین کر رہی ہے۔ بارسوخ ذرائع کے مطابق قتل ہونے والے اشخاص میں سے ایک یادوؤں کا تعلق ریاست ہائے امریکا سے ہو سکتا ہے۔ پولیس ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تفصیل بتانے سے گریزاں ہے مگر گمان غالب ہے کہ یہ افراد نشیات کی خرید و فروخت میں ملوث ہو سکتے ہیں۔

میں نے خبر پڑھی اور اخبار دہرا کر کے رکھ دیا۔ ایک مقتول کے متعلق تو میں جانتی تھی مگر وہ دوسرا شخص کون تھا جس کا اسی دوران خون ہوا؟ کیا ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق تھا اگر تھا تو کیا تھا؟ میں انہی سوچوں میں غلطان تھی۔

”آج کل تو یہاں کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں رہی ہے۔“

میرے قریب بیٹھی عورت نے مجھ سے مخاطب ہو کر جب یہ کہا تو میں اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔ وہ ایک اوجیز عمر کی

گوری عورت تھی۔ میرے ایسے چونک جانے پر وہ معذرت طلب انداز میں بولی۔ ”اودہ معاف کرنا میں سمجھتی تھی کہ شاید تم امریکن ہو۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بہت خوب، میں بھی امریکا سے ہوں۔ میرا نام ہانا گرافٹ ہے اور میں وہاں برج پورٹ کینیڈا میں رہتی ہوں۔ میں نے بھی ان دو سیاہوں کے قتل کے متعلق پڑھا ہے۔ اس کے بعد اب مجھے یہاں اپنا آپ بہت غیر محفوظ محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ان میں سے ایک جرمن تھا اور دوسرا امریکی۔“

”جرمن؟“ میں نے سوچا کہ ہونہ ہو یہ وہی سنہری بالوں والا گورا ہوگا جسے میں نے کلب میں سیاہ ڈفل بیگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا اس تمام قصے سے کیا تعلق تھا؟

”ہم نے یہاں گھومنے کے لیے ایک گاڑی کرائے پر لی تھی۔ اس کا ڈرائیور بتا رہا تھا کہ ان دونوں مقتولین میں سے ایک سیاہ فام امریکی تھا اور دوسرا جرمن گورا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان میں سے اس جرمن کا قتل بہت ہی پرتشدد اور ہیمنہ طریقے سے ہوا تھا۔ کسی نے اس کے چہرے پر اتنی زور سے ضرب لگائی تھی کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ کر پیچھے اس کے پیچھے میں دھنس گئی تھی۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ سوچو اس بے چارے کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اخبارات میں یہ تفصیل اس لیے نہیں دی جاتی کہ اس سے یہاں آنے والے سیاح خوف زدہ نہ ہو جائیں اور یہاں آنا چھوڑ نہ دیں۔ کیونکہ سیاحت یہاں پر ایک صنعت کا درجہ رکھتی ہے اور ملک کے لیے زرمبادلہ کمانے کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے۔“

”ویسے یہ سب ایک نہایت گھٹیا کلب میں وقوع پذیر ہوا جو شہر کے انتہائی غیر معروف علاقے میں واقع ہے۔ ہم جیسے سیاح تو ایسی جگہوں کا کم ہی رخ کرتے ہیں اس لیے جنہیں اس بارے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اور وہ دوسرا شخص؟ اس کا قتل کیسے ہوا؟“ میں نے کُریدتے ہوئے پوچھا حالانکہ میں خوب جانتی تھی کہ سیکی لی کا قتل کس طرح ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کے بارے میں ہمارے ڈرائیور نے بتایا تھا کہ وہ ایک ہماری بھر کم سیاہ فام امریکی تھا جسے چاقو کے وارے قتل کیا گیا۔ سینے میں دل کے پتھوں بچ۔ وہ بھی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید

پھنسا دے گی۔

لفٹ تیسرے فلور پر رکی تو میں بھی خاموشی سے سر جھکا کر ان پولیس والوں کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہاں وردی میں بلبوں ایک پولیس والا پہلے سے موجود تھا پھر وہ تینوں لائلہ کے کمرے کے سامنے جا کر رک گئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جوان پولیس افسر نے اچانک مڑ کر میرا راستہ روکنے کی کوشش کی جیسے وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کمرے کے اندر جھانکوں مگر دروازہ کھلا ہونے کے باعث مجھے کمرے کے اندر کارو نکٹے کھڑے کر دینے والا منظر صاف نظر آرہا تھا۔

پردے کھڑکیوں سے نوج لیے گئے تھے اور دھجیوں کی شکل میں فرش پر پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹے ہوئے تھے اور کانچ فرش پر جا بجا بکھرا ہوا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ ٹوٹ کر ایک ٹکڑی ٹکڑی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ لائلہ کے کپڑے اور دیگر سامان فرش پر یہاں وہاں بکھرا پڑا تھا۔ سامنے کی دیوار پر کمرے کے سرخ رنگ سے، جو یقیناً خون تھا، گالیاں اور حرام زادی، لکنا دیگر مغلظات بڑے بڑے حروف میں لکھی ہوئی تھیں۔ لائلہ کا سرخ لباس جو اس نے گزشتہ رات پہن رکھا تھا، فرش پر ایک ٹکڑی کی شکل میں پڑا تھا۔

”خون! اس کا خون ہو گیا۔“ غیر ارادی طور پر میرے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میری آواز سن کر جوان پولیس افسر اپنے ساتھی کے ہمراہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔

مجھے وہ منظر دیکھتے ہی رہتھال بروم یاد آ گیا۔ وہ بھی شیطانی ذہن رکھنے والا ایک انسان تھا جس نے ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں گھس کر وہاں موجود تمام لوگوں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ شکر ہے کہ دو پہر کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں گاؤں کا زیادہ تر شہر نہیں تھا مگر پھر بھی یالیں افراد کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، آن کی آن میں قتل کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں ان دونوں پولیس میں تھی۔ جب میں اور میرا پارٹنر ٹک ڈرٹٹ جائے وقوعہ پر پہنچے تو اس وقت رہتھال بروم اپنی کلاشکوف کو ایک ہاتھ میں تھامے اطمینان سے کھڑا کافی پی رہا تھا۔ اس نے بھی وہاں کی دیواروں پر کسی مقتول کے خون سے انجیل مقدس کے کچھ اقتباسات لکھ ڈالے تھے۔

لائلہ کے کمرے میں جھانکتے ہی میری نظروں کے سامنے کئی برس پہلے کا وہ بیت ناک منظر گھوم گیا۔ یقیناً یہ بھی

تھا۔ اس وقت ملک میں اس قسم کے خطرناک لوگ کہاں سے کہاں تھے۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”اوہ کیا تم لائلہ لگاتے ہو؟ میں نے اپنی باتوں سے نہیں پریشان کرنا چاہتا۔ تم خیال رکھنا اور انجیل جگہوں پر سیر کرنے جانا جن کا انورسٹ گائڈ بکس میں ہوتا ہے۔ ویسے بھی تم انجیل ہو تو ایسی ویسی غیر محفوظ جگہ جانے سے گریز کرنا۔ اچھا میں بتاتی ہوں۔ وہ دیکھو میرے شوہر بالآخر اپنے کمرے سے باہر آ ہی گئے ہیں۔ وہ ہاتھ روم میں بہت وقت لگاتے ہیں اور بیڈنم ہم عورتیں ہیں۔ میں تو تیار ہو کر ذرا پہلے ہی باہر آئی تھی۔ تم اپنا خیال رکھنا۔“

یہ کہہ کر وہ لفٹ میں سے باہر آتے ایک عمر رسیدہ شخص کی طرف چل دی۔ میں کچھ دیر ان دونوں کو ہٹل سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کاش اس طرح کا ٹیک مشورہ اگر مجھے دو روز پہلے مل جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا مگر اب بچتا تو اسے کیا ہوتا؟

سوچ بچار کرتے ہوئے میں ریسٹوران سے نکل آئی اور فرنٹ ایک سے اپنے لیے آنے والی کسی کال کے منتظر بن گئی۔ وہاں وہاں ہالوں، باروں، لابیوں میں جا ب دیا۔ ”ایسا ہی ہے اس رات بھی فرنٹ ڈیسک پر موجود سی۔ ایس۔ ایس۔ ایس اور لائلہ کے ساتھ کھوٹے لکلی تھی۔ وہ مجھے ملے۔“ میں نے پراسی میں؟ کیا اسے میرا اور میرے ساتھ جانے والے لوگوں کے چہرے یاد تھے؟ مجھ پر پھر خوف کا دورہ بڑھنے لگا تھا مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نارمل رہنے کی کوشش کی۔ میں لفٹ کی جانب بڑھی تو وہاں دو آدمی پہلے سے کھڑے لفٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے سوت، ان کی تیز تیز سرکشیوں میں گفتگو اور ہر آنے جانے والے شخص کا بغور مطالعہ کرنا اس بات کی چغلی کھارہا تھا کہ وہ خفیہ پولیس والے تھے۔ ان میں سے ایک قدرے جوان تھا اور دوسرا جو غالباً اس کا باس تھا ذرا بڑی عمر کا تھا، مجھے دیکھ کر انہوں نے مؤدبانہ طریقے سے راستہ دیا اور ہم لفٹ میں سوار ہو گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے تیسرے فلور کا بٹن دبا یا تو میری جان میں جان آئی۔ وہ میرے فلور پر نہیں جا رہے تھے مگر لائلہ تو تیسرے فلور پر ہی مقیم تھی۔ کمرانمبر 314 میں۔ اوہ تو یہاں کی پولیس آخر کار سی سی کی شناخت کرنے میں کامیاب ہوئی مگر کیا لائلہ اپنے کمرے میں وہاں آگئی ہوگی؟ اگر ایسا ہوا تو مجھے پوری امید تھی کہ وہ کینی اپنی جان بچانے کی خاطر سارا ملبا میرے اوپر ڈال کر مجھے

کسی شیطان صفت انسان کا کام ہی لگتا تھا اور مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ اس نے لائلہ کا کیا حشر کیا ہوگا۔ ساتھ ہی مجھ پر یہ عید بھی کھل گیا کہ لائلہ جب میرے کمرے میں آئی تھی تو اس قدر خوف زدہ کیوں تھی اور براؤن کے کمرے تک اکیلی کیوں جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد میں جانے کتنی دیر تک لائلہ ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ حالانکہ میری اس کے ساتھ بہت تھوڑی دیر کی جان پہچان تھی اور اس میں بھی ہر دفعہ اس نے میرا استعمال کیا تھا مگر پھر بھی اس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے بار بار آ جاتا تھا۔ شاید مجھے اس کے نوجوان اور معصوم چہرے میں کہیں اپنی نوجوانی کے دنوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ کافی دیر تک میں ایسے ہی گم مسم بیٹھی رہی۔

میں نے جب گھڑی کی طرف نظر دوڑائی تو احساس ہوا کہ ایسی ہی جانے کا وقت نکل چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب تو یہ کام کمال ہی ہو جائے گا۔

ایک طرف تو مجھے لائلہ کے اس طرح قتل ہو جانے کا افسوس تھا مگر ساتھ ہی خود غرضی پر بھی ایک طرح کا اطمینان بھی تھا کہ اس کی موت کے ساتھ مجھے یہی ملی اور براؤن کے قتل سے جوڑنے والی واحد کڑی ٹوٹ چکی تھی۔

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید میرے لیے اپنی کا کوئی پیغام آیا ہو تو میں نے فرنٹ ڈیسک سے رابطہ کیا۔ میرے لیے دو پیغامات آئے تو تھے مگر وہ اپنی کی طرف سے نہیں تھے۔ ایک پیام ہوٹل کے منیجر کی طرف سے تھا۔ جو میرے کریڈٹ کارڈ کی کچھ مزید تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔ شاید اسے پولیس یا پھر فرنٹ ڈیسک پر موجود لوہی کے ذریعے میرے لائلہ سے تعلق کی خبر مل گئی تھی اور اسی کی مزید تحقیقات کا یہ بہانہ ڈھونڈا گیا تھا۔

دوسرا پیغام ایک انعام فون نمبر سے آیا تھا اور کارل نے کہا تھا کہ میں جلد از جلد اس سے رابطہ کروں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس انجان فون نمبر پر کال کروں یا نہیں کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسپونڈ نہ کیا تو دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز آئی۔ آواز کچھ شناسا تو معلوم ہوئی تھی مگر میں اسے پہچان نہ پائی۔

”تمارا۔“

”جی میں بول رہی ہوں۔“

”کیا تم اس وقت اکیلی ہو؟“

”آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”میں تم سے اسٹیپ اینڈ گو کلب میں ملا تھا۔ اسی رات جس رات تمہارے دوست کا قتل ہوا تھا۔“

”کون ہو تم؟“ میں تنک کر بولی۔

”لیسی، یاد آیا۔ ڈیلا براؤن کا دوست۔“

اب مجھے یاد آیا کہ یہ وہی دہلا پٹلا سا چپکلا زورہ فحش تھا جس کے ساتھ براؤن بڑے پُر تپاک انداز میں ملا تھا۔ کیا اس کا بھی اس شیطانی گورکھ دھندے سے کچھ تعلق تھا؟ مگر میں اس میں کیوں خواہنا اٹھاتی جا رہی تھی؟

”میں تمہیں نہیں جانتی اور نہ ہی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہوں۔“ میں نے اسی تنک مزاحمتی سے جواب دیا۔

”تم نے دیکھا تھا نا براؤن کے ساتھ کیا ہوا؟“

”تم اس بارے میں کس طرح جانتے ہو؟“

یہ کہتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کیونکہ یہ کہہ کر میں نے خود ہی اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ میں جاے وقوع پر موجود تھی۔ مجھے اپنا منہ بند ہی رکھنا چاہیے تھا مگر تیرکان سے نکل چکا تھا۔ منہ سے نکلی بات اور کمان سے نکلتا تیر بھی واپس نہیں آتے۔

”تو تم بھی وہاں موجود تھیں۔ تھیں نا، اب میرے ساتھ کوئی بکواس مت کرنا۔ تم جانتی نہیں کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔

”میں نہیں جانتی تم کیا بات کر رہے ہو؟“

”میں اپنی رقم واپس چاہتا ہوں۔ وہی رقم جو تم نے اور اس چھوٹی کمپنی نے مل کر براؤن کے کمرے سے چرائی ہے وہ میری رقم ہے گھٹیا عورت! میں نے ہی براؤن کے پاس رکھوائی تھی۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی، مجھے تو۔۔۔۔۔۔“

”تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں گھٹیا عورت! رقم تم دونوں میں سے کسی ایک کے پاس ہے۔ کہاں چھپایا ہے تم نے میرا سرمایہ؟“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

مجھے یاد آیا کہ براؤن نے اسے اس رات اپنے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتایا تھا۔ تو کیا یہی آدمی اس کا قاتل تھا؟

”بتاؤ اس کُتیا نے رقم کہاں چھپائی ہے؟ میں جانتا

تھے۔ اب رقم اگر میرے پاس بھی نہیں تھی تو تمہی کہاں اور کس کے پاس؟

غور طلب بات تو یہ بھی تھی کہ وہ میرا پورا نام کیسے جانتا تھا کیونکہ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی تھی، اس کے سامنے تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شاید ان تینوں میں سے کسی ایک نے اسے بتا دیا ہوگا یا شاید یہ کہہ کر جتنی بگھاری ہو کہ میں ان کے ساتھ کام کر رہی تھی، ان کے اپورٹ ایکسپورٹ کے برز میں۔

اس نے لازماً لائلہ کے کمرے کی تلاشی لی ہوگی اور جب رقم وہاں پر نہیں ملی ہوگی تب ہی اسے میرا خیال آیا ہو گا۔ رقم پانے کے لیے اس نے ضرور لائلہ پر تشدد کیا ہوگا۔ مگر رقم اگر لائلہ کے پاس تھی تو اس نے لیسی کے حوالے کیوں نہیں کر دی؟ یا ہو سکتا ہے کہ اس نے رقم کسی ایسی جگہ چھپا دی ہو جہاں تک پہنچنا خود اس کے لیے بھی مشکل ہو؟

مگر اب تو وہ رقم حاصل کرنے میری طرف آ رہا تھا۔ کیا وہ سوچ رہا تھا کہ میں اتنی بے وقوف ہوں کہ چپ چاپ اس کے آنے کا انتظار کروں گی یا دوبارہ اس سے بات بھی کروں گی؟ اس نے مجھے کسی اور وجہ سے فون کیا تھا مگر وہ وجہ کیا ہو سکتی تھی اور وہ رقم آخر بھی کہاں؟

میں نے کمرے میں اپنا دفاع کرنے کے لیے کوئی چیز تلاش کرنی شروع کی مگر ایسی چیز تو بے قیاس تھی نہ اب۔ مجھے ایک کن کی اشرف ضرورت محسوس ہو رہی تھی تاکہ وہ خبیث اگر میرے پاس آنے کی غلطی کرے تو میں اسے مزہ چکھا دوں۔ میں ابھی اسی اوجیز میں مصروف تھی کہ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی۔

میں نے اسے بچے دیا مگر وہ مسلسل بچے جاری تھی۔ آخر تک آکر میں نے فون اٹھا لیا۔

پوچھا۔ ”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ میں نے گرجتے ہوئے ”تمہارا؟“

یہ آواز تو بہت جانی پہچانی تھی اور اس وقت اس نے میرے دل کے تاروں کو چھو لیا تھا۔ ”تمہارا! میں بازیل بول رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ پچھلے بار ہمارے بیچ جو جتنی پیدا ہوئی تھی، اسے ختم کیا جائے۔ اس کے لیے کیا تم میرے ساتھ ایک ڈرنک پیٹا پسند کرو گی؟“ اس نے بڑے مہذب انداز میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

”تمہارا تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”اے اللہ! میں ابلیس، ابلیس رہی ہو۔“

”اے اللہ! کے ساتھ کیا کیا؟“ میں نے بھرائی

اس بارے میں کچھ کھلاڑی یہی ہو سکتا تھا۔ اسی لئے وہ سارا کیل رچا ہوا تھا۔ اس جرم گورے اور ہلکا سا لالہ کے لٹل کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ براؤن کہاں سے لائی ہوگی۔ شاید لائلہ کے بارے میں بھی۔ شاید براؤن لائی ہوگی۔ شاید لائلہ کے متعلق بتا دیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لائلہ کو پہلے سے ہی جانتا ہو۔ یہ اری الیم اس کی اور لائلہ کی بھی تو ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی نے لائلہ کو بھی ڈیل کر اس کے بارے میں دیا ہو؟

”خاتمہ دوندے تم نے صرف رقم کی خاطر اس کا قتل کر دیا۔ اس لڑکی کو اس بے رحمی سے مار دیا تم نے۔“ میں نے نفرت بھرا چہرہ دیکھا۔

”تو کیا بکواس کر رہی ہے مٹھی اچھے تو بس میری رقم چاہیے۔ مجھے بتا! کہاں چھپایا ہے میرا مال؟“

”تمہاری رقم میرے پاس نہیں ہے حرام زادے۔“ میں نے بھی دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

”تم مجھے بے وقوف نہیں بتا سکتی تمہارا کیل! اب تم مجھ سے بیخ نہیں پاؤ گی۔“

”تم میرا پورا نام کیسے جانتے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔“ میں جانتا ہوں تم کہاں ہو۔ میں کسی بھی وقت آکر تمہاری گردن مروڑ سکتا ہوں۔ مجھے میری رقم چاہیے بس! اگر اپنی جان پیاری ہے تو جب میں آؤں تو شرافت سے رقم میرے حوالے کر دینا ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تمہاری اپنی

مال بھی تمہارا چہرہ نہیں پہچان پائے گی۔“

اس کی ہڈیاں بکواس اچھی جاری تھی مگر میں نے غصے سے فون پھینک کر بند کر دیا۔

تو یہ سب اس رقم کا پتھر تھا۔ ہمیشہ دولت کا لالچ ہی انسان کو گناہ کے راستے پر ڈالتا ہے۔ لائلہ کو بھی اسی لالچ نے اکسایا اور اس کی جان چلی گئی اور میں بھی رقم کے لالچ میں آکر اس سارے گورہ دھندے میں پھنس گئی۔ خیر جو ہوا

سو ہوا۔ مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ لیسی جس رقم کی بات کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ رقم میرے پاس ہے اس کی تو میں نے جھلک تک بھی نہیں دیکھی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کا ایہ

چہرہ بھی ٹھیک تھا کیونکہ باقی تمام لوگ تو مارے جاتے

”تم جانتے ہو کہ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں
میں اپنی حفاظت کے لیے مردوں کی ضرورت پڑتی
ہے۔“ ہمیں نے اپنی گردن اگراتے ہوئے کہا۔

”تمارا ہیل! اپنی باتوں کی وجہ سے ایک دن تم بہت
بڑا پھنسنے والی ہو۔“ بازل نے سرزنش کے انداز میں کہا اور
پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں نے تو تمہاری آواز سننے ہی اندازہ لگا
لیا تھا کہ تم کسی مشکل میں ہو پھر جب میں نے تمہیں دیکھا تو
تمہاری آنکھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ تم چاہے جھوٹ
بول بھی لو مگر تمہاری آنکھیں ہمیشہ سچ بولتی ہیں۔“

ہم نیوٹکشن میں واقع ایک چھوٹے سے مگر عمدہ
ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ہم نے وہاں کھانا کھایا اور وہ
ڈرنک بھی لی جس کا بازل نے فون پر ذکر کیا تھا۔ ہلکی ہلکی
پھوار پڑ رہی تھی اور ہر سانس پھر کر صاف ہو چکی تھی۔ میں نے
اسے اب تک کے تمام واقعات کی تفصیل بتائی۔ وہ بڑے
انتہاک سے سب کچھ سن رہا اور پھر بولا۔ ”تو تمہارا خیال
ہے کہ لیسی نے ہی لائلہ کا قتل کیا ہے اور اب وہ تمہارے
پیچھے پڑ گیا ہے؟“

”مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

”کیا وہ ممکن ہے؟“

”نہیں وہ امر ممکن ہے۔“

”وہ بہت بزدل انسان ہے جو عورتوں کو دھمکا تا ہے
اور ان پر تشدد کرتا ہے۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”کیا وہ
نکٹکشن میں رہتا ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی مگر مسٹر بازل ڈیو پیری! تم تو اس
سارے پکڑ سے باہر ہی رہو تو بہتر ہو گا۔“ میں نے جواب
دیا مگر میں جانتی تھی کہ وہ جس قسم کا جذباتی اور غیرت مند
فحش تھا ایسے خطرناک حالات میں وہ بھی مجھے اکیلا نہیں
چھوڑے گا۔

”تو پھر بات وہیں سے شروع کریں جہاں سے
بچھلی دفعہ ہمارے سچ کچھ غلط نہیں پیدا ہوئی تھی۔“ اس نے
رکتے رکتے کہا۔

”ہاں مجھے افسوس ہے کہ میرے منہ سے اس دن
بہت ہی غلط بات نکل گئی مگر پلیز سمجھنے کی کوشش کرو کہ مجھے
اس وقت بہت صدمہ پہنچا تھا جب تم نے اپنی بہن بیٹھنا کے
بارے میں بتایا تھا۔“

”تم شاید نہیں سمجھ سکو کی مگر بعض اوقات جھوٹ کسی کو
دھوکا دینے کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے بھی بولا جاتا ہے
کیونکہ سچائی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اگر تم بھی غربت کی

پچھلی سے پس کر نکلی ہو تیس تو شاید اس بارے میں تمہارا نظریہ
کچھ مختلف ہوتا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اب اس ملک کو ہی دیکھ لو۔ مجھے اس سے محبت
ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں پر سب کچھ ٹھیک نہیں ہے،
بہت سے غلط کام ہوتے ہیں۔ سیاست دانوں اور منشیات
کے اسمگلروں نے اسے جرائم کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ کبھی کبھی
تو یہ سب دیکھنا اور برداشت کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے تو
میں یہاں سے چلا جاتا ہوں مگر پھر اس مٹی کی یاد دلاتی ہے تو
پھر یہاں لوٹ آتا ہوں جیسے کسی محبوبہ سے کچھ دیر کے لیے
ناراضی ہو جائے اور پھر کچھ دنوں بعد ہی صلح ہو جائے۔“

”تمہاری بہن اب کہاں ہے؟“
”میںیں جیکا میں ہے۔ نیوآرک میں کچھ عرصہ
گزارنے کے بعد وہ لندن چلی گئی تھی۔ وہاں پر اس کی
ملاقات اسکرچ نامی ایک لڑکے سے ہوئی۔ غالباً میں نے
جہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ میری ماں کے
چنانچے میں شرکت کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہی جیکا
آئی تھی۔“

”تو کیا وہ ابھی تک تمہارے آبائی گھر میں ہے؟“
”نہیں وہ..... وہاں اُن پہاڑوں پر۔“ اس نے
نیٹکوں پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بہت خوب صورت جگہ ہے۔ بالکل جنت کی
طرح۔ وہاں پر میرے دوست نوکل کا گھر ہے۔ میں اپنی
والدہ کو بھی وہاں لے گیا تھا تا کہ تازہ آب و ہوا میں شاید ان
کی طبیعت بہتر ہو جائے۔ میں جب بھی جیکا آتا ہوں تو وہیں
ٹھہرتا ہوں۔ نوکل بالکل میرے بھائیوں جیسا ہے۔ اس نے
یہاں کی لوک موسیقی کو سننے انداز میں سی ڈیز پر پیش کرنے کا
کاروبار شروع کیا تھا جس میں اسے بہت کامیابی حاصل
ہوئی۔ اب تو وہ بہت امیر کبیر ہو چکا ہے اور زیادہ تر وقت
لندن میں ہی گزارتا ہے۔ مگر یہاں پر بھی اس نے یہ گھر خرید
رکھا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس نے مجھ
خاکسار پر ڈال رکھی ہے۔ حالانکہ اسکرچ اس کا سگا بھائی
ہے مگر نوکل کی ہدایات کے مطابق وہ اس گھر کے آس پاس
بچک بھی نہیں سکتا۔ میں نے جہیں بتایا تھا تا کہ اسکرچ کی
عادات بچپن ہی سے کچھ بگڑی ہوئی ہیں۔“

”اس دن اسٹیپ اینڈ کو کلب میں بھی تم اسی سے
ملنے گئے تھے نا؟“ میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے
ہوئے کہا۔

”ہاں اس لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔“

یائیں اور یہ بھی کہ تم اپنا بل ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں تو بس انہی... پیسوں کا انتظار کر رہی ہوں۔ تصدیق امریکن اسپیشی سے ہو جائے گی اور پھر میں گھر واپس جانے کے قابل ہو جاؤں گی۔ شاید کل اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہو جائے۔“

”مگر وہ شخص؟... لیسی... جس نے تمہیں فون کیا تھا؟“

میں کچھ دیر خاموشی کے بعد بولی۔ ”اس کا کیا؟ اس کو میں دیکھ لوں گی۔“

وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے کچھ ایسی باتیں پتا چلی ہیں جن سے میں تھوڑا پریشان ہو گیا ہوں۔ وہ لڑکا جس نے اس رات کلب میں فائرنگ کی تھی، میں اس کے خاندان کو جانتا ہوں۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنی ماں کے کنٹرول سے باہر ہے۔ وہ برا لڑکا نہیں ہے۔ بس غلط صحبت کا شکار ہے۔ اس کی ماں کی زبانی مجھے پتا چلا کہ وہ کڑی شب جب گھر واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ اس کے پاس ڈھیر سارے امریکی ڈالر تھے جو شاید اسے کسی نے کلب میں فائرنگ کرنے کے لیے دیے تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ فائرنگ کسی کو قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ دراصل قتل سے دھیان ہٹانے کے لیے کی گئی تھی کیونکہ کل فائرنگ کی وجہ سے نہیں ہوئے تھے۔“

”اگر یہ بات سچی تو پھر قاتل کا اصل نشانہ کون تھا؟ لیسی یا پھر وہ جرسن؟“

”پتا نہیں۔ شاید دونوں ہی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”مگر ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”شاید کچھ نہیں یا شاید وہ دونوں ہی کچھ ایسے کام میں ملوث تھے جس کی وجہ سے تعلق بننا ہو مگر یہ بھی ابھی ہم پر کھل نہیں پائی ہے۔“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ”تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلی آتیں؟ وہاں پہاڑوں پر جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ صبح مجھے کچھ کام کے سلسلے میں اپنی بہن کے ساتھ جانا ہو گا بس ایک یا دو گھنٹوں کے لیے۔ تم وہاں آرام کرنا اور پھر میں تمہیں واپس چھوڑ آؤں گا۔ چلو تمہیں بہت اچھا لگے گا۔“

میں سوچ میں ڈوبی رہی کہ اب کیا جواب دوں؟

بازل نے بل ادا کیا اور میری باتوں میں یائیں ڈال کر بولا۔ ”انتاز زیادہ سوچنا صحت کے لیے اچھا نہیں

”کہیں ایسی بات تو نہیں کہ تمہاری پھوٹی بہن اور اہل کا چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کی بے جا جتنی کی وجہ سے اس طرح کے باغیانہ طرز عمل پر مائل ہو گئے ہوں۔ پہلے تمہیں تنگ کرنے کے لیے اور بعد میں شاید انہیں وہ سب کچھ اچھا لگنے لگا ہو؟“ میں نے ان دونوں کی وکالت کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرائے۔

”کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟“

اس نے جواب میں اس طرح کندھے اچکائے جیسے کہنا چاہتا ہو کہ تمہاری مرضی۔

”چلو پھر سی۔ اگلی دفعہ یہاں آئی یا وہ امریکا آئی تو میں اس سے مل لوں گی۔“ میں نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”تو کیا تمہارا یہاں سے جلد ہی کوچ کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ہاں۔“

”تمہارا ویش بیلگ مل گیا؟“

”نہیں ابھی تک تو نہیں۔“

”تو پھر گزارہ کیسے چل رہا ہے؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”بس چل ہی رہا ہے۔ میری ایک دوست جلد ہی مجھ کو رقم بھیج دے گی۔ شاید کل تک۔“

”تو پھر آج رات کا کیا ارادہ ہے؟“

”بس کسی طرح چھپ چھپ کر ہوں مونڈیو بے واپس پہنچوں گی۔“

”چھپ چھپ کر کیوں؟“ بازل نے حیرت سے پوچھا۔

”بس کچھ ہوٹل کے بل کا مسئلہ ہو گیا ہے۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

اس نے پھر سرزنش کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”کتنا بڑا مسئلہ ہے؟“

”پتا نہیں“ میں نے یہاں آتے ہی اپنے کریڈٹ کارڈ کا نقش تو ہوٹل والوں کو دیا تھا۔ اب پھر نجانے کیوں انہیں مزید تصدیق کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

”مجھے لگتا ہے کہ یہاں کی پولیس کو کچھ سن گن مل گئی ہے کہ اس تمام معاملے سے تمہارا کچھ تعلق ہے مگر محسوس ثبوت کے بغیر وہ کسی امریکن سیاح کی اس طرح تفحیک نہیں کر سکتے اسی وجہ سے وہ تمہاری پوری طرح سے چھان بین اور تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا تم واقعی وہی ہو جو تم کہہ رہی ہو

تا۔ پلو دیے بھی میں تمہیں آج رات اس ہوٹل میں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا۔“

☆☆☆

نیلگوں پہاڑوں تک کا سفر بہت خوشگوار تھا۔ سڑک کے کنارے اُسے جنگلی بیڑ پودوں کی خوشبو سے سارا ماحول مہک رہا تھا۔ کہیں کہیں سے سڑک کچھ خراب تھی مگر بازل مہارت سے اپنی جیوی موٹر بائیک چلاتا رہا۔ پھر ایک حویلی نما گھر کے سامنے اس نے موٹر بائیک روکی۔ یہ بہت بڑا گھر تھا جس کی تعمیر و کنٹرین طرز کی تھی۔ تمام اطراف سے خوشنما بیڑ پودوں سے سجایا گھر گرو پرانا دکھائی دیتا تھا مگر لگتا تھا کہ اس کے مالک نے اس کی تزئین و آرائش پر بہت وقت صرف کیا ہے۔ میں بازل کے پیچھے پیچھے اندرونی راستوں سے ہوتی ہوئی گھر کے اوپر ٹیرس پر پہنچ گئی۔ یہاں سے پورے کنکشن شہر کی روشنیاں ایک ستاروں بھری کھکشاں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ٹھوڑی دیر اس سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم اندر چلے آئے اور لاؤنج میں بیٹھ کر میوزک سننے لگے۔ بازل کا دوست ٹوئل کیونکہ میوزک ہی کے بزنس سے وابستہ تھا اس لیے اس نے گھر میں دنیا جہان کی میوزک سی ڈی جمع کر رکھی تھیں۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”ببینا کہاں ہے؟“ تم نے کہا تھا کہ آج کل وہ یہیں ٹھہری ہوئی ہے؟“

”ہاں نہیں، وہ اپنی مرضی سے آتی جاتی ہے۔ مجھے اس کے معمولات کے بارے میں علم نہیں۔ شاید اسکرچ سے ملنے گئی ہو۔ مجھے اس لڑکے سے اس کا میل جول بالکل پسند نہیں۔“ اس نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔

”تمہیں پتا ہے کہ اسکرچ بھی یہاں جسم فروشی کا دھندا کرتا ہے۔ یہاں پر کافی امیر کبیر عورتیں سیاحت کی غرض سے آتی ہیں جو کچھ دیر عیاشی کے لیے اچھے خاصے پیسے دینے کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ اسکرچ ان کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ کافی غلط کاموں میں ملوث ہے جن میں چوری اور نشات کی خرید و فروخت شامل ہے۔ ببینا کو نہیں معلوم کہ وہ کتنے غلط آدمی سے تعلقات بنا کر رہ رہی ہے۔“

”کیا اسی لیے اس کے بھائی نے اس کا یہاں داخلہ بند کر رکھا ہے؟“

”ہاں۔“

”کیا وہ اسے معاف نہیں کر سکتا جیسے تم نے بھی تو ببینا کو معاف کر دیا ہے۔“

”ببینا کا معاملہ اور ہے مگر اسکرچ۔ وہ تو اذلی طور پر

خراب ہے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ٹوئل سے لندن میں ملا تھا تبھی نبجانے ان دونوں کے بیچ کیا ہوا کہ ٹوئل نے اس سے تمام مراسم توڑ لیے۔ میں جانتا ہوں کہ ٹوئل نے بڑی محنت اور لگن سے اپنی عزت اور دولت کمائی ہے۔ وہ کسی بھی قسم کے غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہے۔ شاید اسی لیے وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بھائی کی وجہ سے لوگ اس پر بھی انگلیاں اٹھائیں۔“

پھر ہم نے ٹھوڑی سی ڈرک کی اور وہیں لاؤنج میں ڈانس کرنے لگے۔

میں کافی تھک چکی تھی اور میرے سر میں ہلکا سا درد بھی ہونے لگا تھا۔ میں نے بازل سے سروردی گولی طلب کی اور سونے کی اجازت مانگی۔ اس نے مجھے بیڈ روم تک چھوڑا اور بتایا کہ گولیاں بیڈ کے قریب پڑی ٹیبل کی دراز میں ہیں۔

میں نے سائڈ ٹیبل کی اوپری دراز کھولی تو یہ دیکھ کر کافی حیرانی ہوئی کہ وہاں پر ایک سیاہ رنگ کی چھوٹی سی ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ یہ لوڈ بھی کی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسی سناناں جگہ پر اپنی حفاظت کے لیے ایسا ہتھیار رکھنا شاید ضروری بھی تھا۔ میں نے دوسری دراز کھولی تو سروردی گولیاں مل گئیں جو میں نے دھوئندہ پانی کے ساتھ نگل لیں اور پھر نرم و گداز ماسٹر پر آرام سے سو گئی۔

صبح جب میں سوکر اٹھی تو باہر سے ایک عورت اور ایک آدمی کے اونچی آواز میں لڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے غور سے سننے کی کوشش کی مگر گفتگو کافی حد تک وہاں کی علاقائی زبان میں تھی اس لیے کچھ بول نہ پڑا۔ میں نے اٹھ کر غسل کیا اور اپنے گزشتہ رات والے کپڑے ہی پہن لیے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔

میں تیار ہو کر کمرے سے نکل رہی تھی تو بازل کو باہر ہی کھڑا پایا۔

”تو تم نے ہمیں جھگڑتے ہوئے سن ہی لیا۔“ وہ کھسیانی ہنسی بھرتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا جھگڑا اسکرچ کو لے کر ہی ہو رہا تھا۔ لیکن ناو ببینا پہلے ایسی نہیں تھی مگر اب وہ بہت بدل گئی ہے۔ مجھے تو یہ سب اس اسکرچ کی محبت کا ہی اثر لگتا ہے۔ اب وہ میری کوئی بات سننے اور ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتی۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے؟ بہر حال ہمیں کچھ دیر کے لیے کنکشن جانا ہوگا۔ دراصل وہاں پر ہماری والدہ کی ٹھوڑی سی پراپرٹی اور کچھ بینک میں جمع شدہ پونجی ہے جس کے لیے مجھے اور ببینا کو ایک ساتھ متعلقہ بینک اور دیگر دفاتر میں جانا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ اثاثہ اپنی تینوں بہنوں کے بیچ

میرا بھی دل بے ایمان ہونے لگا کیونکہ سننے میں یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“
”یقیناً ہاں تو تمہیں پیسوں کی کوئی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

”مگر مجھے تو پرانتا پوچھ ڈالنا اچھا نہیں لگے گا۔“
”اچھا تو پھر اسے ایک قرض ہی سمجھ لیتا۔ جب بھی تمہارے پاس اتنے پیسے ہوں تو لوٹا دینا۔ ویسے میرے لیے یہ کوئی بوجھ نہیں ہوگا بلکہ مجھے ایسا کرنے میں خوش محسوس ہوئی۔“

میں نے سوچا کہ اگر زندگی نے جیسا آنے کا ایک موقع دے ہی دیا ہے تو پھر یہاں گھومنے پھرنے اور کچھ سیر و تفریح میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنی کو بھی فون کر کے منع کر دوں گی کہ پیسے نہ بھیجے کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس کے لیے ایسا کرنا کافی مشکل کام تھا۔
”ہاں ٹھیک ہے۔ شاید تم ٹھیک ہی سوچ رہے ہو۔“
میں نے رکستے رکستے جواب دیا۔

پھر مجھے ٹیئرس پر ایک نوجوان لڑکی کھڑی نظر آئی جس کے سیاہ فہر پالے بال چھوٹی چھوٹی مینڈھیوں میں بڑی نفاست سے بنے ہوئے تھے۔ اس کی بازو سے کافی مشابہت تھی مگر ساتھ ہی اس کے چہرے پر عجیب سی کرختگی تھی۔

میں اپنا کافی کاگ ہاتھ میں تھامے اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”گڈ مارننگ۔“ میں نے فضائی میزبانوں جیسی شائستگی اور خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا تم امریکن ہو؟ میرے بھائی سے ملنے آئی ہو؟“ اس نے انتہائی روکھے انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”مگر میں نے تمہارے بارے میں اس کے منہ سے کبھی کچھ نہیں سنا۔ لگتا ہے کہ تم اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہو گی۔“ اس کا لہجہ کافی کرخت تھا۔

”اور تمہارا تو وہ ذکر کرتے نہیں چلتا۔“ میں نے بھی اپنے لہجے میں کرختگی لاتے ہوئے کہا تو وہ تھوڑی سی شرمندہ ہوئی مگر جلد ہی اس کی کرختگی لوٹ آئی۔

”میں تو یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی۔ کتنی گندی اور غلیظ جگہ ہے۔“ وہ ناک سیڑھ کر بولی۔

”مگر یہ تمہارا ملک بھی تو ہے۔ تم یہیں ہل بڑھ کر

مسادی طور پر بانٹ دوں جبکہ بیٹینا سب کچھ اکیلے ہی بڑپنا چاہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ باقی نہیں تو اپنے اپنے گھر دس میں آباد ہیں اس لیے انہیں اس ترکے میں سے کچھ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر یہ تو انصافی کی بات ہے۔“ میں نے لقمہ دیا۔
”ہے تو مگر بیٹینا کو کون سمجھائے۔ خیر آج وہاں جانا تو پڑے گا ہی کیونکہ بیٹینا کل یہاں سے چلی جائے گی۔ ہم ایک یا دو گھنٹوں تک وہاں آجائیں گے۔ تم ٹھہر نہ کرنا۔“
پھر میرے گال پر ہلکا سا بوسہ دے کر بولا۔ ”یہاں گھر کے عقب میں ایک تالاب ہے اور ایک باغیچہ بھی ہے۔ بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔ تم وہاں جا کر آرام کرنا ساری ٹھکان دور ہو جائے گی۔“

”بس زیادہ دیر مت لگانا کیونکہ مجھے امریکن ایمپسی جا کر اپنے سفری پاسپورٹ کا انتظام بھی کرنا ہے اور اس کے بعد یہاں سے جانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”اوہ ہاں تم تو یہاں سے رفو چکر ہونے کا سوچ رہی ہو جبکہ میرا خیال تھا کہ تمہیں ایک دور دراز اور یہاں رکنے کے لیے مثالوں۔“

”اچھا چلاؤ اس بارے میں بھی سوچوں گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہاں آکر تم نے تو پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ ابھی کچھ دیر میرے ساتھ بھی گھوم پھر لیتا۔ میں کنکشن سے واپسی پر ایک گاڑی کرائے پر لے آؤں گا پھر اس میں تمہارے ہوٹل چلے جائیں گے۔ تم وہاں سے اپنا سامان اٹھا لیتا اور پھر ہم ایک دور دراز کے لیے پورٹ اینڈ نیو چلے جائیں گے۔ سمندر کے کنارے بہت ہی خوب صورت جگہ ہے۔ میرا ایک دوست وہاں کے ایک اچھے ہوٹل میں ٹیچر ہے۔ کچھ دیر وہاں سیر سنا کر میں گے۔ پھر مونٹیکو بے اصلی والے بھی جا سکتے ہیں جہاں سب امیر کبیر لوگ چھٹیاں منانے اور سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ میں تمہیں اپنا ملک دکھانا چاہتا ہوں تمہارا تم ایمپسی والوں سے کہہ دینا کہ تمہیں کچھ پرانے دوست احباب مل گئے ہیں اور تم ان کے ساتھ مونٹیکو بے جا رہی ہو وہ تمہارا پاسپورٹ وہیں پہنچا دیں گے۔ پھر تم وہیں سے فلائٹ پکڑ کر واپس جا سکتی ہو۔ ویسے بھی میرے خیال میں تمہیں کنکشن میں اور زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے۔“

وہ جس جوش و خروش سے پلان بنا رہا تھا، اسے دیکھ کر

منظر امام مرتجان مرنج طبعیت کے آدی ہیں۔ بہت کم باتوں کا بڑا سامنے ہیں۔ کئی برس پہلے رفیقہ حیات کا انتقال ہو چکا ہے۔ چند روز قبل دفتر میں بیٹھے تھے۔ نعیم اختر نے خیریت دریافت کرتے ہوئے ان کے بچوں کا احوال پوچھا جو بلوغت سے آگے کھل چکے تھے۔ منظر امام نے فرمایا کہ بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ نعیم اختر نے بیٹے کے بارے میں سوال کیا تو بولے کہ اس کی بھی شادی ہوئے کئی برس ہو گئے۔ پھر ایک گھرا سانس لے کر حسرت سے کہا۔ ”سب کی شادیاں ہو گئی ہیں، بس میں رہ گیا ہوں!“

فییم بولے۔ ”اس عمر میں شادی؟“
 ”ہاں، تو کیا ہوا.....“ انہوں نے جواب دیا۔
 ”میری محنت اور توانائی آج بھی ویسی ہی ہے جیسی تیس
 سال کی عمر میں تھی۔“
 ”یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ فییم اختر کی جرح جاری
 تھی۔

مہر امام نے حسب معمول ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”میرے گھر کے قریب ایک پارک ہے۔ اس میں ایک بڑی سی چٹان ہے۔ میں جوانی میں اس پر طبع آزمائی کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں!“

”کیا آپ وہ چٹان اٹھا لیتے ہیں؟“ حیرت سے پوچھا گیا۔

”جوانی میں اٹھا سکتا تھا، نہ اب اٹھا سکتا ہوں..... صحت اور توانائی جوں کی توں ہے۔“

بڑھایا مگر اس کی بھی لائن ڈیڑھی۔ یہ دیکھ کر میرا ہاتھ کاٹھکڑ
میں نے خوف کو اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا۔ خالی اور
ویران گھر میں مجھے کچھ وحشت سی ہونے لگی تو میں بچن میں
واپس چلی آئی اور کچھ کھانے کے لیے تلاش کرنا شروع کیا
کیونکہ صبح سے میں نے صرف کافی کا ایک کپ ہی پیا تھا۔
ناشا تو بیہینا کی چلی کئی باتوں کی نذر ہو گیا تھا۔

فرج میں کچھ چکن پیٹرو پڑے طے جن کو میں نے
منٹوں میں چٹ کر دیا۔ ساتھ میں جوس پیا اور یوں اپنے
لیے ناشے اور بیج کا بندوبست کر لیا۔ نجانے وہ کس کا کھانا تھا
مگر اب تو میرے پیٹ میں بیج چکا تھا۔ ’موج کرو تھارا‘ میں

”اوہ! اور تم کون ہوتی ہو مجھے حب الوطنی پر بیکھر دینے والی۔ میرے بھائی کی امریکن رکھیل!“ ایک لمحے کو تو میں سی ہو گئی مگر پھر جلد ہی میری آواز لوٹ آئی۔

”میرا تمہارے بھائی سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے اور
 میں اپنے بڑے بھائی کے مہمانوں کے ساتھ تمیز سے پیش
 آتا ہوں۔“

”مجھے تمیز مت سکھاؤ امریکن کُتیا! میں جوتے کی نوک پر رکتی ہوں اپنے بھائی کے مہمانوں کو خاص طور پر تم جیسی عورتوں کو!“

وہ واقعی بہت بدتمیز اور منہ پھٹ لڑکی تھی۔

”بیٹینا چلو! ہمیں ویر ہو رہی ہے۔“ بازل کی آواز آئی تو بیٹینا ہیر پختی ہوئی باہر چلی گئی۔

پیشینا کی تلخ باتوں سے میرا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ بازل اس کے بارے میں سچ ہی کہتا تھا۔ واقعی وہ لڑکی بہت عجیبی ہوئی تھی۔ کتنا فرق تھا دونوں بہن بھائی کے بیچ میں۔

میں نے لود کو سمجھایا کہ ہازل اور اس کی بہن کے
ساتھ لود میں نہیں، ان سے میرا پلچہ لینا نہیں تھا اس
لئے مجھ اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں
تھی۔ پچھتے ہوئے میں نے گھر کے مختلف کمروں کا
ہازہ لینا شروع کیا۔ لاؤنچ، ڈرائنگ اور پھر اینٹک روم
سے ہوتے ہوئے میں کچن میں آگئی۔ کچن کا ایک دروازہ
ہاں ایک کچے کچے راستے کی طرف کھلتا تھا۔ یہ راستے آگے
سبز میوں تک جاتا تھا جن سے چند قدم اوپر ایک چھوٹا سا
ہانچہ تھا جہاں ہر کافی خورد روئے آگے ہوئے تھے۔
یہاں پر ایک سفید سنگ مرمر کی بیچ بھی تھی جو تالاب کے
کنارے لگی تھی۔ اس تالاب کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کافی عرصے
سے اس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ اس میں کافی جھج ہوئی تھی
اور پانی کا رنگ سیاہی مائل سبز ہو چکا تھا۔ وہاں پر پھمروں
کی بھی کافی بہتات تھی۔ کافی گرمی ہونے کے باوجود اس
تالاب میں نہانے یا تیرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
بیچ کے پچھلی جانب کافی درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ پھر
ایک چھکی میرے پیچھے کے اوپر سے گزری جس سے میں
اچھل پڑی اور جلدی سے واپس گھر کے اندر چلی آئی۔ وہاں
میں نے وقت گزارنے کے لیے لی وی یا ریڈیو کی تلاش
شروع کی مگر بے سود۔ میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ

نے اپنے آپ سے کہا اور پھر یکا یک میری نظر مچن کی کھڑکی کی جانب مگنی تو وہاں ایک آدمی کو کھڑے دیکھ کر میں چونک گئی۔ میں نے فوراً مچن کے باہری دروازے کی طرف دیکھا جس کا لاک کھلا تھا پھر جیسے اس نے میری سوچ پڑھ لی ہو، اور اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی جیسے آگے ماتھے تک پہنچ رکھا تھا مگر میں اس کی آنکھیں دیکھ سکتی تھی۔ غلابی اور خوابیدہ سی جن میں کسی شکاری جانور جیسی سرد مہری تھی۔ وہ کافی اونچا لمبا اور توند تھا۔ اس نے جیسے میرے خوف کو محسوس کر لیا تھا۔

”کون ہو تم؟ اور یہاں میرے بھائی کے گھر میں کیا کر رہی ہو؟“ اس نے کافی بھاری اور گرجدار آواز میں پوچھا۔

”اوہ تو یہ اسکرچ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ بیٹینا شاید ایسی لیے میرے یہاں رہنے پر اس قدر برہم تھی۔ اسی نے یقیناً اسکرچ کو یہاں بلا دیا ہوگا۔“

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“ وہ پھر گرجا۔
”اوہ!..... معاف کرنا دراصل تم ایسے اجانک آ گئے کہ میں کچھ ڈرسی گئی تھی۔ میں..... میں بیٹینا مچی دوست ہوں۔“ میں نے کچھ سوچ کر بازل کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔

”میں..... میں امریکا سے آئی ہوں۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

یہ کہتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اسکرچ بھی شاید مجھے بیٹینا کی طرح دھندے والی ہی سمجھ گا اور پھر اس کی نگاہیں جس طرح میرے جسم کے زیر و بم کا جائزہ لے رہی تھیں، مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔

”بیٹینا کی دوست؟ امریکا سے؟ کب آئی ہو؟“ اس نے پولیس والوں کی طرح تفتیشی انداز میں پوچھا۔

”آج صبح ہی آئی ہوں۔“

”مگر آج صبح تو امریکا سے کوئی پرواز نہیں آئی۔“

”وہ..... وہ میرا مطلب تھا کہ میں یہاں آج صبح پہنچی ہوں۔“

اس کو میری بات کا یقین نہ ہوا تھا۔

”تم امریکا میں اسے کہاں ملی تھیں؟“ اس کی تفتیش جاری تھی۔

”نہو آرک میں۔“

”تمہارا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔“

”شاید بیٹینا کے ساتھ ہی کہیں دیکھا ہوگا۔“
”نہیں، نہیں..... میں نے تمہیں کہیں اور دیکھا ہے۔“ اس نے سر جھکتے ہوئے کہا۔

مجھے بھی اب اس کا چہرہ پہلے کہیں دیکھا ہوا لگ رہا تھا۔ خاص طور پر اس کی خوابیدہ آنکھیں۔

”کیا بیٹینا میرے لیے کچھ چھوڑ کر گئی ہے؟“
”نہیں..... نہیں تو۔ وہ تو بس یہی کہہ رہی تھی کہ تم

شاید یہاں آؤ گے۔ اب تم بیٹینا کو تو جانتے ہی ہو کہ وہ کبھی کسی پر اعتبار نہیں کرتی۔“ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ..... وہ اس کی ماں مرگئی تھی! بس اسی سلسلے میں

کچھ کام سے مٹی ہے۔“

”اکیلی؟“

”نہیں کسی بڑے جمین آدی کے ساتھ۔ کہہ رہی تھی

کہ وہ اس کا بھائی ہے۔“

”اوہ! وہ کمینہ۔“

”بھئی میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو بس تھوڑی دیر پہلے

آئی ہوں۔“

اس نے فریج کا دروازہ کھول کر بیئر کی بوتل نکالی اور

پھر اپنے جیکٹ کی جیب سے ایک جیک ٹائف کی طرز کا چاقو

نکالا۔ یہ ایک بہت بڑا اور تیز دھار چاقو تھا جیسا کہ اکثر

شکاری لوگ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ شکار کیے ہوئے جانور کو

کاٹنے اور صاف کرنے کے لیے۔ اس نے چاقو سے بیئر کی

بوتل کو کاٹا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”اچھا تو تم بیٹینا کے ساتھ ہو۔“

”ہاں، ہاں! یہی بتایا تھا میں نے۔“ میں منمنائی۔

وہ ہنسنے لگا جیسے جان گیا ہو کہ میں برابر جھوٹ بولے

جارہی تھی۔ بیئر کی بوتل ایک ہی سانس میں ڈکارنے کے

بعد اس نے خالی بوتل کو مچن سنگ میں چھبک کر چکنا چور کر

دیا۔ اس کے اس وحشیانہ عمل سے میں مزید خوف زدہ ہو گئی۔

”وہ..... وہ میں شاید باہر کچھ بھول آئی ہوں۔“ میں

نے وہاں سے باہر نکلنے کا بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

”دیکھنا کوئی ساپ، چھو نہ کاٹ لے وہاں۔“ وہ

ایسے مسکرایا جیسے مجھے خوف زدہ دیکھ کر اسے بہت لطف آ رہا

ہو۔

میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے تیز قدموں سے

باہر نکل آئی اور پھر مچن کے باہر باغیچے میں رکھے سنگ مرمر کی

بنچ پر جا کر ڈھیر ہو گئی۔ وہ مچن کی کھڑکی سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں بھی اس کی طرف دیکھتی رہی کیونکہ میری دادی کہا کرتی

”مجھے سب پتا چل جاتا ہے۔“ وہ ہڈیانی ہنسی بٹتے ہوئے بولا۔

”یہاں کا پتا اس کالے رنگ کے بیگ میں تھا جسے تمہاری دوست نے میرے ساتھ دیکھا تھا وہاں براؤن کے کمرے میں۔“ اس نے خود ہی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔
”وہ سیاہ رنگ کا ڈفل بیگ؟“ میں نے پوچھا۔
”تم جانتی ہو کہ میں کس بیگ کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ غرایا۔

وہ بیگ جولا نلکہ کے پاس تھا۔ وہ جو اس کے پاس براؤن کے کمرے میں تھا اس میں نے کڑی سے کڑی جوڑنے کی کوشش کی۔

”ہاں وہی بیگ جو اب تمہارے پاس ہے۔ ہنر 57 نے اس جگہ کا پتا ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر اس بیگ میں رکھا تھا۔ پھر وہ حرام زادہ اس کے بارے میں بھول گیا شاید۔ اس رات جب میں براؤن کے کمرے میں پہنچا اور ہم نے اس بیگ کو کھولا تو یہ ٹکڑا اچھے ملا۔ میں نے اسے اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ اس پر کوئی نام نہیں تھا بس ایک پتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ایڈریس میرے کسی کام ضرور آئے گا۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اسی ایڈریس کی مدد سے تمہیں تلاش کر پاؤں گا۔ میرے پاس بس وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ میں اس پتے پر پہنچ گیا تو ضرور اپنی رقم تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ اسی لیے میں جیب چھپا کر پیچھے کے راستے سے گھر میں داخل ہوا۔“ وہ اب بھی بھکارتا شروع ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی ساری قوت مجتمع کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کے ناخن اس کی کلائیوں میں زور سے چھو دیے۔ وہ درد سے بلبلاتا تھا مگر جلد ہی اس نے اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے میرے بالوں پر اپنی گرفت اور مضبوط کردی۔ میری گردن اور سر کی کھال بری طرح دکھ رہی تھی۔ پھر اس نے میری گردن کو ایک زوردار جھٹکا دیا تو ایک بار تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا مگر میں جلد ہی ہوش میں آ گئی۔ وہ ابھی تک میرے بالوں کو پکڑے میری گردن کو پیچھے کی طرف جھٹکا رہا تھا۔

”تم نے سنا نہیں؟ تم نے سنا نہیں میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ مجھے رقم کا پتا بتا دو۔ دیکھو، اب تم خود ہی مجھے تشدد کرنے پر مجبور کر رہی ہو۔“
”اچھا اچھا! بتاتی ہوں۔“ میں نے درد سے کراہتے

کہی کہ پاگل کتے سے کبھی نظر بٹانی نہیں چاہیے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اوسمان اسکرچ پر ہی رہا اور سچ کے پیچھے جھار یوں میں ہوئی سرسراہٹ کی مجھے خبر نہ ہوئی۔

پھر اچانک میرے پیچھے کوئی آن کھڑا ہوا اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر میرا سر پیچھے کی طرف کھینچا۔ اس کے بدن سے پسینے کی بو آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بالکل اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔ میری پیچ بھی جیسے میرے حلق میں ہی کہیں پھنس گئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میرا آخری وقت آ گیا ہو پھر اس کی باریک اور اونچی سی آواز سنائی دی جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔

”دیکھا کہ میں تیری گردن مروڑنے آ ہی گیا۔“ لیسی چلا یا۔ ”تو چاہتی ہے کہ میں تیری گردن توڑ دوں؟ اگر نہیں تو بتا کہ میری رقم کہاں ہے؟ کتنا پریشان کیا ہے تو نے مجھے! اگر اب تو تو میرے قابو میں آ چکی ہے۔ اب بتا کہاں چھپائی ہے میری رقم؟“

وہ ہڈیانی انداز میں پیچ رہا تھا۔ پھر اس نے میرے اوپر گرفت تھوڑی ڈھیلی کی تو مجھے سانس آیا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ جیسے میں نے بازل کے موٹر سائیکل کی آواز سنی ہو مگر پھر وہ آواز تدم ہو کر دب سی گئی۔ میں سوچنے لگی کہ شاید اس نے موٹر سائیکل کھڑی کر دی ہوگی اور گھر کے اندر چلا گیا ہو گا۔ انا یہ صرف میرا وہم تھا مگر میں اتنا جانتی تھی کہ اگر بازل واپس آیا تو مجھے ڈھونڈنے ضرور آئے گا۔

مگر وہاں کوئی بھی نہ آیا۔ اسکرچ بھی نہیں۔ میں نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو اسکرچ اب وہاں پر موجود نہیں تھا۔ میرے بال اب تک لیسی کی گرفت میں تھے۔ وہ اپنی گرفت پھر سے سخت کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو میں تم پر تشدد نہیں کرنا چاہتا مگر میں ایسا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا اگر تم نے مجھے رقم کے بارے میں نہیں بتایا۔ بس میری رقم میرے حوالے کر دو پھر میں اپنی راہ لگوں گا اور تم اپنی راہ لگنا۔ مجھے ویسے بھی خوب صورت عورتوں پر تشدد کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

پھر وہ میرے بالوں کو کھینچ کر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”تم نے سنا نہیں میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں ذلیل عورت! دیکھو اس رقم پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ بس تم مجھے اس کا پتا بتا دو میں وعدہ کرتا ہوں میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”تمہیں یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے راجے ہوئے پوچھا۔

ہوئے کہا ”میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں مگر پہلے مجھے چھوڑ دو پلیز، مجھے چھوڑ دو۔“

اس نے ایک لمحے کو رک کر سوچا اور پھر میرے بالوں کو چھوڑ دیا اور میرے سامنے آ کر گھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر قاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میرا دل تو اس کے منہ پر ٹھوکنے کو جا رہا تھا مگر میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا چپک چپک زودہ چہرہ سینے، دھول اور مٹی سے اٹا ہوا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کی۔

”وہیے تمہارا اس سارے معاملے سے کیا تعلق ہے؟ تمہیں دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ تم جیسی عورت اس قسم کے کام میں ملوث ہوگی۔ تم جیسی نرم و نازک اور خوب صورت عورت کو تو ایسے جھمیوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔ اب دیکھو تم میرے سامنے کیسی بے بس کھڑی ہو۔“ وہ ایسے بولا جیسے اسے میرے ساتھ بہت ہمدردی ہو۔

میں نے سر کو ایسے ہلانا شروع کیا جیسے میں بے ہوش ہوئے لگی ہوں۔

”اوہو اب تم بے ہوش مت ہو جانا۔ پہلے مجھے رقم کا پتا بتا دو پھر جو چاہو کرنا۔ ہوش میں رہنا خواہ بے ہوش ہو جانا۔“

پھر میں گرنے لگی۔ وہ مجھے سہارا دینے کے لیے بڑھا۔ میں نے رک کر ایسی شکل بنانی شروع کی جیسے میں الٹی کرنے لگی ہوں۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”ارے رے یہ کیا ہو گیا نہیں؟“

وہ تالاب کی جانب پیچھے ہٹ گیا تھا اور اس کے ہاتھ نیچے تھے۔ مجھے اسی موقع کی تلاش تھی۔ میں نے دہرے ہوتے ہوئے اس کے پیٹ پر اپنے سر سے ایک زوردار ٹکڑا مارا اور پھر ایک زوردار لات اس کی ٹانگوں کے درمیان نازک حصے پر۔ درد کی شدت سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے اس پر ٹکڑا، گھونٹوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ وہ تالاب میں گرنے والا تھا مگر اچانک کمال پھرتی سے اس نے اپنا توازن بحال کیا پھر میری ایک لات نے اسے تالاب کے کنارے چاروں خانے چت کر دیا۔ میں لپک کر اس کی پشت پر سوار ہو گئی۔ میرا ایک گھٹنا اس کی کمر پر اور دوسرا اس کے دونوں شانوں کے بیچ لگا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میرے ڈرا سے گھٹنے پر زور دینے سے اس کی ساری کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ وہ مکمل طور پر میرے

قابو میں آچکا تھا۔ میرے اندر چھپی پولیس والی پوری طرح بیدار ہو چلی تھی۔ اب تشدد کرنے کی باری میری تھی۔

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ تالاب کے گندے پانی کے نیچے دھکیل دیا۔ جب تھوڑی دیر بعد اس کا سر باہر نکلا تو وہ چیخا۔ ”کینی عورت! تو ایسا کیوں کر رہی ہے؟“

وہ اپنا سر کسی پھینکے کتے کی طرح دائیں بائیں جھکنے لگا۔ اس کے منہ سے گندہ پانی اور رال بہہ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کا سر پانی کے نیچے دھکیلا جب باہر نکلا تو وہ چیخنے پلانے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“

”اوہو اب جناب کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور جو میرے بالوں کا حشر کیا تم نے حرام زادے۔“ یہ کہتے ہی میں نے اسے تالاب کے گندے پانی میں ایک اور غوطہ دیا۔

”یہ مجھے فون پر ڈرانے دھکانے کے لیے۔ میرا اس تمام معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو بس ہوٹل میں ان لوگوں سے ملی تھی اور ان کے اصرار پر ان کے ساتھ گھومنے چلی گئی مگر پھر وہ ایک ایک کر کے مرنے چلے گئے۔ میرے پاس تمہاری رقم نہیں ہے نہ مجھے اس رقم کو حاصل کرنے کی خواہش ہے اور نہ ہی میں اس کے متعلق کچھ جانتی ہوں۔ میں نے تو اس رقم کی جھلک تک بھی نہیں دیکھی۔“

میں نے اس کے سر کو پانی کی سطح سے ذرا بلند کرتے ہوئے کہا پھر ایک اور غوطہ دیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے لالکے کے ساتھ جو کچھ کیا، یہ اس کے لیے ہے۔“

”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہہ رہا ہوں کہ مجھے لالکے نام کی کسی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔“ وہ پانی ٹھوکتے ہوئے بولا۔

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ تالاب کا گندہ پانی اس کے ناک اور منہ سے نکل رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کا سر تالاب کے کنارے دے مارا۔ اب اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ تاکہ میں انہیں دیکھ سکوں۔“

میں نے ٹھکانا انداز میں کہا۔

”پلیز مجھے چھوڑ دو۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔

”اچھا اب مجھے کینی اور حرام زادی کے القابات سے نہیں بلاؤ گے کینی؟“ میں نے اس کے بالوں پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

قصہ ابلیس

میں بھی وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد میرا اس سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ اس رات جب اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی تو میں جان بوجھ کر انکار کر دیا۔

اس نے ایک بار پھر بھانسنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ میری گرفت اس پر بہت مضبوط تھی۔

”مجھے چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ دیکھو اگر میں تمہیں مارنا چاہتا تو اسی وقت تمہاری گردن تو زسکا تھا مگر میں خوب صورت عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔“

”ہاں بس ان کے بال نوچے ہو۔ چلو اب یہ رقم کا قصہ بتاؤ۔ یہ کیا چکر ہے؟“

”کیا جاننا چاہتی ہو تم؟ اگر تمہیں رقم کے بارے میں کچھ نہیں پتا تو یہ سب جاننا تمہارے لیے کیوں اتنا اہم ہے؟“

”کیونکہ وہ آدمیوں اور ایک عورت کا قتل ہو چکا ہے اس رقم کی وجہ سے۔“

بازل ٹھیک ہی کہتا تھا کہ میں اپنے اندر کی پولیس والی سے کبھی اپنا دامن نہیں چھڑا پاؤں گی۔ سچ، غلط، جرم، سزا اور انصاف کا حصول یہ سب میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

”وہ رقم کس کام کے لیے تھی؟“

”مجھے کیا پتا، کوکین، جس یا پھر کوئی اور نشیات۔ اسی کام کے لیے ہوئی۔ آج کل میکسیکو اور کولمبیا کو چھوڑ کر زیادہ تر لوگ بریکاکا ہی رخ کرنے لگے ہیں ان تمام اشیاء کے لیے۔“

”اور مینز کس سے ملے جا رہا تھا؟“

”میں نے بتایا نہ کہ وہ امریکا سے آیا تھا اور کسی شخص سے اسے وہاں کلب میں ملنا تھا مگر تبھی وہاں پر فائرنگ شروع ہو گئی اور پھر کچھ کچھ ہو گیا۔“

”تم اس جرم میں مینز کو کافی عرصے سے جانتے تھے؟“

”تم تو بالکل پولیس والوں کی طرح سوال جواب کرنے لگی ہو۔ تمہیں بتایا نہ کہ میں مینز 57 کو کچھ عرصے سے جانتا تھا۔ انہی کا میں چند سال قبل ملاقات ہوئی تھی مگر یہاں پر زیادہ لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ مینز نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ میں ایسے ہی ایکٹنگ کروں جیسے ہم دونوں اجنبی ہوں۔ اس کے خیال میں یہی بہتر تھا۔ وہ اس رات اس شخص سے صرف بات چیت کرنے کے لیے گیا تھا اور مجھے ساتھ میں اپنی حفاظت کے لیے لے گیا تھا۔ اب یہاں پر کسی کی کمی ہوئی بات پر مکمل

”اچھا چلو اب مجھے سب کچھ سچ بتاؤ۔“ میں نے گرجتے ہوئے حکم دیا۔

”کیا؟ کیا جاننا چاہتی ہو تم؟“

”سب کچھ ایہ مینز 57 کون ہے اور یہ پیسوں کا چکر

آخر ہے کیا؟“

”مینز 57 نے ہی اس کا لے ڈفل بیگ میں وہ پیسے رکھے تھے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”اور یہ مینز 57 کون ہے؟“

”تھا۔ اب وہ مر چکا ہے۔ اس کا یہی نام تھا۔ کم از کم اس نے مجھے تو اپنا یہی نام بتایا تھا۔“

”مگر وہ کون تھا؟“ میری تفتیش جاری تھی۔

”وہ وہی جرم گور تھا جسے تم نے اس رات کلب

میں دیکھا ہوگا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا تھا جب تم براؤن اور ان دوسرے لوگوں کے ساتھ کلب میں آئی تھیں۔“

میں نے اس رات ہونے والے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی، وہی سنہری بالوں والا نوجوان ہوسکا تھا جو لسی اور اس سفید ہڈ والی جیکٹ والے کے درمیان بیٹھا

تھا۔ اس کے پاس ہی ایک سیاہ ڈفل بیگ پڑا تھا۔ اس وقت بھی مجھے اس کلب میں اس سیاہ بیگ کی موجودگی کچھ عجیب سی لگی تھی۔ جیسے اس کا مالک جلد ہی نہیں دور جانے والا تھا۔

”تم اس مینز 57 کو کیسے جانتے تھے؟“

”ہم نے کچھ عرصہ قبل ساتھ ہی کچھ کاروبار کیا تھا۔ ابھی ایک ہفتے پہلے وہ مجھے ٹیکرل میں ملا تھا۔ اسے میری مدد

درکار تھی۔ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک کام کے سلسلے میں امریکا جا رہا ہے اور پھر اسی ہفتے اس کو جیکواہل آنا تھا۔ وہ کوئی ضروری

چیز انگلشٹن میں کسی کو دینے جا رہا تھا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا تاکہ تمام معاملہ آسانی سے منٹ جائے۔

اس کے لیے وہ مجھے وہ ہزار ڈالر دینے کو تیار تھا۔ میں مان گیا۔ بس اسی وجہ سے ہم اس رات وہاں کلب میں گئے

تھے۔“

”وہاں تم کس سے ملنے گئے تھے؟“

”مجھے کیا معلوم کس سے ملنا تھا اُسے۔“

”سچی لی کہہ رہا تھا کہ وہ تم سے پہلے ملا ہوا تھا۔ کیا تم اُسے جانتے تھے؟“

”ہاں میں اسے کافی پہلے سے جانتا تھا۔ ان دنوں ہم اسے صرف ’ٹی‘ کہا کرتے تھے پھر میرے ساتھ کام کرنے

والے ایک لڑکے نے بے ایمانی سے سچی لی کا کچھ مال اُڑا لیا اس ارے کہ سچی لی سارا الزام میرے سر نہ دھر دے

تھا۔ میں صبح جب اُس سے وہ بیگ واپس لینے پہنچا تو میرا خیال تھا کہ اس میں سے کافی رقم میں براؤن کو دے دوں گا مگر جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کسی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کام یقیناً تم لوگوں میں سے کسی کا تھا۔ وہ لڑکی لائلہ! جو تصویریں سچج رہی تھی وہ بھی تو وہاں موجود تھی جب میں اور براؤن بات کر رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ نہ ہو رقم اسی کے پاس ہوگی۔ میں اس کے ہوش پہنچا اور اس کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ اس کے کمرے میں پولیس آئی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس نے وہ رقم والا بیگ تمہارے پاس رکھوا دیا ہوگا کیونکہ تم بھی تو اس کے ساتھ تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ شاید اس کام میں تم بھی اس کے ساتھ شریک ہو۔ تمہارے بارے میں اسی نے مجھے بتایا تھا۔“

”تو کیا لائلہ وہیں موجود تھی جب تم نے براؤن کو وہ بیگ دیا اور اس پیسے کے متعلق بتایا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا مگر میں جان چکی تھی کہ یقیناً لائلہ وہیں موجود تھی، اُس نے وہیں پر اس بیگ اور اس میں رکھی رقم کو دیکھا تھا۔ مجھے اسی وقت اس کی باتوں میں جھوٹ کی ٹھنک سنائی دی تھی جب اس نے مجھ سے آنکھیں چرائی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ براؤن نے رقم کہاں رکھی تھی کیونکہ جس شخص نے بھی براؤن کا قتل کیا تھا، وہ رقم اسے نہیں ملی تھی۔ اسی لیے لائلہ پہلے تو ڈر کر وہاں سے بھاگ کر آگئی تھی مگر رقم کی کشش نے اسے براؤن کے کمرے میں دوبارہ جانے پر مجبور کیا اور اس کے لیے اس نے میرا سہارا لیا۔ حیرت کی بات تو یہ بھی تھی کہ اس رقم پر نہ تو براؤن کا کوئی حق تھا، نہ لائلہ کا اور نہ ہی پولیس کا۔ مگر لائلہ اور براؤن کی موت کی وجہ وہی رقم تھی۔“

”مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ اگر تم میں سے کسی کے پاس بھی وہ رقم نہیں ہے تو پھر آخر اتنی رقم کئی کہاں؟ اور عس کے پاس؟“ لیسٹی چنچا۔

”کسی نہ کسی کے پاس تو ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”شاید گھوم گھام کر واپس اسی شخص کے پاس جس سے ملنے ہنز جا رہا تھا۔ جس کی رقم وہ بھی۔ وہی شخص جس نے ایک غریب لڑکے کو پیسے دے کر اس رات وہاں کلب میں فائرنگ کروائی تھی تاکہ وہ ایک ایسے مہرے کا کام تمام کر سکے جس کی اب اسے کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تم ہی وہ بیگ لے کر بھاگے تھے اور شاید اسے براؤن کے ٹھکانے کا بھی پتا چل گیا تھا کیونکہ اس وقت وہ

یقین تو نہیں کیا جاسکتا مگر میرے ساتھ اس کی یہی بات ہوئی تھی۔ پھر وہاں پر براؤن اور تم سب لوگ آگئے اور پھر اس چھوٹی حرافہ نے تصویریں پھینچی شروع کر دیں۔ میں وہاں کسی تصویر میں ہنز کے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا پھر جیسے ہی وہاں پر گولیاں چلتی شروع ہوئیں اور اندھیرا ہو گیا تو میں نے وہ پیسوں والا کالا ڈفل بیگ اٹھایا اور وہاں سے روفو چکر ہو گیا۔“

اس کی کہی ہوئی باتوں میں کافی ستم موجود تھا مگر مجھے پھر بھی لگا کہ وہ کافی حد تک سچ ہی بول رہا ہے۔

”تو تم نے اس جرمن گورے کو قتل کیا اور پھر اس کا پیسوں سے بھرا بیگ لے کر بھاگ گئے۔“ میں نے کرختگی سے پوچھا۔ حالانکہ لیسٹی کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ اس جرمن کا پاسی کا بھی قتل کر سکتا تھا۔

”نہیں نہیں میں نے کسی کا قتل نہیں کیا۔ وہ تو جب گولیاں چلتی شروع ہوئیں تو اس کے چند لمحوں بعد ہی میں نے ہنز کو مارتے ہوئے دیکھا۔ وردا زے سے آتی بدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ہنز کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ اس کے نیچے گرنے سے وہ بیگ پھسل کر میرے پیروں کے قریب آ گیا تھا۔ میں اسے اٹھا کر وہاں سے بھاگ گیا پھر میں براؤن کے ہوش گیا اور وہ بیگ اس کے پاس رکھوا آیا۔“

”ظہر و ظہر! تمہارا مطلب ہے کہ اس رات تم ہی براؤن سے ملنے گئے تھے اور وہ رقم سے بھرا تھا اس کے پاس رکھوا آئے تھے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔“

”کتنی رقم تھی اس بیگ میں؟“

”کافی زیادہ۔ میں نے تو اپنی ساری زندگی میں اتنی رقم نہیں دیکھی تھی۔ صرف نقدی نہیں تھی بلکہ کچھ ہیرا ہانڈ بھی تھے جو کہ کافی زیادہ مالیت کے تھے۔“

”تم وہ بیگ براؤن کے پاس کیوں چھوڑ آئے؟“

”کیونکہ شہر کے جس علاقے میں، میں رہتا ہوں وہاں اتنی رقم اپنے ساتھ لے کر گھومنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ اس جرمن گورے کو بھی حفاظت کے لیے میری ضرورت پڑی تھی۔ میری حفاظت کے لیے کون تھا؟ براؤن کو میں بہت پہلے سے جانتا تھا، وہ میرے بھائیوں کے جیسا تھا۔ میں اس پر اعتبار کر سکتا تھا۔ میں نے وہ بیگ براؤن کے پاس صرف رات بھر کے لیے رکھوا دیا تھا۔ میرے سامنے اس نے وہ بیگ ایک الماری میں رکھ دیا

”تم جانتے ہو کہ میں کس لیے آیا ہوں۔“ اسکرچچ نے آرام سے کہا۔

اسکرچ نے لیسی کی جانب ایسے دیکھا جیسے اسے اس کی آواز سنائی نہ دی ہو۔

”کیا کہتا تم نے؟ میرے پاس وہ رقم نہیں ہے۔“
اب وہ ہمارے بالکل پاس آچکا تھا مگر وہ چالاک تھا
اس لیے تالاب کے سامنے نہیں کھڑا ہوا تاکہ ہم میں سے
کوئی اسے وہاں دھکا نہ دے۔
”میں اپنی رقم لینے آیا ہوں۔“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے تمہاری رقم کے بارے میں کچھ نہیں۔“ ایسی گڑبڑ اُپا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کسی طرح پیچھے والی جھاڑیوں تک پہنچ جاؤں تو شاید وہاں سے بھاگ کر گھر سے پیچھے اور پھر باہر جاسکتی تھی مگر سڑک کی آنکھیں کسی شکاری کی طرح ہم دونوں پر بھی ہوئی تھیں جو بھی پہلے حرکت کرتا اس کی موت یقینی تھی۔

میں نے اسکرینچ کے بارے میں کچھ اور بھی اندازہ لگایا۔ ایک تو یہ کہ اسے لوگوں کو خوف زدہ کرنے میں لطف آتا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسا شکاری تھا جو کسی بلی کی طرح پہلے اپنے شکار سے ٹھیکتا تھا اور پھر اسے ادھ موا کر کے آرام سے شکار کرتا تھا شاید ایسا کرنے میں بھی اسے لطف آتا تھا۔

”مجھے بتاؤ میری رقم کہاں ہے؟“ اسکرینج جذبات سے عاری آواز میں بولا۔

”تمہیں بتایا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ لیسی پھر گڑگڑایا۔

”تم وہی ہونا جو اس رات کلب میں ہینر کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“ اسکرینچ پسی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اوہ تو وہ تم تھے جسے مینز اس رات ملے کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم وہی ہو مگر.....“ پھر لسی نے اپنا سر جھکا کر رامت بھرے لہجے میں کہا۔ ”مینز رقم تمہی کو دینے جا رہا تھا، ہے نا؟ معاف کرنا، مینز کے مرنے کے بعد میں نے وہ قفل بیگ وہاں سے اٹھالیا تھا مگر اب وہ رقم میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو..... مگر وہ رقم اب تو تمہارے پاس ہی ہونا چاہیے۔“ پھر

وہیں جو تھا جب براؤن نے اپنے ہوش کا نام اور کرے
 کا نہر تمہیں بتایا تھا پھر وہ اپنی رقم تلاش کرتے براؤن کے
 کمرے میں جا پہنچا اور اس کا قتل کر دیا۔ شاید وہیں سے
 اے اٹلک کا ٹھکانا بھی معلوم ہو گیا ہو گا اور پھر اس نے اسے
 ہی قتل کر دیا۔“

نہیں جب اپنا ماہرانہ تجزیہ ایسی کے گوش گزار کر رہی تھی تو اس وقت اسکرچ بچن سے باہر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں ایسی کی پشت پر سے اتر آئی اور وہ بھی لکھڑکھاتا ہوا میرے قریب کھڑا ہو گیا اور اسکرچ کو ہمارے پاس آتا دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور اس کی غلائی خوابیدہ آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ کسی خون آشام درندے کی طرح۔

اس کی وہ خوابیدہ شیطانی آنکھیں دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ اس رات اسٹیپ اینڈ گو کلب میں یہی تھا جسے دیکھ کر میں ٹھنک گئی تھی پھر مجھے اس کے سارے کارنامے یاد آئے اور میں چپ سادھے اسے اپنی طرف آتے دیکھتی رہی۔ جیسے اس نے مجھ پر کوئی سحر پھونک دیا ہو۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو اپنی ٹانگ پر ہلکے ہلکے ایسے مار رہا تھا جیسے کسی ناندیدہ دھن کو یاد کر کے طبلہ بجا رہا ہو۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا جس کا پھل دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس قانون ہی کا نظر آ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور پینے کے قطرے میرے ماتھے سے پھسل کر میری آنکھوں کو دھندلانے لگے۔ اسگریج کی جنونی آنکھوں میں شیطانیت رقصاں تھی اور موت کے سائے لہرا رہے تھے۔ مجھے ہانا گرانٹ کی بات یاد آئی کہ اس نے اس جرم منہجر کا قتل کس بہیمانہ طریقے سے کیا تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ کر اس کے پیچھے میں دھنسن گئی تھی۔ مجھے براؤن اور لائل کا بھی خیال آیا اور۔۔۔ تھمال بروم کا بھی۔

اسکرچ ہمارے بالکل قریب آ چکا تھا۔ یہی کی سانس
بہا تیز تیز چلتی شروع ہو گئی تھی۔ اس کی ناک سے بدستور
خون بہہ رہا تھا۔ اس نے خون کو اپنے ہاتھ کی پشت سے
صاف کرنے کی کوشش کی تو غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ
میرے بازو سے ٹکرا گیا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ شاید
وہ بھی اس بات کا اندازہ کر چکا تھا کہ اس کا دہلا پتلا وجود
اسکرچ جیسے دیو قامت انسان سے مقابلہ کرنے کے قابل
نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ اپنے سارے
گناہوں کا لمبا میرے اوپر ڈال کر اپنی جان بچانے کی
کوشش ضرور کرے گا۔

”میرے پاس اب تمہاری کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔“ لیسی مسلسل رورہا تھا۔ اس کی آنکھیں اسکرچ کے ہاتھ میں پکڑے چاقو پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکرچ نے چاقو لیسی کی ناک کے نیچے رکھا اور دھیرے سے سکرایا۔

”میری بات کا یقین کرو اگر تم میرے پاس ہوتی تو اب تک میں تمہیں دے چکا ہوتا۔ وہ مجھ سے کسی نے چرا لی۔“ لیسی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”کس نے چرا لی؟ کہاں ہے میری رقم؟“

”یہ اس نے! اس کتیا سے پوچھو کہ رقم کہاں ہے۔“ لیسی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی کتیا اس رات ان سب کے ساتھ تھی۔ اس نے خود ابھی مجھے سب کچھ بتایا ہے کہ رقم کہاں اور کس کے پاس ہے۔ میرے بھائی یقین کر دو کہ تمہاری رقم میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ رقم تمہاری ہے۔ وہ تو جب ان لوگوں نے فارنگ کر کے اس رات کلب میں بلب توڑ دیے تھے اسی وقت میں نے دیکھا کہ ہینز کی لاش میرے قدموں میں پڑی تھی، میں اسے جانتا تھا۔ وہ میرا دوست تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس بیگ میں کافی رقم موجود تھی۔ تو بس میں نے وہ بیگ اٹھا لیا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ رقم تمہاری ہے تو بھی اس بیگ کو ہاتھ تک نہ لگاتا۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی مگر یہ سب نادانی میں ہوا۔ پلیز خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

کتیسی بذاتی انداز میں مڑ مڑا رہا تھا اور اپنی جان بخشی کی ہیک بائک رہا تھا۔

”یہ..... یہ کتیا جانتی ہے کہ رقم کہاں ہے۔ میں بھی اس سے یہی پوچھ رہا تھا مگر یہ مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ تم جانتے ہو نا کہ یہ یقین زادیاں کیسے ناک کرتی ہیں مردوں کو بے وقوف بنانے کے لیے۔ تم اسی سے پوچھ لو نا کہ رقم کہاں ہے۔ یہ سب جانتی ہے۔“

پھر یک دم وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا جیسے اس نے اسکرچ کی آنکھوں میں کچھ پڑھ لیا ہو۔ کچھ ایسا جو میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اسکرچ کی دنیا میں کمزور اور غدار قسم کے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ خواہ وہ غداری کسی دشمن کے ساتھ یہ کیوں نہ کی جائے۔ یہ ان لوگوں کا اصول تھا جو کسی اور اصول اور قاعدے کو نہیں مانتے اور لیسی میرے ساتھ غداری کر رہا تھا۔

لیسی کے قدم ڈمگانے لگے۔ اس کی آنکھیں ابھی

میری طرف اشارہ کر کے لیسی بولا۔

”رقم جس کی تھی اس کے پاس پہنچ چکی ہے مگر تمہارے پاس بھی اگر رقم نہیں ہے تو پھر..... مگر میری بات کا یقین کرو تم اب میرے پاس نہیں ہے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

لیسی اب اپنی زندگی کی ہیک بائک رہا تھا پھر وہ اپنے کھٹنوں پر گر گیا۔ اس کی پٹنی پٹنی آنکھیں یہاں وہاں گھوم رہی تھیں۔

میری نظر اسکرچ کے بیان کے اوپر لگے خون کے دھبوں پر پڑی۔ مجھے بازل کا خیال آیا۔ اگر وہ اب اس آیا ہوگا تو ضرور مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اب تک تو اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کہیں یہ دھبے بازل کے خون کے تو نہیں تھے؟ یہ سوچ کر ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ اسکرچ کچن کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا مگر پھر وہ وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ کیا اس نے بھی بازل کے آنے کی آہٹ سن لی تھی اور پھر..... اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکی۔ کیا واقعی اسکرچ نے بازل کا خون کر دیا تھا؟

مجھے اپنا آپ بے بس اور مجبور سا لگنے لگا تھا مگر پھر بھی میں نے اسکرچ پر اپنے خوف کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور شاید یہ نفرت ہی مجھے اس کا سامنا کرنے کی جرأت دینا نہ بھی عطا کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کیسے نے بازل کو قتل کر دیا ہے تو اب میں اس کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے تو اب اپنی ساری قوت اپنا دفاع کرنے اور اپنی جان بچانے کے لیے استعمال کرنی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ میرے بھائی جونی نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اپنا خوف اور کمزوری کبھی اپنے حریف پر ظاہر نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ طاقت کی ہی طاقت تعلیم کرتی ہے۔ دور غلامی میں بھی جو غلام طاقتور اور مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے تھے ان کو عام طور پر اتنا نہیں مارا پٹا جاتا تھا جتنا کہ کمزور اور جلد خوف زدہ ہو جانے والے غلاموں کو۔ وہ غلام جن میں کوڑوں کا خوف ان کی عزت نفس پر حاوی ہو جاتا تھا۔ وہ تو کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ہار چکے ہوتے تھے۔

میں نے جونی کی کبھی بات یاد آتے ہی اسکرچ کی طرف بے خوفی اور جرأت رندانہ کے ساتھ گھورتا شروع کیا۔

قصص ابلیس

طرح توڑا کہ اس کا ایک بڑا ٹکڑا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ کافی تیز دھار کا تھا اور بوقت ضرورت چاقو کی طرح استعمال کیا جاسکتا تھا۔

اسکرچ پچن کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے دروازہ لاک توڑ دیا تھا مگر وہ لکڑی کا پرانا دروازہ اسکرچ کی دو تین لاتوں کی مار سے زیادہ نہ تھا۔

پچن کا دروازہ اسکرچ کی تیسری یا چوتھی کک پر چرچاہٹ کے ساتھ ٹوٹ گیا اور اسکرچ بڑے اطمینان کے ساتھ پچن میں داخل ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرایا۔

”اچھا تو تم میرا مقابلہ اس سے کرو گی؟“ اس نے میرے ہاتھ میں پڑے کاٹج کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے تمہارے دوست کا کیا حشر کیا؟ کیا تم واقعی یہ سوچتی ہو کہ تم میرا مقابلہ اس چھوٹے سے کاٹج کے ٹکڑے سے کر سکتی ہو؟ کان کھول کر سن لو کہ میں یہاں اپنی رقم حاصل کرنے آیا ہوں اور اسے حاصل کر کے ہی دم لوں گا۔ تمہارے عاشق سے بھی میں نے یہی کہا تھا۔“ وہ کس دوست اور عاشق کی بات کر رہا تھا؟ کیا اس سے اسکرچ کی مراد بازل تھا؟

”تم اس کے بارے میں جانتا چاہتی ہو تو بس یہاں پر گرے خون کی لکیر کی سیدھ میں چلتی جاؤ۔ تم اس تک پہنچ جاؤ گی۔“

میں نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا۔ بازل ضرور واپس آ گیا ہوگا اور اس نے میرے بارے میں دریافت کیا ہوگا۔ مجھے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اسکرچ اور بازل کا ضرور آمناسامنا ہوا ہوگا۔ اسکرچ کے ہاتھ میں پڑے خون آلود چاقو کو دیکھ کر میرے دل میں ایک بار پھر وسوسوں نے جنم لیتا شروع کیا۔ میں رونا جا رہی تھی مگر میں نہیں جانتی تھی کہ اسکرچ میرے آنسوؤں کو دیکھے۔ میں جی کڑا کر کے ایک بار پھر اسکرچ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے نہایت سردہری سے گھورتی رہی۔

”تم مجھ سے لڑنا چاہتی ہو؟ تو چلو لو مگر پھر جب لڑائی ختم ہو گی تو تمہیں میری بات ماننی پڑے گی اور جو مجھے چاہیے وہ دینا پڑے گا۔“

پھر یک دم مجھے سمجھ آ گیا کہ میں اس عفریت پر کیسے قابو پاسکتی تھی، کیسے اس پر سبقت حاصل کر سکتی تھی جس طرح میں نے ایسی کی کمزوری کا اندازہ لگا کر اسے زیر کر لیا تھا

تب اسکرچ کے ہاتھ میں تھا سے چاقو پر نگی ہوئی تھیں مگر اسکرچ نے اس کا استعمال نہ کیا۔

کوئی پیشگی وارننگ دیے بغیر اسکرچ نے ایک ہی جھٹکے میں ایسی کی گردن موز کر اس کی گردن کا مٹکا توڑ دیا۔ کسی ماہر جینجو یا سنگ دل جلا دی طرح۔ بس ایک ہی وار میں کام تمام۔ ایسی کی آنکھیں اب بھی ویسے ہی پھٹی ہوئی تھیں اور ان میں خوف کے سائے چھائے ہوئے تھے مگر ان میں زندگی کی کوئی رقم باقی نہ رہی تھی۔ وہ کسی ایسی پستی کی طرح میرے پیروں کے پاس آگرا جس کی ڈوریاں کاٹ دی گئی ہوں۔

میرے ذہن کی ہر سوچ جیسے جم سی گئی۔ ہر سمت خاموشی تھی۔ ہر طرف موت کا سناٹا چھایا تھا۔ اسکرچ نے میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں قاتلانہ قفا تھا۔ اس کی آنکھیں سانپ کے جیسی تھیں۔ ہماری پوٹے اور برف کی طرح سرد۔ شاید اس آدی کی آنکھوں سے بھی زیادہ سرد جس کا ابھی ابھی اس نے قتل کیا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ کب مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ میں جانتی تھی کہ اس وقت ذرا سی بھی حرکت میرے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اسے ایسے ہی گھورتی رہی جیسے آپ کسی پچن پھیلائے ہوئے ناگ کو دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کب آپ پر حملہ آور ہوگا اور ڈس لے گا۔

اسکرچ نے ایسی کی طرف دیکھا اور جھک کر اس کے بے جان چہرے کو چھوا اور پھر اس کی گردن کو جیسے کچھ ہی لمحے پہلے اس نے توڑ کر زندگی سے اس کا ناجی توڑ دیا تھا۔

میں نے وہ موقع غنیمت جانتے ہوئے دوڑنا شروع کیا اور بھاگتے ہوئے پچن تک پہنچ گئی۔ دروازہ لاک نہیں تھا اور میں تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ اسکرچ میرے پیچھے بڑے آرام سے چلا ہوا آ رہا تھا جیسے وہ اس بلی جو ہے کے کھیل سے بہت لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس کے چہرے پر پھیلی شیطانی مسکراہٹ اس بات کی غمازی کر رہی تھی۔

میں نے پچن میں اپنے دفاع کے لیے کوئی شے ڈھونڈنی شروع کی مگر بدحواسی میں کوئی چھری یا چاقو نہ ملا۔ وہاں پر کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں چھپ کر میں اپنی جان بچا پاتی پھر میری نظر پچن سنگ میں پڑی بیڑی کی بوتل کے کاٹج کے ٹکڑوں پر پڑی جسے اسکرچ نے وہاں پھینک کر توڑ دیا تھا۔ ان ٹکڑوں میں بھی کوئی اس قابل نہیں تھا جسے بطور ہتھیار استعمال کیا جاسکتا۔ میں نے فریج سے بیڑی کی ایک اور بوتل نکالی اور اسے پچن سنگ کے کنارے پر پٹخ کر اس

بالکل اسی طرح مجھے اسکرچ کو مات دینے کا طریقہ بھی سمجھ آ گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے اپنی کامیابی کی دعا مانگی۔

ساتھ ہی ساتھ میں نے بتا مزاحمت کے اسکرچ کو اپنے قریب آنے دیا جیسے کہ میں اس کی مردانگی سے بہت متاثر اور مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے قریب آ کر میرے جسم پر دیر سے دیر سے ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ میں نے ہلکی سی مزاحمت کے بعد اس کے آگے ہتھ پڑا ڈالنے کا ناک کیا۔ اس نے کالچ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اگرچہ اندرونی طور پر مجھے اس کے اس طرح چھوئے سے بہت گھن آ رہی تھی مگر میں اس پر یہ ظاہر کیے بغیر ایسے ہی ناک کرتی رہی جیسے مجھے اجنبی مردوں سے اس طرح جسمانی تعلقات بنانے میں کافی تجربہ حاصل تھا۔ مجھے یاد تھا کہ اسکرچ نے پہلی ملاقات میں مجھے دھندلا کرنے والی جسم فروش عورت ہی سمجھا تھا۔ اب میں اس کے آگے ایسے ہی پیش آ رہی تھی جیسے کوئی پیشہ ور فاحشہ ہو۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پھر میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے پاس ہے۔ سارا مال تمام وقت میرے پاس ہی تھا۔“

”تم تو بڑی کھلاڑی نکلیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
”بس میں نے بھی ضرور ہی نہیں کیا۔“ میں نے بھی اداۓ دلربائی کے ساتھ فقرہ چست کیا۔

”وہی تمہارے پاس بھی نہ ہوا تو پھر کہاں ہوگا؟“
”میں جانتی تھی کہ تم جیسے ذہین کھلاڑی کو اس منطقی نتیجے پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“
”تم اس کا لے کئے باز ل کو کیسے جانتی ہو؟“

”بس یونہی ایک آدھ مرتبہ بیٹھنا کے ساتھ ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میری دوست ہے نا۔“ میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح کہا جیسے اب مجھے جھوٹ بول کر کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔
”وہ بے وقوف ایسے ہی تمہارے لیے اپنی جان کی بازی لگانے پر تیار ہوا تھا؟“

”مرد تو سارے ہوتے ہی بے وقوف ہیں۔“ میں پھر انداز دلربائی سے مسکرائی۔
”اوہ تو ایسا جتنی ہوتی؟“

”ہاں! اور نہیں تو کیا؟ اب دیکھ لو وہ لیس بھی تو کتنا بے وقوف تھا۔ ہے نا۔“ میں نے اپنے بالوں کو ہالی ڈوڈ کی کسی ٹی گرڈ فلم کی قانون شکن بدعاش لڑکی کی طرح جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

”میں تو شروع سے ہی جانتی تھی مگر وہ بے وقوف خواہواہ اوروں کو سچ میں لے آیا مگر میں جانتی تھی کہ جیت بالآخر میری ہی ہوگی۔ مجھے ہمیشہ جیتنے کی عادت جو ہے۔“ میرا ٹی گرڈ ہالی وڈ میلو ڈراما جاری تھا۔ مجھے کڑی سے کڑی جوڈو کرکائی حد تک توساری کہانی کا پتا چل چکا تھا۔ اب بس ضرورت اس بات کی تھی کہ میری بتائی ہوئی کہانی پر اسکرچ کو یقین آجاتا اور میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی مگر ساتھ ہی ساتھ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ میری ذرا سی بھی چوک جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ مجھے روہرہ کربازل کا بھی خیال آ رہا تھا۔ کیا واقعی اس نے باز ل کا خون کر دیا تھا یا صرف اسے زخمی کیا تھا؟

اسکرچ نے اپنی جذبات سے عاری خوابیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسی انداز میں اپنا میلو ڈراما جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے کچھ ناخوشی بھی دکھائے جیسے میں نے اکثر نوجوان جسم فروش عورتوں کو کرتے دیکھا تھا۔

”اس بے وقوف کے پاس رقم تمہی مگر زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ اس چھوٹ کر کے پاس بھی نہیں۔“

اب اتنا تو میں جان ہی چکی تھی کہ اس سنگ دل آدمی نے لائلہ کو قتل کرنے سے پہلے اس سے اپنی رقم کے بارے میں جاننے کی ضرورت کو کش کی ہوگی اور براؤن کا حشر دیکھنے کے بعد لائلہ نے اسے سب کچھ سچ بتا دیا ہوگا۔ لائلہ اپنی ضرورت تھی مگر اس حق ہرگز نہیں تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتی ہوگی کہ جان سے پیاری چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔ مجھے اب فکر صرف ایک ہی بات کی تھی اور یہ کہ وہ رقم آخر ہی کہاں؟

”وہ لڑکی؟“ اسکرچ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
”ہاں تبھی تو وہ تمہیں اس بارے میں کچھ بتا نہیں پائی۔“ میں فوراً بولی کیونکہ میں جانتی تھی کہ اتنا سا تو ضرور سچ تھا ہی۔

اسکرچ کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرانے لگے۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں کا بدلہ انداز دیکھتے ہی مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ میں نے شاید کوئی غلط بات کہہ دی تھی۔ میں نے ایک دم پتیز ابدلا۔ ”اسی لیے تو وہ تمہیں ابھی تک ملی نہیں۔ تمہیں وہ اس لڑکی کے پاس ملتی بھی کیسے سارا وقت وہ میرے پاس جوگی۔“

”تو اب وہ کہاں ہے؟“ وہ چنگھاڑا۔ اس کی آنکھوں میں وہی درندگی لوٹ آئی تھی جیسی لیس کو قتل کرنے

کر دو تم نے ہنر اور براؤن کے ساتھ کیا اور جو کچھ تم نے لالکے کے ساتھ کیا۔“
اس کے چہرے کے تاثرات میں پھر شک کے سائے گہرے ہونے لگے۔ شاید مجھ سے پھر کوئی غلطی ہو گئی تھی مگر کیا؟

”اس بات کا انحصار تو تم پر ہے۔ ویسے مجھے بے باک اور بے خوف عورتیں پسند ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔
”تم بھی بہت طاقت ور ہو اور مجھے طاقت ور مرد پسند ہیں۔“ میں نے پھر یہی گریڈ فلی ہیرڈن والے ڈائلاگ بولے اور اس کے بازو کو آہستہ سے جھوا۔ اس نے سیزیموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے آگے دھکیلا اور خود میرے پیچھے چلنا شروع کیا۔

میں آہستہ آہستہ سیزیمیاں چڑھ کر بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گئی۔ جیسی مجھے اپنے بیٹے جمال کا خیال آیا اور یہ بھی کہ شاید اب میں بھی اسے دیکھ نہ پاؤں گی۔ یہ سوچتے ہی میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے جن پر میں نے بڑی مشکل سے قابو پایا۔

”کب سے یہ کام کر رہی ہو؟“ شاید بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اس کے ذہن میں کچھ اور خیالات بھی ابھرنے لگے تھے۔

”کافی وقت سے۔“ میں نے تیزی سے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اسکریج نے مجھے اپنی جانب کھینچا تو میں نے غیر ارادی طور پر اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے اس خبیث درندے کی سب خواہشات کو پورا کرنا تھا۔ میں نے مزاحمت کرنی چھوڑ دی اور اس کے ہاتھ میرے جسم پر یہاں وہاں پھرنے لگے۔ مجھے اس سے سخت کراہیت محسوس ہو رہی تھی مگر کیا کرتی؟ مجبوری تھی۔ اس کو روکنا تو کتنا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ اس کے ہاتھ بھی اس کی آنکھوں اور دل کی طرح سخت اور سرد تھے۔

”نہیں یہ کام کرنا اچھا لگتا ہے؟“

”اس کا انحصار تو اس بات پر ہوتا ہے کہ میں کس کے ساتھ یہ کام کر رہی ہوں۔“ میں نے اٹھلاتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرنا ہی لیا۔

”تم بیٹنا کو کب سے جانتے ہو؟“ میں نے اس کا دھیان ہٹانے کی خاطر کہا۔

۔ پاپائی۔

”میں نے اسے بڑی حفاظت سے چھپا کر رکھا ہے۔“
”ہاں میں۔“ مونٹگو بے ہوٹل میں۔“ میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”اوہ! کہاں پر؟“

”تم اسے میرے بغیر نہیں حاصل کر سکتے۔“

”تو پھر چلو۔“ وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولا۔

”میری کار باہر پہاڑ کے نیچے کھڑی ہے۔“

”مگر مجھے چابی درکار ہوگی۔“

”چابی؟ وہ کس لیے؟“

”ہاں چابی! کیا تم مجھے بھی لپسی سمجھتے ہو؟ میں اس جیسی احمق نہیں ہوں کہ اتنی بڑی رقم کو یونہی کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں جہاں بے کوئی بھی لوکا پھنسا کر اسے لے آئے۔ میں نے وہ رقم ایک سیف ڈپازٹ باکس میں رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے پھر اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔“

”وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔“ اسکریج مسکراتے ہوئے بولا۔

”وہ دراصل چابی اور پرکھی ہے۔“ میں نے معصوم سی شکل بناتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے اوپر اپنے بیڈ روم میں ہی چھوڑ آئی تھی۔“

اسکریج کے چہرے پر پھر شک کے سائے لہرانے لگے۔ وہ بھلے بہت سفاک درندہ تھا مگر کسی جانور ہی کی طرح اس کے ذہن میں ابھرتے شکوک و شبہات کو اس کے چہرے کے تاثرات میں پڑھا جاسکتا تھا۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میں نے بھی پوری کوشش کی کہ وہ میرے چہرے سے میرے جھوٹ کو نہ پکڑ پائے۔ اس نے میرے بازو کو پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایسا صرف اپنی مردانگی جتانے کے لیے کر رہا تھا اس لیے میں نے بھی اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کے بعد بالوں کو باغیانہ انداز میں جھٹکا۔

”جب تم اسے حاصل کر لو گے تو میرے ساتھ پھر کیا کرو گے؟“

میں اس سوال کا جواب جانتی تھی مگر مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ مجھ سے اسی قسم کے سوال کی توقع رکھتا تھا اگر میں یہ سوال نہ کرتی تو اسے کچھ شک ہو سکتا تھا۔

”تم کیا چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟“
”میں نہیں چاہتی کہ تم میرے ساتھ بھی وہی سلوک

”کافی دیر سے۔“ اس نے کچھ سوچ کر اپنے ہاتھ خود ہی دور کر لیے۔

”چلو جانی نکالو۔“ وہ آہستہ سے غرایا۔

میں بیڈ کے قریب پڑی سائڈ ٹیبل پر جھکی۔ وہ بالکل میرے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

”کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا۔ تم جانتی ہو کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔“

”اوه تم اس بات کی کوئی فکر نہ کرو جان من۔ مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے۔“ میں نے پھر اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی تو وہ بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ دراز کے اندر اس کی اوپر کی طرف ایسے پھیرنا شروع کیا جیسے میں وہاں پر کوئی شپ سے چپکانی ہوئی شے ڈھونڈ رہی ہوں۔

”میں نے اسے یہیں دراز کے اوپر شپ سے چپکایا تھا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

گن اب میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ یہ ایک چھوٹا مگر کافی وزنی 22 ریوالور تھا۔ اس کے چھوٹے سائز کی وجہ سے پہلے اسے لوگ زنانہ ہتلول بھی کہا کرتے تھے۔ قریب سے فائر کرنے سے یہ کافی مہلک ثابت ہو سکتا تھا مگر بعض اوقات تو لوگ اس کی دو گولیاں کھانے کے بعد بھی اٹھ کر اپنے حریف کی گردن دیوبج لیا کرتے تھے مگر مجھے تو اب بس اسی چھوٹے سے ہتھیار کا آسرا تھا۔

اسکرینج میری طرف بڑھا۔ میں نے اسی وقت پھرتی سے مڑ کر اس کے اوڑھے درمیان کچھ فاصلہ قائم کیا۔ میری گن کی نال اس پر تھی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ میں گن دیکھتے ہی اسکرینج نے مجھے زور سے دھکا دے کر دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ میری ہنسی سائڈ ٹیبل کے ساتھ ٹکرائی اور درد کی ایک شدید لہر میرے بازو میں دوڑ گئی مگر میں نے پھر بھی گولی چلا دی۔ گولی اسکرینج کے بازو پر لگی۔ اس نے حیرت سے اپنے بازو سے نکلنے خون کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف شعلہ بار آنکھوں سے گھورا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اگر اب میں نے اس خبیث کا خاتمہ نہ کیا تو میری موت یقینی تھی۔ میں نے اپنا توازن درست کرتے ہی اس پر دوبارہ فائر کیا۔ میرا نشانہ اس کے دل پر تھا مگر گولی اس کے کندھے میں لگی۔ وہ زہر خند انداز میں ایسے مسکرایا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ اب تیری خیر نہیں۔

میں نے ایک بار پھر فائر کیا اور پھر ایک دفعہ اور جب

تک وہ زمین پر ڈھیر نہ ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے اس کے نزدیک جا کر دیکھا کہ کیا وہ واقعی مر گیا تھا؟ اس کا جسم بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کسی کی جان لینا میرے لیے کبھی بھی آسان نہیں ہوتا مگر کبھی بھی اپنے دفاع کے لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ وہ مر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اسے سچ بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کسی مرتے ہوئے آدمی سے سچ چھپا کر رکھنے کی ویسے بھی کوئی تنگ نہ تھی۔

”معاف کرنا اسکرینج مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا کیونکہ دوسری صورت میں تم یقیناً میری جان لے لیتے۔ مگر سچ یہی ہے کہ میرے پاس بھی تمہاری رقم تھی ہی نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی اور اب کس کے پاس ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی خاطر تمہاری اور ان دوسرے لوگوں کی جان چلی گئی۔ اگر تم اب بھی کچھ کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو۔“

اس نے اپنی خواہیدہ آنکھیں آخری بار کھول کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

”تو وہ سارا وقت اسی کے پاس تھا۔“

پھر اس نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں۔ میرا ذہن سن سا ہور ہا تھا مگر میں پھر بھی بازل کے خون کے دھبے جہاں نظر آئے ان کے پیچھے چلنے لگی۔ خون کی ایک لکیر ایک اندرونی کمرے میں جا کر ختم ہوئی۔ بازل وہیں پڑا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر بری طرح گھائل تھا۔ اس کے سینے کے دائیں جانب ایک بڑا سا زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

”کیا تم نے اس نکتے کو مار دیا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا کیا، میں ایسا نہ کر پایا۔“ اس نے کراچے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے لیے ایبونیٹس بلاتی ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس سے بڑے بڑے گھماؤ جھیلے ہیں۔ اس زخم سے میرا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ میری بات غور سے سنو۔“ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”مگر میں.....“

”میری بات سنو۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تم وہ گن جس سے تم نے اس کو مارا ہے، میرے

خریدا تاکہ پہلی ہی فلائٹ سے واپس اپنے بیٹے کے پاس گھر جا سکوں۔

☆☆☆

”تو سارا وقت وہ اسی حرام زادی کے پاس تھا۔“

یہ ایک مرتے ہوئے آدمی کے آخری الفاظ تھے اس لیے مجھے یہ بھلانے مشکل تھے۔ ان الفاظ کی بازگشت میرے کانوں میں بار بار سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ہونٹ مونٹھو بے میں بازل کی پائیک کی چابی میوس کے حوالے کی۔ اپنا سامان پیک کیا اور ہونٹ کا بل ادا کیا۔

”تو سارا وقت وہ اسی حرام زادی کے پاس تھا۔“

کیا اس بات سے اس کی مراد میں تھی؟ کیا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں اس کی موت کے وقت بھی اس سے جھوٹ بول رہی تھی؟ یا پھر اس نے بھی وہی اندازہ لگایا تھا جس منطقی انجام تک میں بہت پہلے ہی پہنچ چکی تھی یعنی لائلہ نے وہ رقم کسی ایسی جگہ چھپائی تھی جہاں تک وہ نہ پہنچ پاتا تھا۔ شاید براؤن کی کرائے کی گاڑی میں۔ اس بات کا تو مجھے یقین تھا کہ لائلہ براؤن کی گاڑی میں ہی ہونٹ مونٹھو بے تک پہنچی تھی۔ شاید اس نے رقم گاڑی کی ڈکی میں یا پھر سیٹوں کے نیچے نہیں چھپا دی ہو جو شاید اب تک کسی پارکنگ والے یا ڈرائیور کے ہاتھ لگ چکی ہوگی اور اس کی قسمت بدل چکی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ چلو اس سارے خون خرابے کے بعد کسی ایک غریب آدمی کا تو بھلا ہو ہی گیا ہوگا۔ وہ رقم اب جہاں بھی تھی مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دنیا میں بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب انسان کو کبھی نہیں مل پاتا اور شاید یہ بھی انہی سوالوں میں سے ایک تھا۔

”تو سارا وقت وہ اسی حرام زادی کے پاس تھا۔“

شاید ان الفاظ کا مطلب کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

میں نے اپنی کوفن کر کے بتایا کہ میرا پیٹھ بیگ مل گیا ہے اور اگر اس نے ابھی تک پیسے نہیں بھیجے تو کوئی بات نہیں۔ مجھے اب ان پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے اسی رات واپسی کا ٹکٹ مل گیا۔ ڈائریکٹ پرواز نہیں تھی چنانچہ ایک جگہ دو گھنٹے رکتا تھا مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں جلد از جلد جہاز سے نکلنا چاہتی تھی۔

مجھے رہ رہ کر بازل کا بھی خیال آ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اس کی صحت یابی اور تندرستی کی دعا مانگتی رہی۔ اس نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ اگر وہ نہ ملتا تو میں نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوتی۔

پولیس آئی تو میں یہی کہوں گا کہ وہ بلا اجازت گھر میں گھس آیا تھا۔ یہاں ایک شخص کا قتل کیا اور اسے اوپر مٹا آور ہو کر مجھے زخمی کر دیا۔ میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنی گن سے اس کو قتل کر دیا۔“

”مگر میں تو.....“

”تمہارا بحث مت کرو۔ گن مجھے دے دو۔ تمہارا پیٹھ بیگ اس کی گاڑی میں ہے ڈکی میں۔ تم میرا موٹر سائیکل لے کر چل جاؤ۔ اپنے ہونٹ جا کر اپنا سامان اٹھاؤ اور پھر اس مقام سے نکل جاؤ۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا جیسے وہ بہکی ہوئی باتیں کر رہا ہو۔

”میری بات مانو تمہارا! اس کی گاڑی وہاں پہاڑی لے چو کھڑی ہے۔ بیٹینا کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کیچ یہاں ضرور آئے گا اور میں اس کی موجودگی میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔“ وہ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اپنی ساری قوت متبہج کر کے اس نے پھر اصرار کیا۔ ”تمہارا پاسپورٹ اور دیگر اشیاء تمہارے پیٹھ بیگ میں اس کی گاڑی میں ہیں۔ اب تمہیں سڑک کرنے میں لاپرواہی نہ رہنی ہوگی۔ میری پائیک لو اور جاؤ۔“

”مگر میں تمہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی ہاں۔“ میں نے تقریر یاروتے ہوئے کہا۔

”تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس آئے گی اور سو سوال پوچھے گی۔ پھر وہ تمہیں ان دوسرے مقتولین کے ساتھ بھی جوڑ سکتے ہیں۔ تمہارا گھر واپس جانا ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ یہاں سے کچھ دور جا کر تم کسی بھی پے فون سے پولیس کو ایک گمنام فون کال کر دینا۔ بس یہی کہنا کہ وہاں پہاڑ کے اوپر والے پتھروں میں دو آدمیوں کا قتل ہو گیا ہے جبکہ ایک گمناں ہے۔ باقی کا وہ خود ہی کر لیں گے۔ اب اور وقت ضائع مت کرو اور جاؤ۔“

”مجھے ایسے تمہیں چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا۔“

”میری فکر نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوتے ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ تم سے ابھی مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ اس کی بڑی بڑی گہری آنکھوں میں محبت کا چشماں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چومنا اور پھر اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنا پیٹھ بیگ اس کیچ کی گاڑی سے نکالا۔ ہاں کی موٹر سائیکل لے کر قریبی پیٹرول پمپ تک گئی اور وہیں سے پولیس کوفن کر دیا۔ اس کے بعد میں ہونٹ بے پہنچی اور اپنا سامان سینا پھر اپنی واپسی کا ٹکٹ

ٹیکسی کے ذریعے اسٹریٹ پورٹ پہنچی اور اپنی پرانی ٹکٹ دے کر نئی بک کی ہوئی ٹکٹ حاصل کی۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا مگر میں ہی جانتی تھی کہ گزشتہ چند دن کتنے 'ٹھیک' گزر رہے تھے۔

جہاز کو اڑان بھرنے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ میرا وہاں جا کر کچھ اور 'سیاحت' کا ارادہ تو نہ تھا اس لیے میں وہیں پر موجود کافوں کی جانب چلی گئی کیونکہ مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ میں نے کسی کے لیے بھی یہاں کی کوئی سوغات یا تحفہ نہیں خریدا تھا۔ کم از کم مجھے جمال، اپنی، جیک اور ایک دو اور دوستوں کے لیے تو کچھ نہ کچھ خریدنا ہی تھا۔

پھر مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ آپ اسے 440 دولت یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ کا کہہ سکتے ہیں۔
"تم نے سوچا ہو گا کہ میں مر گئی۔"

میں بھمدکی ہو گئی۔
"تم نے میرا وہ سرخ ڈریس زمین پر پڑے دیکھا، وہی جو سبکی کی کو اس قدر ناپسند تھا اور تم نے سوچا کہ میں مر گئی ہوں۔"

اس نے بچوں کی طرح ہنسنے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ میں پکڑی لی شرٹس زمین پر گر چکی تھیں۔ میری آنکھیں پھٹی ہوئی اور منہ کھلا کھلا رہ گیا تھا۔

اس نے وہی گلابی ٹیشو والی جینز لگا رکھا تھا جو اس دن پہنا ہوا تھا جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے سرخی مائل بھورے بال ایک بڑے سے ہیٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ اگر میں نے اس کی آواز نہ سنی ہوتی تو شاید اس جلیے میں کبھی اسے پہچان نہ پاتی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کو گلے لگاؤں یا پھر ایک پھپر سید کروں۔
"تمارا میں نے تمہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔" اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔
"تم تمہیں کہاں الوکی پہنچی؟"

"میں نے تمہارے کمرے میں کئی بار فون کیا۔ میں مانتی ہوں کہ اس دن مجھے تمہیں اس طرح وہاں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"مگر تم غائب کہاں ہو گئی تھیں؟" مجھے ابھی تک اس کے زندہ ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔
"وہ میں جازا ریکس چلی گئی تھی۔ ابھی وہاں آئی ہوں۔"

"جزا ریکس؟ وہاں کیا کرنے گئی تھیں خبیث لڑکی؟"

"میری بات تو سنو تمہارا۔"

"نہیں نہیں، اب مجھے تمہاری کوئی بکواس نہیں سنی۔ خدا کے لیے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی میں نے ایک زنانے دارتھڑاس کے گال پر جڑ دیا۔

"پانچ آدمیوں کا ٹل ہو چکا ہے اور ایک بہت اچھا آدمی بری طرح گھاسل ہے۔ ان میں سے دو سے تعلقات بھی رہ چکے ہیں۔ بالکل ٹکس قسم کی عورت ہو جاؤ اور پھر بھی میرے قریب بھی پہنچنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے اب تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ جن لوگوں کے مرنے یا زخمی ہونے کا تم ذکر کر رہی ہو، ان میں سے کسی کو بھی میں نے تو نہیں مارا؟" میں سیکی لی اور براؤن کے ساتھ ضرور رہی ہوں مگر ان دونوں کے ٹل سے میرا کوئی تعلق نہیں اور وہ دوسرے لوگ۔ ان کو تو میں جانتی تک نہیں۔ تم مجھ سے اتنی ناراض کیوں ہو۔ میری بات تو سنو۔"

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سنی۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"تمہارا تمہیں پتا ہے وہ ساری رقم میرے پاس ہے۔ ہاں وہ ساری کی ساری اب میری ہے اور کچھ پر تو تمہارا بھی حق بنتا ہے۔"

"تو سارا وقت وہ اسی کے پاس تھا؟" اسکرچ کے آخری الفاظ کا مطلب اب مجھ پر واضح ہوا تھا۔

"تمہارا پلیز میری بات سنو۔ تم بھلے نہ مانو مگر میں تو تمہیں اپنی دوست ہی سمجھتی ہوں۔ بہت عرصے بعد مجھے تم جیسی اچھی دوست ملی ہے۔ پلیز پلیز میری بات تو سنو۔ وہ بچوں کی طرح خد کر رہی تھی۔"

"کیا ہے؟ اب یہ تمہاری کوئی نئی چال تو نہیں؟" میں نے اپنے شکوک کو آواز دیتے ہوئے کہا۔
"نہیں بھی میں تمہیں ساری بات تفصیل سے بتاتی ہوں۔"

"رہنے دو۔ مجھے اب تم سے کوئی بات کرنی ہی نہیں ہے۔ تم پلیز میرا پیچھا چھوڑ دو اور اب مجھے چین سے اپنے گھر واپس جانے دو۔ دیکھو اگر تم نہ نہیں تو میں اس پولیس والے کو بلا لوں گی۔"

"تمہارا مجھے پتا ہے کہ تمہاری فلائٹ جانے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ تو چلو کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

لیے مشروبات کا آرڈر دیا۔

”میرے خیال میں تم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی ہو گی کہ میں اس خوبی درندے کے ہاتھوں بچ کیسے نکلی جو سب کا خون کرتا پھر رہا تھا۔“

”ہاں چلو وہیں سے شروع کر دو۔“ میں بھی اب کچھ متجسس ہو چکی تھی۔

”چلو میں وہاں سے کہانی شروع کرتی ہوں جب میں نے تمہیں براؤن کے کمرے میں چھوڑا..... یا پھر اس سے ایک رات قبل سے جب یہ.....“

”جہاں سے شروع کرو لائلہ مگر ذرا اختصار سے بتاؤ۔ تمہارے پاس بھلے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے مگر مجھے تو اکاؤنٹی کلاس میں ہی دیکھ کھانے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری داستان سنتے سنتے میری فلائٹ مس ہو جائے۔“

”اوہ! تو تمہارا پیٹ بیگ مل ہی گیا۔“ وہ میرے پیٹ بیگ کو ایسے چھتہ پتہاتے ہوئے بولی جیسے وہ کوئی زندہ شے ہو۔
”تمہارا تو پاپیوٹ، پیسے اور سب کچھ اسی میں تھا! اوہ مجھے معلوم تھا کہ تم جیسی ہوشیار اور عقلمند عورت کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی نکالے گی۔ تم نے کیا اسے اسی آدمی کے پاس سے حاصل کیا جس نے اسے براؤن کے کمرے سے اٹھایا تھا؟ وہی آدمی جس نے براؤن کو قتل کیا۔ اسے میرے ہوٹل کے کمرے کی چابی بھی اسی کے اندر پڑے میرے پرس میں سے ملی ہوئی۔ تم نے دیکھا تھا اس نے میرے کمرے کا کیا حشر کیا تھا؟ دیواروں پر کیسی گندی گندی گالیاں لکھی تھیں۔ تم نے دیکھا تھا؟“
”تم اپنی کہانی سناؤ لائلہ، میرا قصہ رہنے دو۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

لائلہ نے اپنے ہاتھ میں تھامے جام کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”وہ آدمی جو براؤن کو اس رات کلب میں ملا تھا نا، وہی اس رات اسے کمرے میں لٹے آیا تھا۔ وہ..... وہی جو دبلا پتلا سا تھا اور جس کے چہرے پر چچک کے داغ تھے۔“

”لیسی۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”ہاں ہاں، تمہیں اس کا نام کیسے پتا چلا؟“

”میری یادداشت بہت اچھی ہے۔“

”ہاں تو اس رات وہ براؤن کے کمرے میں آیا تھا،

ایک کالے رنگ کا ڈفل بیگ لے کر۔ میں اس وقت بیڈروم میں تھی۔ پھر مجھے ان کے زور زور سے قہقہے لگانے کی آواز

”کھا..... کیا تم بھی اسی فلائٹ سے امریکا جا رہی

”نہیں میں ابھی امریکا نہیں بلکہ ابھی تو میں کچھ سیر کرنے کے لیے جا رہی ہوں۔“

پھر میرا بازو پکڑ کر وہ بولی۔ ”میں جرنل کینن سے کل ان یہاں پہنچی ہوں اور میں برابر چیک کر رہی ہوں کہ تم سے نہاری واپسی سے پہلے ملاقات ہو جائے۔ اگر تم مجھے یہاں نہ ملے تو شاید تمہیں ڈھونڈنے کے لیے مجھے کسی سرائیگ رساں کی خدمات حاصل کرنی پڑیں مگر قسمت کی خوبی دیکھو کہ تم مجھے یہیں مل گئیں۔“

”ہاں تمہاری قسمت کی خوبی کہ تم وہاں جزائر کینن میں سمندر کے کنارے موج مستی کرتی رہیں اور یہاں میری جان پر پنی رہی۔“ میں نے دانت چبھتے ہوئے کہا۔

”ارے میری جان تمہارا! غصہ تھوک دو اور میری بات غور سے سنو۔ دیکھو اب یہاں کھڑے کھڑے تو ساری باتیں نہیں ہو سکتیں تو کیوں تاہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں اور میں ساری بات سچ سچ بتاتی ہوں۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو تمہارا میں بھی کافی مشکل وقت سے گزری ہوں مگر دیکھ لو ہم دونوں ہی زندہ سلامت ہیں اور ہمارے دشمن ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر پائے۔ اپنی ہمت اور حوصلے سے ہم نے سب کو مات دے دی۔ تم ہاؤنڈ ناؤگر ہم دونوں کا خیر ایک ہی منی سے بنا ہے۔ پلیز چلو نا!“

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ جہاز کے جانے میں ابھی دو گھنٹے سے کچھ اوپر وقت رہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ ہم فرسٹ کلاس کے ویشنگ لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔

”تمہیں پتا ہے کہ اب میں ریوڈی جبرو جا رہی ہوں۔ ہمیشہ سے ہی مجھے وہاں جانے کا شوق تھا۔ سنا ہے کہ وہاں کی خوب صورت جگہ ہے۔ میرے جہاز کے جانے میں اب چار گھنٹے باقی ہیں۔ میں بھی نکلتی ہوں۔ جلد از جلد نکلتا ہوں۔“

”ہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ریوڈی فرسٹ کلاس میں۔ پتا ہے انسان کے لیے یہی ایسے ان ساری آسائشوں کی عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ ابھی نہیں جانتے۔“

”ابھی ابھی آتے ویر کو دیکھ کر لائلہ نے ہمارے

آئی تو میں نے آکر دیکھنا چاہا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ جب میں سٹنگ روم میں آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اس بیگ کو کھول کر بیٹھے تھے۔ اس بیگ میں بہت سارا پیسہ تھا۔ نوٹ ہی نوٹ! اور ساتھ میں بہت سارے بیزر بانٹ بھی تھے۔ دس دس ہزار ڈالر کی مالیت کے۔ وہ دونوں اسی رقم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ لیسی وہ رقم رات بھر کے لیے براؤن کے پاس رکھوانے آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ صبح آکر وہ اسے لے جائے گا۔ اس کام کے لیے وہ براؤن کو کافی رقم دینے کو تیار تھا مگر بچ پوچھو تو میرے خیال میں یہ اس کا ایک بہت ہی احقانہ منصوبہ تھا۔ درحقیقت وہ دونوں ہی احمق تھے۔

”احق؟ مگر میرا تو خیال تھا کہ تم براؤن سے محبت کرتی تھیں؟“

”محبت؟ اوہ میں نے یہ تو کبھی نہیں کہا تھا کہ میں براؤن سے محبت کرتی تھی۔ ہاں میرا اس کے ساتھ چکر ضرور چل رہا تھا۔ وہ میرا کافی خیال رکھتا تھا۔ کم از کم اس کتے کے بچے سی سی لی سے تو بہت زیادہ۔ تو بس اس کے ساتھ کچھ اچھا وقت ضرور گزرا مگر مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔“

”اچھا چلو آگے بڑھاؤ اپنی کہانی۔“ میں نے آنکھوں کو کھماتے ہوئے کہا۔

”مگر میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا ایسا انجام ہو۔ دراصل براؤن عجیب اضطرابی مزاج کا انسان تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اس رات سی سی لی کو لے کر دیا تھا۔ خیر وہ توجہ ہوا سو ہوا۔ تو اس رات براؤن اور لیسی نے پھر وہ رقم دوبارہ اس بیگ میں ڈالی اور اسے الماری میں رکھ دیا۔ اس کے بعد لیسی وہاں سے چلا گیا۔ براؤن نے اس کے جانے کے بعد وہ بیگ الماری سے نکالا اور رقم دوبارہ گنی۔ اس کے دل میں لالچ آگیا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ اس رقم سے ہمارے سارے سنے پورے ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ وہ رقم ہماری تو نہیں تو وہ ہٹنے لگا اور بولا کہ اس رقم سے ہم دنیا میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ پھر اس نے ایک پلان بنایا۔ اس نے کہا کہ ہم علی ایچ ہی اس ہوٹل سے رو پکھر ہو جائیں گے۔ لیسی کے لیے کچھ رقم ضرور چھوڑ جائیں گے مگر زیادہ تر ہم اپنے ساتھ لے کر جزائر یمن چلے جائیں گے اور وہاں کے کسی بینک میں وہ رقم ڈپازٹ کر دیں گے۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں لیسی رات کو ہی واپس آگیا تو؟ یہ خیال آتے ہی اس نے کچھ ردی اخبار اس ڈفل بیگ میں نیچے بچھا دیے اور اوپر کچھ اصلی نوٹ

بھی رکھ دیے تاکہ بیگ کا وزن اتنا ہی رہے۔ اس نے بیگ کو بند کر کے ایک طرف سے زپ اس طرح چھسدا کہ بیگ کو پورا کھولنے میں دقت ہو۔ اس نے ایسا ارے کیا کہ جب لیسی بیگ کھولے تو بظاہر اسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی لگے مگر وہ مکمل اطمینان کرنے کے لیے بیگ کو پورا نہ کھول پائے۔ براؤن نے کہا کہ یہ بیگ ہاتھ جاتے وقت ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک پر رکھوا جائیں گے لیسی جب وہاں آئے تو اسے یہ کہہ کر دے دیا جائے کہ ہمیں کسی ضروری کام کے سبب جلدی جانا پڑ گیا۔ لیسی جب وہاں آئے گا تو وہ بیگ کی زپ کھول کر چیک کر چاہے گا مگر اڑی ہوئی زپ کے کارن ایسا کر نہیں پائے گا۔ ویسے بھی وہ رقم وہیں بیٹھ کر تو گننا نہیں شروع کر دے گا۔ جب تک وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچے گا اور بیگ کو پورا کھول کر رقم گنے گا، اس وقت تک ہم اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکے ہوں گے پھر اس نے سٹنگ روم کے صو کے دو بڑے کٹن لے لیے اور انہیں کھول کر ایک بلیڈ کی مدد سے ان کے بیچ سے کچھ فوم کاٹ کر نکال دیا اور وہ راہاں چھپا دی۔ اوپر سے دوبارہ کچھ فوم رکھ دیا اور غلاف چڑھا کر بند کر دیا۔ پھر ہم سو گئے لیکن اس رات مجھے بالکل نیند نہ آئی، رہ رہ کر مجھے سی سی لی کے قتل کا منظر یاد آ رہا۔ مانا کہ براؤن نے اس کا قتل اس کے میرے ساتھ ہمارا سلوک کی بنا پر کیا تھا مگر وہ اس کا دوست بھی تو تھا۔ کوئی اپنے دوست کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ مجھے بھی خیال آیا کہ براؤن اب لیسی کے ساتھ بھی دھوکہ کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں، میں اس سے اپنے ساتھ دھوکہ کرنے کی کیا امید رکھ سکتی تھی؟ اور جیسی پھر وہ سب کچھ ہو گیا۔“

”کیا ہو گیا؟“ میں نے اور متبست ہوتے ہوئے پوچھا۔

”لائف کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ ان پر بڑا مشکل سے قابو پا کر بولی۔“

”تمہارا تم شاید میرے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتیں۔ تمہارے خیال میں ایک ادارہ مزاج بد چلن، اور بھولتی لڑکی ہوں مگر میں نے دو آدمیوں کو جن کے ساتھ میرے بہت قربت کے تعلقات تھے، اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا ہے۔“

میں نے اسے تسلی دینے کے بعد پوچھا۔ ”تو کیا وہاں کوئی اندر کھس آیا تھا؟“

پوچھا۔

”ہاں۔ ایسی اور وہ دونوں ہی مرتکبے ہیں۔“

”اچھا مگر میرے کمرے میں پھر وہ کون آیا تھا؟“

”یہ سب بعد میں پوچھنا، پہلے تم اپنی کہانی تو مکمل کر لو۔ پھر جب تم مجھے اپنے ساتھ لے کر تیل اڑھوں گے تو پھر کیا ہوا؟“

”ہاں وہاں میں سٹنگ روم میں ہی رہی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ جو بھی وہاں آیا تھا، وہ اس بیگ کو ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ جب وہ اسے مل گیا تو وہ اسے ساتھ لے کر چلا گیا ہو گا۔ وہ رقم وہیں کمرے میں ہی موجود تھی۔ میں نے کٹن کھول کر ساری رقم نکالی اور پھر بالکونی کے راستے باہر کود گئی۔“

”مجھے براؤن کی لاش کے ساتھ چھوڑ کر تاک کہ جب پولیس آئے تو سارا الزام میرے سر پر قہوپ دے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب پولیس تمہیں لاش کے پاس پائے گی تو وہ اتنا تھوڑا سوچیں گے کہ تم جیسی عورت براؤن جیسے بے گنے آدمی کا خون کیسے کر سکتی ہے؟ جس کسی نے بھی براؤن کا قتل کیا تھا، وہ کافی مضبوط اور طاقتور تھا۔“ لائلہ صفائی دیتے ہوئے بولی۔

”بہر حال جو بھی وہ بیگ لے کر گیا تھا، وہ ساتھ میں تمہارا وینڈ بیگ بھی لے گیا ہو گا کیونکہ وہ اس بیگ کے اوپر ہی پڑا تھا میں نے سوچا تھا کہ جب ہم ایسی کے لیے وہ بیگ فرنٹ ڈیسک پر چھوڑنے جا میں گئے تو ساتھ میں میں تمہارا بیگ بھی فرنٹ ڈیسک پر رکھوا دوں گی کہ یہ تم تک پہنچا دیا جائے مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ وہ دونوں ہی بیگ اٹھا کر لے گیا۔ جلدی میں مجھے اپنا پرس تمہارے بیگ سے نکالنا یاد نہ رہا اور شاید قاتل اسی کی مدد سے میرے ہونٹ کے کمرے تک پہنچا ہو گا۔“

”تمہارے کمرے میں؟“

”ہاں میرا خیال ہے کہ جب ہم براؤن کے کمرے تک گئے ہوئے تھے بھی وہ وہاں میرے کمرے میں آیا ہو گا کیونکہ جب اس نے وہ ڈفل بیگ کھول کر دیکھا ہو گا اور اوپر کے چند نوٹ ہٹانے کے بعد اسے وہ کاغذ ملے ہوں گے تو وہ بہت سچ پایا ہو گا۔ میرے پرس سے اُسے میری تصویریں اور ہونٹ کی چابی مل گئی ہوگی اور وہ میری تلاش میں نکل پڑا ہو گا۔“

”ذرا سوچو تمہارا! اگر تم میرے ساتھ براؤن کے

”میرا خیال تھا کہ شاید براؤن نے ٹیرس کا دروازہ کھولا ہوا تھا۔ مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی تو میں نے اسے جا کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا کہ اب اٹھ ہی گیا ہے تو وہ نہا دھو کر تیار ہو جائے کیونکہ ہمیں وہاں سے صبح سویرے ہی نکلنا تھا۔ سو وہ اٹھنے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھ اس کے چلانے کی آواز آئی اور پھر دھم دھم کی آواز آئی جیسے کوئی زور زور سے کوئی چیز مار رہا ہو۔ مجھے وہاں سے اُٹھنے کے لیے پھرنے کی بھی آواز آئی جو کہ براؤن نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ ننگے پیر تھا۔ میں چپکے سے بیڈ کے پیچھے ہار چھپ گئی۔ مجھے وہاں سے کسی کے الماریاں کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی جیسے جو بھی وہاں آیا تھا، وہ واپس جا چکا ہو۔ میں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہاں سے نکل کر باتھ روم کی طرف گئی تو براؤن زمین پر پڑا تھا اور اس کے سر سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ مجھے خیال آیا کہ جس نے بھی اسے قتل کیا تھا شاید وہ اب بھی وہیں کہیں گھات لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسی لیے میں سٹنگ روم میں جائے بغیر ہی براؤن کے والٹ سے کچھ رقم نکال کر بالکونی کے راستے باہر کود گئی۔“

”اور اس کے بعد تم میرے پاس چلی آئیں؟“

”ہاں کیونکہ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا مگر جب میں وہاں سے آئی تھی تو میرا خیال تھا کہ دروازہ کھلا تھا۔ کسی نے بعد میں آکر اسے بند کیا تھا۔ جب ہم دونوں وہاں پہنچے تھے تو ہمیں دروازہ بند ملا تھا۔ نجھانے دروازہ کس نے بند کیا ہو گا؟“

”ایسی نے۔ جب وہ وہاں پہنچا ہو گا اپنی رقم واپس لینے۔“

”تو کیا ایسی ہی نے براؤن کا قتل کیا تھا؟ کیا تمہارا وینڈ بیگ بھی اسی نے اٹھایا تھا؟“

”نہیں یہ کام ایسی کا نہیں تھا بلکہ ایک اور کہتے کا تھا۔“

”تمہارے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہو گا؟“

لائلہ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”جہنم میں! کیونکہ وہ مر چکا ہے۔“

”کیا؟“

”ہاں۔“

”کیا واقعی؟“ لائلہ نے بے یقینی کے عالم میں

کمرے تک جانے کے لیے راضی نہ ہوئی ہوں، میں اسے اپنے کمرے میں ہی ملتی اور پھر وہ میرے ساتھ کچا سلوک کرتا؟ جب میں پیسے لے کر مونٹگو بے ہوٹل واپس پہنچی تو وہ میرے کمرے سے جا چکا تھا۔ میں کمرے کا وہ حال دیکھ کر بہت ڈر گئی۔ بس میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور اپنا پاسپورٹ لے کر وہاں سے بھاگ گئی۔ براؤن کی کار میں ہی میں نکلتی کی حدود سے باہر نکل آئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ قاتل یا گلوں کی طرح میری تلاش میں ہوگا اور سوچا کہ یہ سب تب ہی صرف اس وجہ سے آئی کہ براؤن کا دوست ہمیں اس رات کلب میں مل گیا تھا۔

”مگر تمہیں اس بات کا کوئی خیال نہ آیا کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ میری تلاش میں بھی نکل پڑے گا؟“ میں نے قدرے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں ایک دوسرے ہوٹل سے فون کیا تھا مگر تم نے فون اٹھایا ہی نہیں۔ میں تم سے بس یہی کہنا چاہتی تھی کہ اس ہوٹل سے یا پھر ہوٹل کے تو اس ملک سے ہی نکل جاؤ۔ میں نے ہی ہوٹل کے منیجر کو فون کر کے کہا تھا کہ کسی نے ہوٹل کے کمر نمبر 314 میں بہت توڑ پھوڑ کی ہے اور یہ کہ شاید وہاں پر کوئی زخمی بھی ہے۔ میں نے فون کرتے وقت اپنی آواز بدل لی تھی کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ ہوٹل والے پولیس کو ضرور فون کریں گے۔ میں یہ سب کچھ تمہارے لیے ہی تو کر رہی تھی کہ اگر پولیس وہاں موجود ہوگی تو تم بھی محفوظ رہو گی۔“

”اچھا تو پھر جب تم مجھے تلاش کرتے کرتے تھک گئیں تو پھر تم نے کیا کیا؟“ میں نے طنز پوچھا۔

”پھر میں نے پیسے لیے اور فلائٹ پکڑ کر سیدھی جزائر کین چلی گئی۔ اب وہ ساری رقم میری تھی۔“ لائلہ نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں لائلہ اب وہ ساری رقم تمہاری ہے۔“ میں نے سردہری سے جواب دیا۔

میں جانتی تھی کہ لائلہ شاید اب بھی پورا سچ نہیں بتا رہی تھی اور شاید اس کی کہانی میں اب بھی سقم موجود تھے مگر مجھے اب اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے اب سارے معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

”تمہارا تمہیں معلوم ہے کہ اس سیاہ و فل بیگ میں کتنی رقم موجود تھی؟ وہاں جزائر کین کے بینک میں جمع کرواتے وقت وہ سارا پیسا گنا گیا تھا ہمارا لاکھ پچاس ہزار ڈالر وہاں میں نے تمہارے نام پر بھی ایک اکاؤنٹ کھلوا دیا ہے۔“

”میرے نام پر؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہاں کیونکہ میری جان میں پیسے دھیلے کے معاملے میں اپنی بات کی بہت بچی ہوں۔ جب ہم براؤن کے کمرے میں گئے تھے تو میں نے..... کہا تھا کہ میں تمہیں پچاس ہزار ڈالر دوں گی۔ میں نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا دیے ہیں اور کیونکہ تمہیں میری وجہ سے بہت پریشانی اٹھانی پڑی ہے اس لیے میں نے کچھ زیادہ ہی رقم جمع کرائی ہے۔ تمہارے نام اور پاس ورڈ کے سوا کوئی اور ان پیسوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا یہ لو! یہ پاس ورڈ سنہال کر رکھنا کہیں کم نہ کر دیتا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھ کر میرے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ہم نے اپنی اپنی ڈرنک ختم کی۔

”لائلہ تمہاری باتوں میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ؟“ میں نے آخر کار پوچھ ہی لیا۔

”سب کا سب سچ ہے تمہارا۔ دے دیے بھی اب سچ بتانے کے لیے باقی بچا ہی کون ہے؟“ پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا خیال ہے کہ ہم جی واپس جا کر اپنی دوستی کو جاری رکھ سکیں گے؟ گھومیں گے۔ پھریں گے۔ ڈھیر ساری شاپنگ کریں گے۔ اچھے اچھے لوگوں سے ملیں گے۔ کہو کیا خیال ہے تمہارا؟“

”کم از کم اس جنم میں تو نہیں لائلہ لو۔“ میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”اپنی باقی باتوں میں وہ جتنی بھی ناقابل اعتبار تھی مگر پیسوں کے معاملے میں لائلہ اپنے قول کی پکی نگلی۔ تمہارا بیل کے نام پر جزائر کین کے بینک میں واقعی ایک اکاؤنٹ موجود تھا اور جب میں نے اپنا پاس ورڈ ”دی مونٹگو بے“ جو لائلہ اپنے پیپر نیٹکین پر لکھ کر میرے بیگ میں ڈال دیا تھی۔ دے کر چیک کیا تو اس اکاؤنٹ میں اتنی ہزار ڈالر موجود تھے۔

مجھے اس دن ایک اور خوش خبری ملی ایک خوب صورت پھولوں کے بڑے سے گلدستے کی صورت میں۔ یہ بازل کی طرف سے تھا۔ اس کے ساتھ ایک کارڈ تھا جس پر مختصر سا پیغام تھا۔

”خاتون کی خدمت میں سلام اپن کا۔

بہت جلد امریکا آ رہا ہوں۔ بازل۔“

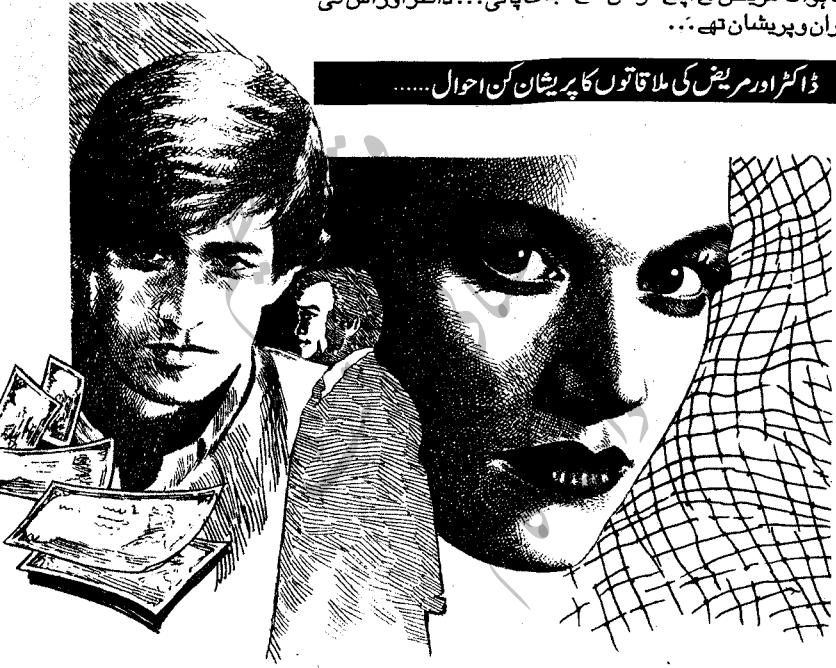


دور کی آواز

تمکین رضا

ایسے شخص کی کتھا جسے اچانک ہی نفسیاتی مرض لاحق ہو گیا...
 اکثر کا کہنا تھا کہ ایسے مریض کبھی اپنے مرض سے چھٹکارا پانا نہیں
 چاہتے... وہ اپنی خوابوں بھری دنیا میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں مگر
 پھر ایسا ہوا کہ مریض نے اپنے مرض سے نجات پالی... ڈاکٹر اور اس کی
 طب حیران و پریشان تھے...

ڈاکٹر اور مریض کی ملاقاتوں کا پریشان کن احوال.....



جس وقت وہ بتا رہا تھا اس وقت اس کی آنکھوں
 میں چراغ سے جلنے لگے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔
 ”کیا بتاؤں، کیا خوب صورت آواز ہے اس کی۔
 جیسے کانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس آواز نے مجھے
 اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس اسی کو سنتا
 رہوں۔ اپنا ہوش ہی نہیں رہتا۔ پاگل سا ہو جاتا ہوں۔“
 ”کیا تم صرف اس کی آواز ہی سنتے ہو۔ یا اس سے
 باتیں بھی ہوتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، صرف آواز۔“ اس نے بتایا۔ ”اگرچہ میں اسے مخاطب بھی کرتا ہوں۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ میری بات کا جواب نہیں دیتی۔ صرف اپنی بات کرتی ہے۔“

”اور وہ کتنی کیا ہے؟“

”میرے پاس چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”کہاں چلے آؤ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو اس نے نہیں بتایا۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

میں ایک سائیکازسٹ ہوں۔ ایک ماہر نفسیات۔

میرے پاس دن بھر ایسے ہی مریض آتے رہتے۔ جو کسی فوبیا یا مانیائیں جٹا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا ذہنی خلل ان کے چہروں سے واضح ہوا کرتا ہے۔ ان کی آنکھیں ایک خاص کیفیت کا پتا دیتی ہیں۔ ان کے چہروں پر وحشت سی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بہت پرسکون تھا۔ ٹھہرا ہوا لہجہ۔ ٹھہری ہوئی گفتگو۔ ہاں، عام طور پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو نفسیاتی مریض ہوتے ہیں، ان کے گھر والے انہیں لایا کرتے ہیں۔ وہ اپنا علاج وغیرہ نہیں کرانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں جبکہ یہ شخص خود ہی میرے پاس آیا تھا۔ اکیلا۔ اسی لیے میں نے اسے دوسرے مریضوں سے مختلف سمجھا تھا۔

وہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ماسٹر کر لکھا ہے اور وہ بھی انگلش لٹریچر میں۔ یقیناً اس کا ویرٹن بھی وسیع ہوگا۔ وہ شخص ایک ایسا مسئلہ ہے کہ میرے پاس آیا تھا کہ ابھی تک جس کا جواز میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔

اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک بینک کا منیجر ہے۔ بہت ڈتے داری کی پوسٹ تھی اس کی۔ ایسا آدمی جب اس قسم کے کسی مرض میں گرفتار ہو جائے تو پھر بہت پر اہم ہو جاتی ہے۔ وہ چونکہ ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اسی لیے وہ ایک ماہر نفسیات کے پاس پہنچا تھا۔ ورنہ یہاں تو بابا آن کی لائن لگی رہتی ہے۔ دھونی دی جاتی ہے۔ زنجیروں سے باندھ کر اس پر تشدد کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس پر کوئی جن یا بھوت آگیا ہے جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔

اس قسم کے امراض schizophrenia کی

وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ذہنی خلل ہے۔ اس میں جٹلا شخص کو نفسی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ اس دہم میں جٹلا ہو جاتا ہے کہ کوئی اس کو بلارہا ہے۔ اس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کو کوئی راز بتانا چاہتا ہے، وغیرہ۔ یہ ایک ناکارہ کر دینے

والی ذہنی کیفیت ہوتی ہے۔ مریض کو ناموجود سنائی یا دکھائی دینے لگتا ہے۔ مریض کے لیے حقیقی یا خیالی دنیا میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ ناموجود آوازیں اسے ہنساتی ہیں، رلاتی ہیں۔ خوف زدہ کرتی ہیں۔ ترغیب دیتی ہیں اور وہ ان سے باقاعدہ باتیں کرتا ہے۔ اس کو اپنی صحت وغیرہ سے دلچسپی نہیں رہتی۔ ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے کہ لوگ اسے پاگل سمجھنے لگتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ ایک مرض ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہمارے یہاں یہ یا تو پاگل پن ہے یا کسی جن یا بھوت کی کارستانی ہے۔

”ڈاکٹر صاحب، اگر میں پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ تو شاید میں بھی خود کو پاگل سمجھنے لگتا۔ یا یہ سمجھتا کہ میں نفسیاتی مریض ہو گیا ہوں۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے، وہ آواز ایک حقیقت ہے۔“

”جی ہاں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ میں نے کہا۔ یہ بھی ایک ٹریینٹ ہے کہ مریض کو انکار نہ کیا جائے بلکہ اس کی ہاں میں ہاں ملائی جائے اور غیر محسوس طور پر اس کا علاج شروع کر دیا جائے۔ میں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ”یہ بتائیں۔ آپ کن لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کے گھر والے۔“

”جی ہاں۔ میں شادی شدہ ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”تین سال پہلے میری شادی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اتنی جلدی بیوی مجھے پاگل سمجھنے لگے۔“

میں ہنس پڑا۔ اس نے ایک دلچسپ بات کہہ دی تھی۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ آوازیں کیسی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو آپ بتائیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے میں یہ بتا دوں کہ یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے۔ میرا گمان نہیں ہے۔“

”پھر تو آپ کو کسی بابا کے پاس جانا چاہیے تھا۔“

”یہی تو انھن ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں۔ اس قسم کی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔“

”دیکھیں مسٹر جنید۔ میں آپ کا علاج کروں گا لیکن میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔“

”جی فرمائیں۔“

کے خطرناک مرحلے شروع ہوتے ہیں۔ جب وہ اس مرض کے تحت کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے۔ ایک طرح سے ٹرائس کی کیفیت میں آ جاتے ہیں۔

”جنید صاحب، اس نے آپ سے کیا فرمائش کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے کہا تھا کہ میں اسی وقت تمہارے سامنے آؤں گی جب تم اپنی بیوی کو تھپڑ مارو گے۔“ اس نے بتایا۔ اس کی آواز میں شرمندگی تھی۔

”تو کیا آپ نے اس سے ملنے کی فرمائش کی تھی؟“ ”جی ہاں۔ میں اس کی آواز میں سنتے سنتے تنگ آ چکا تھا۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا کہ تم بھی میرے سامنے آؤ۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اسی وقت سامنے آئے گی جب میں اپنی بیوی کو تھپڑ ماروں گا۔“

”معاہدہ خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔“ اور آپ نے تھپڑ مار دیا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے گردن جھکائی۔ ”کیا کرتا؟“ ”کیا اس کے بعد وہ سامنے آئی؟“

”نہیں، اس نے کہا کہ مجھے ابھی دو تین امتحان بھی دینے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ ظاہر ہوگی۔“

”کیا آپ اپنی سز کو یہاں لاسکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کیوں؟“ اس نے ابھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ چونکہ ایک الجھا ہوا معاملہ ہے۔۔۔ اسی لیے میں انہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یوں سمجھ لیں چند احتیاطی تدابیر بتاتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اے آؤں گا لیکن آپ مجھے اطمینان دلا دیں کہ میں بالکل تو نہیں ہوں۔ وہ آواز واقعی ایک حقیقت ہے۔ کوئی انجانی سی شے ہے۔ اس دنیا میں بے شمار مجید ہیں اور وہ بھی ان مجیدوں میں سے ایک ہے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”ایسا ہی ہے۔ میں نے کچھ روحانی عاملوں سے، کچھ اسکالرز سے رجوع کیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی بتایا ہے۔“

”تو پھر کیا کروں میں۔ یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔“ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ہر پرالم کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ اس کا

”میں آپ کو یہ ممکن دوایں دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے معاہدہ آپ کو پوری نیند لینی ہوگی اور صحت مند رہے گا۔“

”نیر، میں اس کا وعدہ تو نہیں کر سکتا لیکن بقیہ دونوں امکان پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”ایک ہفتہ دو استعمال کر کے مجھے بتائیں۔ اس کے بعد ضرورت سمجھی تو پھر باقاعدہ علاج ہوگا۔“

میں نے اسے دوا بھی لکھ کر دیں۔ ہدایات دیں، وہ اٹھا گیا۔

میں نے یہ بتایا ہے کہ اس قسم کا معاملہ میرے لیے نیا نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے مریض اسی قسم کے آیا کرتے ہیں۔ اس مصروف زندگی نے ہم میں سے ہر ایک کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔

ڈپریشن، فینش، الجھنیں۔ سیاسی اور ملکی حالت۔ ہمارے ملک پر چھائی ہوئی خوف کی کیفیت۔ ان سبھوں نے ہمیں ذہنی مفلوج کر دیا ہے۔ ہم خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں رہنے لگے ہیں۔ یہ جنید بھی انہی میں سے ایک تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھا لکھا تھا۔ اسی لیے ادھر ادھر پھرتے کے پھرتے میرے پاس آ گیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد اس کا اپائنٹمنٹ تھا۔ مجھے اس کا انتظار تھا کہ اس کی کیفیت معلوم ہو سکے کہ میری تجویز کردہ دواؤں نے اس پر کتنا اثر کیا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد وہ آ گیا۔ اس بار وہ کچھ نڈھال سا تھا۔ پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو فریش دکھائی دے رہا تھا لیکن اس بار وہ رجھایا ہوا تھا۔

”تشریف لائیں جنید صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”بتائیں کیسے ہیں؟“

”بہت پریشان۔“ اس نے بتایا۔ ”کچھ بھی نہیں وا۔ وہ آواز میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ بلکہ اب تو اس کا ورائیو بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ میں نے شاید بتایا نہیں تھا کہ پہلے وہ صرف رات کے وقت سنائی دیتی تھی جب میں اپنے کمرے میں ہوتا تھا۔ دفتر میں اس کی آواز بھی سنائی نہیں ل۔ لیکن اب۔۔۔ اب تو۔۔۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔“

”ہاں بتائیں، خاموش کیوں ہو گئے؟“ میں نے کہا۔

”وہ ایسی سیدھی فرمائشیں کرنے لگی ہے۔“ اس نے

اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہیں سے اس مرض

بھی نکل آئے گا۔ آپ کل سڑک کو لیتے آئیں۔“
دوسرے دن وہ اپنی بیوی کو لے آیا تھا۔ وہ ایک کم عمر کی خوب صورت سی لڑکی تھی۔ بہت انجمی ہوئی بہت پریشان۔ اس کا نام غزالہ تھا۔
”جنید صاحب! آپ کمرے سے جائیں۔ مجھے ان کو کچھ سمجھانا ہے۔“ میں نے کہا۔
”ضرور۔“ وہ باہر چلا گیا۔

”میرے شوہر کو ہوا کیا ہے؟“ اس کی بیوی پھٹ پڑی۔ ”کیا یہ پاگل ہو گئے ہیں؟ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ کل..... کل تو انتہا ہو گئی۔ بات کچھ بھی نہیں تھی اور.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”بات کچھ بھی نہیں تھی۔ ان کی قیاس ایک طرف کری ہوئی تھی۔ بس اسی بات پر مجھے ایک تھپڑ مار دیا۔ کیا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے، تم کیا جانو اس کائنات کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ اب بتائیں کیا ایسی باتیں کی جاتی ہیں؟“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ایک مرض ہے۔ وہ نفسیاتی مریض ہو گئے ہیں۔“
”ایسا کون سا مرض ہو گیا ہے؟“

”اس کو شیئر فرینڈ کہتے ہیں۔“ پھر میں نے اسے تفصیل سے اس مرض کے بارے میں بتا دیا۔
وہ بے چاری یہ سب سن کر حیران رہ گئی تھی۔

”میرے خدا! وہ روئے لگی تھی۔“ اب کیا ہو گا؟“
”آپ ہی ان کو ٹھیک کر سکتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیونکہ آپ ان کے قریب ہیں۔ آپ ان کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے مریض ایسی غیر متوقع حرکت بھی کر سکتے ہیں جو آپ کو حیران کر دے۔ لیکن ان کی کسی بات پر آپ ریش نہ ہوں۔ وہ جو کہیں، وہ سنتی رہیں۔ ہاں میں ہاں ملائی رہیں۔“

”تو کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟“
”میں علاج ہی کر رہا ہوں۔ ان کی کونسلنگ کرنی ہو گی۔ وہ بھی کئی بار۔ تب جا کر وہ ٹھیک ہوں گے۔ آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔ جب کوئی غیر معمولی صورت ہو تو مجھے فون کریں۔ میں دوا بھی تجویز کر دوں گا۔“

”کیا ابھی کوئی میڈیسن نہیں دیں گے؟“
”میں نے ابتدائی میڈیسن لکھ دی ہیں۔ وہ استعمال کروائیں لیکن پابندی کے ساتھ۔“

دلوں چلے گئے۔ مجھے عام طور پر مریضوں کے ساتھ ان معنوں میں کمرشل ہونا پڑتا ہے کہ دن بھر کئی لوگ آتے ہیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ لیکن ہر ایک کو ڈیل کرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کو سننا پڑا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کہانی ہوتی ہے۔ اچھے ہوئے ذہن کی انجمی ہوئی کہانی۔

شاید ایک ہفتے کے بعد جنید کی بیوی نے فون کیا۔ بہت پریشان تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب، میں فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ معاملہ بریس ہو گیا ہے۔“
”اور جنید کہاں ہیں؟“

”وہ آفس میں ہیں۔“ اس نے بتایا۔
”اگر میری جیسی ہے تو آجائیں۔“ میں نے کہا۔

وہ آدھے گھنٹے کے اندر ہی پہنچ گئی تھی۔ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب! اب میں اس پاگل کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے میری سارا جیولری لے جا کر سمندر میں پھینک دی ہے۔“
”جیولری سمندر میں پھینک دی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں، وہ کہہ رہا تھا کہ اس دیوی نے سونے کا قربانی مانگی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ سونا سمندر میں بہاؤ میں تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ وہ میرے سامنے زبردستی جیولری پاکس لے کر گاڑی پر سمندر کی طرف نکل گیا۔ میں چیختی چلائی اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اتفاق سے مجھے ایک ٹیکسی وقت پر مل گئی تھی۔ میں نے اس کے ذریعے تعاقب کیا۔ اس کو ٹیکسی چوٹی پر جا کر پکڑا۔ مجھے دیکھ کر اس نے نفو ہی پاکس کو سمندر میں اچھال دیا۔ کہانی ختم ہو گئی۔ وہاں ایک ٹھیلے والا ہے جو مچھلیوں کے چارے وغیرہ بیچتا ہے اس نے میری مدد کی۔ اس نے غوطہ خوروں سے ریلوے کی۔ انہوں نے بھی سمندر میں جا کر جھان بین کی لیکر کچھ پتا نہیں چلا۔ اس دوران کیا ٹری پولیس اسٹیشن سے پولیس والے بھی آ گئے، انہیں بھی یہ پچویشن معلوم ہوئی انہوں نے بھی مدد کی لیکن جانے والی چیز چلی گئی۔“

”اور اس دوران وہ کیا کرتے رہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ان پر تو کوئی اثر ہی نہیں تھا۔“ اس نے بتایا۔
”بس رہے تھے۔ اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ دیوی۔ ان کی قربانی قبول کر لی ہے۔ ورنہ باکس مل جاتا۔“

”پھر کیا ہوا؟“
”پھر کیا ہوتا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے انہیں واپس

کہا۔ ”وہ تو بے قصور ہیں۔“

دو دن کے بعد پولیس میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ وہی کہانی لے کر آئی تھی جو جنید کی بیوی مجھے بتا چکی تھی۔ پولیس والوں نے مجھ سے دو تین سوالات کیے۔ جنید کے مرض کی ہسٹری معلوم کی۔ پھر واپس چلی گئی۔ مختصر یہ کہ مجھے ایک بار عدالت میں بھی جا کر کوای دینی پڑی تھی۔ میرے علاوہ وہ لوگ بھی اس بات کے گواہ تھے جن کے سامنے جنید نے اپنی بیوی کے زیورات سمندر میں پھینک دیے تھے۔ خاص طور پر پتھلیوں کا چار اچیتے والا۔

جنید کو سزا تو کچھ نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی جاب چلی گئی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں بہت دنوں تک کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ چھ مہینے کے بعد میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی گیا تھا۔ وہ کانفرنس نفسیات ہی کے موضوع پر تھی۔

دن بھر کانفرنس میں مقالے سنتے ہوئے تھکان سی ہونے لگی تھی۔ شام کے وقت میں یونیورسٹی شاپنگ سینٹر میں کچھ شاپنگ کے لیے چلا گیا اور وہاں میں نے جنید کو دیکھ لیا۔ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں کسی اور طرف متوجہ تھے لیکن میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”مسٹر جنید۔“ میں نے آواز دی۔

اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ”ارے ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں؟“

”میں یہاں ایک سیمینار میں آیا ہوا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

اس دوران اس کی بیوی بھی میری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ وہ بھی بہت حیران اور خوش ہو رہی تھی۔

”آج میں نا ڈاکٹر صاحب۔“ جنید نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”سامنے نگارو ہے۔ وہاں چل کر بیٹھے ہیں۔ فریج ریسٹوران ہے۔ کافی بہت اچھی ملتی ہے۔“

میں اس وقت فری ہی تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ آخر یہ دونوں یہاں کیا کر رہے ہیں اور اس کے مرض کا کیا حال ہے۔ ہم سب نگارو میں آکر بیٹھ گئے۔ جنید نے کافی کارڈز روئے دیا تھا۔

”ہاں بھائی، اب بتائیں یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”مئی مہینے ہو گئے کوئی تیر نہیں ملی تھی۔ ایک دو بار میں نے فون بھی کیا تھا لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔“

”ڈاکٹر صاحب! ہمیں یہاں آئے تقریباً دس مہینے ہو

”اے میں، مجھے کچھ اسی قسم کا اندیشہ تھا۔“ میں نے اس قسم کے مریضوں کو ہوش کہاں رہتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ بہر حال اب میں فوری طور پر ان کو ہائی ڈوز دے رہا ہوں لیکن یہ وقتی علاج ہوگا۔ اس کے بعد ان کو ”مڈل ٹانک کرانی ہوگی۔“

”اب تو مجھے اس بات کا ڈر ہو گیا ہے کہ وہ کہیں خود کو بھڑکائی نقصان نہ پہنچا دیں۔“ اس نے کہا۔

”اس کے لیے آپ کو احتیاط کرنا ہوگی۔“

اس کے بعد کئی دن ہو گئے۔ ایک دن جنید خود سے پاس آ گیا۔ وہ اس دن پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ ”الٹر صاحب! میں اس آواز کا کیا کروں۔ اب تو وہ مجھے اسی لہجہ سے کام بتانے لگی ہے۔“

”پریشان نہ ہوں۔ اس سے آپ کا پیچھا چھوٹ جائے گا۔“

”ڈاکٹر صاحب! جب وہ آواز ہی نہیں رہے گی تو میری زندگی سے ایک حسین رنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔“ اس نے کہا۔

اس نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ ایسے مریض اپنے اہلوسان سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ وہ خوابوں کی باتیں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔

میں نے اسے کچھ اور دوا میں تجویز کر دیں۔ وہ چلا گیا۔ پھر بہت دن ہو گئے، اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں دوسرے مریضوں میں الجھ گیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس کی بیوی کا فون آیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کیا آپ جانتے ہیں۔ جنید پولیس کی تحویل میں ہے؟“

”وہ کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”انہوں نے اپنے بیک سے پانچ کروڑ ٹکڑا کر سمندر

”پنچک دیے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کیا؟“ میں نے سن کر حیران رہ گیا تھا۔

”جی ہاں، پولیس نے سمندر سے دو تھیلے تو نکال لیے

”ایک کروڑ کی رقم واپس مل گئی ہے۔ لیکن چار کروڑ کے ٹکڑے ان کا پتا نہیں چل رہا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں ایسا کروں۔“

”مجھے اسی بات کا ڈر تھا کہ ایک دن کوئی بڑا نقصان

”اے میں گئے۔“

”الٹر صاحب! پولیس آپ کے پاس بھی پہنچے گی۔“

”اے میں، پلیز ان کو جنید کی بیماری کا بتا دیجیے گا۔“

”پولی کہنے کی بات نہیں ہے مسٹر جنید۔“ میں نے

کچے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم نے یہاں کی شہریت لے لی ہے۔ یہاں سیٹ ہو گئے ہیں۔ پارٹنرشپ میں ایک بزنس بھی شروع کر دیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”اور کراچی میں جو کچھ تھا، اس کا کیا ہوا؟“

”وہاں تھا ہی کیا۔“ اس بار اس کی بیوی بول پڑی۔ ”ہمارا مکان کرائے کا تھا۔ ایک گاڑی بھی وہ بیچ دی تھی۔ فرنیچر بھی اسی طرح نکلا دیا تھا۔ اور پیسے ٹرانسفر کر کے۔۔۔۔۔“

وہ اس طرح خاموش ہو گئی جیسے غلطی سے بول گئی ہو۔ اس وقت جنید نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ہمارے پاس تھوڑے بہت پیسے تھے۔“ جنید نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”وہی ہم نے ٹرانسفر کروا دیے تھے۔“

نہ جانے کیوں مجھے ان کی باتوں سے کچھ لڑ بڑکا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر بھی میں نے ان پر قابو نہیں ہونے دیا۔ پھر ایک خیال ذہن میں آیا جو میں نے پوچھ ہی لیا تھا۔ ”جنید صاحب! آپ لوگوں کو یہاں کی شہریت کس بنیاد پر مل گئی۔ قوانین تو بہت سخت ہوتے جا رہے ہیں؟“

”ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ پوری دنیا میں ایک قانون ہے کہ اگر آپ ان کے مطلوبہ اکاؤنٹ شو کر دیں تو وہ بزنس کے لیے ویزے دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہریت بھی دے دیتے ہیں۔“

”ہاں، اتنا تو معلوم ہے لیکن وہ رقم کروڑوں میں ہوتی ہے۔“

جنید خاموش ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اس بات کا کیا جواب دیا جائے۔ پھر اس نے کہہ ہی دیا۔ ”مئی ہاں ڈاکٹر صاحب، ہم نے تین کروڑ دیے ہیں۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس سوچتا رہ گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد خود جنید نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتا ہی دوں۔ ایک بوجھ سا ہے۔ اس کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔“

میں صرف اس کو دیکھتا رہا تھا۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے شاید میں جانتا ہوں۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ سب میری پلاننگ تھی۔“ اس کی بیوی نے کہا۔ ”جنید نے صرف ایکٹ کیا تھا۔“

”میں سمجھ گیا اور تم دونوں نے انتہائی ہوشیاری سے اس پلاننگ پر عمل کیا اور مجھے اس لیے انوکھا کیا تاکہ

عدالت کو ایک مستند ڈاکٹر کی گواہی مل سکے کہ یہ ایک نفسیاتی مریض ہے۔ یہ جو بھی کر رہا ہے، بے خودی کے عالم میں کر رہا ہے۔ اس نے بیوی کے زیورات سمندر میں پھینک دیے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ ایبٹین ہوں۔ تاکہ اس کے بعد دوسرے مرحلے میں یہ اپنے بینک سے رقم نکال کر دو تھیلیاں سمندر میں پھینک دے اور باقی گھر میں چھپا لے۔ کیوں ایسا ہی کیا ہے تاہم نے؟“ میں نے جنید کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔“ اس کی آواز میں شرمندگی تھی۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

”افسوس تو مجھے اپنے آپ پر ہو رہا ہے کہ میری علمی حیثیت نے قانون کو دھوکا دیا اور میں تمہاری ناپاک سازشوں میں تمہارا شریک بن گیا۔“

”ڈاکٹر صاحب! ہم دونوں آپ سے شرمندہ ہیں۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

”کیا فائدہ ایسی شرمندگی کا؟“ میں نے کہا۔ ”کیا تم دونوں خود کو پولیس کے حوالے کر دو گے؟ کیا تم بتاؤ گے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے جرائم کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ ڈاکو تو رپو اور لے کر بینک میں داخل ہو کر رقم لوٹ کر بھاگ جاتے ہیں اور بعد میں پکڑے جاتے ہیں۔ لیکن تم نے اپنی معلومات کا سہارا لے کر ایسا منصوبہ بنایا کہ اگر پکڑے بھی جائے تو بھی کوئی آنچ نہ آئے۔ یہی سمجھا جائے کہ تم شیزوفرینیا کے مریض ہو۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر تمہارے حق میں گواہی دینے کو تیار ہو جائیں گے اور تم قانون کا مذاق اڑاتے ہوئے صاف ہو کر رہا ہی پالو گے۔ افسوس، میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس قسم کی کامیابی کی کوئی مدت ہوتی ہے۔ نہیں، یہ صرف زندگی تک ہے اور یہ زندگی کب تک کی ہے۔ بہر حال تم دونوں خوش رہو اگر رہ سکتے ہو۔“

وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے اور میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

تو کبھی بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کے امراض سے باہر قسم کے لوگوں کا فائدہ ہو جاتا ہے اور کبھی خود میری فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن ایسے کیس بہت کم ہوتے ہیں۔ میں نے یہ کہانی اس لیے لکھی ہے کہ اگر کوئی مریض کسی ڈاکٹر کے پاس آئے تو خدا کے لیے اسے مریض ہی سمجھیں۔ جینا اور اس کی بیوی جیسا سازش نہ سمجھیں۔



قصہ جدید

منظر امام

انارکلی ایک پرانی داستان... پرانی کہانی ہے جس پر انداز بدل بدل کر نہ جانے کتنے قلم کاروں نے طبع آزمائی کی ہے... آج کے تناظر میں یہ کہانی کیا اور کیسی ہوتی... اس کا لطف پڑھنے میں ہی آئے گا... سیاست اور سیاسی محبت کے زاویوں کو عیاں کرتی ایک شگفتہ تحریر...

قارئین کے لیے منفرد آئٹم کی ایک یارگار کہانی

دربار سجا ہوا تھا۔ مندر شاہی کے دونوں طرف اور سامنے کرسیاں لگی ہوئی تھیں جو سب خالی تھیں۔ اسٹیج پر تان سین اپنا گٹار سنبھالے کسی سوچ میں گم تھا کہ انارکلی دربار میں داخل ہوئی۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر تان سین سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”تان سین! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ”بادشاہ سلامت نے مجھے یہاں بیک گراؤنڈ میوزک کے لیے رکھا ہے انارکلی۔“ تان سین نے ادب سے جواب دیا۔

”اس وقت جاؤ یہاں سے۔ شہزادہ سلیم آنے والے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہاں کاٹھم دیا تھا۔“
 ”انارکلی! آپ دونوں تو پارک میں ملا کرتے ہیں۔ آج دربار میں کیسے آئے؟“
 ”پارک میں بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں تان سین! کھیل کے میدانوں پر توجہ نہ دینا کاراج ہے۔“
 یہ گفتگو جاری تھی کہ شہزادہ سلیم شانہ وقار کے ساتھ دربار میں داخل ہوا اور تان سین پر نظر پڑے ہی بولا۔ ”تان سین، ہم تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔“
 ”زورہ نوازی ہے شہزادے کی۔“ تان سین نے سر کوٹھ دے کر کہا۔

”تان سین! ہم آج انارکلی سے اپنے دل کی بات کہنے والے ہیں۔ تم کوئی اچھا سا نقشہ چھیڑ دو۔“
 ”ابھی لیں شہزادے۔ جب تک آپ موڈ بنالیں۔“
 تان سین بولا۔
 شہزادہ سلیم مڑ کر انارکلی کے قریب پہنچا اور چڑپاتی لہجے میں بولا۔ ”انارکلی تم نہیں جانتیں کہ ہمیں تم سے کتنی محبت ہے۔“

اچانک تان سین نے ایک کلاسیکی راگ الاپنا شروع کر دیا جسے سنتے ہی شہزادہ سلیم تقریباً بیچ کر بولا۔ ”بندر کو، خدا کے لیے بند کرو۔ یہ کیا شروع کر دیا تم نے؟“
 ”یہ راگ ہمیں پلائی ہے شہزادے۔“

”وہاں تان نہیں۔ تم ماحول کے موڈ کو بھی نہیں سمجھتے۔ اس وقت ہم رومیٹک موڈ میں ہیں اور تم ہمیں راگ ہمیں پلائی سنا رہے ہو۔ کچھ اور سناؤ تان سین۔ تم سے اچھا تو وہ اپنا ڈی جے ہے، وہ ماحول کو سمجھ کر گانے سناتا ہے۔“

”ڈی جے کو تو بھول جائیں شہزادے۔ وہ تو عمران خان کے جلسوں میں پرمانٹ ہو گیا ہے۔“
 انارکلی بولی۔ ”چلو تو پھر تم ہی کچھ اور سناؤ۔ کیوں ٹائم ضائع کر رہے ہو۔ مجھے گھر جا کر چائینز بھی بنانا ہے۔“

تان سین نے پہلو بدلا اور ایک باب وٹن چھیڑ دی جسے سنتے ہی انارکلی نے والہانہ رقص شروع کر دیا۔ یہ محفل شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک ملازم دربار میں داخل ہوا اور فرشی سلام کر کے بولا۔ ”شہزادے، شہزادے! بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں۔“

یہ سنتے ہی شہزادہ سلیم نے کہا۔ ”انارکلی، تم اس راستے سے نکل جاؤ۔ جلدی، میں ابھی جہاں پناہ کو فیس کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

انارکلی اٹھلا کے بولی۔ ”شہزادے! میں تو روزانہ بادشاہ سلامت کو فیس کرتی ہوں۔“

”وہ کیسے؟“
 ”فیس بک پر..... بادشاہ سلامت ڈیلی مجھ سے چیکنگ کیا کرتے ہیں۔“

شہزادہ سلیم نے بوکھلا کر پوچھا۔ ”یہ میں کیساں رہا ہوں؟ کیا ابا حضور کو معلوم ہے کہ تم کہاں رہتی ہو؟ اور کیا نام ہے تمہارا؟“

”نہیں شہزادے! میں نے انہیں اپنا نام رخسانہ خاتون بتا رکھا ہے اور یہ لکھتی ہوں کہ میں خنڈ آدم میں رہتی ہوں۔“

”چلو، پھر تو صحیح ہے۔ اس قسم کے معاملات میں بندے کی صحیح لوکیشن کا پتا ہی نہیں چلتا۔“

تان سین نے ٹھنکدار کر کہا۔ ”آپ دونوں کیسی باتوں میں لگ گئے۔ بادشاہ سلامت کسی بھی لمحے آنے والے ہیں۔“

”انارکلی! تم تو نکل لو۔ تان سین، ماحول کو سمجھو۔“
 شہزادہ جلدی سے بولا۔

”سمجھ گیا ہوں شہزادے! اگلی گھنٹہ کریں۔“ تان سین گٹار سنبھال کر سیدھا ہو گیا۔

انارکلی بک کر مسند شاہی کے پیچھے چھپ گئی۔ تان سین نے اپنی کرسی کے نیچے چھپایا ہوا ڈیک آن کر کے قوالی لگا دی۔ گھمراہ ہو رہی تھی۔ ”مدینے چلیں..... آؤ مدینے چلیں.....“ شہزادہ سلیم پر لیک ایک وجد طاری ہو گیا اور وہ جھومتے لگا۔

اسی اثنا میں بادشاہ سلامت دربار میں داخل ہوئے۔ اس روح پرور منظر کو دیکھ کر تالی بجائی۔ تان سین نے جھک کر پھرتی سے ڈیک آف کر دیا۔ تان سین کے ساتھ شہزادہ سلیم نے بھی جھک کر بادشاہ سلامت کو آداب کیا۔ بادشاہ نے اشارے سے تعظیم قبول کی اور شہزادے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”شہزادے! ہم تمہیں سیدھے راستے پر دیکھ کر خوش ہوئے۔“

”جی، ابا حضور! اب تو صرف ہم ہیں اور خدا سے لو لگائی ہوئی ہے۔“

”پھر تو تم کا سلطنت کے قابل نہیں رہے۔ ہم کا ردِ باب سلطنت تمہارے کسی بھائی کے حوالے کر دیں گے۔“

”ارے نہیں ابا حضور، ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ ہم نے اب اتنی بھی لو نہیں لگائی ہے کہ تاج و تخت سے بے نیاز ہو

”جہاں پناہ! مجھے شہزادہ عالم کی وجہ سے دیر ہوگئی۔“
کارہینٹر نے منمناتی ہوئی آواز میں بتایا۔
”اس بات کی وضاحت کی جائے۔“ بادشاہ نے حکم دیا۔

”شہزادہ عالم کی سواری گزر رہی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ پردو کو لکھا ہوتا ہے۔ کئی گھنٹوں سے دونوں طرف کی سڑکیں بند کر دی گئی تھیں۔ میں نے خود شمار کیا ہے۔ پوری چالیس گاڑیاں تھیں۔ ایک درجن تو پولیس موہاں تھیں بادشاہ سلامت!“

”ادہ ظلم ہے، نا انصافی ہے۔ ایک شہزادے کی سواری گزرے اور اس کے ساتھ چالیس چالیس گاڑیاں ہوں اور ہماری رعایا پریشان ہوتی رہے۔“ بادشاہ نے پہلو بدل کر کہا پھر آواز دی۔ ”خان خاناں۔“

”حاضر ہوں ظل الہی۔“ مخاطب کا فوری جواب آگیا۔

”شہزادے کے اسکاؤڈ میں سے پانچ گاڑیاں کم کر دی جائیں۔ ہینٹیس یعنی قمرنی فائیو گاڑیاں بہت ہیں۔“ بادشاہ نے کہا پھر کارہینٹر سے مخاطب ہو گیا۔ ”اب تو خوش ہوتا۔“

”جو حکم عالی جاہ۔“ خان خاناں نے ادب سے کہا۔
”بیریل! تم اس کارہینٹر کو زنان خانے میں بھیج دو۔“
بادشاہ نے اگلا حکم صادر کیا۔

”کچھ ایڈوائس مل جائے گا ظل الہی۔“ کارہینٹر نے دیر سے سے پوچھا۔

”حدادب، گستاخ۔ کیا تجھے بادشاہ پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ تیری مزدوری مار جائیں گے؟“ قلی خان نے طیش میں آکر کارہینٹر پر آنکھیں نکالیں۔

”تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہ قسم کے لوگ مزدوری وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتے۔“ خان خاناں نے بھی اس موقع پر کارہینٹر کی سرزنش ضروری سمجھی۔

”گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، سرکار!“ کارہینٹر ان پر دیر سے حملوں سے بھولا گیا۔

”لے جاؤ اس کو۔“ بادشاہ نے ملازموں سے کہا۔
”خان خاناں! ہماری کچھ میں نہیں آیا کہ ابھی تم نے کارہینٹر سے جو بات کہی وہ ہماری تعریف میں تھی یا ہم پر طنز کر رہے تھے۔“

”تعریف تھی جہاں پناہ۔ طنز کو کوئی فائدہ ہو تب ہی

ہا میں۔“
”چلو اس موضوع پر بعد میں بات ہوگی۔“ شہزادے کی بات ٹال کر بادشاہ نے تان سین کو آواز دی۔

”جی عالم پناہ!“ تان سین نے سر جھکا کر کہا۔
”تمہیں معلوم ہے کہ آج کل پورے ملک میں بجلی کی شارٹج ہے۔ لوگ لوڈ شیڈنگ سے پریشان ہیں۔“
”جی ہاں عالم پناہ!“ تان سین نے اقرار کیا۔

بادشاہ نے نری سے کہا۔ ”تم دیکھ راگ کی پریکٹس کرلو۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس ملک کے کسی بھی گھر میں اندھیرا ہو۔ شام ہوتے ہی تمہیں دیکھ راگ گا کر ہر گھر میں روشنی کرنی ہے۔ سمجھ گئے؟ آج ہم آرڈیننس بھی جاری کر دیں گے۔“

فرمان سنا کر بادشاہ دربار سے چلا گیا اور شہزادہ سلیم نے بے اختیار ہنسا شروع کر دیا۔ اناکارگی بھی مسند کے پیچھے سے نکل آئی اور شہزادے کی ہنسی میں شریک ہوئی۔

”آپ ہنس رہے ہیں شہزادے، میں تو مر گیا نا۔“
تان سین بے بسی سے بولا۔

”موسیقار بنے پھرتے ہو تو اب بھگتو دیکھ راگ اور لوڈ شیڈنگ کو۔“ شہزادے نے ہتھیار مار کر کہا۔

اگلے دن دربار سجا۔ بادشاہ سمیت ہر ایک اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھا لیکن بیریل کی جگہ خالی تھی۔ بادشاہ نے اس کو کوٹھ کیا اور کسی سے مخاطب ہوئے بغیر بولا۔
”بیریل کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آرہا۔“

اسی لمحے بیریل دربار میں داخل ہوا۔

”بیریل! کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم کتنی دیر سے آئے ہو؟“ بادشاہ نے غصے سے سوال کیا۔

”مہابلی! آپ نے فرمایا تھا کہ مہارانی جو دھاپائی کے تخت کی چولیس مل رہی ہیں۔ کسی ماہر کارہینٹر کو لے آؤ۔ اب میں کیا کرتا مہابلی۔ وہ کارہینٹر ہی دیر سے آیا۔ بس اس لے کر سیدھا چلا آ رہا ہوں۔“

”اس کارہینٹر کی یہ مجال کہ شای کام میں دیر کرے، لایا جائے اس کو۔“

شای بلکہ نادر شای حکم تھا۔ ذرا سی دیر میں شای فائدے کارہینٹر کو پکڑ لائے۔ ”کارہینٹر حاضر ہے بادشاہ!“ ایک ملازم نے اطلاع دی۔ کارہینٹر نے دربار میں داخل ہو کر بادشاہ کے سامنے سر خم کر دیا۔

”کارہینٹر! بتاؤ تم اتنی دیر سے بیریل کے پاس کیوں

بندہ طنز کرے۔“

”جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔“ وقفہ آتے ہی ایک ملازم نے اجازت چاہی۔

”یہ اس پر ڈھینڈکرتا ہے کہ نیوز کیا لائے ہو؟“ بادشاہ نے بے نیازی سے کہا۔

”جہاں پناہ! شاہی محل کے سپاہی ایک استاد کو پکڑ لائے ہیں۔ وہ کچھ باغی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔“
”حاضر کیا جائے۔“

استاد کو دربار میں لایا گیا تو وہ مؤدب اور شائستہ نظر آ رہا تھا۔

”مابدولت نے سنا ہے کہ تو نے بچوں کو تعلیم دینی شروع کر دی ہے؟“ بادشاہ نے سوال کیا۔

”شہنشاہ! بچوں کو نہیں بڑوں کو تعلیم دے رہا ہوں، تعلیم بالغان۔“ اس نے بتایا۔

”اتنا بڑا جرم، اتنی بڑی جرأت۔ کیوں کر رہا ہے ایسا؟“ بادشاہ کو یکا یک غصہ آ گیا۔

”بادشاہ سلامت! میں لوگوں کو باشعور بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”ہم نے دس دفعہ یہ شاہی فرمان جاری کیا ہے کہ لوگوں کو ڈگری یافتہ بنایا جائے تعلیم یافتہ نہ بنایا جائے اگر وہ باشعور ہو گئے تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہم اسی لیے تو حکمران ہیں کہ لوگوں کے پاس شعور نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ ہوتے ہی وہ ہمارے پورے سسٹم سے بغاوت کرنے لگیں گے اور بخدا ہم یہ نہیں چاہتے۔۔۔۔۔ لے جاؤ اس استاد کو۔ اور اسے کال کوٹھری میں ڈال دو۔“ بادشاہ نے فیصلہ سنایا۔

خادم استاد کو کالر سے پکڑ کر ٹھٹھٹے ہوئے لے گئے تو بیرٹل نے دھیرے سے کہا۔ ”جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔“

”اجازت ہے۔“

”بادشاہ سلامت۔ ہم اگر اسی طرح تعلیم سے منہ موڑتے رہے تو ترقی کیسے کریں گے؟“

”عام آدمی کو ترقی نہیں، صرف دو وقت کی روٹی چاہیے۔ سمجھ گئے؟ عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔ صبح سے موڈ خراب ہوتا جا رہا ہے۔“ بادشاہ نے منہ بتا کر کہا۔

”بادشاہ سلامت! اگر اجازت ہو تو دل آرام کو حاضر کروں۔“ قلی خان نے جھٹ موقع سے فائدہ اٹھایا۔

”کون ہے یہ دل آرام؟“ بادشاہ نے تجسس سے پوچھا۔

”شاہی محل کی ایک ڈانسر ہے بادشاہ سلامت! اس بات کا دکھ ہے کہ ابھی تک اس کو پانی پر فارمنس دکھانے چانس نہیں ملا۔“

”کیوں نہیں ملا چانس؟“

”جب بھرتیاں رشتے داروں کی ہوں، تو اس کو کہاا سے چانس ملے گا۔“

”بہت تشویش کی بات ہے کہ ہمارے رشتے داروں میں بھی ڈانسرز ہیں۔“

”بادشاہ سلامت! آپ کے رشتے داروں۔ سوائے ٹھٹھٹے لگانے کے اور کام ہی کیا کیا ہے۔“

”بخدا یہ سب من کر دل پر بوجھ ہو گیا ہے۔ اس بوجھ اتارنے کے لیے اس رقاصہ کو حاضر کیا جائے۔ کیا نام بتایا؟ اس کا۔۔۔۔۔ دل آرام۔“

”حکم کی تعمیل ہوگی بادشاہ سلامت! قلی خان نے، جھکا کر کہا۔

”تو پھر حاضر کیا جائے دل آرام کو۔“

قلی خان کے اشارے پر ایک خادم دل آرام کو بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ اس نے آتے ہی دل موہ لینے وا۔ انداز میں کہا۔ ”کمز آداب کرتی ہے۔ شہنشاہ!“

”دل آرام! ہم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ یہ تمہارا انعام۔“ یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے اپنے گلے سے ہاتھ اتار کر دل آرام کی طرف اچھال دیا اور بات جاری رکھی۔

”نی الجال تو یہ ایلینین ہے۔ اگر تمہاری پر فارمنس اچھی رہے تو سونے کا ہار بھی مل جائے گا۔“

اس موقع پر تان سین نے اٹھ کر کہا۔ ”شہنشاہ! اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”شہنشاہ عالم! آپ کو یاد ہو گا کہ ایک بار میرے ڈاننگ اسکول کی ایک ڈانسر کو آپ نے چپک دیا تھا۔ وہ ابھی تک کیش نہیں ہو سکا ہے۔ کئی بار باؤنس ہو چکا ہے۔ تان سین نے ہلکے کیا۔

”تان سین! کیا تمہیں ہمارا اصول نہیں معلوم۔ ہمارے وعدے اور چپک کیش ہونے کے لیے نہیں ہوتے۔ میڈیا کی کوریج کے لیے ہوتے ہیں، سمجھے؟“ بادشاہ کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”سمجھ گیا عالم پناہ!“

”اگر آئندہ ایسی شکایت کی تو ہم شاہی موسیقار کے طور پر کسی اور کو پانسٹ کر لیں گے۔ چلو دل آرام کے لیے

کوئی راگ چھیرو۔“ بادشاہ نے اسے تادیب کرتے ہوئے
”سلم دیا۔“

”بادشاہ سلامت! اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟“
اس بار دل آرام نے اجازت چاہی۔ ”میں آج کل گروپ
ڈانس کی ریہرسل کر رہی ہوں۔ اگر اجازت ہو تو وہی پیش
کروں۔“

”اجازت ہے۔“

اور پھر وہاں ہر طرف سے رقاصائیں نکل آئیں۔ قلی
خان نے شاید پہلے سے ان کا انتظام کیا ہوا تھا۔ دربار میں
رقص کی ایک سحر آفریں محفل کا آغاز ہو گیا۔ رات گئے اس
محفل کا اختتام ہوا تو سب بخور اور صحت سے چورتے۔ نتیجہ
نکلے اگلے دن دربار بالکل خالی تھا۔ سلیم اور انارکلی کو سوچ
گیا۔

مسترباشی کے قریب پہنچ کر سلیم نے کہا۔ ”انارکلی! اگر
تم جانتی ہو کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب
ہندوستان کے شہنشاہ ہوں گے اور تم ملکہ عالیہ کہلاؤ گی۔“

”شہزادے! اس کینز کو یہ صرف ایک خواب دکھائی
دے رہا ہے۔ بادشاہ سلامت مرنے کے موذ میں نظر نہیں
آ رہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم از کم چالیس
پچاس سال اور پہنچ لیں گے۔“ انارکلی نے ہامی سے کہا۔

”انارکلی! یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ اتنے دنوں کے بعد تو
ہم بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔“
”اور یہ چھی ہو سکتا ہے کہ اسی انتظار میں آپ اللہ کو
پیارے ہو جائیں۔“

”انارکلی! کوئی مشورہ دو ہمیں۔ بخدا تم جو کہتی ہو، وہ سچ
ہو جاتا ہے۔ بہت کالی زبان ہے تمہاری۔ مشورہ دو!“ سلیم
تڑپ کر بولا۔

”بغافوت کر دیں شہزادے..... بغافوت۔“ انارکلی
نے رسائیت سے مشورہ دیا۔
”خاموش! تم ایک بیٹے کو باپ کے خلاف بھڑکار رہی
ہو۔“ سلیم کا پارا چڑھ گیا۔ ”بخدا ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم ایسا
نہیں کر سکتے۔“ وہ چند لمحوں کے لیے رکا جیسے کچھ سوچ رہا ہو
پھر پُر خیال انداز میں بولا۔ ”ویسے بغافوت کے لیے بندے
کہاں سے آئیں گے؟“

وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن تھے کہ اسی اثنا میں
دل دربار میں داخل ہوا اور ان پر نظر پڑے ہی ایک کونے
میں کھپ گیا۔

انارکلی خاموش رہی تو سلیم نے اصرار کیا۔ ”بتاؤ انارکلی!

نیک نیتی

”اگر تمہیں کہیں سے سو کا نوٹ پڑا مل جائے تو کیا تم
رکھ لو گے بیٹا؟“

”جی نہیں مولوی صاحب۔“

”شاباش اسے کہتے ہیں نیک نیتی اور ایمان داری۔
مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اچھا بتاؤ بیٹا تم اس نوٹ
کا کیا کرو گے؟“

”میں اسے فوراً خرچ کر دوں گا۔“

☆☆☆

عورت اور مرد کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی
تھی؟“

”غالباً ایک گھونٹنے والے دروازے پر..... بھی
سے دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔“

کراچی سے سنیم یونس کا تعاون

بغافوت کے لیے بندے کہاں سے آئیں گے؟“

”شہزادے! آپ اس کی فکری نہ کریں۔ میرا چھوٹی
زاو بھائی اسی قسم کے کام کرتا ہے۔ وہ کرائے کے بندے
لے آئے گا۔ بس اس کو پیسے چاہئیں اور ٹرانسپورٹ کی
ضرورت ہوگی اور کوئی اچھا سا موپائل دلوا دیجیے گا تاکہ وہ
دائیں ایپ بر لوگوں سے کانٹیکٹ کر سکے۔“

”انارکلی! جو ہمارے یہاں بڑے بڑے جلسوں
میں جو لوگ آتے ہیں وہ اسی طرح آتے ہیں؟“ شہزادے
نے پوچھا۔

”اور کیا شہزادے! آپ ذرا ان کی ویڈیو تو غور سے
دیکھیں۔ ہر جلسے میں ایک ہی جیسی صورت کے لوگ دکھائی
دیں گے۔“

”تم نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں انارکلی۔“

”بس شہزادے! کہیں ایسا نہ ہو کہ بادشاہ بچنے کے
بعد آپ اس کینز کو بھول جائیں۔“

”بخدا ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہمارے خون میں بے وفائی
شامل نہیں ہے پیاری انارکلی۔“

”لیکن شہزادے آپ ہی کے آباؤ اجداد تو اپنے خونی
رشتوں کے گلے کاٹتے آئے ہیں۔“

”بخدا یہ ہم پہ تہمت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے
اپنے رشتے داروں کا بھٹکا کیا ہے لیکن بے وفائی کبھی نہیں کی۔“

ہم جو کرتے ہیں اعلانیہ کرتے ہیں۔ اگر ہم نے کبھی تم کو بھی چھوڑا تو اعلانیہ چھوڑیں گے۔ باقاعدہ پریس کانفرنس کر کے!“

”شہزادے! آپ کیا مجھے چھوڑنے کی پلاننگ کر رہے ہیں؟“

”سوچ پر پابندی مت لگاؤ انارکلی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جو قومیں سوچ نہیں سکتیں وہ ترقی بھی نہیں کر سکتیں۔ چلو اب کہیں ایسا نہ ہو کہ اب حضور چک پڑیں۔“

ان کے جاتے ہی بیدار اپنی کمین گاہ سے نکلتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”اب دیکھتا ہوں شہزادے! تم کس طرح انارکلی سے شادی کرتے ہو۔“

اسی شام قلی خان اور خان خاناں دربار میں باتیں کر رہے تھے۔ قلی خان نے رازدارانہ لہجے میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ”خان خاناں! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے شہزادے ایک کنیز کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں؟“

”جانتا ہوں میں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اس کا انجام کیا ہوگا؟“

”جی ہاں، ایسے عشق کا انجام بھی ہوتا ہے۔“

”کیا تم عشق کے خلاف ہو؟“

”عشق کے خلاف نہیں ہوں۔ اس رویے کے خلاف

ہوں کہ ہمارے حکمران عشق کے چکر میں پڑ کر اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں اور دشمن ہمیں برباد کر دیتا ہے۔“ خان خاناں نے کہا۔

ان دونوں کی باتیں ادھوری رہ گئیں کیونکہ بادشاہ ٹہلنا ہوا دربار میں آ گیا تھا۔ اس نے مسند نشین ہوتے ہی ان سے پوچھا۔ ”تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”جہاں پناہ! ہم مظہر سلطنت کے مستقبل کی فکر کر رہے تھے۔“ قلی خان بولا۔

”بے وقوف، جب تک سوسنر لینڈ کا پیک سسٹم موجود ہے، ہمارا مستقبل محفوظ ہے۔“ بادشاہ نے بے پروائی سے کہا۔

”بادشاہ سلامت! مستقبل تو بادشاہوں کا محفوظ ہونا۔

ہم تو عوام کی فکر کر رہے تھے۔“ خان خاناں بولا۔

”ایک بات بتاؤ۔ کیا ہمارے عوام کو خود اپنی فکر ہے؟“ بادشاہ نے پوچھا۔

”نہیں جناب عالی، عوام کو تو کوئی فکر نہیں ہے۔ اسی

لیے تو بار بار ایک جیسے بندوں کو ووٹ دے کر دربار میں بھیج دیتے ہیں۔“

”تو پھر رہتے دو۔ جب خود عوام کو اپنی فکر نہیں ہے تو تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“ بادشاہ نے کہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

تان سین خانی دربار میں مسند شاہی سے لگا بیٹھا تھا کہ سلیم اور انارکلی اس گوشہ عافیت میں آ گئے۔ سلیم نے چونک کر کہا۔ ”تان سین؟“

”شہزادہ عالم! غلام حاضر ہے۔“ تان سین نے فوراً جواب دیا۔

”تم ہر وقت یہاں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟“

”شہزادہ عالم! نگرانی کے لیے۔“

”کس بات کی نگرانی؟“ سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

”شہزادے! بادشاہ کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی ان کا تخت ان سے چھین نہ لے۔ انہیں کہیں سے پتا چل گیا ہے کہ آپ ان کی جگہ لینے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔“ تان سین نے بتایا۔

”تان سین! کس نے یہ خبر لیک کی ہے؟“

”شہزادے! ہمارے چیمبل والوں کا بھی کام رو گیا

ہے۔ اپنے ٹاک شوز میں اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔“

”ٹاک شوز پر پابندی لگوا دو۔“

”ایسا نہ کریں شہزادے، اگر ایسا ہو گیا تو ہمارے

عوام انٹرنیٹ سے محروم ہو جائیں گے۔“

”چلو ٹیک ہے۔ ہم اگر اپنے عوام کو اور کچھ نہیں دے

سکتے تو کم از کم ٹاک شوز تو دے ہی سکتے ہیں۔“

”تان سین! کیا ہماری خبریں بھی ٹاک شوز میں آ رہی

ہیں؟“ انارکلی نے پوچھا۔

”انارکلی!“ تان سین نے کچھ کہنا چاہا مگر سلیم نے

اسے ڈانٹ دیا۔ ”جہاد! تان سین، یہ ہندوستان کی

ہونے والی ملکہ ہیں۔ تم ان کو انارکلی نہیں کہہ سکتے۔“

”گستاخی معاف شہزادے! جب یہ بات ڈیکلیر ہو

جائے تو پھر اس وقت آپ جو چاہیں، وہ کہوں گا۔ ابھی تو ان کا

ٹیکس پنڈٹنگ میں ہے۔“

”اچھا، اچھا، اب تجلیہ۔ ہمیں انارکلی کی سولو پر فارمنس

دیکھنی ہے۔ انارکلی! آج اس طرح رخصت کرو کہ اس محل کے درو

دیوار بھی تالیاں بجانے لگیں۔“

”میں حاضر ہوں شہزادے۔“

”تم کیوں کھڑے ہو، کھٹو یہاں سے۔“ سلیم نے

تان سین سے کہا۔

براجمان تھے۔ سلیم اور انارکلی مسند شاہی کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اپنے تخت چکر سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔ ”شیخو! ہم نے سنا ہے کہ تم اس کیزی انارکلی سے محبت کرتے ہو؟“

”جی ہاں، بادشاہ سلامت! ہم نے اگلے سال شادی کا پروگرام بھی بنایا ہے۔ شادی ہوتے ہی ہم سوئزر لینڈ چلے جائیں گے۔“ سلیم نے منتانت سے اقرار کیا۔

”اس کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟“ بادشاہ نے پوچھا۔

”ابا حضور! سب کچھ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ہوگا۔ بعد میں آپ بھگتے رہیں۔“

”انارکلی! تم میں اتنی ہمت کہاں سے ہوئی کہ تم شہزادے سے محبت کرو۔“ اب بادشاہ انارکلی کی طرف متوجہ ہوا۔

”بادشاہ سلامت! اس ناچیز کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔“ انارکلی بولی۔

”فرض کرو اگر ہم شہزادے کو تخت و تاج سے محروم کر دیں تو؟“

”تو پھر یہ کیزی کسی اور کو تلاش کر لے گی۔“

”سن لیا تم نے بے وقوف شہزادے، یہ ہے تمہاری محبت۔“ اب بادشاہ نے سلیم کو جتایا۔

”انارکلی! کہہ دو کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ بادشاہ کے خوف سے کہا ہے۔“ سلیم جذبہ بانی ہو گیا۔

”ہاں سلیم! یہ بادشاہ کا خوف ہے۔ ورنہ میں تو آپ سے محبت کرتی ہوں۔“ انارکلی نے فلابازی کھائی۔

”گستاخ کیزی، ابھی تو کیا کہہ رہی تھی؟“ بادشاہ غرایا۔

”بادشاہ سلامت! میرا ضمیر اچانک جاگ گیا ہے۔ جس طرح اور بہت سے لوگوں کا جاگا ہے۔“

”کیا اپنے ضمیر کو اور کچھ دیر سلائے نہیں رکھ سکتی تھی؟“

”شہزادے! میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر دیکھوں گا“ اس نے التجا کی۔

”میرے لیے کیا حکم ہے شہزادے؟ میں اشارتوں اور مارک جاذب“ انارکلی نے پوچھا۔

”انارکلی! تم اپنا کام جاری رکھو۔ ہم نے کبھی اس بات پر دوا نہیں کی۔ ہم اگر پروا کرتے تو آدھی دنیا اس وقت ہمارے پاس ہوتی۔“

”جو حکم شہزادے!“

ابھی انارکلی اشارت بھی نہیں لینے پائی تھی کہ باہر سے آواز لگی۔ ”ہوشیار خبردار، مہارانی جودھا بانی تشریف لارہی ہیں۔“

”یہ بودالہ محترمہ کو بھی اسی وقت آتا تھا۔ چلو نکلو یہاں سے۔“ سلیم نے نینزاری سے کہا اور انارکلی کا ہاتھ پکڑ کر دربار سے نکل گیا۔

شام کو بادشاہ خالی دربار میں اپنی مسند پر بیٹھا ایک اشتہار کے بول ٹنگتار اچھا کہ بیریل ادھر ادھر کا جائزہ لیتا ہوا اس کے پاس آپہنچا اور جھک کر بولا۔ ”مہابی! اس غلام کو آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہاں کہو، اجازت ہے۔“ بادشاہ نے اپنی مصروفیت ترک کر کے سر ہلایا۔

”لیکن اس کے لیے حلیے کی ضرورت ہوگی مہابی!“

بادشاہ نے تالی بجاتی اور کونوں کھدروں میں بادشاہ کے اشاروں کے انتظار میں دیکھے ہوئے سارے خدام تیزی سے رفو چکر ہو گئے۔

”اب کہو۔“ بادشاہ نے بیریل سے کہا۔

”مہابی! شہزادے ایک کیزی انارکلی کے عشق میں جلا ہو کر آپ سے بغاوت کے منصوبے بنا رہے ہیں۔“ بیریل نے دھماکا کیا۔

”تم سچ کہہ رہے ہو بیریل؟“ بادشاہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

”جی ہاں مہابی! میں صرف اسی وقت جھوٹ بولتا ہوں جب مجھے بی وی پرائمر دیو دیتا ہوتا ہے۔“

”بیریل! اکل دربار میں پہلا کیس انارکلی اور شہزادے کا ہوگا۔ ان دونوں کو پیش کیا جائے۔“ بادشاہ نے فیصلہ سنا

”حکم کی تعمیل ہوگی مہابی!“ بیریل نے فرش تک جھک کر کہا۔

اگلے دن دربار جاتا تو سارے درباری اپنی نشستوں پر

بادشاہ کے دل پر گہرا اثر کیا۔
 ”نہیں جہاں پناہ! انڈین گیتوں پر آج کل پابندی لگی ہوئی ہے۔ جتنا سنا دیا، وہی کافی ہے۔“
 ”کنیزز.... تو تمہیں اقرار ہے کہ تم نے شہزادے سے محبت کی ہے؟“
 ”جی ہاں قلی الہی۔“

”خان خاناں!“ بادشاہ نے آواز لگائی۔
 ”غلام حاضر ہے بادشاہ سلامت!“
 ”جاؤ اس انارکلی کو دیوار میں چنواؤ۔“
 ”ایسا ظلم نہ کریں ابا حضور، اگر آپ نے ایسا کیا تو تاریخ کیا کہے گی؟“ سلیم اپنے باپ کے سامنے کڑکڑایا۔
 ”کہنے دو تاریخ کو۔ اور ویسے بھی آج کل تاریخ پڑھتا کون ہے۔ یہ زمانہ فزکس، کیمسٹری کا ہے۔ تاریخ سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ خان خاناں! لے جاؤ انارکلی کو۔“
 ”سلیم! اپنا خیال رکھنا اور اپنی دو انیمز وقت پر لیتے رہنا۔ کوئٹہ شہرول پر کنٹرول کے لیے واک کرتے رہنا۔“ انارکلی نے شہزادے سے مخاطب ہو کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”تو یہ سب بول کر ہماری ہمدردیاں حاصل نہیں کر سکتی انارکلی! ہاں، تیری کوئی آخری خواہش ہے تو بتا دے۔“
 بادشاہ نے کہا۔

”جہاں پناہ! میں اپنے سلیم کے سامنے آخری پر فارمنس دینا چاہتی ہوں۔“ انارکلی بولی۔
 ”بجدا ہم اتنے ظالم بھی نہیں ہیں انارکلی کہ اس قسم کی اجازت نہ دیں۔ اجازت ہے۔“
 تان سین نے ڈیک آن کر دیا۔ گانا چلا۔ ”ہم یہ اِزام تو ایسے بھی ہے، ویسے بھی سہی۔“ رقص تھا تو انارکلی کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

”ہم تجھ سے بہت خوش ہوئے انارکلی! بجدا ہم اپنے اصولوں سے مجبور ہیں۔ خان خاناں! جاؤ، اس کو دیوار میں چنواؤ، لے جاؤ۔“ بادشاہ سلامت نے انارکلی کی دل جوئی کرنے کے باوجود اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔
 ”الوداع سلیم، الوداع!“ انارکلی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”الوداع!“ سلیم کی آواز ساٹھ تھی۔
 ”سلیم تم اتنے ٹھنڈے ہو کر الوداع کیوں کہہ رہے ہو؟“ انارکلی نے پوچھا۔
 ”تو کیا کروں۔ والدہ محترمہ نے میرے لیے ایک

دوسری لڑکی تلاش کر لی ہے۔ گوالیار کے راجا کی بیٹی ہے۔ بیوی کا ٹیٹ میں دوسرے نمبر پر آچکی ہے۔“ سلیم نے بتایا۔
 ”لے وقا، سنگ دل، میں قیامت تک تمہیں معاف نہیں کروں گی، نہیں کروں گی معاف۔“ انارکلی فرط جذبات سے بے قابو ہو کر تقریباً چیخ پڑی۔
 ”لے جاؤ اس کو!“ بادشاہ نے اونچی آواز میں حکم دہرایا اور سپاہی اسے دربار سے ٹھیک کر لے گئے۔
 ”سلیم! ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم ایک کنیز سے محبت کا جرم کرو گے۔“ انارکلی کو لے جائے جانے کے بعد بادشاہ نے اپنے پیوت سے کہا۔

”ابا حضور! یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پہلار کی غلطی کی تھی لیکن اس کی اتنی بڑی سزا انارکلی کو نہیں دینی تھی۔“ سلیم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے دل کی بات کہہ ڈالی۔
 ”بالکل ٹھیک کیا ہے ہم نے۔ بادشاہوں کے دل ہتھ سے زیادہ سخت اور بے رحم ہوتے ہیں۔ بادشاہ اگر نرم دل ہو جائیں تو سب من مانی کرنے لگتے ہیں، دو کوڑی کے عوام بادشاہوں کے منہ آنے لگتے ہیں۔ کنیزیں شہزادوں سے اور غلام شہزادوں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔“

اسی وقت خان خاناں ہانپتا کانپتا دربار میں آیا اور چڑھے ہوئے سانپوں کے درمیان رک رک کر بولا۔
 ”بادشاہ سلامت! بادشاہ سلامت! انارکلی فرار ہو گئی۔“
 ”فرار ہو گئی؟ کیسے؟ کیا تم نے اسے دیوار میں نہیں چنوا یا تھا؟“ بادشاہ مسند سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”وہ دیوار تو زکفر فرار ہوئی ہے بادشاہ سلامت!“ خان خاناں نے بے بسی سے کہا۔
 ”دیوار تو زکفر؟ کسی دیوار تھی جو ایک کمزور لڑکی سے ٹوٹ گئی؟“

”بادشاہ سلامت! آپ نے ساری شاہی دیواروں کا ٹھیکا اپنے ماموں کو دیا ہوا تھا۔ اس دیوار میں بھی دو نیمیر میٹرل استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے اتنی آسانی سے ٹوٹ گئی۔“
 ”خدا کی پناہ! ہم نے اس محل کا ٹھیکا بھی تو اسی ماموں کو دیا تھا۔“ بادشاہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور پھر یک لخت باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ہر طرف بھاگو، دوڑو، کھلو کی چیخ بیکار مچی۔ سب دیوانہ وار محل کے در و دیوار سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس جھگڑ میں بادشاہ بھی کاسی کی راہ تلاش کر رہا تھا!

جاسوسی ڈائجسٹ

راکیل لیلی کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اس لیے وہ آنے والوں کو نہ دیکھ سکی لیکن وہ ڈرائیو سے آنے والی سمجھتے ہوئے قدموں کی آواز سن سکتی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ گاڑا اور آلوکاٹے پر تھی۔ اس لیے اس نے پلٹ کر اپنے بیٹے اور اس کے دوستوں کا استقبال کرنے کی زحمت نہیں کی جو ٹائٹ کلاس سے واپس آئے تھے، اسے اپنی شفٹ شروع ہونے سے پہلے رات کا کھانا پنانا تھا۔ اچانک ہی دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سن کر وہ

جال

تنویر ریاض

بچے والدین کی زندگی بھر کی محنت اور محبت کا ثمر ہوتے ہیں... ان کی پرورش و تربیت میں ماں باپ پر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ خوب سے خوب تر ہو... مگر کبھی کبھی یہ بچے ماں باپ کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل جاتے ہیں...

ماں اور بیٹے کی محبت میں لالچ کی دراڑ ڈالنے والے مجرم کا قصہ



چونکہ اٹمی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ مقامی خیروں میں تیز آنکھی اور طوفان آنے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اس کی تصدیق کھڑکی پر لگے ہوئے پردوں کے نہرانے سے بھی ہوگئی۔

”اچھا ہوا کہ تم لوگ طوفان شروع.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ اس نے اپنے عقب میں ہنسی مذاق اور جیسے ہوئے جملوں کے بجائے غرغراہے لیتی ہوئی آواز سنی جیسے کوئی کئی کر رہا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی نظر اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے پر گئی جو چٹن نیبل پر جھکا ہوا تھا جہاں وہ دونوں عموماً کھانا کھاتے تھے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے کنارے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور حلق سے خونک آواز نکال رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید اور دہشت زدہ لگ رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے میز کو چھوڑ دیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے ڈگمگایا۔ رائیل کے ہاتھ سے چھری فرش پر گر گئی۔

”اسٹیفن“ وہ چلائی۔ ”یہ کیا ہوا؟“ اسٹیفن کے ہاتھ گلے کی طرف گئے۔ جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو یا خود اپنا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے ماں کو ایک طرف دھکیلا۔ وہ فرش پر گر گئی اور وہ لڑکھاتا ہوا اس کے جالگر آیا۔ رائیل نے سر اٹھا کر اپنے اگلوں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ بیسن پر جھکا خون کی لٹی کر رہا تھا۔ رائیل نے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ دہشت سے اس کے ہاتھ پاؤں کمزور اور ڈھیلے پڑ گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھ سکتی، اسٹیفن بھی گر پڑا۔

وہ دیکھتے ہوئے اس تک پہنچی اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسٹیفن کا ایک بازو گولی کی طرح اس کے چہرے سے ٹکرایا اور وہ تقریباً اپنے حواس کھوٹی۔ اس کے ساتھ ہی اسٹیفن بھی بے حس و حرکت ہو گیا۔

☆☆☆

”ہمیں وہاں سے کچھ نہیں ملا۔“ سراخ رساں سارجنٹ گیون ولف نے پولیس ڈپارٹمنٹ کے چیف کو بتایا۔ ”کچھ ایسی چیزیں ہیں جن پر شک جاسکتا ہے۔ مثلاً گیراج میں رکھا ہوا ریڈی ایٹر، مائع کا آدھا کنٹینر اور ہاتھ روم میں پانی جانے والی ڈرین کلینر کی کھلی ہوئی بوتل لیکن میڈیکل ایگزامنر کی تحقیقات کے مطابق ان میں سے کوئی

بھی چیز اس واردات میں استعمال نہیں کی گئی۔“ ”پھر یہ کیا ہو سکتی ہے؟“ جولین ہال نے اسکرین ڈور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں گھر کے باہر اندھیرے میں کھڑے ہوئے تھے۔

”خون کی لکیر دراصل باہر پورچ سے شروع ہوتی ہے۔“ گیون نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا بہت سا حصہ تیز ہوا اور بارش کی وجہ سے صاف ہو گیا ہے۔ لیکن یہ لکیر سیدھی پچن کی طرف جا رہی ہے۔ جہاں پہنچ کر اس لڑکے کو خون کی لٹی ہوئی اور وہ وہیں مر گیا۔ یہ بالکل ظاہر نہیں ہو رہا کہ اسے گھر میں کچھ کھانے یا کوئی دوا لینے کا وقت ملا ہوگا۔“

جولین نے اپنے سینئر سراخ رساں کے عقب میں چھوٹے سے پچن کی طرف دیکھا جو کسی دہشت ناک فلم کے سیٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ فرش، سبک اور کینٹ پر خون ہی خون تھا جو سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ منظر دیکھ کر اس کی ماں پر کیا گزری ہوگی لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکی۔ پھر اسے وہ غیر مطمئن نظر آنے والا جوان سراخ رساں یاد آیا جسے اس نے آخری بار مرنے والے کے ساتھ مردہ خانہ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”تمہارا ماتحت کیا جا رہا ہے؟“ سراخ رساں نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل ویسا ہی جیسی کہ تمہیں تو بخشتی۔ اسے مردہ خانے جانے کی ڈیوٹی بالکل پسند نہیں آئی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر واپس پٹرولنگ میں چلا جائے۔“

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنی نظریں چیف کے چہرے سے ہٹائیں اور بولا۔ ”وہ اس کام کے لیے موزوں نہیں ہے چیف۔ وہ بالکل مختلف ہے۔“

”کیا ہم سب ایسے نہیں ہیں؟“ جولین نے جواب دیا۔ ”اے صرف ایک اچھے استاد کی ضرورت ہے۔“

”تم بہتر سمجھتے ہو۔“ گیون نے کہا۔ ”وہ پٹرولنگ میں بھی خوش نہیں تھا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایک اچھا سراخ رساں بن سکتا ہے۔ اسے کچھ وقت دو۔“

”لیکن اس کے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ نہیں ہوگا چیف کیونکہ میں اس کے ساتھ بھی دوسرے لوگوں جیسا سلوک کر رہا ہوں۔“

”تب تو مجھے پہلے ہی اس کی حالت پر افسوس کر لینا چاہیے۔“ جولین نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ

کرتے ہوئے کہا۔

”کیا واقعی؟“ اس کے پاس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔
”مجھے صرف چند گھنٹے سونا نصیب ہوا۔“ ٹیلر نے جواب دیا۔ ”میں اپنے داغ سے پوسٹ مارٹم اور اس یوکو ابھی تک نہیں نکال سکا جبکہ میں دوسرے غسل کر چکا ہوں لیکن وہ بومیرے داغ میں بس گئی ہے۔“

”میڈیکل ایگزامین کیا کہتا ہے۔ اسٹیفن کی موت کیسے واقع ہوئی؟ اس کے جسم میں ایسی کیا چیز گئی جو اس کے لیے زہر قاتل تھی؟“

”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کی موت ایک ایسے زہر سے ہوئی جو خون کی نالیوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن وہ بھی اصل وجہ نہیں جانتا جب تک اسٹیفن کے معدے میں موجود مواد کا تجزیہ نہیں ہو جاتا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کوئی الکھلی تھی۔ اب تک وہ یہی اندازہ کر پایا ہے۔“

گیون اپنی کرسی سے اٹھا اور ٹیلر کی کہنی پکڑتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہاری نئی ذمہ داری کا پہلا دن ہے۔ وہ اسے دروازے سے باہر لے گیا اور کہنے لگا۔ ”تم کیا کہتے ہو۔ کیوں نا ہم چند معصوم شہریوں کو پریشان کریں اور دیکھیں کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے، وہ اس سے زیادہ کیا جانتے ہیں۔“

☆☆☆

وہ دونوں ٹریسی میڈل کے بیٹکے پر پہنچے جو اسے والدین سے درٹے میں ملا تھا۔ اس کے ماں باپ دو سال پہلے ایک کار حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ دروازے پر ایک زرد رو دیلی پتیلی عورت آئی۔ گیون نے اسے اپنا جچ اور شانتی کارڈ دکھانے کے بعد کہا۔ ”ٹریسی میڈل! ہم تمہارے دوست اسٹیفن لیلی کے بارے میں کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں اندر آنے دو گی؟“

”میں نہیں جانتی..... مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ گیون نے کہا۔ ”ہم یہ بتانا چاہ

رہے ہیں کہ تمہارا دوست اسٹیفن اس دنیا میں نہیں رہا۔“

ٹریسی کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا اور وہ کپکپاتا ہوا

ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”دروازہ کھولو۔ پھر ہم اس پر گفتگو کریں گے۔“

گیون نے اصرار کیا۔

وہ انہیں لیونگ روم میں لے گئی۔ اس نے انہیں

بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر

سرگوشی میں بولی۔ ”وہ ٹھیک تو ہے؟“

اب ملے گی۔ میڈیکل آفیسر عام طور پر دفتر کا وقت ختم ہونے تک انتظار کرتا ہے۔“

”ابھی یہ معلوم کیا جا رہا ہے کہ اسے ایسی کیا چیز دی گئی جس سے اس کی موت واقع ہوئی۔“

”اوہ میرے خدا۔“ جولین بڑبڑاتے ہوئے بولا پھر چند لمبے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”کیا ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ گھر کس طرح پہنچا۔ کیا وہ گاڑی خود چلا کر لایا یا کسی نے اسے گھر پر اتارا؟“

”اس کی ماں کا خیال ہے کہ اسٹیفن کے ساتھ کوئی اور بھی آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے دیکھتی وہ جا چکا تھا۔“ گیون نے ڈرائیوے میں کھڑی ہوئی کار کو کچھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ ان کے پاس ایک ہی کار ہے جو گھر پر کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گیا تھا لیکن اس نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ کون تھے اور اسی طرح کوئی اسے واپس بھی چھوڑ گیا۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”اس لڑکے کی دوستی کھشاد رے کے لڑکوں سے تھی۔ وہ اس گروہ کا رکن تھا جو ہمیں ڈسکنی کی وارداتوں میں مطلوب ہے اور وہ کبھی کبھی ان کا ساتھ دیتا تھا۔ یاد رہے کہ اس نے پہلی بار اس واردات میں حصہ نہیں لیا تھا۔“

جولین کو یاد آ گیا کہ اسٹیفن چوری اور تھب زنی کی کئی وارداتوں میں ملوث تھا۔ اس کے علاوہ نشیات کا بھی دھندا کرتا تھا۔ اس کے طویل عرصے سے غائب باپ کے گزشتہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔

”گو یا تم ان میں سے چند کے نام جانتے ہو گیون؟“

”میں ان سب کھلاڑیوں کو جانتا ہوں چیف۔“ اس نے اپنی کینٹی پرائنگی مارتے ہوئے کہا۔ ”ٹریسی میڈل، بلیز او برے اور شاید میک ایفی بھی۔ یہ مقامی بد معاشوں کا چھوٹا سا گروہ ہے۔ جنہوں نے ان دنوں شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اسٹیفن کو دیکس کیونٹی کالج میں رات کی کلاس لینا تھی۔ میں کل کالج جا کر چیک کروں گا۔ اگر وہ کالج سے غیر حاضر تھا تو ضرور کسی کے ساتھ کہیں گیا ہوگا۔“

جولین نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جہیں جو کچھ بھی معلوم ہو، وہ مجھے ضرور بتانا۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

”اوہ، میرے خدا! میں بہت تھک گیا ہوں۔“

رائے رساں ٹیلر ایرکن نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے فریاد

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ گیون نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔ وہ اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا جبکہ ٹیلر ایک کاؤچ پر بیٹھ چکا تھا۔

”میں نہیں جانتی کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ سب کیا ہے؟ کیا مجھ پر کسی بارے میں شبہ کیا جا رہا ہے؟“

”مس مینڈل۔“ ٹیلر نے نرمی سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا خیال ہے کہ گزشتہ شام اسٹیفن تمہارے ساتھ گاڑی میں اسکوٹ گیا تھا۔ لہذا تم وہ آخری فرد ہو سکتی ہو جس نے اسے زندہ دیکھا ویسے تو ہم اس کے تمام دوستوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا..... آخری فرد.....“ اس نے بولنا شروع کیا پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔

”اوہ میرے خدا اسٹیفن۔“ اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔

”کیا اسٹیفن بیمار تھا جب تم اسے گھر لے کر آئیں؟“

ٹیلر نے اپنی بات جاری رکھی۔

وہ جواب دینے سے پہلے تھوڑا سا ہچکچائی پھر مضبوط

لہجے میں بولی۔ ”کس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھا؟“

”کیا کل تمہاری اور اسٹیفن کی ٹائٹ کلاس نہیں

تھی؟ اس کی ماں کا بھی خیال ہے۔“

”میں..... میں کل بیمار تھی۔“ ٹریسی نے کہا۔ ”مجھے

ہیپاٹائٹس سی ہے۔ بعض اوقات آرام کی غرض سے گھر پر کتنا

پڑتا ہے۔“

”کیا تم دونوں نے گزشتہ شب کوئی نشہ کیا تھا؟“

”تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی؟“ وہ

سانپ کی طرح چھٹکاری۔

”میں تمہارا ڈوپ ٹیسٹ بھی کروا سکتا ہوں۔ اس

لیے بہتر ہوگا کہ خود ہی بتا دو۔“

”میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو فوراً میرے گھر سے

چلے جانا چاہیے۔“

ٹیلر اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور ٹریسی پر نظریں جماتے

ہوئے بولا۔ ”اگر تم جتنا دودو میں کوئی سختی نہیں کروں گا لیکن

اگر ہمیں معلوم ہوا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو یا اپنے دوست کی

موت کے بارے میں کچھ چھپا رہی ہو تو تم پر تحقیقات میں

رکاوٹ ڈالنے کا الزام لگ سکتا ہے۔ اس لیے اس پر اچھی

طرح سوچ لو۔“

یہ کہہ کر وہ مڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹریسی

بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چلتے ہوئے بولی۔

”تم مجھے دھمکی نہیں دے سکتے۔“

گیون نے دروازہ کھول کر ٹیلر کو باہر جانے کا راستہ

دیا اور مڑتے ہوئے بولا۔ ”اور تم بھی ایک کل کی تحقیقات

میں معلومات نہیں چھپا سکتیں تاوقتیکہ اپنے آپ کو بچانے کے

لیے ایسا کرنا ضروری ہو۔“

”قتل؟“ ٹریسی نے گھبراہٹ میں دہرایا۔ اس کی

آواز سے غصہ جھلک رہا تھا۔

”ہاں۔“ گیون نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

”مکنہ طور پر یہ قتل ہی تھا۔ میں تمہارے باقی ساتھیوں سے

بھی ملوں گا۔ ان سے ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

جب وہ دونوں اپنی گاڑی کی طرف واپس آ رہے

تھے تو گیون نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے

برآمدے میں رکھے ہوئے فلیٹ اسکرین پر غور کیا؟“

ٹیلر نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ بولا۔ ”اوہ میرے

خدا، اس کا ساڑھی کی کار کے برابر تھا۔ اسے تو نہ نصب کیا گیا

اور نہ ہی اس کے ارد گرد پینٹنگ میٹرل پڑا ہوا تھا اور یہی

بات مجھے شک میں ڈال رہی ہے۔“

”اس نے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ اسٹیفن کے

ساتھ کیا ہوا..... وہ کیسے مر گیا۔“ ٹیلر نے آہستہ سے کہا۔

گیون نے اپنی بھوس اوپر چڑھا لی اور بولا۔

”اس بارے میں شور مچانے کی ضرورت نہیں۔“

☆☆☆

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لڑکا اسٹیفن کیلی اور اس

کے گروہ کے ساتھ مل کر کیا کر رہا تھا۔“

گیون نے شیور لیٹ کی پیئریٹ پر بیٹھے ہوئے تبصرہ

کیا۔ ”وہ ویسکس ہائی اسکول کا اسٹار ایتھلیٹ ہے اور اسے

مختلف اداروں سے وظائف ملتے رہتے ہیں۔ اگر وہ صحیح سمت

میں چلتا رہے تو یہ آسانی کاؤنی کا بج میں جاسکتا ہے۔“

”کچھ لوگ محض دوستی نبھاتے ہیں۔“ ٹیلر نے کہا۔

”ایسا نہیں ہے کہ اس کے بہت سارے دوست ہیں اور وہ

سب اکٹھے رہتے ہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ بلیز اور اسٹیفن

بہت گہرے دوست تھے۔“

”اس تیز مشاہدے کے لیے شکریہ۔“ گیون نے

طنزیہ انداز میں کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس

مجھے انسانی فطرت کے بارے میں سکھانے کے لیے بہت

کچھ ہے۔“

ٹیلر منہ بنا کر رہ گیا۔ پھر سارے راستے اس نے کوئی

بات نہیں کی۔

سرخ ہو رہی تھیں۔

نیلر نے پہلا سوال کیا۔ ”کل جب تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تو کیا وہ تمہیں بیمار لگ رہا تھا؟“
”میں نے کل اسے نہیں دیکھا۔“ اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

نیلر کو اس صاف جھوٹ پر بہت حیرت ہوئی۔ وہ بولا۔ ”لیکن تمہاری ممانے ابھی ابھی تصدیق کی ہے کہ کل شام تم اسے اس کے گھر چھوڑنے گئے تھے۔“

اجانک ہی کمرے میں ایک آواز گونجنے لگی اور بلیر نے گھبرا کر نائٹ اسٹینڈ پر رکھے اپنے میل فون کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اٹھانا نہیں چاہ رہا تھا۔

”نہیں، ماں کو معلوم نہیں ہوگا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسے چھوڑنے گیا تھا جبکہ میں گزشتہ روز کلاس میں ہی نہیں گیا۔“

نیلر نے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکتی دیکھیں۔ اس کا باس اپنی جگہ سے اٹھا اور فون کی طرف چند قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟“
”کوئی بات نہیں۔ بعد میں بات کر لوں گا۔“ بلیر نے کہا۔

”دیکھو تو سہی کون ہے۔“ سراخ رساں چلاتے ہوئے بولا۔ ”فریسی شاید تمہیں کوئی اہم بات بتانا بھول گئی تھی۔ اسی لیے اس نے دوبارہ فون کیا ہے۔ آگے بڑھو اور اس کی بات سن لو۔“ وہ فون اس کے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم انتظار کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“
”اگر تم کلاس میں نہیں گئے تو اس کے بجائے کیا کرتے رہے؟“ نیلر نے پوچھا۔

”میں دوڑنے چلا گیا تھا۔“
”کہاں؟“

”کاؤنٹی پارک میں۔ وہ جگہ چڑیا گھر کے قریب ہی ہے۔“

”اندھیرے میں؟“ سراخ رساں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہاں کچھ اسٹریٹ لائٹس لگی ہوئی ہیں۔“

”تم بارش میں دوڑتے رہے؟“ گیون نے پوچھا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“

بلیر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، میں

”اس نے پہلے ہی فون کر دیا ہوگا۔“ گیون نے بلیر کے گھر کے قریب پہنچ کر اپنے پارٹر کو خبردار کیا۔ اس نے دوسری منزل کی کھڑکی کا پردہ ہٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے پہلے کہ وہ دستک دیتے، مسز او برے دروازہ کھول چکی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ رو رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ اس نے ان دونوں کے بیچ اکتھتے ہوئے کہا۔ ”اسٹیفن مر چکا ہے۔ میں تمہیں نہیں بتا سکتی کہ ہم نے اسے کتنی مرتبہ دات کا کھانا کھلایا جب اس کے والدین مشکل دور سے گزر رہے تھے۔ وہ بلیر کے لیے بھائیوں جیسا تھا۔ ان دونوں میں بہت قربت تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اتنی ہی راتیں یہاں بھی گزاریں جتنی اپنے بستر میں۔“

”تمہارے بیٹے نے اس خبر کا کیا اثر لیا مسز او برے؟“ نیلر نے نرمی سے پوچھا۔

”میں ابھی ابھی یہ خبر لی ہے۔ اس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔“

”ہاں میڈم، میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس پر بہت زیادہ اثر ہوا ہوگا کیونکہ اس نے گزشتہ رات اسٹیفن کو گھر چھوڑا تھا۔“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم نہیں جانتے کہ اس کی کیا حالت ہو رہی ہے۔“

گیون نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں اس تک پہنچا دو۔“

”اوہ نہیں۔“ مسز او برے چلاتے ہوئے بولی۔ ”وہ بہت پریشان ہے اسے اس وقت تنگ مت کرو۔“

”میڈم! ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو۔“

”انہیں اوپر آنے دو ماما۔“ سیزھیوں پر سے ایک اہم ہوئی آواز آئی۔

مسز او برے ایک طرف ہوتے ہوئے غیر یقینی انداز میں بولی۔ ”ٹھیک ہے اگر تمہیں یقین ہے ہنی کہ اس کے لیے یہ بہتر ہو۔“

دونوں سراخ رساں سیزھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ وہ ان کے اپنے کمرے میں لے گیا۔ جہاں چیزیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کرسی پر سے فٹ بال اور

ایک رسالوں کا ڈھیر اٹھا کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ ”اگر تمہارے کمرے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے پہلی بار اس کے کمرے کا دورہ کیا۔ وہ دہرا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک

”اوہ میرے خدا! یہ تو بڑی قابلِ نفرت بات ہے۔“

”لیکن شاید نہیں۔“ گیون بولا۔ ”یاد رکھو کہ یہ بچے

ہماری نظروں میں ان ذہنیوں کی وجہ سے آئے جن کا ابھی تک سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

ٹیلر نے مستحکم سے سر ہلایا۔

”ہمیں کرس میک ایلی کو نہیں بھولنا چاہیے جو بہت بڑا

بد معاش ہے اور اصلاح خانہ میں بھی رہ چکا ہے۔ اگر یہ بچے ان وارداتوں میں ملوث ہیں تو مجھے شبہ ہے کہ چوری کا مال

اسی کے پاس جا رہا ہے۔ تم نے ہی اس موسم سرما میں یہ رپورٹ دی تھی کہ اس کی کارڈیسی کے گھر کے باہر کھڑی

دیکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی نے ان لوگوں کی زبان بند کر دی ہو۔ ممکن ہے کہ اسی نے ہمارے مقتول کو بھی روکا ہو۔“

ٹیلر اس کے بارے میں جانتا تھا لیکن اس سے بھی براہِ راست واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس علاقے میں وہ ایک

بد معاش اور رہزن کے طور پر مشہور تھا۔ گو کہ اس کا قد صرف پانچ فٹ تھا اور لیکن اس نے ورلڈ کے ذریعے اپنا جسم

مضبوط بنا رکھا تھا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ٹیلر نے اسے سڑک پر کھڑے ہوئے دیکھا تھا جیسے وہ اسے ایک انگلی سے

سلیوٹ کر کے چیلنج کر رہا ہو۔

دیکس کیڈنی کالج میں کچھ دیر رکنے کے بعد وہ میک ایلی کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ گیون نے گاڑی میں

بیٹھے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے کوئی بھی گزشتہ روز کلاس میں نہیں گیا۔“

”اب ہمارے پاس کیا باقی رہ گیا ہے۔“ ٹیلر نے کہا۔ ”اس حقیقت کے علاوہ کہ وہ کہیں نہیں گئے اور انہوں

نے کچھ نہیں کیا جو ہم شروع سے جانتے ہیں۔“

سارنٹ گیون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس نے ایک مناسب جگہ پر گاڑی روکی

اور اترتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں رکوں گا اور تم اس سے بات کرو گے۔ ہمارے درمیان پہلے ایک تنازعہ ہو چکا ہے

اور میں اسے دہرائی نہیں چاہتا۔ اس لیے آج تم اس کے سامنے جاؤ گے۔“

یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر ایک مکان کی جانب بڑھ گیا۔ ٹیلر اس کے پیچھے پیچھے گیا تو وہ ایک لکڑی

کے بنے ہوئے گیرج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ یہاں رہتا ہے۔“ اس نے ایک اپارٹمنٹ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آگے بڑھو۔“

ٹیلر مشتبا انداز میں اپنے پاس کی طرف دیکھتے ہوئے

اکیلا بی تھا۔“

”اکیلا۔“ گیون نے دہراتے ہوئے کہا۔ ”بہت

افسوس کی بات ہے۔ یہ سن کر میرا رونے کو دل چاہ رہا ہے۔“

بلیز نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اکیلے رہنا پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی جرم نہیں۔“

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہیں چند اداروں کی جانب سے وظیفہ ملتا ہے۔“ گیون نے اچانک ہی موضوع بدل

دیا۔ ”اور ان کی مدد سے تم آگے بڑھنے کی توقع کر سکتے ہو؟“

”ہاں۔“ بلیز نے پرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے کچھ نے مجھ سے بات کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں

دیکس سے ہی کرپویشن کروں۔ اب تک سب ٹھیک جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اگلے موسم گرما تک کوئی خوش خبری سننے کو

ملے گی۔“

”کیا کسی بڑے وظیفے کی بات ہو رہی ہے؟“ گیون نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔“ بلیز نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ ڈیڈ کی کا بزنس ختم ہونے سے ہمیں

مالی مشکلات کا سامنا ہے۔“

”اگر کس۔“ گیون نے اچانک اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ یہ بات

اسکول سے ہی معلوم ہو سکے گی کہ گزشتہ روز کلاس میں ٹائٹ کلاس اینڈ کی تھی۔“ پھر اس نے بلیز کی طرف مصافحہ

کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے مل کر خوش ہوئی۔ اس موسم خزاں میں ٹی وی پر تمہارے بیچ ضرور

دیکھوں گا۔ میں تمہارا بہت بڑا پرستار ہوں۔“

پھر وہ تھوڑا سا جھکا اور رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”شاید تم اپنی ٹریڈی کوفون کر کے بتانا

چاہو کہ تم سے پوچھ کچھ مکمل ہوئی اور تم محفوظ ہو۔ وہ پریشان ہو رہی ہوگی۔“

☆☆☆

”وہ بہت پریشان لگ رہا تھا باس۔“ واپس آتے ہوئے ٹیلر نے راستے میں کہا۔ ”اگر ہم اس سے مزید پوچھ

کچھ کرتے تو وہ سچ اگل دیتا۔“

”نہیں، اس کے لیے بھی اسے اوپر کے احکامات کی ضرورت ہوتی۔“

”تمہارا اشارہ ٹریڈی کی جانب ہے؟“

”شاید۔“ گیون نے کہا۔

جال

موجودگی کو محسوس کر کے میک کی آنکھوں میں بھی حیرت اُتر آئی تھی۔

”تم کچھ نہیں کرو گے۔“ گیون نے اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا اور میک کو اٹھنے میں مدد دینے لگا۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”اسے ہمارے ساتھ کام کرتے ہوئے چند ہی مہینے ہوئے ہیں مسٹر میک ایف، یہ صرف اپنا تاثر قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ نوجوان خون ہے۔“

”اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر تم نہ روکتے تو میں اسے مزہ چکھا دیتا۔“ میک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اگر اجازت ہو تو میں بھی بیٹھ جاؤں۔“ اس کا ہاتھ ابھی تک میک کے کندھے پر تھا۔

میک نے اشارات میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں ابھی تک ٹیبلر پر جمی ہوئی تھیں۔ ”ٹھیک ہے میں اس بات کو سنبھال ختم کرتا ہوں۔“ وہ اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں اس سے بات نہیں کروں گا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ وہ یقین دلاتے ہوئے بولا پھر اس نے ٹیبلر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہو گا کہ تم دروازے کے باہر انتظار کرو۔ جب تک تمہارا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔“

ٹیبلر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ تبھی اس نے اپنے پاس کو کہتے ہوئے سنا۔ ”اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے کرس..... کیا میں تمہیں کرس کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟“

”کوئی بات نہیں۔ میں اسے بھول چکا ہوں اور تمہاری عزت کرتا ہوں۔“

”شکریہ کرس..... تم مجھے گیون کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ ٹیبل کے نیچے سے کافی پانی گزر چکا ہے۔ اب ہم اسے بھلا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔“ پھر وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم نے اسٹیشن کی موت کے بارے میں سنا ہو گا۔“

میک نے غماخ انداز میں سر ہلا دیا۔

”اور تم اس کے کچھ دوستوں کو بھی جانتے ہو گے؟“

اس بار اس نے نفی میں سر ہلایا اور کندھے اچکا تے ہوئے بولا۔ ”میں ایسا نہیں سمجھتا، وہ سب نوجوان لڑکے ہیں۔“

”گویا تم انہیں جانتے ہو؟“ سراخ رساں طنزیہ

اس مکان کی جانب بڑھا تو پیچھے سے آواز آئی۔ ”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

ٹیبلر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتا، اس نے اپنے آپ کو ان سیز جیوں پر پایا جو گھر کے دروازے تک جا رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر پاس کی طرف دیکھا اور سیزھیاں چڑھ کر دو مرتبہ دروازے پر دیک دئی جب کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے کچھ دیر بعد یہی عمل دہرایا۔

”کیا بات ہے؟“ میک ایف نے چلاتے ہوئے کہا۔ وہ اچانک ہی میس پیٹنے بغیر دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔ ٹیبلر نے اسے اپنا بیچ اور شناختی کارڈ دکھایا تو وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں مسٹر میک ایف۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟“

”ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اکیلے ہو۔“

ٹیبلر کو اچانک ہی احساس ہوا کہ گیون اس کے پیچھے نہیں آیا اور نہ ہی کہیں دکھائی دے رہا ہے۔ میک ایف نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے ہو تو وارنٹ لے کر آؤ۔“

ٹیبلر اپنا پاؤں دروازے کی چوکت پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”دروازہ بند مت کرنا۔ تم بے رول پر ہو اور میں ایک پولیس آفیسر۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور وہ دوبارہ کھل گیا۔

میک ایف اپنے ہی زور میں لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی جانب کافی کی میز پر جا کر۔ جہاں پہلے سے ہی بیئر کی خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ لٹو لٹو کر فرش پر گر گئیں۔

ٹیبلر غصے سے بولا۔ ”ایک بات اور۔ اب اگر کوئی بہرول کا رتہا رے پاس سے گزرے تو اسے عزت دینا۔ اگر آئندہ تم نے اس پر انگلی اٹھائی تو تمہاری خیر نہیں۔“

”تم مجھے پریشان نہیں کر سکتے۔“ میک چلاتے

”ئے بولا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ ”میں تمہارا سر توڑ دوں گا.....“

”سراخ رساں۔“ ایک جانی پہچانی آواز اس کی

ساتھ سے لگائی۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

ٹیبلر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ میک کو اس

آخری فاصلہ چھٹکا چاہ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نووارد کی

مداخلت کرنا پڑی۔ ”گیون نے کہا۔ ”البتہ مجھے کوئی پیکش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں صرف ان بچوں کے نام لیتا اور باقی اس کے سوچنے کے لیے چھوڑ دیتا۔“

ٹیلر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ گیون نے ایک غلطی کا اعتراف کر لیا تھا۔ وہ اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ”اب کیا کرنا ہے؟“

”آج کا کام ختم ہوا۔ اب ہمیں گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔ اس معاملے کو کل دیکھیں گے۔“

☆☆☆

”میں بہت تھک گیا ہوں۔“ ٹیلر فریاد کرتے ہوئے بولا۔ ”میری آنکھیں لگی تھیں کہ ڈسپنسر کا فون آ گیا۔“ اس کے سامنے کافی کا تیسرا کپ رکھا ہوا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔

”بہتر ہے کہ تم کافی ختم کر لو۔“ گیون بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ یہ وہی لوگ تھے۔“ اس نے گزشتہ شام ہونے والی ڈکیتیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

”نوجوان سراغ رساں نے اپنا سر تھام رہا تھا تو ہوا۔“ گیون نے کہا۔ ”ہاں، یہ وہی لوگ تھے۔ انہیں پرانے مکانوں کی دچ سے یہ علاقہ پسند ہے کیونکہ ان میں سے زیادہ تر میں سکیورٹی کسمرے نہیں لگے ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈکیتوں کی گزشتہ لہر کے باوجود ان کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ان میں سے دو جگہوں پر پہلے بھی واردات ہو چکی ہے لیکن ان کے مالکان نے اپنے آپ کو یا ڈاکوؤں کے بجائے ہمیں مورد الزام ٹھہرایا۔“

”مجھے ایک جگہ سے سگریٹ کا کٹلا ملا ہے جبکہ مالک کا کہنا ہے کہ ان کے گھر میں کوئی سگریٹ نہیں بیٹا۔“

”مار لبرو منٹھول.....؟“ ٹیلر نے پوچھا۔

”اگر تم میک کے بارے میں سوچ رہے ہو تو یہ درست نہیں۔ وہ سگریٹ منٹھول نہیں تھا۔ تم نے کچھ دریافت کیا؟“

”ہمیں ایک نیکے ملا جو ڈاکوؤں نے ایک مکان سے اٹھا یا تھا تاکہ دوسرے مکان کی کھڑکی توڑ سکیں۔ میں ایک کتے کی مدد سے اس مکان تک پہنچ گیا جس میں وہ داخل ہوتے تھے لیکن مالک مکان نے کہا کہ اس کے یہاں ڈکیتی نہیں ہوئی اور وہ سکیورٹی سسٹم کی وجہ سے بچ گیا۔“

”مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔“ گیون نے تمبرہ کیا۔

”پھر کیا ہوا؟“

”ٹیلر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”کچھ نہیں باس۔“

انداز میں بولا۔ ”ٹریسی مینڈل، بلیز او برے وغیرہ وغیرہ۔“

”میرا مطلب ہے کہ میں نے انہیں دیکھا ضرور ہے۔ یہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“

”بالکل۔“ گیون متفق ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور تمہیں ان کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ تم اس لڑکی کے پاس جاتے رہتے ہو؟“

”ایک منٹ۔“ اس نے احتجاج کے طور پر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔

”کیا وہ تمہارے لیے کام کر رہے ہیں یا صرف چوری کا مال تمہیں لاکر دیتے ہیں۔ ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس لڑکے کے ساتھ کیا ہوا۔ تمہارے پاس اپنے آپ کو بچانے کا یہی ایک موقع ہے ورنہ تم ہماری نظر میں سب سے زیادہ مشتبہ ہو۔ ممکن ہے کہ تمہارا مقصد اس کو نقصان پہنچانا نہ ہو لیکن اس صورت میں بھی بہتر ہے کہ تم وضاحت پیش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔“

کرس نے اپنی آنکھوں کو دائیں بائیں حرکت دی پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور وہ گیون کی طرف ایک انگلی کرتے ہوئے بولا۔ ”تم اس جگہ کی تلاشی لے سکتے ہو۔ یہاں کوئی غیر قانونی چیز نہیں ہے۔ نہ تو چوری کا مال اور نہ ہی نشیات۔ اگر واقعی تمہیں کچھ مل گیا تو مجھے جھکڑی لگا سکتے ہو لیکن تم یہاں صرف مچھلیاں پکڑنے آئے ہو۔ ان بچوں نے تم سے کچھ نہیں کہا کیونکہ ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات نہیں ہے۔ میں دوبارہ جیل جانا نہیں چاہتا کیونکہ اب میری عمر زیادہ ہو گئی ہے۔“

گیون نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اچھی امید رکھنی چاہیے لیکن اس معاملے پر جلدی سوچو۔ میں تمہاری زبان سے سنا چاہتا ہوں ورنہ میرے بس میں کچھ نہیں رہے گا۔ تم دوبارہ جیل جانا پسند نہیں کرو گے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ اصلاتی مرکز میں انفران دوسرے قیدیوں کو بتائیں کہ تم نے کس طرح ایک لڑکے کو مار دیا کیونکہ وہ تم سے بے ایمانی کر رہا تھا۔“

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔ ٹیلر بھی اس کے پیچھے پیچھے کار تک آیا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ ”مجھے تم سے شکایت ہے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں۔ ہر دائرہ کو اپنے ماتحتوں سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔“

”تم نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے

جال

پولیس نے میک کو حراست میں لے لیا تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے لگ رہا تھا کہ اس نے گرفتاری دینے میں کچھ مزاحمت کی تھی اور وہ بہت بُرے حال میں نظر آ رہا تھا۔ گیون نے ان دونوں پولیس والوں کو باہر جانے کا حکم دیا جو اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان میں سے ایک نے کمرے سے نکلے وقت گیون کے خطرناک تصور بھانپتے ہوئے کہا۔ ”تمت بھولو سار جنت کہ یہاں کسرا لگا ہوا ہے۔“ گیون نے غیر ارادی طور پر اوپر کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”دردازہ بند کر دو۔“

میک اپنی ابھی تک قیص کے بغیر تھا۔ اس کی کہنیوں اور داہنے گال پر تازہ خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ گیون اسے دیکھ کر مطمئن انداز میں مسکرایا جبکہ میک کی نظریں فرش پر تھیں اور اس کی ایک کلائی دیوار میں نصب زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔

”میں مختصر بات کر دوں گا۔“ گیون غراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے لڑکی چاہیے، ابھی اور اسی وقت۔ تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

میک اپنا چٹخا سر ہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔“

”تم اس کے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہو۔ میں نے ایک ڈسکی کی واردات سے تمہارا اور اس لڑکی کا ڈی این اے لیا ہے۔“ گیون نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ ”وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ تمہیں اس کا پتا چل گیا اور تم نے اسے غائب کر دیا۔ یاد کرو میک۔ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا کہ دوبارہ اندر جانا نہیں چاہتے۔“

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ میک احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ”تم میرا ڈی این اے نہیں لے سکتے کیونکہ میں کبھی کسی ڈسکی میں شامل نہیں رہا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ ”مجھے تمہارے گھر سے دو چیزیں ملی ہیں جن سے بہت کچھ معلوم ہو رہا ہے۔ اب تمہارے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ تم کتنے عرصے کے لیے اندر جاتے ہو۔ درنہ جو سچ ہے وہ بتا دو۔“

میک چند لمحوں تک اپنی پوزیشن پر غور کر تا رہا پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے کچھ جگہیں منتخب کر رکھی ہیں جہاں میں چوری کا مال اپنے جانے والوں کو بچتا ہوں۔ وہ نیچے چوریاں کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آئے۔ جب اسٹیشن کا کل ہوا تو بلیر پاگل ہو

نے ایک بار فنٹ پاچھ پر بوسو گئی۔ آدھے ہلاک تک اس کا تعاقب کیا اور پھر رک گیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی کار میں سوار ہو گئے۔“

”کتنے گمراہ افسر کا بھی یہی خیال ہے۔“

”یہ دونوں چیزیں لیبارٹری بھیج دو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔“

☆ ☆ ☆

”میں کل شام سے اسے فون کر رہی ہوں لیکن جواب نہیں ملا۔“ آنٹی نے روتے ہوئے بتایا۔ ”وہ پاون سال کی تھی اور اس کا وزن دو سو پونڈ کے قریب تھا۔ ہم ہر ہفتے کی صبح ناشتے پر اکٹھے ہوتے تھے لیکن جب کوئی جواب نہیں ملا تو مجھے پریشانی ہوئی اور میں اسے دیکھنے چلی آئی۔“

”تم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا؟“ گیون نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ جب میں نے یہاں کا منظر دیکھا تو سمجھ گئی کہ کوئی واردات ہوئی ہے۔“

سار جنت نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔“ پھر اس نے سراغ رساں ایرکسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس جگہ کی اچھی طرح تلاشی لو۔ شاید تمہارے مطلب کی کوئی چیز مل جائے۔“

اس کا کیل فون بھی چیک کر دو۔“

”ہمیں اس کا فون چیک کرنے کے لیے وارنٹ

درکار ہو گا۔“ ٹیلر نے اسے یاد دلایا۔ ”اس بارے میں احکامات موجود ہیں۔“

”دفع کرو ان احکامات کو۔ یہ ایک ہنگامی صورت

حال ہے اور میں مارشل لا کا اعلان کر رہا ہوں۔“ اس نے

درازاہ بند کیا اور اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”کچھ

مہ نے ڈی این اے کے لیے لے لیتا۔ مثلاً اس کا ہیز

رٹ۔ کافی کپ، میلے کپڑے، وغیرہ وغیرہ۔“

ٹیلر ہنڈ روم کی طرف جانے لگا تو وہ بولا۔ ”دہاں

وہ وہاں اسکرین کا نمبر بھی نوٹ کر لیتا تاکہ چوری ہونے

والے اسکرین کے نمبروں سے اسے چیک کیا جاسکے۔“

☆ ☆ ☆

گیون کے پولیس اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی عیشی



طاہر حیات میڈل

سٹائیسویں قسط

انگلے

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پہاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیر داری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سپاہیوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اٹروں سوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ برنگی... ایک لہو رنگ اور

دل گداز داستان...



میں ڈنمارک سے پاکستان کی کسی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تالا کر دیا۔ میں نے سربراہ ایک ذہنی کراٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و انصافی کا ایسے سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے کھیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ نے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین بھٹانے کو کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور کھیل داراب کے دست راست اسپنڈل قیصر چوہدری کے سامنے بیٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس جبر کی سزا اسے یہی ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن کا تھوڑا سیٹ جلا کر رکھ کر دیا گیا اور وہ خواہش کر دیا کہ وہ جیل پہنچ گیا۔ اسپنڈل قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا پورے تین تین تھیں تھا، وہ سبلی پورپ کے کئی بڑے بڑے ٹیکسٹیر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچنے ہی پر زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کر وہاں ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں کا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ اتنی بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا فنڈ اصفیٰ معیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور علیہ دلائی کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والدین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدائی موت میں بھی اسی زمین دار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب پیار کی کاٹھاکڑی تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاد نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو ملہ آدروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ یہ دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ وہاں آنے کے بعد میں نے ہمیں بدل کر مولوی فدائی کے ملاقات کی اور اس سے بچنے پر پہنچا کر عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو لڑکھوایا گیا۔ ایک گھنٹا دیوار کے خاتمے کے بعد ہم گھر والوں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاد ڈاکو کے ڈیرے پر پہنچا۔ یہاں سجاد کی ماں (دائی) مجھے اپنا ہونے والا جوانی بھی۔ جس کی پوتی مہنا عرف مانی سے میری بات ملے تھی۔ یوں سجاد سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاد نے میرا مقابلہ باقرے سے کر دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاد کو مقابلے کا بیڑا کھینچ کر دیا۔ میرے بیٹے نے سجاد سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگا گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا کھوکھوہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاد اور عالمگیر میں دراز ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوج مقابلے کے بارے میں سوچے سوچے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے لکڑی باری گینک کے لوگ تھے جس کا سرغندہ جان ڈیر کر تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست وزی کی کے ساتھ اجتماعی حملہ کیا، پھر وزی کی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ مجھے چھ ماہ بھولنے ہوئی۔ پھر میرا رحمان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور انیشننگ کی حیثیت سے MMA کی فائنل میں جھلک کر تاجور اور دوسری طرف اسکاٹس کی اوٹ میں کھسار کی گینک کے غنڈوں سے برسر پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاد سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاد کا دل جیت لیا۔ سجاد سے کہہ کر میں نے اپنی کوبو لایا۔ سجاد ایک حسین و شیزہ کوبو لایا تھا کہ ان کی طرح سچا سنوار کر ریان فرداں (وہ صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیس اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فرداں کے کھلے نمائندے پاراڈاس پہنچے۔ وہاں صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ بروٹائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ بروٹائی میں اس کی خاندانی خوشی چل رہی تھی۔ سجاد کو پاراڈاس میں گلیڈی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پاراڈاس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کون لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں ہر بلا مضر پایا جاتا ہے۔ زینب والا حاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اٹھایا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے بولکھیاں تیار کی گئیں، وہ پاراڈاس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاد پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زیر پلاٹین موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں امداد لائی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو گاہہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یوں کہ ابراہیم پریشان ہو گیا۔ آخر آقا جان جو پاراڈاس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغندہ نائب کے فرار کا ڈنمارک جایا۔ ایک بار پھر پاراڈاس میں معاملہ کونج اٹھے۔ تاجور کو لڑکیاں چلیں اور مقابلے میں سرغندہ نائب اور اس کا ساسی جبریت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے ان کا خون نہٹ کر اپنا حقیقت کھل کر سامنے آئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ نائب امداد کے بعد بروٹائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے ڈوے صاحب کے برادر سبکی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی ہیگ صاحب کا روبرو کر برا حال تھا، امداد کے بعد آواز مہونے کے لیے میں اور سجاد ڈوے صاحب کے ساتھ بروٹائی جانے کے لیے تیار تھے۔ بروٹائی جانے سے پہلے میں

انکارے

الہ نگر تاجر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجر کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چھ لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔
 ۷۔ سامنے دو بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پاراؤں تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی
 لڑائی کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ بردہ لائے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور
 امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بیٹی قطیہا کمانڈر اور بیوی وارثہ سیفی تھیں۔ وہ ایٹرن کنگ کی
 مہلت سے جان کٹی تھی۔ میں کئی بار میں اس کے ہمراہ پارہاں فرانس کی پہلی بوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں برقی جاری تھیں۔ مجھے شروع
 ۸۔ آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے تار چٹلے لے گیا۔ میرے ساتھ جان بھی اس کی لپیٹ میں آئی۔ جانوں کی نہ کی طرح مجھ
 ۹۔ تک پہنچی وہ زخموں سے چور تھی۔ آقا جان اور علی نے خون کی منصوبہ بندی کی تھی۔ بالاخر میرے جو خدشات تھے وہ حرف بہ حرف درست
 ۱۰۔ ثابت ہوئے۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے نکل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور فساد و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بھاوی
 ۱۱۔ گئی۔ اس حملے میں ریان فرانس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے
 ۱۲۔ ہان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ہم سب پر زمین پر آسائش نہ خانے میں منتقل ہو چکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے
 ۱۳۔ ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دوچار
 ۱۴۔ تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ نہایت ہوشیاری سے ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ اور میں اس حملے میں جا بچا جان رائے زل اور
 ۱۵۔ آقا جان کی نیم موجودگی۔ میں نے رائے زل کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا اور یہ کارنامہ انجام دے ڈالا تھا۔ ہمارا منصوبہ تقریباً کامیابی سے
 ۱۶۔ اٹھارہ ہوا تھا۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ رائے زل بالکل شیک ہے۔ اس پر اس کی جگہ تھی رائے زل تھا۔ ہم پر زمین میں مقید تھے۔ رائے زل زندہ
 ۱۷۔ ہے یہ خبر بہت ہی دل سو گئی۔ ہم خون کے گھونٹ پی کر وہ حملے مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لڑائی میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک
 ۱۸۔ باوجود موجودگی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے لٹکانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تہارک باہر جاتے ہیں مگر پتا چلتا ہے کہ باہر
 ۱۹۔ ابھی کے لوگ تھے۔ تہارک پھل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ابھی کے ہتھے چڑھ جاتے
 ۲۰۔ ہیں۔ بے تحاشا تشدد دینے کے باوجود ہم قطیہا اور ابراہیم کا پتا نہیں پتا تھے۔ سیف کی بری حالت تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے
 ۲۱۔ الیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اہمال بہت برا تھا۔ امریکی لوگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ بردہ لائی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں
 ۲۲۔ رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے ہمارا براہ منے تھے۔ ان کا ایک ہی تقاضا تھا کہ اب بارود
 ۲۳۔ نام جاؤ۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارے قافلے کا رخ اب ڈی جیس کی جانب تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہوئے کہا۔ "ایئنق نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم راجر کو قتل دے
 رہے ہو۔ اس سے کہہ رہے ہو کہ گولی چلی بھی تو زیادہ
 ہلاکتیں نہیں ہوں گی۔ جواب میں راجر نے کہا تھا کہ یہ تو
 وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ راجر نے تمہیں یہ مشورہ بھی
 دیا تھا کہ تم اس کی بلٹ پر وف جیکٹ لیکن لو۔ تم نے کہا تھا،
 جب سیکورڈ ہزاروں لوگ بلٹ پر وف جیکٹ کے بغیر آگے
 بڑھیں گے تو ہم بھی بڑھ سکتے ہیں اور ویسے بھی بلٹ پر وف
 زندگی کی ضمانت تو نہیں ہوتی۔"

پال خاموشی سے میری جانب دیکھتا رہا۔ میں نے
 کہا۔ "تم نے کئی گھنٹے میں یہ باتیں؟"
 پال نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سانس لے کر
 بولا۔ "اور اسی لیے تم نے مجھے جیکٹ منگو کر دی تھی۔"
 "پھر بھی تمہارا کندھا تو زخمی ہو ہی گیا۔" میں نے
 کہا۔

"یہ کچھ بھی نہیں ہے میرے دوست! میں تمہاری مدد
 کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم
 حق پر ہو اور ان لوگوں کے کندھے سے کندھا مل رہے ہو جو

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ زیب؟" پال کی آواز میں
 ارتعاش تھا۔

"یہ ہوا ہے پال، بکتر بند گاڑیوں کی طرف جھپٹنے سے
 پہلے مجھے اور میرے ساتھی ایئنق کو معلوم تھا کہ مشین گنوں کے
 منہ مل سکتے ہیں، تم صرف طفل لیلی دے رہے ہو۔"

"مگر کیسے معلوم ہوا؟" پال کی نیلی آنکھوں میں
 گھس آمیز حیرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے پال کے اس ساتھی کی طرف اشارہ کیا جس کا
 نام اس نے راجر بتایا تھا اور جو شکل و صورت سے کوئی انیسویں
 لاکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا۔ "چارچ کرنے سے چند منٹ
 پہلے تم نے راجر سے کسی جتنائی زبان میں تھوڑی سی بات کی
 تھی۔ وہ زبان یہاں کسی کو نہیں آتی تھی لیکن میرے پاس
 یہاں ایک ایسا جن ہے جو ہر طرح کی جتنائی زبان کو سمجھ سکتا
 ۶۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ تم دونوں میں کیا بات ہوئی
 ۷۔"

پال کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے
 ۸۔ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایئنق کی طرف اشارہ کرتے

ظلم کے پنجے میں ہیں۔“

پندرہ بکتر بند گاڑیوں میں سے دس بارہ ضرور ایسی تھیں جن کے گن مینوں کو ہت ہی نہیں ہو سکی تھی کہ وہ انسانوں کے سیلاب کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس پر مشین گن کا فائر کھول سکیں۔ ان بکتر بند گاڑیوں میں موجود زیادہ تر امریکیوں کی جان بچ گئی تھی اور قائم مقام جاسم کے حکم پر سرکردہ مظاہرین نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا مگر جن گاڑیوں سے فائر کھولا گیا تھا، ان کے سواروں کو جھوم کے قہرے کوئی نہیں بچا سکا تھا۔ آٹھ دس اہلکاروں کی ہلاکت یقینی تھی ابھی بہت سے شدید زخمی تھے۔ ایسے ہی ایک امریکی گاڑی کی لاش کو میں نے لوگوں کے پاؤں میں روندے جاتے دیکھا۔ ایک وہ امریکی تھا اور ایک یہ تھا جو میرے ساتھ جپ میں بیٹھا تھا۔ دونوں کے کردار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

جپ پر سے ہمیں حدنگاہ تک انسانی سراور لہراتے ہوئے پرچم نظر آتے تھے۔ اس بیکراں جھوم کو اب زیادہ دیر روکے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے باہمی مشورے کے بعد آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی میری اور عارفہ خاتون کی جھپیں آگے بڑھیں، جاسم والی جپ بھی حرکت میں آگئی۔ ان جھپوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر انسانی سروں کا بیکراں سمندر بھی متحرک ہو گیا۔

زمین جیسے دہل رہی تھی۔ آسمان جو حیرت تھا۔ کل کے قبل عام میں تین سو سے زیادہ افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ یہی قبل عام تھا جس نے آج لوگوں کو دوبارہ وار کھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قبل عام آقا جان نے جنس انفس کو دیا تھا۔ ظالم اور جابر حکمران اسی طرح اپنی پچاسی کا پھندا اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ عوامی رد عمل بس اتنا کرتا ہے کہ یہ پھندا ان کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔

ڈی پئیس کی بلند وبالا دیواروں تک ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آئی۔ دو کلو میٹر کے اس نہایت پُر جوش سفر کے دوران میں ہی ہمیں ایک خوش کن اطلاع بھی ملی۔ یہ اطلاع جاسم نے ہم تک پہنچائی، اس نے بتایا۔ ”شہر کے مشرقی ساحل سے گرے فورس کے تین بریگیڈ ایک بڑے کالوائے کی صورت میں ڈی پئیس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ اس نفری میں شامل ہونا چاہ رہے تھے جو ڈی پئیس کی حفاظت کر رہی ہے مگر عظیم الشان انسانی ریلے کی خبروں نے انہیں ہراساں کر دیا ہے اور وہ وہیں سے واپس نیوٹی کی طرف چلے گئے ہیں۔“

پال نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ کل والے قتل عام نے رائے زل اور آقا جان کو بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ جہاں عام لوگوں میں بے پناہ اشتعال پیدا ہوا ہے وہاں رائے زل کی فوج میں بھی کئی طرح کی چھ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ گرے فورس میں کئی لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح عزت مآب ریان فردوس کی فیملی نے آقا جان پر اندہ بھروسہ کر کے بہت نقصان اٹھایا اسی طرح عزت مآب رائے زل بھی اس شخص کو وسیع اختیارات دے کر غلط کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی کا خیر خواہ نہیں۔ بس اقتدار بھوکا ہے۔“

اب ہمیں ڈی پئیس کے بلند کس اور برجیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ نیوٹی کا بہت بڑا پرچم غامبانہ قبضے کی علامت بن کر ایک برجی پر لہرا رہا تھا۔ گرے فورس نے ڈی پئیس کے گرد مورچے بنا رکھے تھے اور خندقیں کھود رکھیں۔ بکتر بند گاڑیوں کی قطاریں، خاردار تاروں کے چھلے، ریت کی بوریاں، غرض دیوانوں کے راستے روکنے ہر سامان یہاں موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں گریبانوں کے ڈھیر بھی لگیں گے۔

”اب کیا کرنا ہے جناب؟“ جاسم نے براہ راست مجھ سے پوچھا۔

”تمہاری کیا رائے؟“

”لوگ آپ کے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ رکاوٹ سے ٹکرا جائیں گے۔ لاکھوں کے اس مجمع میں ہزاروں ایسے ہیں جنہوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکے ہوئے ہیں۔“

”یہاں اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بہت بڑی خونریزی بھی ہو سکتی ہے۔“ میرے لہجے میں بجا طور پر تشویش کی لہ تھی۔

پال نے اپنی نئی آنکھیں سیڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کی دھوپ میں بہت بلندی پر پہلی کا پٹر زک موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ پال بولا۔ ”اب یہ آخری مرحلہ ہے اور یہاں پر امکان فنی فنی کا لگ رہا ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو پال؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”یہاں بھی اگر جھوم، زل کر کے ڈی پئیس کی طرف بڑھے تو بے پناہ نفسیاتی دباؤ کام کر سکتا ہے، فائر کھولنے والے ذہنی منطوق ہو سکتے ہیں مگر اتنا ہی امکان اس بات کا بھی ہے کہ تخت یا تختہ کے مصداق، زمین اور فضا سے نیچے

ایک موقع دیا جانا چاہیے۔ ان کو بتایا جائے کہ سرنڈر کے سوا ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”جناب! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان کی طرف کوئی مذاکراتی ٹیم روانہ کی جائے؟“

”مجھے لگتا ہے کہ مناسب رہے گا مگر ہم ان مذاکرات کو ایک دو گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں دے سکتے۔ جامائی کے لاکھوں شہری اس وقت سڑکوں پر ہیں۔“

”آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں جناب۔“

”میں تمہاری حالت کی طرف سے بھی پریشان

ہوں۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ تم اپنے آپ پر بہت ظلم کر رہے

ہو۔ اتنے شدید بخار اور ایسے ”الکیشن“ میں تم پر کسی بھی

وقت بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے۔“

”آپ کی دعا میں ساتھ ہیں تو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“

”یہ لڑکی کون ہے؟“ محترم ذکری نے اچانک

موضوع بدلا۔ ”یہ تمہارے لیے مسلسل آنسو بہا رہی ہے اور

دعا میں کر رہی ہے۔“

”میں سمجھ گیا کہ وہ تاجور کا ذکر کر رہی ہیں۔ میں نے

کہا۔ ”وہ میری بہن وطن ہے حضرت! مجھ پر بے حد بھروسہ

کرتی ہے اور میری ہی وجہ سے ان حالات میں پھنسی ہوئی

ہے۔“

”کہا جا رہا ہے شاہ زیب کہ وہ تمہاری معیت ہے اور

کسی وجہ سے تم دونوں کے درمیان ناراضی چل رہی ہے۔“

”مم..... معیت والی بات درست نہیں ہے حضرت!“

”اس کا مطلب ہے ناراضی والی بات درست

ہے..... نہیں شاہ زیب..... میں نے اس لڑکی کی آنکھوں

میں سچے موتیوں کی پاک چمک دیکھی ہے۔ ایسی چمک مجھے

بہت ہی کم آنکھوں میں دکھائی دی ہے۔ اگر کسی وجہ سے تم

نے اس کا دل دیکھا ہے تو اس کی دلجوئی کرو۔ خاص طور سے

ایسے نازک موقع پر تمہیں اس کی بہترین دعاؤں کی ضرورت

ہے۔ ایسی دعا میں جن میں ناراضی کا شائبہ تک نہ ہو۔“

”محترم کہاں ہے وہ؟“

”بہت فرمانبردار اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔

میرے مع کرنے کے باوجود ابھی یہاں بیٹھی میری ٹانگیں دبا

رہی تھی۔ تم چند سیکنڈ ہولڈ کرو۔ میں اس سے تمہاری بات

کراتا ہوں۔“

محترم حاذق ذکری کے قدموں کی چاب اُبھری اور

پھر تھوڑی دیر بعد مجھے تاجور کی مدد آواز سنائی دی۔ ”شاہ

زیب! آپ کیسے ہیں؟ بہت خطرے والی خبریں مل رہی

لوگو! بدلی پارٹ کر دی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت سی

پاؤں ہل جائیں گی۔“

میں نے آگے تین بند کر لیں۔ دل و دماغ پر بے پناہ

یہ بوجھ اتنا شدید تھا کہ زخموں کی اذیت بھی پیچھے

پڑ گئی تھی۔ ایسے میں وہی نورانی چہرہ میرے تصور میں اُبھرا

اس نے کل رات کے آخری پہر مجھے مرکوز چھوڑنے سے

روکا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے ہزاروں چاہنے والوں

اس موقع پر اکیلا نہ چھوڑوں۔ اس شخص ترین مرحلے

میں میرا دھیان سیدھا محترم حاذق ذکری کی طرف کیا۔

مے دل نے گولہ ہی زنی کہ مجھے ان سے رہنمائی لینا

پڑے۔

میں دیکھ رہا تھا، قائم مقام ناظم جاسم کے پاس

ایک فون موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ چند

دقائق بعد میں محترم ذکری سے بات کر رہا تھا۔ وہ مرکوز

اسی گھر میں تھے جہاں تاجور بھی موجود تھی۔ محترم ذکری

نے لیکڑوں جانناز اور پاسان بریگیڈ کے لوگ اس جگہ کی

حفاظت کر رہے تھے۔

محترم ذکری نے کہا۔ ”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم اس

پارڈی میں نہیں رہ سکو گے اور نکل کر لوگوں کے درمیان

گلی جاؤ گے۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کو آگاہ کیے بغیر نکل

یا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔“

”جو ہو گیا سو ہو گیا..... اور شاید اچھا ہی ہوا۔ مجھے جو

اطلاعات مل رہی ہیں ان کے مطابق تم لوگ ڈی پٹیل کی

پارڈی تک پہنچ چکے ہو۔ یہ بڑی کامیابی ہے مگر حالات یہ

کی تیار ہے ہیں کہ بہت زیادہ خور بڑی بھی ہو سکتی ہے۔“

”میں اسی حوالے سے آپ کی رائے چاہ رہا ہوں

اب! میں تمہا اس ذمے داری کو نبھانے کے قابل نہیں

ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔“

”تم غلط کہہ رہے ہو شاہ زیب! تم تمہاری ذمے داری

کا لے کے قابل ہو اور تم نے اٹھا کر دکھائی بھی ہے..... باقی

بالتجربہ رائے ضرور دے سکتا ہوں۔ آخری فیصلہ تمہیں خود

لے لینا ہے..... اور میری رائے یہ ہے کہ ہمیں حتی الامکان

پارڈی سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہانا دانی اور اس کا

ان لاکھوں لوگوں کو دیکھ ہی چکے ہیں جنہوں نے پٹیل کو

ہار لیا ہے۔ وہ لوگ نتیجے ہونے کے باوجود اپنے

مے میں چٹانوں کی طرح مضبوط ہیں۔ ہانا دانی، رائے

اور ان کے گماشتے آقا جان کو..... صورت حال سمجھنے کا

"No."

حصولہ دیا۔

اسمیتان سے اور..... کراے سے جھٹی نوائانی سے
 ”

جاء -

تکلیف جھیلتا ہوا کنٹینر کے نچلے حصے میں چلا گیا۔ یہاں تین چار ”بنک بیڈز“ موجود تھے اس کے علاوہ ایک آرام دہ ڈبل بیڈ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ درحقیقت ایک اچھے بیڈ روم کی بیشتر سہولتیں اس نچلے پورشن میں موجود تھیں۔

پال کے مجبور کرنے پر میں ڈبل بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ زخم آگ کی طرح جل رہے تھے مگر میں اپنے تاثرات سے زیادہ ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ حالات کا رخ دیکھ کر فی دلی چھینٹنے کے لیے مجھے کچھ بدل رہے تھے۔ ایک چھینٹل پر نیوز کاسٹر اپنے فیڈر رپورٹر سے سوال جواب کر رہا تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے آگ صرف ان ہی ”پراپرٹیز“ کو لگائی جا رہی ہے جو آقا جان کی ملکیت ہیں؟“

”جی ہاں۔“ رپورٹر نے موبائل فون پر جواب دیا۔ ”ہماری اطلاعات کے مطابق یہ تقریباً ساری ”پراپرٹیز“ واڈ اگینی کی ہیں اور سب جانتے ہیں کہ واڈ اگینی میں آقا جان نے حال ہی میں یادوں فیصلہ حصہ خریدا ہے۔“

نیوز کاسٹر نے کہا۔ ”کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تشدد کی یہ لہر اس نسل عام کا نتیجہ ہے جو کل ”اسکوائرڈ“ ہووا اور جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اس کا آرڈر و محترم آقا جان کی طرف سے ہوا تھا۔“

”بالکل ایسا ہی لگ رہا ہے جی۔ آپ اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں جہاں آگ لگی ہوئی ہے وہاں واڈ اگینی کے سائن بورڈ بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ کروڑوں ڈالر مالیت کی اشیاء ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے راکھ ہو رہی ہیں۔“

فی دلی کی آدمی اسکرین پر آتشزدگی کے مختلف مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی جھلکی آقا جان کی بھی نظر آئی۔ اس کا نیم گنجا سر پیٹے سے تر تھا اور وہ کسی نیوز رپورٹر پر بڑی طرح برس رہا تھا۔

نیوز کاسٹر نے ایک تجزیہ نگار کو لائن پر لے لیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ آئندہ تین چار گھنٹوں میں حالات کیا رخ اختیار کرنے جا رہے ہیں؟ یہ تجزیہ نگار سرسراہٹے زل کی زبان بول رہا تھا۔ اس کی بکواس مستحیا کر رہا تھا۔ اینٹ نے جھیل بدل دیا۔

میری نگاہ کنٹینر کی کمز کی سے باہر گئی۔ کمز کی کے بالکل پاس مجھے خوردہ نظر آئی۔ اس نے اپنے دونوں رخساروں پر جاما جی کا دورنگا جھنڈا پیٹ کر رکھا تھا۔ اب وہ اپنے تیرہ چودہ سالہ خوب رو بیٹے کے چہرے پر ”آزادی“

میں لے گیا۔ ”اس حوالے سے یہاں کافی تجربہ کار لوگ ہیں جو کچھ بھی کرنا ہے آپ لوگ خود کریں مگر ہم ایش ہے کہ اس بات چیت کو تین چار گھنٹوں سے وقت نہ دیا جائے۔“

”ہمارے یہی کوشش ہوگی جناب! ہم آپ کو ساری طرح حال سے مسلسل باخبر بھی رکھیں گے۔“

میں نے پال کی طرف دیکھا، اس نے بھی تائیدی اشارے سر ہلایا۔

میرے دونوں ڈاکٹر نے ایک بار پھر معائنہ کیا۔ وہ ہار یہی کہہ رہے تھے کہ مجھے ”ہا پھلا رڈ“ کے جانے کی اورت ہے۔ میرے جو زخم ٹھیک ہو رہے تھے وہ بھی پھر بگڑنے لگے تھے۔ خصوصاً جہاں سے مردہ جلد کا ٹکڑا لگی تھا۔ یہیں انفیکشن زدہ تھیں۔ بخار کی شدت بھی صرف دو اونس وچ سے کم محسوس ہوتی تھی۔

شام کے سائے بڑی تیزی سے پھیلے اور پھر جاما جی کی س آن ہو گئیں۔ مذاکرات جاری تھے۔ نو بجے کے عوام نے اور خواص نے جیسے تیسے پیٹ پوجا کی۔ اسی ران میں خبر ملی کہ رائے زل اور آقا جان نے انجینی سے دورہ کرنے کے بعد باذان کی رہائی والی شرط مان لی ہے مسٹر باذان کو مذاکرات کے لیے جیل سے رہا کیا جا رہا ہے۔

اس بات کا صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ مذاکرات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے، ہو سکتا تھا کہ ہمیں کل صبح تک انتظار کرنا پڑتا۔

رات دس بجے کے لگ بھگ دو بڑے کنٹینرز ہجوم سے راستہ بناتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کنٹینرز کے چاروں طرف بلب پروف چادریں تھیں اور ان اردوں پر جاما جی کے جھنڈے پر پٹ تھے۔ اس کے علاوہ ان پر شہید کاٹھرا افغانی، قسطنطین اور میری تصویریں نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ (میری تصویر جہاں بھی دکھائی دیتی تھی یہ فی دلی حالت والی تصویر ہوتی تھی)

جاسم نے بتایا۔ ”عمائدین نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈی ایس کی طرف بڑھتے وقت آپ، مسٹر پال، عارفہ بی بی اور لکھنؤ افراد اس کنٹینر پر سوار ہوں گے۔ فی الوقت یہ کنٹینر آپ لوگوں کے آرام کے کام آئے گا۔ خاص طور سے آپ کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے شاہ زیب صاحب۔“

جاسم ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے دو چار گھنٹے آرام کی ضرورت تھی۔ میں اینٹ کا سہارا لیتا ہوا اور گود کی

”میں نے پوچھا تھا لیکن تم نے کہا تھا کہ خود تو بتائیں گے۔“

ایشق نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر طویل سانس لی۔ کنٹینر کی کھڑکیوں سے باہر جھوم کا دلولہ ایک مسلسل شور کی صورت میں ڈھلا ہوا تھا۔ لیکن کنٹینر کے اندر یہ شور بچار ساٹھ فیصد کم تھا۔ ایشق نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں جناب کہ اگر خورسنہ صاحبہ نہ ہوتیں تو شاید آپ کو ہماری لاشوں اور سراغ بھی نہ ملتا۔ انہوں نے ہماری جان بچائی اور جاناچر تک پہنچنے میں ہماری بہت مدد بھی کی۔ درحقیقت اگر یہ کہ جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہم نے ٹاپو والی پناہ گاہ سے نکل کر سخت غلطی کی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہم رات کی تاریکی اور بارش کا فائدہ اٹھالیں گے اور کسی طرح ساحل پہ پہنچ جائیں گے۔ ہمارے پاس ریز کی ایک چھوٹی سی کشتی تھی جس میں دتی پب سے ہوا بھری جاتی ہے۔“

”تم شروع سے بتاؤ گے تو کچھ پتا چلے گا۔“ میں نے اسے ٹوکا۔

وہ بولا۔ ”بچھلے بیٹھے جب ہم نے ٹی وی پر دیکھا کہ یہاں حالات خراب تر ہوتے جا رہے ہیں اور آپ کو نارچہ سیل میں شدید ترین اذیت پہنچائی گئی ہے تو ہماری برداشت جواب دینے لگی۔ میں نے سجاد سے مشورہ کیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ہر صورت باہر نکلیں گے۔ سب سے پہلے ہم نے یہ بارودی پینٹکس ڈھونڈیں اور عہد کیا کہ گرفتاری کی صورت میں ہم بلاتا خیر خود کو اڑالیں گے۔ اس کے بعد ضروری سامان اور ریز بوٹ کے ساتھ ہم دیا نے تک پہنچے اور پتھر سرکا کر باہر نکل آئے۔ باقی سامی ہماری اس کارروائی سے بالکل لاعلم تھے۔ اس رات تیز بارش بھی ہو رہی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ شاید ہم نگرانوں کی نظروں سے بچ جائیں گے۔“

”بہت غلط خیال تھا۔“ میں نے کہا۔

”بجا کہہ رہے ہیں آپ، یوں لگتا ہے کہ ان خبیثوں نے وہاں چپے چپے پر رائل بردار بٹھار کئے ہیں۔ ہم بمشکل دس پندرہ قدم دور ہی گئے تھے کہ کسی نگران کو شک ہوا۔۔۔۔۔۔“

”ہالٹ۔۔۔۔۔۔ ہالٹ“ کی آوازیں آئیں اور سرچ لائٹس گردش کرنے لگیں۔ ہم اتراپی کی طرف دوڑے اور کنارے کے قریب ایک ابھری ہوئی چٹان کے نیچے کچڑ میں چھپ گئے۔ ہماری پلاننگ غلط ثابت ہو چکی تھی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم کسی سسٹن کنارے پر ریز بوٹ میں ہوا بھریں گے اور چھوٹے چھوٹے چھوڑوں کے ذریعے ٹاپو سے

کے حروف پینٹ کر رہی تھی۔ آخری حرف پینٹ کرنے کے بعد وہ قریب کھڑے سجاد کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ابھی تک سمجھ پر بت سکھ والے گیٹ آپ میں تھا۔ خورسنہ، سجاد کے چہرے پر بھی کچھ لکھنا چاہ رہی تھی مگر وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سجاد کا چہرہ گہری سنجیدگی میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھنے والا عموماً خوف زدہ ہو جاتا تھا مگر خورسنہ اور اس کا بیٹا، سجاد سے کافی بے تکلف دکھائی دیتے تھے۔

سجاد نے چہرے پر پینٹ کروانے سے مسلسل انکار کیا تو خورسنہ نے رنگ اور برش اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھمایا اور عقب میں جا کر سجاد کو اس طرح جکڑ لیا کہ سجاد کے بازو بھی خورسنہ کی گرفت میں آ گئے۔ ”کرو انکل کو پینٹ۔“ وہ بولی۔

”مجھے ایسا مذاق چنگا نہیں لگتا۔“ سجاد نے پکامندہ بنا کر کہا۔

”لیکن مجھے تو بہت چنگا لگتا ہے۔“ خورسنہ نے سجاد کے ہی لہجے میں کہا۔

خورسنہ کی گرفت میں یقیناً اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ سجاد جیسے گراؤنڈیل کو بے بس کر سکتی۔ اسے سجاد کی مہربانی ہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ زبردستی نہیں کر رہا تھا بھر غالباً اس نے مدم لہجے میں خورسنہ سے یہی کہا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ چھوڑا بہت پینٹ کروا لیتا ہے۔

خورسنہ نے اسے چھوڑ دیا مگر اس کے عقب میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی رہی۔ خوش رولر کے نے سجاد کے ایک رخسار پر ایک چھوٹا سا جھنڈا بٹایا اور خوش ہو گیا۔ سبکین ترین حالات میں ان لوگوں کی یہ ہلکی پھلکی مصروفیت اس امر کی گواہ تھی کہ لوگوں کے حوصلے بلند ہیں اور وہ مستقبل قریب کے نقشے میں کامیابی کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔

میں نے بڑبازانہ اردو، ایشق سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے، لگتا ہے کہ دو دنوں میں ہی سجاد اور یہ خورسنہ کافی قریب آ گئے ہیں؟“

”نہیں جی۔ اتنی جلدی بھی نہیں ہوا یہ سب کچھ۔ یہ تانا بانا چند دن چپچے تک گیا ہوا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”آپ نے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اور امریش۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے سجاد صاحب ٹاپو سے نکل کر یہاں تک کیسے پہنچے؟“

چلے گئے۔ بارش کا شور اور بادلوں کی گرج چمک یہاں معدوم ہو گئی۔“

ایق کی روداد دلچسپ تھی مگر میرے ذہنوں میں لگی ہوئی آگ مجھے کسی پہلو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ خصوصاً جہاں پسلیوں پر سے اسکن کاٹی گئی تھی وہاں بہت تکلیف تھی۔ ویسے بھی اب اپن کلر انجکشن ”ری پیٹ“ کیا جاسکتا تھا۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر نے ایک انجکشن مزید دے دیا، یہ فوری ریلیف دیتا تھا۔ کچھ سکون ملا تو ڈاکٹر کے اصرار پر میں نے ایک اور اندرجی بار برکھا کر ایک برگر کے چند لقمے لیے۔ اس دوران میں ایتق نے اپنی باقی روداد سنائی۔

وہ بولا۔ ”اس لالچ میں دو اداؤں کی بومگی۔ یہ زیادہ تر مقامی طور پر تیار کی گئی دیسی ادویات تھیں۔ کچھ جڑی بوٹیاں خام شکل میں بھی یہاں موجود تھیں۔ سنگھاڑے کی شکل والا ایک مقامی پھل (جو ایک مرتبہ سیف بھی لایا تھا) تین چار بور یوں میں یہاں اسٹور کیا گیا تھا۔ کچھ دیگر خشک نباتات بھی اسی طرح جہاں ”اسٹورڈ“ تھیں۔ خورسنہ نے فرش کے چند چوٹی تختے اپنی جگہ سے ہٹائے اور ہمیں ایک چھوٹے سے تاریک خلا میں گھسا دیا۔ یہ مستطیل جگہ بمشکل دس مربع سات فٹ کی ہوگی۔ اس کی چھت چار فٹ سے بلند نہیں تھی۔ ہم اس میں بس جھک کر بیٹھ سکتے تھے۔ خورسنہ نے تختے دوبارہ جوڑ دیے۔ پھر ہمیں آواز سے پتا چلا کہ اس نے ایک دو بور یوں کے منہ کھولی دیے ہیں اور ان میں موجود سنگھاڑے جیسا پھل فرش پر بکھر گیا ہے۔ خورسنہ اس لالچ میں اکیلی تھی مگر چند منٹ بعد کچھ اور لوگ بھی لالچ میں داخل ہو گئے۔ آدازوں اور لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ خورسنہ کے ساتھی ہی ہیں۔ وہ لمبے ہمارے لیے شدید تناؤ والے تھے شاہ زیب بھائی۔“

ایق نے جھرمجری سی لی اور..... بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر خورسنہ وہ نہیں تھی جو اس نے ظاہر کیا تھا..... تو پھر ہمیں کسی بھی وقت اپنی دھماکا خیز پھلتس کی ڈوریاں کھینچنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی شدید ٹین ٹین کے بعد ہمارے اندیشے زائل ہونا شروع ہو گئے۔ ہم دم سادھے اپنی جگہ بیٹھے رہے اور باہر سے آنے والی آوازیں اور آہٹیں سنتے رہے۔ شکاری چاقو کے حملے سے امریش..... میرا مطلب ہے سچاول کی کلائی اور ٹانگ پر کٹ آئے تھے۔ خورسنہ نے کہا تھا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد دوبارہ آئے گی لیکن ہمیں زیادہ دیر اس کا انتظار کرنا پڑا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ کتنی دیر؟“ ایتق نے پوچھا۔

اور جانے کی کوشش کریں گے مگر اب ہر طرف سرج لائش حرکت کر رہی تھیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم بڑھوٹ پر یہاں سے نکل سکتے۔ چند ہی منٹ میں ہمیں اپنے ارد گرد بھاری بوٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پتا چل رہا تھا کہ گھبراہٹ ہو رہا ہے۔ ہم دلدلی زمین پر چلتے اور پھٹتے ہوئے سمندر کے ساتھ ساتھ قریب ایک فرلانگ آگے نکل گئے۔ یہ جگہ قدرے پرسکون نظر آتی تھی۔ ہم بوٹ میں ہوا بھرنے کا سوچ ہی رہے تھے جب نارنج کی روشنی ہم پر پڑی۔ کچھ پر جھانپناں درختوں سے نیچے کودیں۔ یہ تین امریکی گارڈز تھے جو ہم پر چھپے۔ اس دن آپ کے امریش پوری کا وہ ہنرمیں نے دیکھا جس سے آپ ڈرایا کرتے ہیں۔ اس کے دو مکوں نے دو گارڈز کی کھوپڑیاں چٹائیں جیسے ناریل پر ہتھوڑا مارا گیا ہو۔ تیسرا گارڈ پہلو کی طرف سے آیا اور اس نے سچاول پر شکاری چاقو سے حملہ کیا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا اور ایک درخت سے دے مارا۔ میرے پستول کے دستے کی دو تین ضربوں نے اسے ہم مردہ کر دیا۔ ہم نے مرنے والوں کی برساتیاں پہن لیں۔ ارد گرد پھل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تو تے بعد امکان یہی تھا کہ اب ہم بچ نہیں سکیں گے۔ ہم کہیں چھپنے کا ٹھکانا ڈھونڈ رہے تھے جب ایک نسوانی آواز آئی۔ ”خورسنہ تھی۔ وہ ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی رافٹل تھی مگر انداز میں دشمنی نہیں تھی۔ ہم اس کے پاس پہنچے۔“

وہ بولی۔ ”تم دونوں ہر ہائی لکس کے ساتھی ہو؟“

میں نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

اس نے کہا۔ ”جن سے بھاگ رہے ہو، میں تمہیں ان سے بچا سکتی ہوں۔ اگر اعتماد کر سکتے ہو تو آؤ میرے ساتھ۔“

وہ صاف ستھری اردو بول رہی تھی۔ انداز میں بھی رومانی تھی۔ میں اور سچاول اس کے پیچھے چل دیے۔ بلکہ لہنا چاہیے کہ دوڑ پڑے۔ ایک جگہ سامان ڈھونے والی لکھنیاں اور لکھنیں کھڑی تھیں۔ خورسنہ ہمیں گھنے درختوں اور میدان سے گزار کر ایک لالچ تک لے آئی۔ اس پر وہ مہلک لہرا رہا تھا۔ لالچ کی اندرونی روشنی میں ہم نے لکھنیاں اور سچاول کو دھیان سے دیکھا۔ وہ شکل سے بجلی لگی۔ اب ہم کی مالک تھی، لباس بارش میں بیگیا ہوا تھا۔ اس کے لہ لہاں پہن رکھا تھا وہ نرسنگ یونیفارم سے ملتا جلتا تھا۔ ام لکھنے اور لکھنیاں اتر کر لالچ کے پینڈے میں

”پہیلیاں نہ بھجوا دیا“ میں نے... ہزاروں سے کہا۔

”کہانی میں پہیلیاں نہ ہوں تو مزہ نہیں آتا۔ آپ نے کبھی ڈائجسٹ پڑھا ہے۔ جو نامور رائٹر تھے، شوکت صدیقی، ایم اے راحت، محی الدین نواب اور عظیم الحق حتی..... اللہ ان کو خیرین رحمت کرے، یہ اسی طرح اپنے قارئین کو اپنی تحریروں کا دیوانہ بناتے تھے۔ دراصل کہانی ڈائجسٹ کی ہولم کی یا.....“

”اچھا ادھر ادھر کی نہ ہانگو، اپنے موضوع پر آؤ۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

اس نے غصی سانس بھری۔ ”پہلو ان حشمت ٹھیک ہی فرماتے ہیں، بندر کیا جانے ٹماٹر کا سواد..... ویسے جناب، یہ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ ٹماٹر پھل ہے یا سبزی.....؟“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی پتا نہیں چلے گا کہ تھپڑ کس طرف سے آیا ہے اور کس طرح تمہارے دانت ٹوٹے ہیں۔“

میری... ہزاروں کو عروج پر دیکھ کر وہ جلدی سمجیدہ ہو گیا۔ روداد کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”خورسنہ صاحبہ نے ایک دو گھنٹے کا کہا تھا لیکن ہمیں پورے تیس گھنٹے وہاں محترمہ کا انتظار کرنا پڑا۔ اگلی رات کے تین چار بجے کا مل تھا جب لکڑی کے فرش پر قدموں کی بہت مدھم آواز آئی۔ فرش پر بکھرے ہوئے ”سگھڑائے“ سینے گئے۔ تین تختے ہٹائے گئے اور خورسنہ خاموشی سے اندر آ گئی۔ آج وہ مختلف لباس میں تھی۔ باجامہ قمیص اور اسکارف میں وہ جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی تاخیر کے لیے معافی مانگی۔ وہ ہمارے لیے کھانا اور فرسٹ ایڈ کا سامان بھی لائی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں سجاد کی کلائی اور ٹانگ کے بالائی حصے کا زخم دیکھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایسے زخموں کے لیے تیر ہدف دوا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لالچ دراصل ملتی سامان اور کچھ مقامی طرز کی ادویات لے کر ہی اس ٹاپو پر آئی ہے۔ اس میں تین چار مقامی معالج بھی ہیں جنہیں ”وی ڈوک“ کہا جاتا ہے۔ یہ مقامی طریقے سے علاج کرتے ہیں۔ خورسنہ بطور نرس ان کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ اس نے بتایا کہ ٹاپو کے ارد گرد سمندری پانی میں مگرچھ اور آبی سانپ وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے کانٹے سے کئی فوجی زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے ہی ”وی ڈاکٹر“ پاؤی ڈوک“ یہاں آئے ہیں۔ خورسنہ کے والدین پاکستانی تھے۔ وہ پہلے برونائی میں رہے پھر یہاں آ گئے

تھے۔ خورسنہ جامبی کی ہی پیدائش ہے۔ اردو بالکل دانوں کی طرح بولتی ہے جی۔ خورسنہ نے ٹارچ کی روشنی ایک جگہ سے سجاد کی ٹلواریں کو جاک کیا اور از خود سجاد زخم کا معائنہ کیا۔ اس نے اپنے طریقہ علاج کے مطابق اور پیسے کے محلول سے سجاد کے زخم کو صاف کیا اور مر کر پٹی باندھ دی۔ اس نے پورے تین گھنٹے سے کہا کہ تیر دن کے اندر یہ زخم بغیر ٹانگوں کے ٹھیک ہو جائے گا۔ باتوں سے پتا چلا کہ اس کی ساری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور قسطنطنیہ لیڈر تصور کرتے ہیں۔ قسطنطنیہ کے بارے میں سن کر کے لیے خورسنہ بطور نرس مقامی معالجات یعنی وی ڈاکٹر ساتھ لے گئی ہوئی تھی اور ٹاپو تک پہنچ گئی تھی۔ وہ قسطنطنیہ کے ہاں میں تو کچھ نہ جان پائی تھی مگر ہماری مدد کرنے میں کامیاب رہی تھی۔“

”خورسنہ نے تم دونوں سے پوچھا نہیں کہ قسطنطنیہ ہے؟“

”اس نے پوچھا لیکن وہ بہت معاملہ فہم ہمارے رویے نے اسے سمجھا دیا کہ ہم نے اس لیے اپنے منہ پر بڑے کپے تالے لگائے ہوئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ کل خورسنہ کے بیٹے کو ما میں دیکھ کر سجاد نے جو غیر معمولی دلیری دکھائی؟“

”پچھتے ٹاپو والی روداد بھی ہے۔“

ایتنی کی آنکھوں میں شرارت کی چمک ۱۱

دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ ”یہ آپ کا امریش پوری ہٹا نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی کھوپل ہے جناب.....“

ٹھک پڑتا ہے کہ چاقو کے حملے میں اسے صرف کلائی کٹ آیا تھا، یہ ٹانگ والا کٹ اس نے بعد میں غور سے اس کے زخموں والے لباس کو دیکھ کر خود لگا یا ہوگا اور ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کافی کامیاب رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”خورسنہ اب تک دو تین بار تو اس کی ٹانگ بالائی حصے کا معائنہ کر چکی ہے۔ بالکل ترکی دے رہی ہے اس کی۔ اگر وہ سچ بچ دینہ ہوتا تو میں نے اسے اس کی ران کو تھوڑا کٹ لیتی تھی۔“ وہ سختی خیر لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تم سجاد پر خورسنہ کو کہہ کر الزام لگا رہے ہو۔ تمہاری ذہنیت اتنی گندی نہیں صرف سجاد کے حوالے سے گندی ہو جاتی ہے اور اسے تمہاری موت بھی واقع ہونی ہے۔“



صاحب طرز ادیب خان آصف کی شاہکار کتب

میر

850/-

اللہ کے ولی

850/-

زندہ لوگ

750/-

دلوں کے سچا

1000/-

ان حرم

600/-

فقیر اعظم

500/-

ولولہ انگیز
تاریخی ناول

ٹیپو سلطان

700/-

امام
الہ

750/-

سربریدہ

600/-

رضیہ سلطانہ

550/-

اندھیروں
کے قافلے

700/-

مادہ

500/-

بت شکن

600/-

شمشیر کا قرض

600/-

شعلوں کا کفن

500/-



صاحب طرز ادیب قمر اجناوی کی تاریخی کتب

لہذا کی رات

1500/-

دھرتی کا سفر

1200/-

مقدس مورتی

1200/-

ماہ ہابل

1200/-

جنگ مقدس

500/-

اُورخان الغازی

550/-

مطمان

700/-

شمشیر

500/-

لالہ رُخ

500/-

لہذا کے

400/-

لاڈو

300/-

سرکلر روڈ، چوک اُردو بازار لاہور

فون: 37652546 — 042-37668958

بش پبلی کیشنز

رات کو میں بس تھوڑی دیر کے لیے ہی سو سکا۔ ذہن مسلسل اپنے ارد گرد کی تہلکہ خیز صورت حال میں الجھا ہوا تھا۔ کل کا سورج نہ جانے کس رنگ میں طلوع ہونے والا تھا۔ سوچوں کا دھارا بار بار ناپوں کے حالات کی طرف بھی جا رہا تھا۔ ایتھن کی گفتگو سے پتا چلا تھا کہ وہ لوگ بہت نہیں ہارے اور کئی دن گزرنے کے باوجود مسلسل قسطنطنیہ وغیرہ کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ امریکا سے ایسے جدید آلات منگوائے جا رہے ہیں جو زیر زمین اشیاء کا سراغ لگانے میں مدد دیتے ہیں۔

اگلا دن شروع ہوتے ہی نعروں کی لگاتار آوازوں سے اطراف گونجنے لگیں۔ ہجوم میں کئی طرح کے صیغے اور اشتہار بھی گردش کر رہے تھے۔ ایسے ہی ایک اشتہار میں دو تین تصویریں تھیں۔ ان تصویروں میں کئی خوب رو لڑکیوں کو ڈانس کی تربیت پاتے دکھایا گیا تھا۔ تربیت دینے والا خواجہ سرانجام دانش تھا۔ اس سینٹرل میں لکھا تھا کہ شریف گھرانوں کی ان لڑکیوں کو راتے زل کی تفریح طبع کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ ناظم باذان کی رہائی کا اعلان رات کو ہی کر دیا گیا تھا مگر وہ عملی طور پر ابھی تک رہا نہیں ہوا تھا۔ اس کے حوالے سے مسلسل ٹال مٹول سے کام لیا جا رہا تھا۔ میں نے قائم مقام جاسم سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”وہ لوگ بتا رہے ہیں کہ جیل کی انتظامیہ کو باقاعدہ تحریری حکم کا انتظار ہے۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں محترم باذان ہمارے درمیان ہوں گے۔“

عارفہ خاتون نے پرسوج لہجے میں کہا۔ ”شاہ زیب! ام کو تو یہ شک پڑ رہا ہے کہ ان لوگوں نے ناظم صاحب پر تشدد کیا ہے۔۔۔۔۔ اور ان کا حالت ایسا نہیں کہ ان کو امارے سامنے لایا جاسکے۔ لوگ کو تم سے زیادہ اور کون جانتا ہو گا۔۔۔۔۔ یہ ایک بہت ظالم جہاد کا نام ہے۔“

عارفہ خاتون کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اس بارے میں پال سے بات کی تو اس کی نیلی آنکھوں میں بھی سوچ کی پرچھائیاں لہرائے لگیں، وہ بولا۔ ”شاہ زیب! جب لوگوں نے ہمیں اسپتال سے چھڑا کر مرواؤں میں پہنچایا تو لوگ کو ایسے ہی لگا جیسے سخت بھوک کے عالم میں اس کے منہ سے شکر چھین لیا گیا ہو۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”اس سلسلے میں تمہارا کیا مشورہ ہے پال؟“ میں نے پوچھا۔

”مائی ڈیز شاہ زیب!“ ابھی پال نے اتنا ہی کہا تھا

کہ کنٹینر کے سامنے والے حصے سے کرئل احرار کی چلا آواز آئی۔ ”یہ دیکھیں۔۔۔۔۔ ٹی وی پر کیا نیوز آرہی۔ باذان کے بارے میں بتا رہے ہیں۔“

ہم سامنے والے پورشن کی طرف گئے۔ اُن مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر بریکنگ سلائیڈ چل رہی تھی۔ نیوز کا سٹر بلند آواز میں بول ”کہا جا رہا ہے کہ محترم باذان کو شدید ہارٹ ایٹیک اسپتال میں ڈاکٹرز نے ان کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ترجمان نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ ج باذان کو جیل سے باہر لایا جا رہا تھا تو انہیں سینے میں تکلیف محسوس ہوئی۔ انہیں فوری طور پر ملٹری اسپتال جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔“

”بکواس ہے۔۔۔۔۔ یہ سب بکواس ہے۔ خاتون چلائی۔ ”ان حرامی سٹوروں نے ناظم صیب کو ہے۔ انہیں مار دیا ہے۔ یہ سب کاسب درندہ ہے۔۔۔۔۔ ام ان کو کہیں مارے گا تو یہ ام کو مار دے گا۔ جاسم نے روتے ہوئے کہا۔ ”انہیں کبھی کبھار پریش ہو جاتا تھا لیکن دل کی تکلیف نہیں تھی انہیں سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ انہیں جی کے جلا دلوگ کی نگرانی کی گئی ہے۔ ہم اس کا بدلہ لیں گے۔“

کنٹینر کے اندر ہر چہرہ جھٹما گیا تھا اور اکثر میں فی نظر آرہی تھی۔ نیوز کا سٹر کی آواز گونج رہی تھی بکڑے ہوئے حالات میں محترم باذان کی موت اب بڑے دھماکے کی طرح ہے۔ اس کی تشریح مختلف لوگ طریقے سے کریں گے۔ صورت حال کوئی بھی رخ سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔“

بریکنگ نیوز کی سلائیڈ دکھائی ملی اور اس کے نیوز کاسٹر نے مزید سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ناظر! ابھی اطلاع ملی ہے کہ اسپتال کے باہر مظاہرین تعداد جمع ہو گئی ہے۔ وہ سخت مشتعل ہیں اور اسپتال گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

باذان کی موت کی اطلاع جھلکی آگ کی طرف پھیل گئی۔ یہ پتا بھی چلا کہ باذان کی موت آ نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ لاش کل رات سے اسپتال کے میں پڑی ہے۔

ہجوم جو پہلے ہی پھرا ہوا تھا اب سراپا اُٹھ

آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ شاید رو بھی رہی تھی۔ یقیناً یہ باذان کی ناگہانی موت کا غم تھا۔ جب خطرناک زون کی طرف جانے کے لیے خورسنہ کی جدوجہد نے جنونی شکل اختیار کی تو سجاد نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی ہمارے کنٹینر کے پہلو سے ٹکرائی اور پھر وہیں سڑک پر گر کر ہچکیاں لینے لگی۔ اس کا خوہر بیٹا قریب ہی سکتے زدہ کھڑا تھا۔ سجاد کچھ دیر تک خاموشی سے خورسنہ کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا اور کندھوں سے تھام کر اس کو اٹھا لیا۔ وہ بکھرے بالوں کے ساتھ مسلسل رو رہی تھی پھر وہ سجاد کے گلے سے لگ گئی۔ سجاد تسلی بخش انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

پال اور اس کے اسیکو اسٹائلز ساسی راجر نے بھی یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ راجر بولا۔ ”یہ سردار سنگھ بہت دنگ آدمی نظر آتا ہے۔ ایسا ہی ایک کریکٹر میں نے ہالی ووڈ کی انگلش مووی میں دیکھا۔ وہ ایک سکھ ڈکیت تھا۔“

میں راجر کو کیسے بتاتا کہ اب وہ جس شخص کو دیکھ رہا ہے وہ بھی ایک بڑا ڈکیت ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ سکھ نہیں۔

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ سجاد لمبے لمبے ڈنگ بھرتا، کنٹینر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اس نے پال، راجر اور دیگر افراد کو خاطر میں لائے بغیر براہ راست تجھے مخاطب کیا اور بھاری بھر کم آواز میں بولا۔ ”شاہ زیب! مجھے لگتا ہے کہ اب یہ لڑائی زیادہ دیر کے گی نہیں۔ بہت جیتھی وڈا اچھا شروع ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک گل ہم کو دامغ میں رھنی چاہیے۔ بیگم نورل بھی محل کے اندر ہیں۔ یہ رائے زل اور اس کے گورے بد معاش بیگم نورل کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔۔۔۔۔ اور اس کا ایک حل بھی ذہن میں آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر وہ لوگ بیگم نورل کو یہ خیال بتاتے ہیں تو پھر ہم بھی ان کو انہی کے سکوں میں جواب دے سکتے ہیں۔ ہم۔۔۔۔۔ مادام باذان کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ وہ ابھی تک اسی اسپتال میں ہے جہاں مشر باذان کی لاش رکھی گئی ہے اور جہاں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے ہیں۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ سجاد نے اپنی مصنوعی داڑھی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں، میں کر رہا ہوں۔“ میں نے محکم لہجے میں کہا اور جاسم کو اپنے پاس بلا کر انگلش میں

پال نے اپنی آنکھیں سیکڑ کر کنٹینر کی کھڑکی سے باہر بھوم لہ پناہ بے چینی کا جائزہ لیا اور کھمبہ ہوئی آواز میں ”مالی ڈیزر شاہ زیب! مجھے لگتا ہے کہ اب ہم تادیہ ان لوگوں کو سنبھال نہیں سکیں گے۔ ان میں سے کچھ گروپ نے لنگروں میں نہیں رہیں گے اور ڈی سیلیس کی طرف پناہ لیں گے۔ بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوگا۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”آخری فیصلہ تم کو۔۔۔۔۔ ہی کرنا ہے ڈیزر، کیونکہ لوگ وقت جس کی بات سب سے زیادہ مان رہے ہیں وہ تم اور تمہارے اشارے پر کٹ مرنے کو بھی تیار ہیں۔“

”لیکن انہیں کٹ مرنے دینا کہاں کی دانشمندی میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے پال۔“ وہ الہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ اگر ہم نے آگے ہی بڑھتا ہے تو پھر کیوں نا ان بکتر بند اہوں سے کام لیا جائے جو گل کے لمبے میں ہمارے قبضے آئی ہیں۔ انہیں فوری طور پر آگے لایا جائے؟“

”لیکن وہ گاڑیاں جلوس کے عقبی حصے میں ہیں۔ یہ بالاحالی کلو میٹر کا فاصلہ ہے اور راستے میں تل وھر نہ کو لگن۔ بھوم میں راستہ بنا کر گاڑیوں کو یہاں پہنچنے پہنچنے کی وقت لگے گا اور یہ وقت ہمارے پاس نہیں۔“

میں کنٹینر کی کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھ رہا تھا کہ والوں کی کئی مختل ٹولیاں دیوانہ وار نعرہ زنی کرتے ہوئے ہوں کے قریب چلی گئی تھیں۔ یہ مظاہرین مورچا زن اور پر زبردست پتھراؤ کر رہے تھے۔ مورچا زن اور لی ہندالکا روں کی مہلک رانقلیں اس سنگ باری کے پ میں خاموش تھیں لیکن انہیں زیادہ دیر خاموش نہیں

تھیں۔ گنوں کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر پتھراؤ لے والی مشتعل ٹولیوں میں، میں نے خورسنہ کو بھی ہر خطرے سے بے نیاز تھی مگر خطرہ تو موجود تھا۔ لی ہنا شروع ہوتی تو سب سے پہلے یہی مشتعل گروپ لے۔ تب میری نگاہ دراز قد سجاد پر پڑی۔ وہ تیزی سے گلیا اور خورسنہ کو ”پتھراؤ کرنے والے افراد“ میں گارواہیں لے آیا۔ خورسنہ کا سرخ اسکارف اس کے اتر گیا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھوکا ہو رہا تھا۔ اس کا ہا زان رانقل برداروں کی طرف تھا اور وہ سجاد کی لکل نکل جا رہی تھی۔

ال کے اور سجاد کے درمیان ٹکراؤ ہو رہی تھی تاہم

اسے ہدایت جاری کی۔ یہ بڑی اہم ہدایت تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس پر فوری عمل ہو سکے گا۔ وہ فنٹ بال اسٹیڈیم، اسپتال سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں بیگم نورل کی دشمن اول میڈم ہاناوانی موجود تھی۔ چند منٹ کے اندر سیکڑوں گرین فوجی اسٹیڈیم میں سے نکل کر اسپتال کو گھیرے میں لے سکتے تھے۔

میں نے جاسم سے کہا۔ ”فوری ایکشن کی ضرورت ہے جاسم۔ دس منٹ کے اندر ہمیں اطلاع مل جانی چاہیے کہ اسپتال پر گرین فورس کا قبضہ ہو چکا ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں مسٹر شاہ زیب! اگر یہ آپ کا حکم ہے تو دس منٹ کے اندر اس پر عمل ہوگا۔“

اسی دوران میں کرنل احرار نے اطلاع دی کہ کل کے حملے میں جو بکتر بند گاڑیاں مشین گنوں سمیت ہمارے قبضے میں آئی ہیں ان کو بھوم کے اندر سے گزار کر فرنٹ کی طرف لایا جا رہا ہے۔

جنگ اور مبارزت کا اپنا ایک بہاؤ ہوتا ہے۔ تصادم کی صورت حال ہمیشہ اپنے راستے اور اپنے اوقات خود منتخب کرتی ہے۔ شاید اسی غیر یقینی طریقہ عمل کو لڑائی کا چمڑ جانا کہتے ہیں۔ پھری ہوئی ٹولیاں اپنے قائدین کے معنے کرنے کے باوجود مورچوں سے نزدیک تر ہو رہی تھیں۔ ایک طوفانی لہر تھی جو کنارے تو ڈر کر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہاؤ بنا چاہتی تھی۔ اسی دوران میں وہ خبر بھی آگئی جس کا ہمیں انتظار تھا۔ تھمنائے چہرے والے جاسم نے آکر اطلاع دی۔ ”اسپتال کے باہر گرے اور گرین فوجیوں میں خون کی جھڑپ ہوئی ہے۔ اسپتال کے باہر رائے زل کے سپاہیوں کی صرف ایک کمپنی تعینات تھی۔ اسٹیڈیم سے نکلنے والے سیکڑوں فوجیوں نے انہیں روند کر رکھ دیا ہے۔ میڈم ہاناوانی کو حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا ہے۔“

”بکتر بند گاڑیاں کہاں تک پہنچی ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ان کی رفتار سست ہے جناب! بھوم میں سے راستہ بنانا بہت مشکل ہے لیکن وہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں۔“

اس روز مجھے پہلی مرتبہ پتا چلا کہ عوامی بہاؤ کیا ہوتا ہے اور جب ایک بار یہ پہاڑی دریا کی طرح رفتار پکڑ لیتا ہے تو پھر اس کے راستے کو بدلنا یا اسے کناروں میں بند کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ اس روز مجھے پہلی مرتبہ آگاہی ہوئی کہ پھرے ہوئے بھوم لیڈروں کے کنٹرول سے باہر کیسے آتے ہیں۔ میرا حکم تو یہی تھا کہ ابھی آگے نہیں بڑھا جائے

گا۔ عارفہ خاتون اور جاسم کننیز کی چھت پر موجود تھے میگا فونز کے ذریعے بار بار پکار رہے تھے کہ مورچوں طرف نہ بڑھا جائے مگر نوجوانوں کی مشتعل ٹولیوں نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ پتھراؤ کرتے کر مورچوں اور خندقوں کے نزدیک تر پہنچ رہے تھے۔

”بکتر بند گاڑیاں آرہی ہیں۔ آپ لوگ چند منٹ انتظار کریں۔“ یہ جاسم کی آواز تھی جو بے پناہ شور میں ڈوب کر ابھر رہی تھی..... اور پھر وہ کچھ ہوا جس کا اندیشہ دل کو ڈرا رہا تھا۔ بھوم میں سے کچھ لوگوں نے مورچا اہلکاروں پر گولی چلا دی۔ گولی کا جواب گولی سے آیا اور کوئی معمولی جواب نہیں تھا۔ کئی مشین گنوں نے اپنے کھولے تھے اور موت کی سوغات تقسیم کی تھی۔

بالکل یہی لگا جیسے ایک بہت بڑے بارودی ڈھیر چنگاری دکھا دی گئی ہے اور زمین و آسمان کے قلابے قیامت بہا ہو گئی ہے۔ لوگ دھمی ہو ہو کر گرے۔ پہلے سر بھوم دس پندرہ قدم پیچھے کی طرف گیا، پھر وہ رکا، سنبھلا دوبارہ مورچوں کی طرف چھٹا۔ یہ جاننا اس مصرع کی ز: تصویر تھے۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔ اور بازوئے قاتل میں بہت زور تھا۔ انہوں نے کو رعایت نہیں کی۔ ایک بار پھر گولیوں کی باڑیں آئیں لاشیں ایک دوسرے کے اوپر گر گئیں۔ اب ہمارا رکنا بجا بیکار تھا۔ ہمارا کننیز حرکت میں آیا اور یہی وقت تھا جب میری نگاہ ڈی ہیلز کی تفصیل نماد بوار پر پہنچی۔ میں نے ایک بو فگن کے دیوید پیل بیرل کو حرکت کرتے دیکھا۔ میر۔ دل نے گواہی دی کہ کننیز کو نشانہ بنایا جانے والا ہے۔ میں نے فوری طور پر کننیز چھوڑنے کا حکم دیا اور خود بھی ایٹق۔ سہارے باہر آ گیا۔ بو فگن کا شیل بنیادی طور پر تو طیار۔ کو گرانے کے لیے ہوتا ہے مگر اسے دیگر ٹارگٹس کے لیے بھ استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک منٹ میں تقریباً 120 راؤنڈ فائوٹے ہیں۔ یہ شیل سات آٹھ کلومیٹر تک بہ آسانی مار کر سکا ہے، مگر اس وقت اسے صرف پانچ چھ سو فٹ کی دوری سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ چہ سینڈ بعد ایک ساعت دشمن دھماکا ہوا اور ہمارا کننیز آگ اور دھوکے کے ایک بڑے گولے میں تبدیل ہو گیا۔ کننیز کے ارد گرد موجود درجنوں افراد اس فائرنگ کی زد میں آئے۔

دوسرا منظر اس سے زیادہ ہولناک تھا۔ عارفہ خاتون جوش کے عالم میں ابھی تک دوسرے کننیز پر موجود تھیں اور اسے کافی آگے لے گئی تھیں۔ اس کننیز پر ایم آر ایل سے

فوجیوں اور امریکن گارڈز کے ساتھ زوردار دو بدو لڑائی شروع ہو گئی۔ جب ایسا گھمسان کارن پڑ جائے تو مشین گنیں اور مارٹلز، پوزر وغیرہ کہاں استعمال ہو سکتی ہیں۔ ہاں چھوٹے ہتھیاروں کے فائر متواتر سنا دیے رہے تھے یا پھر آرمی ڈیگز اور خجروں وغیرہ کی چمک نظر آتی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ انیق میرے قریب موجود نہیں ہے۔ میں اسے دیکھ رہا تھا جب راجر نے اپنی ٹیلی اسکوپ میری طرف بڑھائی اور گیٹ کی داہنی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مشر شاہ زیب! ادھر دیکھو، تمہارا دوست ہے وہاں۔ یقیناً بہادر آدمی ہے۔“

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگا کر اسے فوکس کیا اور تھوڑا داکھیں بائیں ہلایا۔ میرا جسم سناٹا اٹھا۔ مجھے وہاں سجاد کی جھلک نظر آئی۔ وہ گھمسان کی لڑائی کا حصہ تھا۔ اس کی پگڑی محل چکی تھی۔ واڑھی اتر چکی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ رائل اس کے ہاتھ میں بھی مگر شاید خالی ہو چکی تھی۔ وہ اسے کسی برجھی کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ رائل کی سنگین، دوپہر کے سورج کی روشنی میں گاہے بگاہے بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ وہ اس ٹولی میں سب سے آگے تھا جو گرے فوجیوں اور امریکن گارڈز کی صفیں چر کر گیٹ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔

اور پھر مجھے انیق بھی نظر آیا۔ اس نے سجاد کے کندھے سے کندھا مل کر کھڑا تھا۔ دست بدست لڑائی میں انیق بھی ایک نہایت خطرناک حریف تھا اور اس کا ثبوت ڈی پیس کے گیٹ پر مل رہا تھا۔ اس نے میری نظروں کے عین سامنے ایک امریکی گارڈ کے پیٹ میں چھرا گھونپا اور پھر سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔ ”شاباش۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور یہ لفظ انیق اور سجاد دونوں کے لیے تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں زخمی اور لاچار ہونے کے باوجود زخمی اور لاچار نہیں ہوں۔ میں اس لڑائی میں حصہ لے رہا ہوں۔

میرے ارد گرد سیکڑوں جاننازوں نے دہرا تھرا حفاظتی حصار قائم کر رکھا تھا۔ اسی دوران میں ہماری نظر بلیک ہاک کن شپ ہیلی کاپٹر پر پڑی۔ سابقہ لڑائیوں میں ہم نے ان ہیلی کاپٹر کو باقاعدہ ہم گم گم کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ہیلی کاپٹر کی آمد پر تھوڑی سی تھی۔ وہ نیچی پرواز کرتے ہوئے ڈی پیس کے گیٹ کی طرف آئے مگر ان کو چلانے والے اندھے نہیں تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ نیچے گھمسان کی دست بدست لڑائی ہو رہی ہے۔ یہاں فائرنگ کر کے یا بم

ملا کر کیا گیا۔ دوراکنٹ کنٹینر کے سامنے والے حصے سے فرائے۔ میں نے عارفہ خاتون کی سفید چادر کے ٹکڑے ہوا میں اڑتے دیکھے۔ یقینی بات تھی کہ عارفہ خاتون کے علاوہ درجنوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ مختصر الہم اب مورچوں تک پہنچ چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

جب مارے کاٹے گئے لوگ اپنے ہی پیاروں اور اپنے ہی ساتھیوں کی تڑپتی لاشوں کو پھلانگ کر قاتلوں کی کین گماہوں تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر جو کچھ ہوتا ہے وہ تاریخ کے ہزار صفحات پر رقم ہے اور جب قاتلوں تک پہنچنے والے لاعداد ہوں تو پھر وہاں لاشیں نہیں گرتیں، پرچے اڑتے ہیں اور ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جو مناظر ہم نے دیکھے وہ دست بدست لڑائی کے تھے، مگر یہ لڑائی میں میں سینکڑوں سے زیادہ جاری نہیں رہ سکی۔ ہزاروں فٹ اوپنی پیکار تھی لہروں اور بیت کی دیواروں کے درمیان لڑائی بھلا کتنی دیر جاری رہ سکتی ہے؟ وہاں ہم نے رائے زل کے فوجیوں اور ایجنسی کے گارڈز کو پھنسنے پرانے کپڑوں کی طرح الہم میں اچھلتے اور پاؤں میں روندے جاتے دیکھا۔ ہاں ایسے ہی موقع ہوتے ہیں جب کوئی خاص یونیفارم موت کا لباس بن جاتی ہے۔ اب لوگ جنونی انداز میں ڈی پیس کے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں یہ دیکھ کر دوک ہوا کہ ہم سے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کی دوری پر ڈی پیس کا مین گیٹ بند نہیں ہے۔ یہ وہی مضبوط زین سلاٹنگ گیٹ تھا جسے ریان فردوس نے ڈی پیس کے دفاع کے لیے ہنگامی طور پر تعمیر کرایا تھا۔ کمانڈر افغانی نے اسی گیٹ کے سامنے اپنی جان دی تھی کیونکہ جب وہ ابھی ڈی پیس میں داخل ہونا چاہتا تھا گیٹ آٹو میٹک طور پر بند ہو گیا تھا۔ آج بھی اندیشہ یہی تھا کہ اس گیٹ کو پار کرنے کے لیے ہمیں سخت کوشش کرنا پڑے گی لیکن اس امانت نازک موقع پر یہ گیٹ اچانک کھلا ہوا دکھائی دیا تھا۔

میں نے سیکڑوں ہرجوش افراد کو دیکھا جو اندھا دھند گیٹ کی طرف لپکے چلے جا رہے تھے۔

”میں یہ کوئی چال نہ ہوں؟“ میرے پاس کھڑے سا کوئی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”اگر چال ہے بھی تو اب ان لوگوں کو ٹی روک نہیں سکتا۔“

دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ برستی گولیوں میں عظیم الشان ہل تک پہنچ گئے۔ اطراف میں موجود سیکڑوں کرے

”جو کوئی بھی ہوگا اپنی جان پر کھیلے گا۔ یہاں سخت سکیورٹی تھی۔“

اسی اثناء میں جاسم سرخ چہرے اور ہانپی سانسوں ساتھ بکتر بند کی کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اس نے کہا: ”زیب صاحب! زیادہ تر لوگ ہتھیار ڈال رہے ہیں بس دوکان پائیکس میں (کہیں کہیں) فائرنگ ہو رہی ہے۔ راء زل اور آقا جان وغیرہ نے خود کو ڈی پکس کی انگیسی میں کر لیا ہے۔ ریان فردوس مرحوم کے کئی قریبی عزیز یز غا کے طور پر ان کے ساتھ ہیں اور ان میں..... بیکم نورل ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارا اندیشہ درست تھا میں نے لمبی سانس لے کر کہا۔“

”اور فیصلہ بھی درست تھا جو آپ نے کیا۔“ جاسم میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ہانا وانی اپنے حفاظتی حصار میں لے کر رائے زل کی اس خباثت توڑ کر دیا ہے۔“

پال نے پوچھا۔ ”آفسیر لوگ کا کچھ پتا چلا؟“ جاسم بولا۔ ”سب لوگ جانتے ہیں کہ یہاں بچے پر شاہ زیب صاحب کی جو تصویر نظر آ رہی ہے..... کیوں نظر آ رہی ہے۔ اس تصویر کو لوگ کی وحشت نے وجود دیا ہے۔ لوگ ہر جگہ اس وحشی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“ جاسم! ہماری کوشش ہوئی چاہیے کہ اسے ز گرفتار کیا جائے۔“ میں نے کہا۔

”ایسا ہی ہو گا جی۔“ وہ میرے عزم لہجے میں بولا۔

ہماری بکتر بند کے شیشے پلٹ پروف تھے۔ اس اوپر BMG ٹائپ کی طاقتور مشین گن ماؤنٹ کی کئی کئی ایک بکتر بند ہمارے آگے اور ایک عقب میں تھی۔ یہ تین گاڑیاں ہجوم میں سے راستہ بناتی ست روی سے انگیسی جانب بڑھ رہی تھیں۔ انگیسی جہاں جامامی کا قابض حکمران اور ایک شیطان مفت عمار (آقا جان) موجود تھے۔ وہ ہی سے پتا چل گیا کہ انگیسی کو چاروں طرف سے پاسبان بریگیڈ کے افراد نے گھیر رکھا ہے اور پوزیشن لی ہو ہیں۔ تینوں بکتر بند گاڑیاں انگیسی کے سامنے جا کر رک گئیں۔ گرین فورس کے ایک دن اسٹار آفسر نے ہمیں ابا موبائل فون مہیا کر دیا۔ اس فون پر رائے زل آن لائن وہ اپنی کرخت آواز میں گرج رہا تھا۔ ”میں اکیلا نہیں جاؤ گا۔ بہت سوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا اور ان میں یہ شخص عورت بھی شامل ہوگی۔“ اس کا اشارہ یقیناً بیکم نسا نورل

چھیک کر وہ اپنے ہی پٹی بھائیوں کے قاتل گردانے جاتے۔ درحقیقت وقت ان کے ہاتھ سے لٹکا چلا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد ہی ہم دیکھ رہے تھے کہ لہرس لیتا ہوا ایک انسانی سمندر ڈی پکس کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ ہر طرف ایک ہی نغمے کی گونج تھی۔

ہم نے جی جان سے جیتا ہے

اور سیرین تان کے جیتا ہے

ہم نے عزم کر لیا۔ جنگ میں قدم وحر لیا.....

بکتر بند گاڑیاں اب موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ ان گاڑیوں پر جامامی کے جھنڈے لہرا دیے گئے تھے۔ مجھے ایک بکتر بند گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ پال، راجر اور کرنل احرار بھی اسی میں سوار ہوئے۔ بے شمار لوگوں کے حصار میں اس گاڑی نے ڈی پکس کے گیٹ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہ بڑا دولہ انگیز منظر تھا۔ سیکڑوں پرچم لہرا رہے تھے اور لکاردوں سے ڈی پکس کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ ہاں..... یہ صرف ایک جامامی کی کہانی نہیں تھی۔ یہ ہر اس علاقے اور خطے کی کہانی تھی جہاں آزادی چھینی جاتی ہے اور جبر کو رواج دیا جاتا ہے۔

کچھ دن پہلے بھی ڈی پکس تھا اور یہی گیٹ تھا جس میں سے رائے زل کی سواری باؤ بہاری بڑے فاتحانہ انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔ آج پانسا پلٹ چکا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ تاجا کو طور پر کسی کا خون نہ بچے۔ اسی دوران میں میرا ایلن فوکیہ رابطہ محترم حافظ ذکری سے بھی ہو گیا۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ صرف ان لوگوں سے لڑا جائے جو اب بھی لڑنا چاہتے ہیں۔

میں نے فوری طور پر جاسم کو بلا دیا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ جاسم کے ذریعے یہ ہدایات دو چار منٹ کے اندر سب ناظمین، کمانڈرز اور کرتا دھرتا افراد تک پہنچ گئیں۔

جب ہم ڈی پکس کے مین گیٹ کے اندر سے گزر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ اس کا ایک دیوبیکل پٹ پورا کھلا ہوا تھا مگر دوسرا تین چار فٹ کے قریب دیوار کے اندر نہیں گیا تھا۔ میں نے کرنل احرار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”کرنل صاحب! اچھے لگتا ہے کہ گیٹ کے میکوم میں کوئی خرابی ہے..... یا پھر پیدا کی گئی ہے۔“

”آپ کی دوسری بات درست ہے شاہ زیب صاحب! کسی نے مین موقع پر ہماری مدد کی ہے۔“

”کون ہو سکتا ہے؟“

لو۔ ورنہ ہم اس گاجھن گائے کا ماس کاٹ کاٹ کر باہر بھیجنا شروع کر دیں گے۔“ آقا جان کی آواز میں دردنگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گاجھن گائے کے الفاظ وہ یقیناً محترمہ بیگم نورل کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

وہ چھت پر جانے کی بات کر رہا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ کوئی بیٹی کا پڑا نہیں وہاں سے اٹھالے گا۔

میں نے جاسم سے کہا۔ ”ان حرام زادوں کو یقین نہیں آ رہا کہ ہانا دانی ہمارے پاس ہے۔ اسپتال میں رابطہ کرو اور اس حراف کی آواز اس کے بیٹے کو سناؤ۔“

جاسم نے فوراً موبائل پر اسپتال میں رابطہ کیا۔ وہاں گرین فورس کے کسی میجر سے جاسم کی بات ہوئی۔ میجر نے جاسم کو بتایا کہ ہانا دانی کو حفاظت اور رازداری کی غرض سے پہلی منزل کے ایک سائڈ پروف سیلنگ روم میں رکھا گیا ہے۔ وہ ابھی اس سے بات کر داتا ہے۔

جاسم یولا۔ ”ہم سے بات کروانے کی ضرورت نہیں میجر! میں تمہیں ایک فون نمبر دے رہا ہوں۔ یہ رائے زل یا اس کے پرسنل سیکریٹری کا ہے۔ تم ہانا دانی کی بات اس نمبر پر کرواؤ۔ لیکن دھیان رہے کہ ہانا دانی اپنی لوکیشن نہ بتانے پائے اور نہ ہی کوئی غیر ضروری بات کر سکے۔“

”اوکے جناب ناظم۔“ میجر کی آواز فون کے اسپیکر پر سنائی دی۔ اسی اثنا میں ہم نے ایک تکلف وہ منظر دیکھا۔ دس بارہ سالہ ایک بچی انیس کی ایک ٹکڑی توڑتی ہوئی باہر آگئی۔ وہ خود نہیں آئی تھی، اسے پھینکا گیا تھا۔ اس کا سینہ خون سے رنگین تھا۔ ہمیں گولی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بچی کو خنجر وغیرہ گھونپا گیا ہے۔

”اوہ گاڈ!“ جاسم نے سر پکڑ لیا۔ ”یہ بیگم نورل کی لے پالک بیٹی ہے۔ بیگم جی کو بے حد پیار تھا اس سے۔“

لڑکی غالباً باہر گرنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو چکی تھی۔ بس اس کے پاؤں میں تھوڑی بہت حرکت باقی تھی۔ اس کا خوب صورت فراک، تصویر حرست بن کر ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

جاسم کے فون پر بیل ہوئی۔ دوسری طرف رائے زل

ہی تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا وہ بے رحم رچھ جس کی آواز کثرت شراب نوشی سے مستقل طور پر بھرائی رہتی تھی۔ عورت بازی اس کی شناخت تھی اور انجینی کی یاری نے اسے سیاہ سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ وہ دھاڑا۔ ”یہ پہلا نمونہ

مرف تھا۔

میں نے کہا۔ ”رائے زل! تم اس عورت کا بال بھی پک نہیں کر سکتے۔ اگر کرو گے تو پھر تمہاری والدہ محترمہ بھی زندہ دفن ہوں گی۔ ان کو بہت شوق ہے ہا اپنی مکلی قبر میں راتیں گزارنے کا۔“

چند لمبے فون لائن پر سناتا رہا پھر رائے زل کی بدلی ہوئی آواز آئی۔ ”کون ہو تم؟ یہ کیا بک رہے ہو؟“

”میں تمہارا باپ شاہ زیب بول رہا ہوں اور تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ تمہاری اسی جان ہماری مہمان ہیں۔ بیگم نورل کے بارے میں کچھ بھی بُرا سوچنے سے پہلے اپنی اس کی بری موت کے بارے میں بھی سوچ لیتا۔“

”تم مادر محترم کی بات کر رہے ہو؟“ رائے زل کی آواز میرے کان میں گونگی۔

”جی۔۔۔۔۔ اسی محترم کی بات ہو رہی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ چاکر کہا۔

چند لمبے تک مدھم کھس پر سنائی دی۔ یوں لگا جیسے رائے زل نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کسی سے بات کی ہے۔ پھر اس کی سنگلاخ آواز دوبارہ ابھری۔ ”تم باسٹرڈ گھس پیٹھے۔ تم اپنی بکواس بند رکھو۔۔۔۔۔ مادر محترم کو تمہاری ہوا بھی نہیں چھو سکتی۔۔۔۔۔ اور اب تم وہ سنو جو میں کہہ رہا ہوں۔“

اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک اس بات سے آگاہ نہیں کہ اسپتال پر گرین فورس کا مکمل کنٹرول ہو چکا ہے اور اس کی ماں ہانا دانی ہماری تحویل میں ہے۔

وہ بغیر کوئی بات نہ تھند لچے میں بولتا چلا گیا۔ ”میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو صرف دس منٹ دیتا ہوں۔ بیڑجیوں کی طرف سے اپنے حرامی ٹوؤں کو ہٹا دو۔ ورنہ ان کے جسم میں اتنے سوراخ ہوں گے کہ ڈی این اے کے بغیر لاشیں پہچانی نہیں جا سکیں گی۔۔۔۔۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں گھس پیٹھے! بیگم نورل اس کی بہنوں، بیٹیوں، بھانجیوں، بھانجیوں کی لاشوں کے لیے بھی ڈی این اے ٹیسٹ ضروری ہو جائے گا۔ گیٹ لاسٹ۔۔۔۔۔ میں کہتا ہوں گیٹ لاسٹ۔“

اس نے قریب بڑی ہوئی کوئی چیز رخ کر توڑ ڈالی تھی۔ یہ آواز بھی فون پر گونگی۔

تب مجھے فون پر وہ آواز سنائی دی جو میرے لیے اس چار دیواری میں منحوس ترین تھی۔ یہ آقا جان کی آواز تھی۔ اس نے گفتگو ایک گالی سے شروع کی اور یولا۔ ”انجی کی محبت پر جانا چاہتے ہیں ہم۔ اپنے بندوں کو وہاں سے ہٹا

ہے۔ سیزھیوں پر تمہارا کوئی پالتو نظر نہیں آتا چاہے ورنہ یہ بدذات عورت تڑپنا شروع کر دے گی۔“ اس کا اشارہ پھر بیگم نورل کی طرف ہی تھا۔

فون پر بیگم نورل کے رونے کی اور بولنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ان کا یہ لوحہ یقیناً اس بچی کے لیے ہی تھا جو ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر، شیشے کی کرچیوں کے درمیان بے سدھ پڑی تھی۔

میں نے سوال کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو ویسے ہی سرخ رہتی تھیں، بالکل انگاروں کی طرح دہک گئی تھیں۔ بیگم نورل نے اسے بھائی کہا تھا۔۔۔۔۔ بے شک سوال نے اسے بہن نہیں کہا تھا مگر میں جانتا تھا، وہ دل سے اس کی عزت کرتا ہے۔

میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ ڈی پبلس کے وسیع سبزہ زاروں اور اس کی مختلف عمارتوں کے گرد ہزاروں افراد موجود تھے۔ خاص طور سے انگیسی کی وسیع عمارت کو لاتعداد مشتعل افراد نے گھیرا ہوا تھا۔ ناظم باڈان اور عارفہ خاتون کی موت نے انہیں سراپا آتش بنا کر رکھا تھا۔ وہ ایک اشارے پر اندر گھسنے اور قاتلوں کی ٹکا بوٹی کرنے کو تیار تھے۔ میں نے رائے زل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں ایک بار پھر تمہیں وارننگ دیتا ہوں، تمہاری ماں مرنے سے پہلے تمہیں بدترین بدو عاؤں سے نوازے گی۔ اگر ابراہیم کی ماں کے ساتھ کچھ ہوگا تو اس کا بدلہ تمہاری ماں کو چکانا ہو گا۔۔۔۔۔ ابھی اور اسی وقت۔۔۔۔۔“

یہی وقت تھا جب جاسم کے دوسرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ اس نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں فی الحال رائے زل سے گفتگو منقطع کر دوں۔

میں نے لائن کاٹ دی۔ جاسم دوسری طرف سے کی جانے والی بات بغور سن رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی چمک محسوس ہوئی۔ بات ختم کر کے وہ بولا۔ ”ابھی خبر نہیں ہے شاہ زیب صاحب!“

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ وہ بولا۔ ”رائے زل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہاناوانی ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں حیران رہ گیا۔ ”جس کمرے میں اسے بند کیا گیا تھا، وہاں پانچ بندوں کی لاشیں پڑی ہیں، چھٹا غائب ہے اور ہاناوانی بھی۔“ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ بولا۔ ”گلتا

ہے کہ ہاناوانی نے کچھ کیا ہے۔۔۔۔۔ ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔۔۔۔۔ وہ بے حد خطرناک اور عیار عورت ہے۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گرین فورس کے آفیسر نے اپنے ساتھیوں کو خود ہلاک کیا ہے اور ہاناوانی کو وہاں سے نکال لے گیا ہے۔“

میرے تصور میں وہی دو چمیل آنکھیں گھوم گئیں جن کو ایک سیاہ شیشوں والی عینک ڈھانپے رکھتی تھی۔ ہاناوانی کی پہچان اس کی وہ ہراساں صلاحیتیں تھیں جن کی بنا پر وہ اپنے دوستوں دشمنوں کو زیر کرتی تھی۔۔۔۔۔ اور ڈاکٹر ماریہ نے مجھ سے کہا تھا (اور محترم ذکر کی نے بھی) کہ ہاناوانی ایک سلسلہ سائنسی حقیقت ہے۔ جدید دور میں اس کے نئے رخ سامنے آ رہے ہیں۔ یہ وہ جادو ہے جس کا تعلق براہ راست انسان کے دل و دماغ سے ہے۔

تو کیا ہاناوانی کی آنکھوں کے جادو نے ایک بار پھر کام کر دکھا یا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ ایسا کچھ کر گزری تھی، جس کی توقع ہم میں سے کسی نے نہیں کی تھی۔ بے پناہ حیرت کے ساتھ غم و غصے کی شدید لہر بھی میرے اندر سے اٹھی اور اس عورت کے لیے نفرت کا دور یا سامنے میں بہہ گیا۔

جاسم کے فون کی بیل ایک بار پھر کریہہ آواز میں پکارنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف حسب توقع رائے زل ہی تھا۔ اس کی آواز اسپیکر سے نکل کر بکتر بند کے اندر سنائی دے رہی تھی۔ ”کہاں مر گئے ہو۔۔۔۔۔ سامنے آؤ۔۔۔۔۔ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے حرام کے جنو، میں صرف دو منٹ بعد اس عورت کے گوشت کا ایک اور ٹکڑا کاٹنے والا ہوں۔۔۔۔۔“

اب اس کی زبان کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ گوشت کا ٹکڑا کاٹنے سے اس کی مراد کسی اور بچے یا نوجوان کو مارنا تھا۔ ویسے یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وقت پڑنے پر وہ سچ سچ بیگم نورل یا کسی اور غمگین کا گوشت کا ٹکڑا شروع کر دیتا۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ میں نے سنہلے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”تم بدذات، تم بات نہ ہی کر دو تو اچھا ہے۔“ وہ پھنکارا۔ ”تمہاری آواز سن کر میرے دماغ میں چنگاریاں چھوٹ جاتی ہیں۔ کسی اور کتے کو فون پکڑاؤ۔“

”تمہیں سمجھ سے ہی بات کرنا پڑے گی رائے زل۔۔۔۔۔ کیونکہ یہاں اور کوئی ایسا نہیں جو تم جیسے پلید جانور کی غلیظ آواز سننے کو تیار ہو، بولو کیا چاہتے ہو؟“

سخت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کرتل صاحب! کیا واقعی شاہ زیب صاحب کو گولی لگ گئی ہے؟“

”نہیں، نہیں۔“ کرتل جلدی سے بولا۔ ”وہ بالکل محفوظ ہیں۔ بکتر بند برسرٹ چلا یا گیا تھا۔ ایک اندرونی لائٹ ٹوٹنے سے ان کی گردن پر معمولی زخم آیا ہے۔“

”کیا..... آپ..... کچھ چھپا تو نہیں رہے؟“ کمانڈر کی آواز کانپ رہی تھی اور اس میں اب بھی اندیشہ تھے۔

”نہیں، شاہ زیب صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔“

”لیکن یہاں تو افواہ پھیل گئی ہے کہ..... خدا نخواستہ..... ان کی زندگی کو..... نقصان پہنچ گیا ہے؟“

پس منظر میں فلک شگاف نعرے اور للکارے سنائی دے رہے تھے۔ میں نے مداخلت کی اور سیل فون پر جھک کر کہا۔ ”نہیں کمانڈر۔ Panic ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ ہم اندر والوں سے بات کر رہے ہیں۔“

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ہم نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ میں پھر وہی بات دہراؤں گا۔ اس دن مجھے پہلی بار پتا چلا کہ لوگوں کے بڑے بڑے مشتعل اجتماع کس طرح سرکش طوفانی ریلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انسانوں کا غیظ و غضب کس طرح بلند دیواروں کو ملیا میٹ کرتا ہے، اور اپنے راستے خود بنا لیتا ہے۔ رائے زل جس شخص سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، وہ لاتعداد لوگوں کے لیے اہم ہو چکا تھا، اس کی زندگی کو نقصان پہنچنے کی خبر نے ہزاروں کے مجمع میں ایسی لہر پیدا کی جسے روکنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

اور واقعی وہ منظر ایک تند و تیز آبی لہر جیسا ہی تھا۔ انیسویں کی مثالی جانب کے لوگ انیسویں کی چار دیواری سے بمشکل پچاس میٹر دور تھے۔ ان میں پاسبان بریگیڈ کے مسلح جانناڑ اور ہتھیار بند رضا کار بھی تھے۔ یہ لوگ گولی کی رفتار سے انیسویں کی طرف بڑھے۔ یہ دس بیس نہیں تھے..... سو دو سو بھی نہیں تھے۔ یہ ہزاروں میں تھے مگر فرد واحد کی طرح حرکت کر رہے تھے..... اور یہ منظر دیکھنے لائق تھا۔

انیسویں کے اندر موجود افراد نے گولیاں چلائیں۔ یقیناً یہ بدحواسوں کی فائرنگ تھی اور ان بدحواسوں کو زیادہ وقت نہیں ملا۔ بمشکل آٹھ دس سینکڑے آن گنت لوگ شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اور پلائی کے دروازے توڑ کر انیسویں میں گھس گئے۔ ہر طرف کھرام مچ گیا۔

اب ہمارا اپنی جگہ رکنا پھر بے کار تھا۔ میری ہدایت

وہ دہاڑا۔ ”میں نے کہا ہے تاکہ تم ایک اجنبی گھس بیٹھے ہو۔ میں تم پر اور تمہاری شکل پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں..... میری بات کسی مقامی سے کرواؤ۔“

”مقامیوں نے ہی تمہارے گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے مجھے منتخب کیا ہے۔“

وہ مغلطات بکنے لگا۔ آخر میں بولا۔ ”تم جیسے خارش زدہ فائٹر میرے سامنے کیڑے کوڑے ہیں۔ تمہاری حیثیت میرے لیے گندی نالی کے کیڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ وقان ہو جاؤ یہاں سے ورنہ بہت شرمندگی والی موت مرو گے..... اس کی آواز ٹش کی شدت سے لرز رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے مرتبے کا نہیں سمجھ رہا تھا مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ مرتبہ اور معیار بدل چکے ہیں۔ وقت کی باگیں اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہیں۔

میں نے پھر بولنا چاہا۔ ابھی میں نے ”سنو رائے زل.....“ ہی کہا تھا کہ آٹو میک رائفل کی لرزہ خیز ”تڑتڑ“ گونجی۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آکر ہماری بکتر بند سے ٹکرائی۔ بکتر بند کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے شیشے ہلٹ پروف تھے، مگر ایک کھڑکی ٹھوڑی سی کھلی ہوئی تھی، برسرٹ کی ایک گولی اندر گھسی اور اینٹ اور کرتل احرار کے سروں کو چھوٹی ہوئی ”روف لائٹ“ سے ٹکرائی۔ لائٹ چمکا چور ہو گئی۔ اس کی کچھ کرچاں میری گردن میں لگیں اور گردن پر خون کی نمی کا احساس ہوا۔ اینٹ نے ”پاور ونڈ“ فوراً بند کر دی تھی۔ ہم سب نیچے جھک گئے۔ میرا دایاں ہاتھ اپنی گردن پر تھا اور ہاتھ پر بھی خون کی کی محسوس ہو رہی تھی۔ بکتر بند کے اوپر لگی ہوئی مشین گن سے جوابی برسرٹ چلا یا گیا مگر یہ گن مین کی اضطرابی حرکت تھی۔ اس کے سامنے کوئی نشانہ نہیں تھا۔ اس نے انیسویں کی سپاٹ دیوار پر گولیاں چلائی تھیں۔

فون کے اسپیکر پر گھبرائی ہوئی آواز دلا رانے زل جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے..... چلے جاؤ میرے سامنے سے..... اس بھڑے ابراہیم کو لاؤ میرے سامنے..... یا اس حرام زادی قسطنیہ کو..... نہیں تو میں چھلنی کر دوں گا سب کو..... ایک کوئیں بخشنو گا۔“

اس کے لہجے میں اب ایک جابر حکمران کی جگہ جنونی قاتل بول رہا تھا۔ اس کا پرتکبر انداز گواہ تھا کہ وہ اپنے ارد گرد موجود لوگوں کو چوچنیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

اسی دوران میں کرتل احرار کے سیل فون پر کال کے سنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف رضا کار کمانڈر زمان بول رہا تھا۔ اس نے

برچھے نے یہ سرتن سے جدا کر کے سنگین پرائنگ دیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد جاسم بھی باہر نکل گیا۔ اب میں بکتر بند میں اکیلا تھا۔

ایک ایک میری نگاہ ہال کے آخری سرے پر ایک ایسے منظر پر پڑی جس نے مجھے سرتاپا جھنجھوڑا۔ یہ بس ایک جھلک ہی تھی جو میں نے دیکھی۔ مگر یہ جھلک بھی سینہ چیرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے دیکھا دو تنومند افراد ایک عورت کو بالوں اور بازو سے کھینچتے ہوئے سیزھیوں کی طرف اوجھل ہو گئے۔ ان میں سے ایک یقیناً وہی فرہبہ اندام شیطان تھا جسے لوگ رائے زل کے نام سے جانتے تھے۔

شدید ترین افراتفری میں کسی کی نظر شاید ہی اس منظر پر پڑی ہو۔ میں نے باور دینا دھکولی اور سینے کی پوری طاقت سے پہلے جاسم اور پھر اینق کو پکارا مگر ان تک میری آواز نہیں پہنچی۔ اسی دوران میں میں اسی مقام پر دہشت پرستی بم کا ایک دھماکا ہوا جہاں میں نے چند لمحوں پہلے اینق کو دیکھا تھا۔ طاقتور دہشتی بم تھا۔ شعلے کے ساتھ دھواں پھیلا اور میں نے انسانی گوشت کا ایک لوتھڑا بکتر بند گاڑی کی وینڈ اسکرین سے چپکتے دیکھا۔ یہ کس کا لوتھڑا تھا..... مرد کا تھا عورت کا..... یا پھر..... اس سے آگے میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور میرے پاس کچھ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں جان چکا تھا کہ رائے زل اور شاید آقا جان بھی بیگم نورل کو لے کر جھٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ بیگم نورل کو کون پوانٹ پڑھ کر یہاں سے راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔

اب یہ منوں کا نہیں شاید سینڈوں کا کھیل تھا۔ مجھ میں اتنی سکت ہرگز نہیں تھی کہ میں بکتر بند سے نکلتا۔ برستی گولیوں میں اس طویل ہال کمرے کو پار کرتا اور سیزھیوں تک پہنچ سکتا۔ ایک ایک میری نگاہ دائیں جانب المونیم کے دو چھوٹے دروازوں کی طرف اٹھ گئی۔ میں ایک لمبے عرصے تک اس انگیسی کا مقیم رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان دروازوں کے ساتھ ہی ایک لفٹ بھی موجود ہے۔

میں اپنی رہی کہی قوت جمع کر کے بکتر بند سے اتر ااور جھک کر چلتا ہوا (خود کو گھسیٹتا ہوا) المونیم کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ دو قدم آگے دائیں جانب لفٹ کا سلور کلر دروازہ موجود تھا۔ میں لفٹ میں گھس گیا اور ٹاپ کا ٹین دبا دیا۔ بکتر بند سے نکلنے ہوئے ایک M-16 رائفل میں نے اٹھائی تھی۔ لفٹ نے مجھے پانچ چھ سینڈ میں چوٹی منزل کی وسیع و عریض چھت پر پہنچا دیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ ہوا کہ یہاں ایک اوٹ میں چھوٹے سائز کا سرخ اور سیاہ آئرش بیلی

پر ڈرائیور نے اس اینجیل بکتر بند گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھایا اور ہم بھی ایک بڑے چوٹی دروازے کو توڑتے ہوئے انگیسی میں گھس گئے۔ میں نے بہت سے خوش پوش بچوں اور عورتوں کو دیکھا۔ وہ اندرونی حصے سے نکلے تھے اور چلاتے ہوئے مختلف اطراف میں راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ میں انہیں شکلوں سے جانتا تھا۔ ان میں زیادہ کا تعلق شاہی فیملی ہی سے تھا۔ ان میں سے دو چار زخمی بھی تھے۔ میں اس میدان کارزار کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ آج سے چند ماہ پہلے جب میں چاند گڑھی میں تھا، میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس گاڑی کی خاموش فضا سے نکل کر ایک ایسی جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ میں ان مسافروں کا راہی تو نہیں تھا۔ میں تو پاکستان پہنچنا تھا نذر ورلڈ کے کچھ دشمنوں سے اوجھل ہونے کے لیے..... اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دلربا چہرے کی تلاش میں۔ یہ دونوں مقاصد تو بہت پیچھے رہ گئے تھے اور میں گھر گیا تھا ایک ”باقاعدہ جنگ“ کے شعلوں میں۔ شاید اسی کو حالات کی من مرضی اور رخصت حیات کی سرکشی کہتے ہیں۔

☆☆☆

انگیسی کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر دہشتی بموں کے دھماکے بھی سنائی دیے۔ ہر طرف دھوئیں اور بارود کی بو تھی۔ میری نگاہ سجاد اور اینق پر پڑی۔ ایک بار پھر دونوں اکٹھے نظر آ رہے تھے۔ سجادوں کے سامنے ٹھہرنا کسی عام شخص کے بس کا روگ نہیں تھا جو اس کا ایک طوفانی مکا کھا لیتا تھا، دوسرے کی ”ڈیمائٹ“ نہیں کرتا تھا۔ اینق کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی چینی رائفل تھی۔ میں نے اسے ایک ستون کی اوٹ میں دیکھا۔ وہ گاہے گاہے اوٹ سے نکل رہا تھا اور ایک چھوٹا برسٹ چلا کر پھر سے اوٹ میں ہو جاتا تھا۔ وہ ایک خطرناک جگہ پر تھا۔ میری دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔

کرنل احرا بھی دلیرانہ انداز میں اس مار دھاڑ میں شریک ہو چکا تھا۔ تاہم جاسم میرے پاس بکتر بند کے اندر ہی تھا۔ وہ بولا۔ ”ادھر دیکھیے شاہ زیب صاحب! ایک خدار کا انجام۔“

میں نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بالکل یقین نہیں آیا کہ میں حقیقت میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔ یہ کسی ”ہار“ فلم کا سینہ یا جانتی آنکھوں کا خواب لگتا تھا۔ کمانڈر ادوان کا سر ایک رائفل کی سنگین پرنگ ہوا تھا اور درجنوں لوگ اس رائفل کے ارد گرد دیوانہ وار تاج رہے تھے، کسی رضا کار کے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ کراچی

شمارہ ستمبر 2017ء
کی جھلکیاں

منتخبی

اس شاعر کا زندگی نامہ
جس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا

روایت شکن

ان لوگوں کا تذکرہ جنہوں نے
علم کی شمع روشن کی

لیڈی کلر

اس اداکار کی حالات زندگی
جولو کیوں کا پسندیدہ تھا

پرائی کچھ

ایسے قصے مشرق میں رونما نہیں ہوتے ہیں

روایت نگار

بھی بہت سی سچ بیانی، ناواقف
فراموش واقعات، سچے قصے

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

کا پڑ پہلے سے موجود تھا۔ دونوں تو مند افراد بیگم نورل کو
بے دردی سے سر کے بالوں سے کھینٹتے ہوئے بلی کا پڑ کی
طرف لے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک وہی درندہ
مفت رائے زل تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشین پمپل
تھا۔ دوسرا شخص رائے زل کا کوئی کزن ہی لگتا تھا، کیونکہ وہ
بھی اسی کی طرح فریہ اندام اور مکروہ صورت تھا۔ اس کے
ہاتھ میں کلاشنوف تھی۔ تب میری نگاہ آقا جان اور اس کے
دو امریکی گارڈز پر پڑی، وہ بھی رائے زل کے ساتھ ہی راہ
فرار اختیار کر رہے تھے۔

سب سے پہلے آقا جان کی منہوس نگاہ ہی مجھ پر پڑی
تھی۔ اس نے انگلی میری جانب سیدھی کی اور چلایا۔ اس کی
بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر اس کی بات کا مطلب واضح
تھا۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ایک چوکور ستون
کی آڑ لے کر رائے زل کو نشانے پر رکھ لیا۔ "میں آگیا ہوں
رائے زل..... اور میں تجھے بھاگنے نہیں دوں گا۔" میں نے
پورے یقین سے اور جیسے پھڑوں کی پوری طاقت سے کہا۔
میں نے رائے زل اور اس کے کزن کو بری طرح
چونکتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے مجھے آقا جان کی طرح
دیکھا نہیں تھا مگر میری آواز وہ ضرور سن رہے تھے اور شاید
M-16 کی خوفناک نال بھی انہیں نظر آرہی تھی۔ مجھے
ایڈوائس یہ تھا کہ میں آڑ میں تھا اور وہ لوگ مکمل جگہ پر۔ بلی
کا پڑ کا پتکا گھومنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آواز بڑھتی
جاری تھی اور اس کے ارد گرد موجود لوگوں کے لبھن
پھڑ پھڑانے لگے تھے۔

رائے زل نے اپنے مشین پمپل کی نال بیگم نورل کی
کنپٹی سے لگا دی اور دھاڑا۔ "تم مجھے نہیں روک سکتے.....
کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔ اگر روکنا چاہتے ہو تو پھر اس کی
لہذا تم قیمت اس بد ذات بڈھی کی موت ہے..... اس کی موت
ہے۔"

اس نے اتنے زور سے مشین پمپل کا بیرل بیگم نورل
کی کنپٹی میں گھسا یا کہ وہ بے ساختہ چلا اٹھیں۔ ان کی حالت
بڑی تھی۔ چٹا کنپٹی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے
پر گہری خراشیں تھیں۔ وہ ایک باپردہ خاتون تھیں۔ میں نے
اکیں بھی حجاب کے بغیر نہیں دیکھا تھا مگر آج ان کے چاندی
کے تاروں والے بال جھکے کی ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے
اور ان کا ایک بازو کندھے تک عریاں ہو رہا تھا۔
اب آقا جان اور اس کے دونوں گورے گارڈز نے

رہ گئی تھی۔ وہ اس انگلی کو سیاہ ٹریگر پر ایک جنبش بھی دیتا تو موت کے شعلے آزاد ہو جاتے۔

رائے زل جنونی انداز میں ہسا اور دھاڑا۔ ”اکیلا نہیں مروں گا۔ میں بتا دوں اکیلا نہیں مروں گا..... حرام زرا دو اس کی زندگی چاہتے ہو تو میرا راستہ چھوڑنا ہوگا۔“

وہ بیگم نورل کو کھینچتا ہوا ہیلی کاپٹر کے دروازے تک لے گیا۔ یہ خاص قسم کا کم وزن اسارٹ ہیلی کاپٹر آئرش ساخت کا تھا۔ ایسے ہیلی کاپٹر مضبوط چھتوں پر آسانی سے لینڈ اور پرواز کر سکتے ہیں۔ اب بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ آقا جان اور اس کے دونوں سفید فام گارڈز بھی ہیلی کاپٹر کے قریب سمٹ آئے تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ وہ حادی ہو چکے ہیں، جب تک بیگم نورل گن پوائنٹ پر ہیں، ہم میں سے کوئی گولی نہیں چلا سکتا۔ نہ اب..... نہ ہیلی کاپٹر کے پرواز کرنے کے بعد۔

یہ واقعی بے بسی کے لمحے تھے۔ سجاد کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ کمائڈر زبان اور کرنل احرار بھی دم بخود تھے۔ جاسم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر کو ہولے سے فنی میں ہلایا..... اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

بیگم نورل کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ اب بھی پکار رہی تھیں۔ ”یہ قاتل ہے۔ اس کو جانے نہ دو..... اسے مار دو.....“

درجنوں رائفلیں ”موت“ اگنے کے لیے تیار تھیں مگر ان کے ٹریگیز دبانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ فوج کے ابر کرم کے اندر سے شکست کی بجلی لشکارے مارنے لگی تھی۔ رائے زل کے چہرے پر جنون تھا اور ایک خباثت بھری مسکراہٹ تھی۔

ایکایک میں نے کچھ محسوس کیا۔ منظر میں کچھ تبدیلی آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بیگم نورل نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی ہے۔ ان کی شہادت کی انگلی سیدھی تھی۔ پھر جیسے فلم کے سلوموشن میں چیزیں آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہیں، میں نے دیکھا کہ وہ اپنی انگلی کو اوپر کی طرف اٹھا رہی ہیں۔ انگلی اور شمشین پھل کا فاصلہ کم ہوتا چلا گیا۔ وہ سلوموشن نہیں تھا لیکن مجھے سلوموشن ہی کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا یا کرتا..... بیگم نورل اپنی انگشت شہادت کو ٹریگر تک پہنچا چکی تھیں۔ میں نے ان کی انگلی کو رائے زل کی فربہ انگلی کے اوپر دیکھا۔ دوسرے لفظوں میں اب ٹریگر پر دو افراد کا کنٹرول تھا۔ ایک وہ جو

بھی اسارٹ ہیلی کاپٹر کی اوٹ میں جا کر اپنی رائفلیں میری طرف سیدھی کر لی تھیں۔ آقا جان کی چال میں اب بھی لنگڑاہٹ موجود تھی۔ یہ لنگڑاہٹ اس جھلانگ کی نشانی تھی جو جلسہ گاہ میں میری فائرنگ کے وقت آقا جان نے جان بچانے کے لیے اسٹیج پر سے لگائی تھی۔

مجھے رائے زل کی آنکھوں میں جو جنون نظر آیا وہ گواہی دے رہا تھا کہ اگر وہ مرے گا تو بیگم نورل کی موت بھی ساتھ ہی واقع ہوگی۔ اس نے اپنی فربہ انگلی شمشین پھل کی سیاہ لہلیں پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک ہلکا سا دباؤ کئی مہلک گولیاں بیگم نورل کے سر میں اتار سکتا تھا۔

مقامی لیڈروں میں قطینا کے بعد بیگم نورل ہی وہ واحد ہستی تھی جسے لوگ دل و جان سے چاہتے تھے اور جو جامی کا شیرازہ بکھرنے سے بچا سکتی تھیں۔ ان کی زندگی کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

اب میں اکیلا نہیں رہا تھا۔ میرے درجنوں ساتھی چھت پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں مجھے سجاد، اور کرنل احرار بھی دکھائی دیے۔ ہیلی کاپٹر کو وہ طرف سے نشانے پر لے لیا گیا تھا۔ رائفلیں اور گن تکتی ہوئی تھیں اور لگا ہوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ ٹارگٹ بھی سامنے تھا اور مجبوری بھی..... اور مجبوری کوئی معمولی نہیں تھی وہ بیگم نورل تھیں، ان کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

رائے زل نے بیگم نورل کو گن پوائنٹ پر رکھا اور اپنے فربہ اندام کزن کو ہیلی کاپٹر میں گھسنے کا اشارہ کیا۔ وہ اگلے قدموں چلتا ہوا ہیلی کاپٹر کے اندر چلا گیا۔ اب رائے زل بھی بیگم نورل کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا اگلے قدموں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

بیگم نورل نے اپنے گلے کی پوری طاقت سے پکار کر کہا۔ ”میری پروا نہ کرو..... تمہیں اللہ کا واسطہ ہے میری پروا نہ کرو۔ مار دو اس کو..... یہ قاتل ہے عزت مآب کا..... یہ قاتل ہے کمال کا..... اور..... اور اس نے تڑپا تڑپا کر مارا ہے میرے بے شمار بچوں کو اور بھائیوں کو..... اسے جانے نہ دو.....“

بیگم نورل کی آواز گلے میں گھٹ گئی..... کیونکہ رائے زل نے اپنی توانا کلائی کا بے رحم دباؤ بیگم نورل کی گردن پر بڑھا دیا تھا۔ سونیل ہی سہی لیکن وہ اس کی ماں تھیں اور کچھ بھی نہ ہوتیں تو بھی وہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ رائے زل بڑی وحشت سے اور بے حد توہین آمیز انداز میں انہیں اپنے ساتھ کھینچ رہا تھا۔ میری نگاہ جیسے اس کی فربہ انگلی پر جم کر

وسیع چھت پر موجود گرین فوجیوں میں سے دو کے پاس راکٹ لانچر موجود تھے۔ انہوں نے لانچر کندھوں پر رکھے اور پہلی کا پٹر کو ”ہٹ“ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے پکار کر انہیں منع کیا۔ میں دیکھ رہا تھا اور کرنل احرار وغیرہ بھی دیکھ رہے تھے کہ پہلی کا پٹر تیس پچیس فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہو سکا۔ وہ بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے کوئی کھلی پچی تھی پھر وہ ایک دم گھوم کر مزید نیچے آ گیا۔ اس کا دروازہ ابھی تک پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ آقا جان اور لوی ایک دوسرے سے کھنکھاتا چھت پر گرے۔ پہلی کا پٹر نے دوبارہ اوپر اٹھنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔

راکٹ لانچر والوں نے لانچر دوبارہ اپنے کندھوں پر رکھ لیے تھے۔ ان میں سے ایک نے پکار کر کرنل احرار سے پوچھا۔ ”سر! ہم ہٹ کریں؟“ کرنل احرار نے میری طرف دیکھا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ تب تک بات کرنل کی سمجھ میں بھی آ چکی تھی۔ اس نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ”ٹھہر جا بھی۔“ میں نے دیکھا گرین فوجیوں نے آقا جان کو چھت کے کنگریٹ پر اٹا لٹایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور گنجلے سر پر بے شمار خون کی خراشیں تھیں۔ شرٹ بھی پھٹ چکی تھی۔ ”ہتھکڑی لگاؤ۔“ کرنل احرار نے پکار کر حکم دیا۔ اسے ہتھکڑی لگائی جانے لگی۔

پہلی کا پٹر اب کچھ فاصلے پر جا چکا تھا مگر راکٹ اب بھی اسے آسانی سے نشانہ بنا سکتے تھے۔ کرنل احرار نے ایک بار پھر مشورہ طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔ اس مرتبہ میں نے کرنل کی توقع کے مطابق اثبات میں سر ہلایا۔ لانچر والے نے بڑے تربیت یافتہ انداز میں ایک گھٹنا فرش پر ٹیک کر اور ”یو فاسٹرز“ میں دیکھتے ہوئے نشانہ لے لیا۔ اس کے ایک سامھی نے مخصوص انداز میں الٹی گنتی گنی اور پھر فائر کر دیا۔ پہلی کا پٹر بمشکل 100 میٹر دور گیا تھا۔ راکٹ اس کے پچھلے حصے میں لگا۔ اس کی دم جھڑ کر گری۔ سپاہیوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ پہلی کا پٹر جرحی کی طرح گھوما اور پھر دھماکے سے بلاسٹ ہو گیا۔ اس کا کچھ لمبا ساحل کی طرف گرا۔ کرنل احرار نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے تعریفی نظروں سے کیوں دیکھا ہے (بے شک وہ ایک تجربہ کار فوجی آفیسر تھا لیکن شدید تباہی کے ان لحاظات میں میرے ذہن نے اس کے ذہن سے تھوڑا سا بہتر کام کیا تھا۔ اگر ہم شروع میں ہی پہلی

ارانا چاہتا تھا اور ایک وہ جوڑ کے بت کو توڑنا چاہتا تھا اور کامیاب اسی نے ہوتا تھا جوڑ کے بت کو توڑنا چاہتا تھا اور وہ کامیاب ہوا۔ خوفناک آواز سے مشین پمپل سے گولیاں لگیں۔ بیگم نور کا سر بری طرح دائیں بائیں ہلا۔ خون کی ایک پچکاری سی دوسری پٹی سے لگی۔ شوہر اور بیٹے کی قربانی کے بعد بیگم نور نے اپنی جان کا نذرانہ بھی اپنے ہاتھوں سے پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے ہمارے اور رائے زل جیسے خطرناک شخص کے درمیان سے وہ رکاوٹ ہٹا دی تھی جو اس کے لیے ایک نئی زندگی کی نوید بن سکتی تھی۔

ان ناقابل فراموش محوں میں رائے زل کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ جیسے بل میں گھسنے والے کسی موڈی جانور کو دم سے پکڑ کر کھلے میدان میں پھینک دیا گیا ہو۔ سکتے کے چند لمحے گزر گئے تو رائے زل نے ایک چٹھاڑ کے ساتھ اپنا پمپل سیدھا کیا لیکن وہ ہمیں جتنا نقصان پہنچا سکتا تھا، پہنچا چکا تھا۔۔۔۔۔۔ اب اس کی باری تھی۔ میرے ہاتھوں میں موجود M-16 گن کا سٹکل شاٹ سیدھا اس کی شرگ میں لگا۔ درجنوں رانگلوں نے پلک جھپکتے میں رائے زل اور اس کے ساتھیوں کو بھون کر رکھ دیا۔ فقط ایک شخص اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا اور وہ آقا جان تھا۔ اس عمارت نے ہمیشہ کی طرح پھرتی دکھائی تھی اور پرواز کرتے ہوئے پہلی کا پٹر کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مگر ابھی پہلی کا پٹر فضا میں دس بارہ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوا تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک پرچھا پس سی اڑ کر پہلی کا پٹر کے ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو گئی۔ ہم میں سے کوئی ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا۔ پہلی لگا جیسے یہ کوئی رکھوالی کا کتا ہے لیکن وہ کتا نہیں تھا۔ وہ ایک اور جانور تھا۔

بعض اوقات، واقعات کے تسلسل میں کچھ کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو وقتی طور پر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، لیکن وہ موجود رہتے ہیں۔۔۔۔۔ اور بھی کئی حیران کن طور پر پھر سے نمودار ہوتے ہیں۔ جو پرچھا پس، آقا جان کے پیچھے پہلی کا پٹر کے اندر مچھی مچھی وہ کسی کتے یا دوسرے پالتو جانور کی نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ لوی کی تھی۔ از میر طیب کی وہی پالتو بندری۔۔۔۔۔ جو لیہ کے پارا ہاؤس میں اور پھر یہاں ڈی بیس میں ہر جگہ گھومتی پھرتی نظر آتی تھی۔ فائنا ماں از میر طیب کی موت کے بعد اسے میں نے کئی مرتبہ اداس بیٹھے دیکھا تھا۔ سست اور بیزار۔۔۔۔۔ لیکن آج وہ اچانک نمودار ہوئی تھی اور پہلی کی طرح کوندی تھی۔

کا پٹر کھٹ کر دیتے تو ہوسکتا تھا کہ اس کا لمبا کچھ بھرے ہوئے ڈی پٹیل کے اندر گرتا اور جانی نقصان ہوتا)

ہم بیگم نورل کی لاش کی طرف بڑھے۔ سجاد آگے تھا۔ اس نے بڑے دھمی انداز میں بیگم کی خونچکا لاش کو اپنی پکڑی کے وسیع کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ پھر وہ ایک طرف جھپٹا۔ اس نے ایک رضا کار کے ہاتھ سے کنارہ نما وزنی پر چھا جھینا اور رائے زل کی طرف گیا۔ شاہی لباس والے فربہ اندام رائے زل پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی مگر اس نے بلٹ پروف پہن رکھی تھی۔ اس بلٹ پروف کے باوجود اسے تین چار گولیاں تو ضرور لگی تھیں۔ وہ ابھی سانس لے رہا تھا۔ مشتعل افراد اسے ٹانگوں سے کھینچتے ہوئے بیگم نورل کی لاش سے دور لے گئے تھے۔ سجاد لپکا۔ اس نے رائے زل کے سر کے ”خون آلود ہال“ کھٹی میں جھڑے اور برچھے کے ایک ہی طوفانی وار سے اس کا سر، اس کے تن سے جدا کر دیا۔ بالکل جدا۔۔۔۔۔۔ یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ پھر ایک اور ڈرامائی منظر سامنے آیا۔ چند افراد نے رائے زل کے ”سر کٹے دھڑ“ پر سے شاہی چٹا چھاڑ دیا اور اس کے قتل قتل کرتے چرنی دار سینے پر کچھ تلاش کرنے لگے۔ تب انہوں نے یکبارگی فلک شکاف نعرے بلند کیے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، ان لوگوں نے رائے زل کے بدن پر کوئی نشانی دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی تھی کہ اس بار واقعی اصلی رائے زل نشانہ بنا ہے۔

میرے سینے میں ایک اضطراب سا تھا۔ مجھے اتنی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے بڑی خطرناک جگہ پر دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ اور پھر اسی جگہ پر بینڈ کرینڈ کا ساعت شکن دھماکا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ اور بکتر بند گاڑی سے ٹکرانے والا انسانی گوشت کا لوتھڑا۔ کہیں اتنی؟؟؟ میں اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو میری رگ جاں کے قریب ہو چکا تھا۔ جیسے میرے جسم کا حصہ بن چکا تھا۔۔۔۔۔۔ کہاں تھا وہ؟

میں نے جاسم سے کہا کہ وہ نیچے جا کر اتنی کو دیکھے۔ وہ فوراً اپنے دو محافظوں کے ساتھ بیڑھیوں کی طرف لپک گیا۔ میری دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ رائے زل کا پڑ غرور سر لوگوں کے پاؤں میں تھا۔ اسی دوران میں مجھے کمانڈر زمان خان دکھائی دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم نے اتنی کو دیکھا ہے؟“

”افسوس، اتنی کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“ یہ اتنی کی اپنی ہی آواز تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس

کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے مگر وہ ٹھیک تھا۔ ”بہت بڑے لختی ہوئے۔ میری جان نکال دی۔“ میں نے کہا۔

”جان تو میری بھی تقریباً نکل ہی گئی تھی، یہ دیکھیں۔“ اس نے اپنی پشت مجھے دکھائی۔ اس کی کمر پر ایک بڑا کٹ تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ سفید شرٹ وہاں سے پھٹی ہوئی تھی۔ شاید دستی بم کے دھماکے کے وقت شیشے کا کوئی ٹکڑا وہاں لگا تھا، وہ بولا۔ ”افسوس اس بات کا ہے جناب کہ زخم پیچھے پر آیا ہے۔ سینے پر زخم کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ ویسے آپ مہربان نہ کریں۔ میں آتی جلدی مرنے والا نہیں۔“

”اچھا زیادہ بک بک نہ کرو۔ خون بہہ رہا ہے فوراً ڈریسنگ کرواد۔“

اتنے میں ایک طرف سے خورسہ نمودار ہوئی۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ جوش سے جھٹھارہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بھی باقاعدہ لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ اس نے فوراً اتنی کے زخم پر روئی کا پھایا رکھا اور اسے لے کر نیچے میڈیکل سینٹر کی طرف چلی گئی۔ چمت پر لوگوں کو جھوم بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اس جھوم میں ہی کہیں رائے زل کا کتا ہوا سر بھی کم تھا۔

☆☆☆

انقلاب کو راستہ نہیں دیا جاتا تو پھر خونخوار انقلاب کو راستہ ملتا ہے۔ جامامی میں بھی اس سے ملتا جلتا کام ہی ہوا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں جامامی کے عوام نے درجنوں ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو قابضین سے تعلق رکھتے تھے۔ انجینی کے زیادہ تر اہلکار تو موقع تاک کر پہلے ہی نیوٹری کی طرف بھاگ گئے تھے جو جیسے جیسے انہیں مار دیا گیا یا ہاتھ پاؤں توڑ دیے گئے۔ کئی سوا سر کی گاڑیوں گرفتار ہوئے۔ مختلف جگہوں پر گرفتار ہونے والے گروے فوجیوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ تمام بلی کا پٹرز گرین فورس کے قبضے میں آ چکے تھے۔

میں اب انجینی کی عمارت کے ایک محفوظ حصے میں آرام کر رہی پر نیم دراز تھا۔ ڈاکٹر میرے پاؤں کی نئی ڈریسنگ میں مصروف تھا۔ جاسم میرے پاس آیا اور بولا۔

”شاہ زب صاحب! ڈی پٹیل پر جامامی کا پرچم لہرایا گیا ہے۔ اب پٹیل کی چار دیواری میں صورت حال پوری طرح کنٹرول میں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر ماریہ کا کچھ پتا چلا؟“

وہ بولا۔ ”ابھی تک تو نہیں جناب، لیکن ہم تلاش کر رہے ہیں۔ خواجہ سراخیام دانش بھی گرفتار ہو چکا ہے۔ اس کی تحویل سے درجنوں ایسی لڑکیاں ملی ہیں جنہیں ڈی

انگادے

تھی، معمولی زخمی ہوئی تھی۔ ڈی پیلس کے وٹرنری ڈاکٹر نے اس کو ٹریٹ منٹ دی تھی..... اور عارضی طور پر پتھرے میں بند کیا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے، اچھے اور بُرے لوگ جانوروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ بُرے لوگوں کی اندرونی کشافیت بے زبان جانوروں کے اندر بھی ان کے لیے ناپسندیدگی اور نفرت پیدا کرتی ہے اور یہ ناپسندیدگی یا نفرت ان کے سینوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ یقیناً لوسی نے بھی آقا جان کو ڈی پیلس کے طول و عرض میں ایک تند بگولے کی طرح چکراتے دیکھا تھا۔ نچلے درجے کے ملازم اس کے خوف سے سہمے رہتے تھے۔ وہ لوگوں کو شہر مارتا تھا اور گالیاں دیتا تھا۔ وہ ڈی پیلس کے اندر اور باہر ہونے والے ہر جو رستم میں حصے دار تھا۔ از میر طیب کی موت میں بھی..... اور لوسی از میر طیب کے کندھوں پر جوان ہوئی تھی۔ اس نے از میر کی گود میں اٹھیلیاں کی تھیں اور از میر نے اپنے ہاتھوں سے اسے محبت بھرے لقمے کھلائے تھے۔ کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ لوسی نے جو کچھ کیا وہ ایک پالتو جانور کی اضطرابی حرکت تھی..... اور اس کے پیچھے کسی طرح کی وقاداری یا محبت کو تلاش کرنا درست نہیں۔ مگر جنہوں نے ہیلی کا پتر والے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے وہ اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ آقا جان ہیلی کا پتر پر چڑھنے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا تو..... پتا تو اس نے پھر بھی نہیں تھا لیکن اب اس کی موت آسانی سے واقع ہونے والی نہیں تھی۔

جاسم نے اپنا فون میری طرف بڑھایا۔ اس پر محترم ذکر کی کال آ رہی تھی۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی گھوگر آواز میں بولے۔ ”تمہیں بہت بہت مبارک ہو شاہ زیب! تمہاری قیادت میں آخر جامائی کے عوام نے فتح پائی۔“

”یہ سب کچھ آپ کی رہنمائی سے ممکن ہو پایا ہے حضرت اگر آپ نہ ہوتے تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ خلق خدا جس پر بھروسہ کرتی ہے اس کے اندر کچھ نہ کچھ غیر معمولی ضرور ہوتا ہے۔ آج بہت دنوں بعد میں شہر کی جامع مسجد میں اذان کی صدا سن رہا ہوں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کو..... بیگم نورل کی شہادت کا علم تو ہو گیا ہوگا؟“

”اس نے عظیم قربانی دی ہے۔ اس کا کردار جامائی کی تاریخ میں سنہری حروں میں لکھا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر رائے زل اور آقا جان وغیرہ فتح نکلنے میں کامیاب ہو

پیلس میں داو عیش دینے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ ہم ڈاکٹر ماریہ کے بارے میں خیام سے کبھی پوچھ کچھ کر رہے ہیں۔“

پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ ”دوسری بات یہ ہے جی کہ لوگوں کا پتا نہ ممبر لبریز ہو رہا ہے۔“

”کس حوالے سے؟“

”وہ ہز بانسی لاس ابراہیم اور سپریم کمانڈر قسطنطین کو جلد از جلد آپ کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”ناپو کی صورت حال کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہاں کم و بیش سیات سوانجینی گاؤں اور گرے فوجی موجود ہیں۔ ہماری جنگی مشینوں نے ناپو کو مکمل طور پر گھیر لیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے ان لوگوں کو ہتھیار پھینکنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔“

”ان کا رد عمل کیا ہے؟“

”یہ بات تو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ان کو معلوم ہو چکی ہے کہ جامائی میں انہیں شکست فاش ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ وہ بے وقوفی نہیں کریں گے اور جلد ہی سرنڈر کر دیں گے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ انہیں جنگی قیدیوں کا اسٹیٹس دیا جائے گا اور ان کی زندگیاں محفوظ ہوں گی۔“

”لیکن اب اس میں زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیے جاسم۔“

”ایسا ہی ہو گا جناب۔“ پھر جاسم میری طرف جھکا اور رازداری کے انداز میں بولا۔ ”اس بات کا امکان ہے جی کہ..... آپ کے دونوں ساتھیوں اور محترم باذان کو تشدد کے ذریعے مارنے والا امریکی انفر لوئک بھی ناپو پر ہی چپا ہوا ہے۔“

”اسے کسی صورت بچ کر نہیں نکلنا چاہیے جاسم۔“

میں نے کہا۔

اس نے بڑے ادب سے میرے زخمی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اشاعت میں سر ہلایا۔

بیگم نسائورل کی لاش کو بڑے احترام سے ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جا چکا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں لوگ وہاں موجود تھے اور اٹک بار تھے۔ ہر طرف اس قربانی کا تذکرہ تھا جو بیگم نورل نے جامائی کے بدترین دشمن کو کفر کردار تک پہنچانے کے لیے دی تھی۔

گرفتاری کے وقت آقا جان نے زبردست داویلا چایا تھا۔ گرین فوجیوں اور رضا کاروں نے اسے ٹانگوں سے چھینٹے ہوئے بکتر بند میں پسیک دیا تھا۔

بندر یا لوسی جو ہمیشہ کی طرح رنگ برنگے فراق میں

جاتے تو ایک بار پھر سنگین واقعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

”لیکن حضرت! ہانا دانی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔“

”اس کی کمر ٹوٹ چکی ہے شاہ زیب! اللہ نے چاہا تو وہ بھی جلد انجام کو پہنچے گی۔“

میں نے کہا۔ ”حضرت! ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے اطلاع ملی ہے کہ چھاؤنیوں میں بند کیے جانے والے تمام گرین فوجی باہر نکل آئے ہیں۔ انہوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے وہ سارا سرحدی علاقہ خالی کر لیا ہے جو رائے زل نے پچھلے کچھ عرصے میں قبضے میں لیا تھا۔ اب ہمارے بہت سے دستے نیوٹی کے اندر ہیں اور پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں۔“

محترم ذکر ی بولے۔ ”ہاں یہ بات مجھے ابھی جاسم سے معلوم ہوئی ہے لیکن میری رائے ہے کہ ابھی نیوٹی پر یلغار نہ کی جائے۔ ہاں ان کے کچھ سرحدی علاقے پر کنٹرول ضرور حاصل کر لیا جائے تاکہ ہمارا بارڈر محفوظ رہے۔“

”مجھے یہاں کی سیاست کا کچھ زیادہ علم نہیں ہے حضرت! آپ بڑے ہیں جس طرح مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔“

”میں سمجھتا ہوں شاہ زیب کہ اب قسطنیہ کا جلد سامنے آنا بھی ضروری ہے۔ اس نے اس جدوجہد میں بہت قربانیاں دی ہیں۔ وہ ان معاملوں کی بہت سوجھ بوجھ بھی دیکھتی ہے۔ اس کو جلد از جلد ہمارے درمیان موجود ہونا چاہیے۔“

”آپ بے فکر رہیں جناب، اب یہ دلوں کی نہیں، گھنٹوں کی بات ہے، ٹاپو کا محاصرہ ہو چکا ہے۔“

”مجھے پوری امید ہے، تمہاری قیادت میں جیسے اب تک بہت اچھا ہوا ہے۔ آگے بھی ہوگا۔“ وہ عجیب لہجے میں بولے پھر انہوں نے کہا۔ ”لو تاجور سے بات کرو۔“

چند سیکنڈ بعد تاجور کی آواز ابھری۔ ”ہیلو شاہ زیب! آپ کیسے ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں تاجور۔“ میں نے کہا۔

وہ ذرا رک کر بولی۔ ”یہاں مکان کے باہر ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں آپ کی تصویر ہے اور جامانی کے جھنڈے ہیں۔ وہ خوشی سے ناچ رہے ہیں، نعرے لگا رہے ہیں۔“

”تمہاری دعا سے ہم فتح یاب ہوئے ہیں۔ رائے

زل مارا گیا ہے۔ آقا جان گرفتار ہے۔ جلد ہی ابراہیم اور قسطنیہ وغیرہ بھی ہمارے درمیان ہوں گے۔“

”آپ..... واپس آجائیں..... میں اب بھی بہت فکر مند ہوں..... آپ.....“ اس کی آواز بھرتائی۔ وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔

”ہیلو تاجور!“ میں نے دو تین بار کہا مگر دوسری طرف خاموشی رہی۔ شاید وہ روبرو ہی تھی۔

”او کے، تم حوصلہ رکھو..... میں جلد لوٹ رہا ہوں۔“

میں نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میرا دھیان بار بار ٹھیکل داراب کی طرف بھی جا رہا تھا۔ یہی شخص تاجور کو پاکستان سے یہاں لانے کا ذمے دار تھا۔ اس نے یہ سب کچھ آقا جان کی خاطر کیا تھا۔ اب آقا جان کی ناک میں ٹھیکل پڑی تھی تو وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ جامانی میں ہی نہیں ہے۔

میرا بخار پھر شدت اختیار کر رہا تھا۔ پسیلوں اور پنڈلیوں کے متاثرہ حصے جل رہے تھے۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا، سمندر کے درمیان اس ٹاپو کا۔ یہ مختصر سا خشکی کا ٹکڑا چاروں جانب سے جنگلی کشتیوں اور آرٹلری لانچوں میں گھرا ہوا تھا۔ میں بھی ایک آرام دہ لالچ میں گرفتار احرار کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ سجاد بلی بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ خورسنہ ایک دوسری لالچ میں تھی۔ انیٹ کو میں نے ڈاکٹر مارے کو کھوینے کی ذمے داری سونپی تھی اور وہ جاسم کے ساتھ جامانی میں ہی تھا۔ ٹاپو کو دیکھ کر دل سے ایک آہ نکلی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے کیپٹن تھارک اور کبڑی شاہ سیف کو کھویا تھا۔ ہاں..... پام کے انہی بیڑوں تلے ہمیں.....

محاورتا نہیں جھپٹتا زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیا گیا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں قسطنیہ اور میرے دیگر ساتھی، اب تک کسی شبی مدد کے منتظر تھے۔ آج یہ مدد پہنچ چکی تھی۔ لیکن کیا وہ اب تک محفوظ و مامون تھے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر ابراہیم کی تھی۔ وہ اپنی ”زہریلی مجبوری“ سے لڑ رہا تھا اور اس معاملے کو شاید آریا پار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زینب کو مکمل طور پر کھو کر پایا تھا۔ کیا اب پھر کھونے اور پانے کا مرحلہ درپیش تھا۔

لاؤڈ اسپیکرز پر بار بار مختلف اعلان ہو رہے تھے۔ ٹاپو پر کہیں حرکت نظر نہیں آ رہی تھی مگر یقینی بات تھی کہ یہاں سات سو سے زائد خطرناک مسلح افراد موجود ہیں۔ وہ مختلف مورچوں اور ادوات میں چھپے ہوئے تھے۔

انکارے

ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ٹاپو کا محاصرہ ہونے سے پہلے مسٹر لونگ نے اس بمبلی کا پٹر کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی ہو، اور نا کام کام ہو کر کہیں ٹاپو میں ہی کہیں روپوش ہو گیا ہو۔ یہ بات دل کو لگ رہی تھی۔ لونگ کا اس ٹاپو پر آنا بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی نظر اسی R22 بمبلی کا پٹر پر ہو اور وہ اس پر سوار ہو کر یہاں سے نکلنا چاہتا ہو۔ میں نے کیپٹن سے کہا کہ ایسے دو تین قیدیوں کو یہاں لایا جائے جنہوں نے لونگ کو یہاں ٹاپو پر دیکھا ہے۔ ”میں سر!“ کیپٹن نے کہا اور مجھے اور کرنل کو مشعر کہ سیلیوٹ کرتا ہوا اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا۔

مگر کیپٹن کے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ لالچ کا ایک شیشہ ٹوٹا اور کوئی کود کر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی دائرہ پروف APS رائفل مجھے پہلی نظر میں دکھائی دے گئی۔ سمندری پانی میں بھیجا ہوا یہ نیم خیم شخص لونگ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک چمکڑا کے ساتھ فار کھولا۔ میرے عقب میں کھڑے، گرین فورس کے دو جوانوں کو گولیاں لگیں اور وہ لالچ کے فرش کی طرف بھٹکتے دکھائی دیے۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ لونگ کے انگارہ چہرے پر پڑی۔ اپنی طویل قاتنی کے سبب وہ لالچ کی چھت کو چھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ اس نے گن کا رخ میری طرف کیا۔ مجھے اپنا آخری وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دیا۔ یہی وقت تھا، جب اپنی ایڑیوں پر گھوم جانے والے اسمارٹ کیپٹن نے لونگ پر جھلاٹ لگائی۔ ابھی وہ لونگ کو چھو نہیں پایا تھا کہ لونگ کی چلائی ہوئی نصف درجن گولیاں اس کے جسم میں پھوست ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ لونگ کے اوپر گرا۔ لونگ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے گیا۔ میرے پہلو میں کھڑے سجاد کے لیے یہ ایک دو سیکنڈ کا وقت کافی تھا۔

اس کے منہ سے بے ساختہ ایک ٹیٹ بھجائی گالی نکل تھی۔ اس نے خود کو نیچے توڑا تو اسی وقت جھکا لیا تھا جب پہلی گولی چلی تھی۔ اسی جھکی جھکی حالت میں وہ تیر کی طرح لونگ کی طرف گیا۔ اس نے لونگ کی گن کے بیرل کو اوپر اٹھایا اور لونگ کو اپنے ساتھ لیتا ہوا لالچ کے کچن ڈور سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا اندر جا گرا۔ تب تک اس نے بھی نیچے کے نیچے سے مشین پمپل نکال چکا تھا مگر اب اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ لونگ اور سجاد لمبی طرح گھم گئے تھے۔

میں نے کرنل احرار سے پوچھا۔ ”کرنل! آپ کا کیا خیال ہے، یہ لوگ ہتھیار ڈال دیں گے؟“
”اگر ان کی کمان کرنے والے بہت بڑے بے وقوف نہ ہوتے، تو ایسا ہی کریں گے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“
”لونگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ آخر وقت تک لڑنا نہیں چاہے گا؟“ میں نے پوچھا۔
”اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ جاماچی سے بھاگ کر یہاں کیوں آیا ہے؟ اور واقعی آیا بھی ہے یا نہیں؟“
”یہ بات تو یقیناً سوچنے کی ہے۔ اگر وہ جاماچی میں خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر اس چھوٹے سے ٹاپو پر کیسے بچے گا۔“

ہماری گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ ہماری توقع کے مطابق نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے۔ گرین فورس کے آفیسرز اور گرے فورس کے آفیسرز کے درمیان ایک طرح کی چھوٹی سی فلیگ میننگ ہوئی۔ اس میں ابجیکس کے دو آفیسر بھی شامل تھے۔ ٹاپو پر موجود افراد نے ہتھیار ڈال کر خود کو ہمارے حوالے کر دیا۔

وہ دو تین طویل قطاروں میں سامنے آئے اور اپنے اپنے ہتھیار ”ان لوڈ“ کر کے اپنے سامنے زمین پر رکھ دیے۔ ہتھیار بھینکنے والوں میں دو سو کے لگ بھگ امریکی ابجیکس کے گارڈز بھی تھے۔ ان لوگوں کے لیے چھ کے قریب بڑی کشتیاں کنارے پر لگائی جا چکی تھیں۔ جن قیدیوں کو خطرناک سمجھا جا رہا تھا ان کے ہاتھ پشت پر کیبل ٹائی کے ذریعے باندھ دیے گئے۔ وہ قطاروں کی شکل میں کشتیوں پر سوار ہونے لگے۔

میں نے کرنل احرار کے ایک ماتحت کیپٹن سے پوچھا۔ ”لونگ کے بارے میں کیا خبر ہے؟“
وہ بولا۔ ”ابھی تک اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ لیکن یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ دو تین گھنٹے پہلے تک کہیں ٹاپو پر موجود تھا۔“

”تو کیا یہاں سے نکل گیا؟“ میں نے پوچھا۔
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ کرنل احرار بولا۔ ”اتنے سخت کمرے میں تو چڑیا بھی یہاں سے اڑے گی تو دیکھی جائے گی۔“

کیپٹن بولا۔ ”سر! ٹاپو کی دوسری طرف ایک R22 لالچ کھڑا ہے۔ ہم نے اسے چمک کیا ہے۔ وہ اڑنے لال نہیں ہے۔ غالباً اس کے انجین میں کوئی خرابی

مہلک وار نیچے جھک کر بچایا اور اس مرتبہ لوٹک کے پیٹ پر لات رسیدی۔ وہ جیسے اڑتا ہوا ایک کھڑکی سے نکل آیا اور اسے توڑ کر قلابازی کھاتا ہوا باہر پانی میں جا گرا۔ یہ سب کچھ اتنا آفاتا ہوا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ”اے زندہ پکڑا ہے۔“ میں نے پکار کر کہا۔ کرنل احرار اور مسٹر فوجی لاچ کے مختصر ٹیس پر پہنچے۔ میں بھی اپنے زخمی پاؤں پر بمشکل وزن ڈالتا ہوا، ٹوٹی ہوئی کھڑکی تک گیا۔ لوٹک پانی میں تھا۔ اور اس نے لاچ کے ساتھ جھوٹکی ہوئی دو نیچروں کو تھام رکھا تھا۔ ہمیں بس اس کا بالائی دھڑ ہی نظر آ رہا تھا۔ ”کوئی گولی نہیں چلائے گا۔“ کرنل احرار نے حکم دیا۔

”اسے باہر نکالو۔“ میں نے کہا۔ لوٹک کے پھنے ہوئے ہونٹوں سے خون کے قطرے گر رہے تھے اور سمندر کے پانی میں اوجھل ہو رہے تھے۔ خالی ہو جانے والی گن اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

ایک ایک مجھے لوٹک کے خونچکاں تھوڑے سے اذیت کے آثار نظر آئے۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ کوئی اسے نیچے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کے جسم کو ایک دھچکا سالگا۔ ”اوگا ڈا!“ کرنل احرار کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”یہ اٹلی کیڑا ہے۔ اس نے..... پکڑ لیا ہے۔“

کوئی اور ہوتا تو چلانے لگتا لیکن لوٹک ایک سنگلاخ شخص تھا۔ اس کا چہرہ ضرور کرب ناک ہو گیا، مگر اس نے کوئی صدا بلند نہیں کی۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ خود کو کمرچھ کے جبرؤں سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بے شک وہ ”ملائشین سمندر“ کا ایک خاستری مگر کچھ ہی تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے جسم کی مختصر جھلک بھی پانی میں دکھائی دے جاتی تھی۔

کرنل احرار کے ہاتھوں میں اب ایک ”بڑے کیلپر“ کی رائل نظر آ رہی تھی۔ اس نے میری جانب دیکھ کر لرزراں لہجے میں پوچھا۔ ”اس کو شوٹ کیا جائے؟“ اس کے سوال کا مطلب یہی تھا کہ کیا مگر کچھ کو نشانہ بنایا جائے؟ پتا نہیں کیوں اس وقت میرے اندر ایک عجیب سی بے حسی اور سنگدلی نمودار ہو گئی اور یہ کیفیت بے وجہ تھک تھی۔ میں نے کپٹن تبارک اور سیف کو لوٹک کے تشدد سے تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھا تھا۔ میں نے جاماچی کے عقوبت خانے میں قیدیوں کی لرزہ خیز آہ و بیکاسی سنی تھی اور خود بھی نمبر پھر سیل کی ناقابل بیان اذیت جھیلی تھی۔ میں نے کہا۔ ”نہیں کرنل! ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اس جانور سے

ایک طرف پرائیویٹ امریکی ایجنسی کا نہایت تربیت یافتہ آفیسر تھا جو وحشت میں ایک ”اعلیٰ مقام“ رکھتا تھا، دوسری طرف ایک ذکیت تھا جس میں کچھ زبردست خوبیاں بھی تھیں اور جو پرانے وقتوں سے وراثت میں ملنے والا ایک ”قاتل ہنر“ رکھتا تھا۔ اگلے چالیس پچاس سیکنڈ ایک خوفناک کشمکش کے تھے۔ اس مختصر دورانیے میں لکھوری لاچ کے کئی حصے کھاڑکی شکل اختیار کر گئے۔ لوٹک کی واٹر پروف APS سے کم از کم چھ گولیاں مزید چلیں مگر یہ سب کی سب لاچ کی چھت میں ہی بہت ہو گئیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ گن پر سجاول کی آہنی گرفت موجود تھی۔ شاید یہ گرفت کا مقابلہ بھی تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے گن کا قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور سر دھڑکی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اب کوئی ایک درجن گرین فوجی لاچ میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے لوٹک کو نشانے پر لے لیا تھا مگر گولی وہ بچتی نہیں چلا سکتے تھے۔

ایک ایک اس زور آزمائی کا فیصلہ ہو گیا۔ لوٹک نے ایک چٹکھاڑ کے ساتھ گن کو پورے زور سے کھمایا اور اس کا بیرل سجاول کی پکڑ سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گن سجاول کی طرف سیدھی کرنا چاہ رہا تھا مگر سجاول کے جسم میں بھی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اس نے بچوں پر اچھل کر ایک طوفانی ٹکڑوں کی قامت لوٹک کے سینے پر رسیدی۔ وہ گن سمیت کئی فٹ دور جا گرا۔

”ہالٹ..... ہالٹ۔“ کئی آوازیں گونجیں۔ کم و بیش ایک درجن آٹومیک رائفلیں لوٹک کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ غالباً سیکنڈ کے دسویں حصے میں لوٹک نے اپنا ذہن تبدیل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی گن کے 26 راؤنڈ والے میگزین میں ایک آدھ گولی ہی باقی ہوگی..... اور وہ نارچہ تکنیک کا سہرا سٹار تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی درندگی اسی کی طرف لوٹ کر آنے والی ہے۔ اس نے سجاول کو نشانہ بنانے کے بجائے گن کی مال اپنی پٹیشی پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔

اور اس روز مجھے پتا چلا کہ خوش غمی، تکلف آرام، اچھی موت بڑی موت یہ سب کچھ قدرت کس طرح اپنے قبضے میں رکھتی ہے۔ لوٹک نے آسان موت چاہی تھی مگر یہ اسے نہیں ملی، گن میں سے ٹھک کی آواز آ کر رہ گئی۔ اس کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ لوٹک کی آنکھوں میں حیرت کی یلغار نظر آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گن کو لٹھ کی طرح پکڑ لیا تھا۔ جو بھی سجاول اس کے نزدیک گیا۔ اس نے گن کے وزنی دے سے سجاول کے سر کو نشانہ بنانا چاہا، سجاول نے یہ

جیت پاتا ہے یا نہیں۔“

سجاول کے ہاتھ میں بھی اب ایک طاقتور شات گن نظر آرہی تھی مگر میرا رخ نظر نہ تھے ہوئے اس نے بھی گن جھکا لی۔ سب دم بخود تھے۔ لوگ نے اپنے ہاتھوں کو گھما کر لالچ کی زنجیروں کو اپنی کلائیوں کے گرد دبل دے لیے تھے اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ مگر مجھ اسے پانی میں نہ پہنچ پائے۔ اس کی طویل ٹانگیں اور شاید اس کی ناف کا کچھ حصہ بھی مگر مجھ کے چیزوں میں تھا۔ اس کے ارد گرد کے پانی میں سرخی کی آمیزش تھی۔

میں نے نہایت نفرت سے درندہ صفت لوگ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس لالچ کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ کیپٹن اور دیگر دو فوجیوں کی لاشیں وہاں سے اٹھائی جا چکی تھیں مگر ان کے جوان خون کے بڑے بڑے دھبے ابھی تک فرش پر موجود تھے۔ ایک فوجی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اسے لالچ میں ہی فرسٹ ایڈ دی جا رہی تھی۔

”شکر یہ سجاول۔“ میں نے کہا۔

”زیادہ جتنی نہیں نہ بنو۔ یاری دوستی میں کوئی شکریہ نہیں ہوتا۔“ وہ گہری سنجیدگی بولا۔ اور شات گن کو بے قراری سے اپنے ہاتھوں میں گھمانے لگا۔

اس کا اضطراب بتا رہا تھا کہ وہ لوگ کو جلد از جلد لاش کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے اور بے شمار لوگ بھی تھے جو اس کو لاش کی صورت دیکھنا چاہتے تھے۔ ارد گرد کی جنگی کشتیوں پر اور ساحل پر بہت سے فوجی اور رضا کار جمع ہو چکے تھے۔ ہر نگاہ یقیناً پانی کی طرف ہی لگی ہوئی تھی۔

ہماری لالچ کو دھتے دھتے سے ہچکولے لگتے تھے۔

ان ہچکولوں کی وجہ عیاں تھی۔ یہ موڈی آبی جانور اور موڈی بری درندے کی خونی نگاہوں کے ہچکولے تھے۔

چوس کرین فوجی لالچ کا مکمل معائنہ کر رہے تھے انہیں اندیشہ نہ تھا کہ کہیں لوگ کا کوئی ساتھی بھی موجود نہ ہو۔ لالچ کے فرش کو خون کے دانوں سے صاف کیا جا رہا تھا۔ شواہد بتا رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے تک لوگ ٹاپو پر ہی تھا۔ وہ پانی میں غوطہ لگا کر لالچ تک پہنچا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنانے یا پھر مارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

”کچھ دیر بعد کرنل احراز اندر آیا۔“ ختم ہوا یا نہیں؟“

میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ کرنل نے کہا۔ ”یہ غالباً زیادہ بڑا مگر مجھ نہیں ہے۔ یہ اسے داب کر بیٹھا ہوا ہے۔ چھوڑ دیں رہا اور نہ

ہی ابھی اسے ننگے میں کا سیاب ہو رہا ہے۔“ ایک تجربہ کار کوشل گارڈ نے کہا۔ ”کبھی کبھی مگر مجھ اس طرح کرتے ہیں سراسر یہ شکار کو دبوچ لیتے ہیں اور بہت دیر تک اسی طرح پکڑے رکھتے ہیں۔ شاید انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ وہ جبرے کھولیں گے تو شکار نکل جائے گا۔“

ایک بار پھر لالچ بری طرح ہلنے لگی۔ اب لوگ کے کراہنے اور چلانے کی آوازیں بھی ہم تک پہنچنے لگی تھیں۔ اس کی برداشت جواب دہتی جا رہی تھی۔ اسے موڈی جانور کے بڑوں میں پھنسے اب پندرہ بیس منٹ سے زائد ہو چکے تھے۔ اذیت رساں..... اذیت کے ناقابل شکست کٹھنے میں تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ لوگ سے کئی گنا طاقتور جانور اسے چھوڑے گا نہیں۔

”کیا اسے شوٹ کر دیا جائے؟“ کرنل احراز نے پوچھا۔

”کس کو؟“ میں نے دریافت کیا۔

”مگر مجھ کو یا لوگ کو؟ جس کو آپ کہیں.....“

میری آنکھوں میں کی سی تیرمئی۔ میں اس سوال کا جواب سوچ ہی رہا تھا جب لالچ نے ایک بڑا ہچکولا کھایا۔ ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہوائی فائرنگ بھی سنائی دی۔ ہم نے ٹیس پر جا کر دیکھا، منظر عبرت ناک تھا۔ لوگ نے زنجیریں اب بھی نہیں چھوڑی تھیں۔ مگر سینے سے نیچے اس کا دھرمو جو دبیں تھا۔ اس کے پیٹ کے کچھ اندرونی اعضا پانی پر جھلک دکھا رہے تھے اور پانی سرخ تھا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا زیر زمین پناہ گاہ کا۔ آج کئی ہفتوں کے بعد میں ایک بار پھر اس تاریک دریا کا شور سن رہا تھا جو نجانے کہاں سے نکلتا تھا اور کن اتھاہ غاروں میں سما جاتا تھا۔ یہ وہی قدرتی پناہ گاہ تھی جس کی تلاش میں سات سو سے زائد فوجی، کھوجی اور سراغ رساں کتے چپے چپے کی خاک چھانٹتے رہے تھے مگر اس پتھر تک نہیں پہنچ سکے تھے جسے سرکانے سے ان کے لیے ان کا سم کل سکتا تھا۔ طویل سگی سیزھیاں اترتا میرے لیے خاصا دشوار تھا لیکن خوشی اور جوش کا یہ عالم تھا کہ میں ایک گرین لیفٹیننٹ کے سہارے سے اتر رہا تھا۔ ابھی ہم نصف سیزھیاں ہی طے کر پائے تھے کہ ٹارچوں اور سرچ لائٹس کی روشنی میں مجھے دراز قد

طرح تا امید تھی تو یقیناً صورت حال سنگین تھی، میرے جسم میں ایک سرد لہری دوڑی۔ یوں لگا جیسے دل و دماغ میں کئی دنوں سے پلٹنے والے اندیشے درست ثابت ہو رہے ہیں۔
”کیا ہوا؟ کہاں ہے وہ؟“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

قسطینا نے پلکیں جھپک کر اپنے آنسو سنبھالنے کی کوشش کی اور رہائی جھکے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم ابھی تک سیزیموں پر کھڑے تھے۔ تاریک دریا کا دم شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا، دیواروں پر لمبے لمبے سائے تھے۔ بن مشہد اور سنبل وغیرہ بھی سیزیمیاں چڑھتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ بن مشہد کافی کمزور دکھائی دیتا تھا۔ وہ طویل بخار میں مبتلا رہا تھا۔ سنبل ویسی ہی۔ بن مشہد نے بھی مجھ سے معافہ کیا۔ میں نے سنبل کا کندھا تھمتھایا۔ ہم سیزیمیاں اتر کر پتھروں کے اس قدرتی چیمبر میں پہنچے جہاں ابراہیم موجود تھا۔

میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ چیمبر میں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے زینب کے رونے کی آواز آئی اور دل سینے میں سوکڑے ہو گیا۔ سوالی کا سہارا لیتے ہوئے میں چیمبر میں داخل ہوا۔ نگاہیں جیسے ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ میں سرتاپا پتھرا گیا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں میرے سامنے بستر پر ایک خالی کبل پڑا تھا مگر کبل خالی نہیں تھا، اس کے نیچے ابراہیم موجود تھا۔ بڈیوں کا ایک ڈھانچا جو دکھائی تک نہیں دے رہا تھا۔ اس کی صورت؟ خدا کی پناہ..... یہی لگتا تھا کہ کسی انسانی کھوپڑی پر سیاہی مائل رنگ زین منڈھا ہوا ہوا اور اس رنگ زین پر سرخ دھبے ہوں۔ ابراہیم کی بے نور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور دانت دکھائی دیتے تھے۔ اگر مجھے بتایا نہ جاتا تو میں بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ ابراہیم ہے۔ اس کی سانس کا زیر و بم بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

زینب نے لپٹ کر میری طرف دیکھا پھر اٹھی اور دلدوز انداز میں ”بھائی“ کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ گھونگھٹ کی آوٹ سے وہ نوحہ کنائس انداز میں پکاری۔ ”بھائی! انہوں نے خود کو ختم کر لیا۔ انہوں نے کسی کی نہیں مانی..... کسی کی نہیں۔“

بن مشہد نے جلدی سے آگے بڑھ کر بڈیوں کے ڈھانچے کی نبض ٹولی۔ اس کے سینے پر کان رکھ کر دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ پھر دھکی لہجے میں بولا۔ ”داخل سائز ستم ہوتے جارہے ہیں۔ اب تو شاید ہی ڈاکٹر ز بھی کچھ کر

قسطینا کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسب معمول پینٹ شرٹ میں تھی۔ کمرے ہو لٹر جھول رہا تھا۔ اس کے عقب میں کمانڈر فارس جان تھا۔ قسطینا بھاگتی ہوئی آئی اور ”شاہ زائب“ کہہ کر میرے گلے لگ گئی۔

اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کوئی جھجک نہیں رکھتی تھی اور نہ کسی کی پروا کرتی تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ کمانڈر فارس جان کی طرف بڑھایا۔ وہ بھی میرے گلے لگ گیا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”شاہ زیب صیب! آپ نے وہ کر دکھایا جس کا سہتا یہاں کا لوگ مدتوں سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک ذہنوں کو یقین نہیں ہو رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔“ قسطینا نے مجھ سے الگ ہو کر فوجی انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا اور اٹک بار لہجے میں بولی۔ ”ایئرمن! آخر تم کامیاب ہو گئے۔“

”میں نہیں، ہم سب کامیاب ہوئے۔“
”تم بہت زخمی ہو۔ بہت زیادہ زخمی ہو۔ ہمیں یہاں تقریباً ساری خبریں ملتی رہی ہیں۔ پھوپھو لورل کی موت نے ہمیں بہت دکھ دیا ہے مگر ان کی قربانی رانگاہیں نہیں گئی۔ اس اسٹیٹ کے دو سب سے بڑے دشمن اسی بے مثل قربانی کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچے ہیں۔“
”بے شک آپ درست کہہ رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر سایہ سالہرایا اور وہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔ بولی۔ ”شاہ زائب! ابھی کئی کرنے والے کام باقی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت وقت پر پہنچے ہو بلکہ..... میں تو یہ کہوں گی کہ یہ سب کچھ ڈرامائی حد تک بروقت ہوا ہے۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے کمانڈر فارس کی طرف دیکھا، وہ بولا۔ ”ہاں برادر شاہ زیب! یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اگر آج آپ لوگ یہاں نہ پہنچتا تو شاید..... ام مزید صبر نہ کر سکتا۔ ام سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ شاید ام لوگ سارے خوب (خوف) ایک طرف رکھ کر باہر ہی نکل آتا۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو فارس؟“
قسطینا نے سمیر لہجے میں کہا۔ ”شاہ زائب!.....! ابراہیم کی حالت..... ٹھیک نہیں..... وہ بہت بری حالت میں ہے..... امید تو زیادہ نہیں لیکن شاید اگر وہ اسپتال پہنچ جائے تو.....“ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ قہر مکمل نہ کر سکی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت باہمت لڑکی ہے اگر وہ اس

سکس۔“

حیثیت سے قسطنطین..... ابراہیم سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ اسے ”چھوٹے بھائی“ کہہ کر بلاتی تھی اور بیان فردوس سے اختلافات رکھنے کے باوجود ابراہیم کی بات کو اہمیت دیتی تھی۔ اب بھی وہ مسلسل فون پر مصروف تھی۔ اس نے جزیرے پر موجود بہترین ڈاکٹروں کو ملٹری اسپتال میں جمع کر لیا تھا، ان میں دو غیر ملکی بھی تھے۔

اسی اثنا میں نیلی آنکھوں والا دراز قد پال اندر داخل ہوا۔ اس کے زخمی کندھے پر ابھی تک ڈریسنگ موجود تھی۔ ایک امریکی کو اپنے سامنے دیکھ کر قسطنطین چونکی اور اس کے چہرے پر تردد نمودار ہوا۔ میں نے کہا۔ ”قسطنطین! یہ پال کورنی ہیں۔ انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔ ہر جگہ انہوں نے ہمارے کندھے سے کندھا ملائے رکھا ہے۔ شاید آپ نے نیوز میں بھی ان کا تذکرہ سنا ہو۔“

پال کورنی نے مسکرا کر قسطنطین سے مصافحہ کیا پھر بولا۔ ”یور ہائی ٹس! ہم دیکھ رہے ہیں کہ بیچے (ابراہیم) کی حالت واقعی تھویشناک ہے مگر ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ نیویارک کے بہترین نیوروفزیشن ڈاکٹر یوشروائٹ میرے دوستوں میں ہیں۔ میں نے انہیں پہلی دستیاب فلائٹ سے بردوانی پہنچنے کے لیے کہا ہے۔“

”شکریہ۔“ قسطنطین نے کہا۔ ”یہ نام تو شاید میں نے بھی سنا ہو ہے۔“

اسی دوران میں پال کے سیل فون پر کال آگئی۔ اندازہ ہوا کہ یہ ایک نامور ڈاکٹر کی کال ہے۔ ڈاکٹر چاہ رہا تھا کہ ابراہیم کی کچھ خاص رپورٹس نیٹ کے ذریعے اسے ارسال کر دی جائیں تاکہ وہ سفر کے دوران میں انہیں دیکھ سکے۔

پال، بات کرتا ہوا ڈاکٹر زروم کی طرف چلا گیا۔ قسطنطین بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ کمرے کے دروازے پر اور کوریڈور میں درجنوں مسلح محافظ چوکس کھڑے تھے۔ میں نے کہا۔ ”قسطنطین! آخر ابراہیم اس حالت تک کیسے پہنچا، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ سب کچھ ہو گیا؟“

”وہ کسی کی نہیں سنا تھا شاہ زائب! NEUROTIC کی خاصی مقدار اس کے پاس موجود تھی..... اور وہ اسے معمول کے مطابق استعمال کر سکتا تھا مگر وہ نہیں کرتا تھا۔ جب میں یا فارس اس پر زور دیتے تھے تو وہ ایک دم جھنجھلا جاتا تھا۔ مجھے تو کسی وقت ڈر لگتا تھا کہ وہ خود کو کچھ کر ہی نہ لے۔“

میں نے دل کڑا کر کے ابراہیم کے ناقابل شناخت چہرے کو چھوا۔ میرے دل نے کوئی دلی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ میں نے اس کی پیشانی چومی۔ اس دوران میں قسطنطین اسٹرچر منگوا چکی تھی اور چاق و چوبند فوجیوں کو اسٹینڈ بائی کر دیا تھا۔

میں نے سرگ سے باہر کھل احرار کو ہدایت کی کہ وہ ایک ہیلی کاپٹر فوراً منگوائے۔ ایک مریض کی حالت بہت نازک ہے اور اسے فوراً جامامی کے اسپتال پہنچانا ہے۔

ابراہیم کو اسٹرچر پر لٹا کر باہر لے جانے کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے زینب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے تسلی بخشی کی باتیں کیں۔ اسے ابھی تک اپنی ساس بیگم لورل کی موت کے بارے میں پتا نہیں تھا ورنہ اس کے دکھ میں اضافہ ہوتا۔

اسی دوران میں میری نگاہ اس زریز میں تاریک دریا کی طرف اٹھ گئی۔ گیس پیس اور بجلی کے قصبوں میں اس کا ایک کنارہ نیم روشن دکھائی دیتا تھا۔ وسیع و عریض زریز میں خلا کی چمکت سے عجیب وضع کے حشرات لڑیوں کی صورت میں جھومتے تھے اور ان کے اندر سے قدرتی روشنی پھوٹی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح میں اس پانی کے کنارے، فارس جان کو خاموش بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ پھر میں اس کی ذاتی ڈائری تک پہنچا تھا جو ایک ناقابل فہم زبان میں لکھی گئی تھی۔ زبان شناس ایتھ نے اس ڈائری کو پڑھا تھا اور ہم پر فارس جان کے اس خاموش عشق کا انکشاف ہوا تھا جو وہ اپنی کمانڈر قسطنطین سے رکھتا تھا۔ سارے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے۔ میں فارس اور قسطنطین سے کئی باتیں پوچھتا چاہ رہا تھا مگر ابراہیم کی حالت نے کسی اور ”منگھٹو“ کی منجاش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

☆☆☆

قسطنطین کی واپسی نے جامامی میں جوش و خروش کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ جامامی کے بیشتر باشندے تو پہلے ہی سڑکوں پر تھے اب ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں ڈی پبلک کے اندر اور باہر جمع تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ ان کی سپریم کمانڈر ان سے خطاب کرے۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ قسطنطین اس وقت ڈی پبلک میں نہیں ملٹری اسپتال میں ہے۔ اس کی اور ہم سب کی تشویش عروج پر تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح ابراہیم زندگی کی طرف لوٹ سکے۔ میں جانتا تھا، ایک کرن کی

ایک رومانوی جملہ

”میں رات بھر تمہارے فراق میں جاگتا رہتا ہوں
ررات بھر اپنے خوابوں میں تمہیں ہی دیکھتا رہتا ہوں۔“
دریافت طلب بات صرف اتنی ہے کہ رات بھر
جاگتے والے رات بھر کی کو خواب میں کس طرح دیکھ سکتا ہے؟

☆☆☆

جج: ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے تین راتوں
تک ایک ہی دکان میں بار بار نقب کیوں لگائی؟“
طرم: ”بات یہ ہے، جناب عالی کہ میں نے اس
دکان سے اپنی بیوی کے لیے ایک لباس چرایا تھا جو اسے
پسند نہیں آیا اور مجھے دوبارہ تبدیل کرنے جانا پڑا۔“

☆☆☆

ڈاکٹر: ”کیسے جناب، دل کے آپریشن کے بعد
اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“
مریض: ”کچھ یوں لگتا ہے ڈاکٹر صاحب جیسے
میرے سینے میں ایک کے بجائے دو دل دھڑک رہے
ہوں۔“

ڈاکٹر: ”اوہو، اب پتا چلا میں سوچ رہا تھا کہ اپنی
درست واقع کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں؟“

☆☆☆

ہاکی فیجر: ”الفت حسین، تم نے آج کے فٹ بال
بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا ہے۔“
الفت حسین: ”نہیں جناب، میں سمجھتا ہوں کہ آج
تو مجھ سے بالکل کھلا ہی نہیں گیا۔“
فیجر: ”لیکن تم نے اپنے کھیل سے مخالف ٹیم کی جو
مدد کی ہے اسے عرصہ دراز تک یاد رکھا جائے گا۔“

☆☆☆

کسی محاورے کا اس سے بہتر استعمال ہم نے آج
تک نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوس کی ایک خاتون سے
کہہ رہے تھے۔ ”یہ تو درست ہے کہ آج صبح ہی آپ
میرے پاس معائنہ کرانے آئی تھیں لیکن اس وقت مجھے
آپ کے گھر کے قریب رہنے والے مسٹر شاہد کو دیکھنے آنا
پڑا تو میں نے سوچا کہ چلو، آپ کو بھی دیکھتا چلوں تاکہ
ایک ہی تیر سے دو حکار کیے جاسکیں۔“

کوہاٹ سے نمبر احمد علی شاہ کا کھیل

”آپ لوگ اسے کسی طرح سلا کر یا بے ہوش کر کے
NEUROTIC اس کے جسم میں داخل کر سکتے تھے۔“
”ہم نے اس بارے میں سوچا تھا مگر جب تک دیر ہو
گئی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اسے بے ہوش کرنے کی
کوشش اس کی جان کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔“ چند لمحے
مادوش رہ کر اس نے ایک آہ بیچی اور بولی۔ ”اس کے دماغ
میں بس ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی..... مر جائے گا یا پھر اس
اگر وہ چھٹکارا حاصل کر لے گا۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا
کہ اگر وہ ایسا کرتا ہی چاہتا ہے تو پھر کم از کم اس جگہ تو نہ
کرے۔ جب ہم یہاں سے نکل کر شہر پہنچ جائیں اور طبی
ہولتیں موجود ہوں تو پھر وہ یہ کوشش کر دیکھے مگر وہ کچھ مانتا
ہی نہیں تھا۔“

”زیب کی ہر بات تو مستحکم تھی۔“ میں نے کہا۔
”نہیں۔“ قطینا نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔
”اب وہ اس کی بھی نہیں سنتا تھا بلکہ کئی دفعہ اس سے جھگڑا
اور بے چاری کو کھٹوں تک رونے پر مجبور کیا۔ حالانکہ وہ جو
کچھ کر رہا تھا، اسی کے لیے کر رہا تھا..... اپنی حالت بگڑنے
کے بعد اس نے دو چار بار تمہارا نام بھی لیا شاید تمہیں دیکھنا
چاہتا تھا۔“

پھر قطینا نے میرے سراپا..... پر نگاہ دوڑائی اور غم لہجے
میں بولی۔ ”تم کیسے ہوشیار اب؟“

”آپ کے سامنے ہوں..... آپ کو میرے کندھے
کی بہت فکر رہتی تھی نا؟ اب کندھا بالکل درست ہے۔“ میں
نے اسے بازو ہلا کر دکھایا۔

وہ بولی۔ ”کندھا تو درست ہے لیکن اور بہت کچھ
درست نہیں ہے۔ تمہارے جسم کے جو حصے لباس سے باہر نظر
آ رہے ہیں ان پر زخم ہیں۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر ہی پتا چل جاتا
ہے کہ تم اس وقت بھی شدید بخار میں جھک رہے ہو۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”یہ باتیں زیادہ اہم نہیں
ہیں قطینا! اہم یہ ہے کہ ہم ابھی کی اور اس کے کٹ پتلی رانے
دل کو گھٹکتا فاش دے چکے ہیں..... اور اہم یہ ہے کہ آپ
لے ڈی پیلس پر پھر سے جامانی کا پرچم لہرا رہے ہیں اور یہ بھی
اہم ہے کہ آپ پھر سے ہمارے درمیان ہیں۔ باقی رہے یہ
الم..... تو اب ان کو بہت جلد ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں شاہ
اب؟“

”اگر ضروری ہے، تو پھر اسی منہ سے کر دیں..... اور
اللہ سے اپنے لوگوں سے آپ کا ایک خطاب بھی بہت

ضروری ہے۔ وہ آپ کو سننے کے لیے بے چین ہیں۔
”مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ وہ نہیں سننے کے لیے بے چین ہوں گے۔ تم یہاں کے لوگوں کے لیے بہت اہمیت اختیار کر چکے ہو شاہ زائب!..... شاید مجھ سے بھی زیادہ..... اور مجھے اس کی خوشی ہے۔“

”آپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا قسطنیہ! آپ نے جو طویل جدوجہد کی، میں نے تو بس اس کا آخری فقرہ لکھا ہے..... اور شاید یہ آخری بھی نہیں ہے۔ ابھی اور کئی چھوٹے موٹے مسائل کا سامنا آپ کو کرنا پڑے گا..... اور مجھے پوری امید ہے کہ اب آپ آسانی سے کر لیں گی۔ آپ کو فارس جان جیسے جاں نثار کمانڈروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔“ میں نے سختی خیر لہجے میں کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لیں۔

ہم اس ”آئی سی یو“ کے قریب ہی موجود تھے جہاں مقامی اور غیر ملکی ڈاکٹرز ابراہیم کی فہمیں بحال کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اگلے تین چار گھنٹے اہم ترین قرار دیے تھے۔ جب کوئی ڈاکٹر شیشے کی دیوار کے سامنے سے گزرتا تھا، ہماری نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرتے لگتی تھیں۔ ہم اس کے تاثرات سے جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ صورت حال کیا ہے؟

شدید تشویش سے دھیان بٹانے کے لیے قسطنیہ نے جامامی کی صورت حال کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ اس نے عارفہ خاتون، نیگم نورل اور پھر رائے زل کے آخری وقت کے بارے میں پوچھا۔ میں نے مختصراً جواب دیے۔ جب میں نے محترم ذکری سے ملاقات اور ان کی بے دخل رہنمائی کا ذکر کیا تو قسطنیہ کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس نے اس حوالے سے بھی کئی سوال پوچھے۔ گفتگو کے ایک مرحلے میں اذیمیر طیب کی پالتو لوی کا ذکر بھی آیا۔ اس نے جو کچھ کیا، وہ سب کے لیے حیران کن اور بہت مستثنیٰ خیر تھا۔ میں نے قسطنیہ کو بتایا کہ لوی کی وحشت اب کم ہو چکی ہے۔ اسے بجنرے سے نکال دیا گیا ہے۔

لڑائی کے متعلق ایک سوال کا جواب، میری طرح قسطنیہ کے لیے بھی ایک پہیلی جیسا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ”شاہ زائب! جب تم لوگ ڈی پٹیس کے سامنے پہنچ گئے..... اور لوگوں نے ”آؤٹ آف کنٹرول“ ہو کر خاردار تاریں پھلانگیں اور مورچوں پر قبضہ کر لیا تو ڈی پٹیس کا مین گیٹ

بند ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ کیوں کھلا رہا؟“
”کہا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی تکنیکی خرابی ہو گئی تھی۔ نوے فیصد امکان اسی بات کا ہے کہ یہ خرابی اتفاقاً تھی۔ پیدا کی گئی تھی۔“
”کوئی ہمارا اندر کا ہمدرد؟“ قسطنیہ نے پوچھا۔

”ممکن ہے..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موقع پر مو آپریٹر نے ہی یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔“
”لیکن میری اطلاع کے مطابق، اس مرکزی کمرے پر کم از کم دو آپریٹر موجود ہوتے تھے جو آٹومیک کنٹرول کرتے تھے۔ اکثر ایک سینئر انجینئر بھی اس معاونت کے لیے موجود ہوتا تھا۔ وہ جگہ سخت سکیورٹی رہتی تھی۔“

”بہر حال جو کچھ بھی ہوا قسطنیہ! ایک فنی مدد کی طرح تھا۔ مشغول ہجوم نے اور رضا کار دستوں نے اس موقع پر اور فائدہ اٹھایا اور ڈی پٹیس میں گھس گئے۔“
”آقا جان اب کہاں ہے؟“ قسطنیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”جیل میں..... اسے سخت سکیورٹی میں رکھا گیا ہے۔ مگرین فورس کے کچھ افسران بہت مشغول تھے۔ ان کا کار تھا کہ آقا جان کو پھر پھر سیل میں رکھا جائے..... اور اسے اذیت کا تھوڑا سا مزہ چکھایا جائے جو اس نے مجھ پر رکھی۔ لیکن میں نے منہج کر دیا ہے۔“

”تم پر کیا جانے والا قسم واقعی دل کو چیر ڈالتا ہے۔ بہت بڑے ایم ایم اے فائزر ہو لیکن تم نے یہ لڑائی فائنٹ کے نہیں اپنی غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کر کے جیتی ہے۔ ہم سنتے آرہے تھے کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں کچھ چیز اچانک ”وائرل“ ہو جاتی ہیں اور آقا جانابزار ہا لوگ ان متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہمیں تمہارا ”نار چرپیل والی تصویر“ سے ملا ہے۔“

”بس جو کچھ ہوا خود بخود ہی ہوا۔ کہتے ہیں نا“ بندے کی اپنی پلاننگ ہوتی ہے اور قدرت کی اہ پلاننگ۔“

اس نے ذرا چونک کر میری جانب دیکھا۔ پھر ہو۔ سے بولی۔ ”تم تو قدرت اور خدا کا ذکر کم ہی کیا کر۔ ہو..... مجھے تم کچھ بدلے بدلے نظر آرہے ہو۔“
میں نے گہری سانس لی۔ ”کہتے ہیں ناکثات ایک تعمیر کو ہے زمانے میں۔ میں نے بھی ان گزرے ہو۔ دنوں میں بہت کچھ دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔“

جس سے وہ مردوں میں جان ڈالتا تھا۔ تاہم بڑے سے بڑا مسیحا بھی یہی کہا کرتا ہے کہ موت کے سوا ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔

رات گئے ایک اچھی خبر ملی اور وہ یہ تھی کہ NERVOUS ریسانس کر رہے ہیں اور ابراہیم کی بغض میں کچھ بہتری آئی ہے۔ بہر طور اس کی زندگی مسلسل خطرے میں تھی۔

رات تین بجے کے لگ بھگ میں ڈی ہیلز واپس آگیا۔ میرے ڈاکٹر کا شدید اصرار تھا کہ میں چند گھنٹے کے لیے مکمل آرام کروں۔ میں ڈی ہیلز کے مین گیٹ کے قریب پہنچا تو میری حفاظتی گاڑیوں کو رکنا پڑا۔ گیٹ پر رات کے اس پہر بھی لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ میرے پوچھنے پر کرنل احرار نے بتایا۔ ”آقا جان اور اس کے دو فریبی ساتھی اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں۔“

کل سہ پہر ہی فوجی عدالت نے آقا جان کی قسمت کا فیصلہ کر ڈالا تھا..... اور پیریم کمانڈر کی حیثیت سے قسطنطنیہ اس فیصلے کی توثیق بھی کر دی تھی۔ جامانی کے لاکھوں لوگ اپنے اس بدترین غدار کو جلد از جلد تختہ دار پر دیکھنا چاہتے تھے۔

گرین فوجیوں نے بمشکل راستہ بنایا اور ہماری گاڑیاں ڈی ہیلز کے اندر چلی گئیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچتے دیکھوں۔ کرنل احرار، کمانڈر زمان اور جاسم وغیرہ بھی یہی چاہتے تھے۔ ہم ایک لفٹ کے ذریعے ڈی ہیلز کی بیرونی فسیل پر پہنچے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی مگر یہاں ابھی تک بڑے بڑے پلیٹ فارمز پر مارٹر گنز، پوزر گنز اور ایم آر ایل وغیرہ نظر آرہے تھے۔ ہم فسیل کے اوپر ایک ٹکراؤ پوسٹ کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

پھانسی کا وقت ہو چکا تھا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر چکرا رہے تھے اور دیگر حفاظتی انتظامات بھی مکمل تھے۔ چند منٹ بعد ہی آقا جان اور اس کے دونوں ساتھیوں کو عارضی پھانسی گھاٹ تک پہنچا دیا گیا۔ یہی وہ پھانسی گھاٹ تھا جہاں ہر ولعیز عبدالکریم اور اس جیسے سیکڑوں حریت پسندوں کو بے رحمی سے موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا..... آج آقا جان کی باری تھی۔ بے شک یہ جامانی کی کہانی نہیں تھی، یہ کشمیر، فلسطین، برما، افغانستان اور لیبیا جیسے ہر خطے کی کہانی تھی۔

ہم نے دیکھا کمانڈر فارس جان کی نگرانی میں آقا

”ہماری بات دوسری طرف نکل گئی۔ ہم آقا جان کا ار کر رہے تھے۔ اس کے بارے میں کیا سوچ ہے تمہاری؟“ (آقا جان کو قسطنطنیہ بھی بڑے احترام سے انگل آقا کہا کرتی تھی)

میں نے کہا۔ ”جو آپ کی رائے ہوگی، وہی میری ہو گی۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس شخص نے ایک بدترین غدار کا کردار ادا کیا ہے۔ اسے معاف نہیں کیا جانا چاہیے۔“ قسطنطنیہ حسب عادت اپنے کان کی کوسل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ جھلک رہی تھی۔

میں نے دیکھا ”آئی سی یو“ کی طرف سے پال کورنی ہماری طرف آرہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک تشویش آمیز تیزی تھی۔ ہم اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ پال نے لم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ”بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے، لیکن..... امید کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وائٹ نیویارک ازپورٹ سے روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ اس وقت فضا میں ہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہیے۔“ اس کی آواز کچھ بھرا گئی۔ میرا دل جیسے کسی نے ٹھکی میں لے لیا۔

تو کیا ابراہیم جا رہا تھا؟ کیا زینب اور ابراہیم کمرشانی طور پر ملنے کے بعد پھر جدا ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی حالات کی نہایت خوشگوار کرویش بھی نصیب کو بدل نہیں سکتیں۔ زینب کی قبر بن چکی تھی لیکن پھر کمرشہ ہوا تھا اور وہ زندہ سلامت ابراہیم کے سامنے آگئی تھی لیکن اب حالات کی بدترین سنگینی پھر اس کرشمے کی چمک کو دھندلاتی چلی جا رہی تھی۔

پال نے کہا تھا کہ ابراہیم کے لیے دعا کریں۔ اس نے چارے کے لیے زینب سے زیادہ کس کی دعا قبول ہو سکتی تھی۔ وہ یتیم بے سہارا پہنچا جو دوسروں کے حکم پر اپنے فوہر کا ہاتھ پکڑ کر ہزاروں میل دور اس پردیس میں آگئی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں پر زور دیا اور بمشکل اٹھ کر چند لمہ آگے گیا۔ ساتھ والے کینن میں زینب موجود تھی۔ وہ اگلا فرش پر مصلیٰ پھنچائے سجدے میں گری ہوئی تھی۔

☆☆☆

چند گھنٹے پہلے ڈاکٹر یوشرو وائٹ یہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ وائٹ سے بڑیر یہ ہیلی کاپٹر یہاں آیا تھا اور آتے ساتھ ہی ایلروں کی اس ٹیم میں شامل ہو گیا تھا جو ابراہیم کو کوئے کی لائیت سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے مسیحا وائٹ ڈاکٹر وائٹ کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کی لمبیت میں کمال کا اعتماد تھا۔ خدا کی بخشی ہوئی عقل ہی تھی

جان اور اس کے دونوں ساتھی نمودار ہوئے۔ آقا جان سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر وہ سخت مزاحمت کر رہا تھا۔ سپاہیوں کی گرفت سے نکل نکل جا رہا تھا۔ پھر عجیب منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ اس موقع پر بھی گالیاں بک رہا تھا۔ ہم پلندی پر تھے اس کے باوجود اس کی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔

سخت دھچکا مشتق کے عالم میں اس کا سیاہ ٹراؤ زریخے کھسک کر گھٹنوں تک پہنچ گیا جسے اہلکاروں نے بمشکل کھینچ کر اوپر کیا۔

ایک ایک اس نے لہجہ بدلا اور منت ساجت میں مصروف ہو گیا۔ وہ سپریم کانڈر قسطنطینا کا نام لے رہا تھا۔ ”قسطنطینا کو یہاں لاؤ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ بس ایک بار اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ پھر وہ سپرنٹنڈنٹ جنرل کی طرف مڑا اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ شور کے سبب اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچی۔ بس فون..... بیجی..... غلط فہمی جیسے الفاظ ہی سمجھ میں آئے۔ سپرنٹنڈنٹ اپنا کام اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر آقا جان کو پھانسی گھاٹ کی چوبی سیڑھیوں کی طرف جانے پر آمادہ کرتا رہا۔ وہ نہیں مانتا تو اس کے اشارے پر اہلکاروں نے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور چوڑے پر پہنچا دیا۔ یہاں اس کے دو ساتھی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ آقا جان ایک بار پھر اشتعال میں آیا اور دائیں بائیں زور مارنے لگا۔ اتنے فاصلے سے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا مگر یقیناً اس کی ناک کا بل بہت موٹا ہو چکا تھا، وہی منٹوس بل جس کے نتیجے میں جاناں، زینب اور عبدالکریم جیسے لوگوں پر آفتوں کی یلغار ہوتی تھی۔ اس کے منہ پر سیاہ نقاب چڑھا کر پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ پاؤں کے نیچے سے تختہ نکلنے تک وہ اہلکاروں کے ہاتھوں میں تڑپتا پھرتا رہا۔ تینوں جسم خلا میں بھولے تو ڈی پیلز کے در و درو پار پر جوش نفروں سے گونج اٹھے پھر کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔ جاماجی کے سارے موسم بدل رہے تھے۔

☆☆☆

قسطنطینا، بن مشہد اور دیگر ساتھیوں کو ٹاپو کی زیر زمین پناہ گاہ سے باہر نکلے آج تیسرا روز تھا۔ غیر رسمی طور پر قسطنطینا کو جاماجی میں کلیدی فیصلوں کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ وہ بڑی فہم و فراست سے صورت حال کو کنٹرول کر رہی تھی۔ عوام

کے شدید اصرار پر اس نے ڈی پیلز کی بیرونی بالکونی لاکھوں کے مجمع سے خطاب بھی کیا تھا۔

محترم ڈکری کے مشورے کے عین مطابق نیوڈ یلغار نہیں کی گئی تھی اور صرف بارڈر کے کچھ علاقوں پر کر کے فائر بندی کر دی گئی تھی۔ نجمانے کیوں محترم جا ڈکری کو یقین تھا کہ بہت جلد خونریزی کے بغیر نیوڈ لوگ ڈی پیلز کو مرکز و محور مان لیں گے۔ ہاناوانی بارے میں یہی خبریں تھیں کہ وہ نیوڈی میں ہے اور نے قسطنطینا کے حملے کی صورت میں نیوڈی کا دفاع کرے۔ اعلان کیا ہے (یہ بات اب ثابت ہو چکی تھی کہ حملے روز وہ اسپتال کے سائڈ پروف کمرے سے ایک گر آفسیر کے تعاون سے فرار ہوئی تھی۔ کہا یہی جا رہا تھا کہ آفسیر..... ہاناوانی میں موجود ہینائزم کی غیر معہ صلاحیتوں کا شکار ہوا ہے۔ یہ بات مجھے کچھ عرصہ بتائی جاتی تو شاید میں نہ مانتا..... لیکن اب تو میں حوالے سے ذاتی تجربے..... بلکہ تجربوں کا حامل تھا۔ عینک کے پیچھے چھپی ہوئی خطرناک کشش..... وہ دست بھنور..... اور اس بھنور کے سامنے بے جان ہوتے ہو ہاتھ پاؤں، مجھے سب یاد تھا۔

کئی دنوں سے یہ سوال حل طلب تھا کہ حملے کے ڈی پیلز کا مرکزی گیٹ کیسے خراب ہوا تھا۔ مار دھاڑ دتی، بموں کے دھماکوں میں وہ سی سی وی کیسے بھی رہے ہوئے تھے جو گیٹ کے ارد گرد کے مناظر کو ریکارڈ کر تھے۔ جو ایک دونوں کی تحسین وہ بیکار تھیں۔ ان میں سر جنگی صورت حال ہی دکھائی دیتی تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو چکی تھی کہ دیو پیل گیٹ کے میکینزم کو جان بوجھ کر خراب کیا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ موج پر موجوا یک یا دو کی وی کیسروں میں سے فوٹیج نکال لی گئی ہے یا پھر ان میموری کارڈ ہی موجود نہیں۔

اسی طرح کا ایک اور سوال بھی تھا۔ وہ ڈاکٹر مارے اس کے بیچے کے حوالے سے تھا۔ انیق اور جاسم کی کوئی کے باوجود ابھی تک ڈاکٹر کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اب تکلیف دہ سوچ ذہن میں آ رہی تھی کہ کیا وہ دونوں بھی بہت سے لوگوں میں شامل ہیں جو اس لڑائی میں لقمہ ہوتے ہیں۔

ان دونوں سوالات کا جواب مجھے تقریباً ایک سا ملا۔ میں بیٹھا تھا کہ انیق سر کھتا ہوا اندر داخل ہو اس کے پاس ایک لیپ ٹاپ بھی تھا، وہ بولا

والی ایک چھوٹی کرسی اٹھائی اور اسے دیوانہ وار کنٹرول تختل پر مارنا شروع کر دیا۔ تختل میں سے جو اسپارکس نکل رہے تھے وہ بھی فوج میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کئی تار بیچ کر توڑ ڈالے اور پھر سی ٹی وی کیمرے کے فریم سے نکل گئی۔

میں ششدر تھا۔ ایتھ نے کہا۔ ”دیکھا جائے تو ڈاکٹر ماریہ نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیکڑوں لوگوں کی جانیں اس کے اس دلیرانہ اقدام سے بچ گئی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ڈاکٹر ماریہ اب خود کہاں ہے؟“ میرے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”آپ کے خیال میں اسے کہاں ہونا چاہیے؟“

”میرے خیال میں اسے زندہ ہونا چاہیے۔ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔“

”ڈاکٹر ماریہ زندہ ہے اور میری اطلاعات کے مطابق وہ کل رات تک جامی میں ہی تھی۔ اس نے کسی کو فون کیا تھا اور اس فون کے ذریعے ہم اسے ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں وہ ہمارے سامنے ہو۔“

میں نے ایک بار پھر وہی فوج دیکھی جس میں ماریہ آٹومیک گیٹ کے کنٹرول کو تباہ کرتی نظر آتی تھی۔ یہ سنسنی خیز مناظر تھے۔ ان میں ایک ایسی عورت کا رویل نظر آتا تھا جسے ایک بااختیار شخص نے بلیک میل کر کے اپنے ہیڈ روم کی زینت بنایا تھا۔ اسے روندنا تھا۔ اسے آن گنٹ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کیا تھا۔ اور مسلسل کیا تھا۔ ان مناظر میں اس عورت نے اپنا بدلہ لے لیا تھا اور نہ صرف بدلہ لیا تھا بلکہ اپنے لاکھوں ہم وطنوں کے لیے پیش قدمی اور فتح کی راہ ہموار کی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ایتھ تم نے ابھی ایک فون کی بات کی ہے۔ ڈاکٹر ماریہ نے کس کو کیا ہے فون؟“

”آپ نے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اس اہم فوج تک کیسے پہنچا ہوں؟“

”تم کچھ بتاؤ تو پھر ہے ناں، تم تو ہر وقت لٹھ لے کر سپنس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔“

”سپنس ہی تو کہانی کی جان ہوتا ہے جی۔ آپ نے کبھی کرتل حمیدی فریدی، علی عمران اور میجر پرمود وغیرہ کو پڑھا ہے؟ انہیں پڑھا ناں اسی لیے آپ کو سپنس کا پتا نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے فلسفہ بادشاہ

”لوجی، اپنی سراغ رسانی مکمل ہوگئی، ڈاکٹر ماریہ کا کھوج لگ گیا۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ایک سو ایک فیصد اور آپ کے لیے ایک اور بڑا انکشاف بھی ہے۔ ہم پچھلے تین روز سے اپنے اس محسن کو ڈھونڈ رہے ہیں جس نے ہمارے لیے ڈی پیکس کا دروازہ کھولا۔ آپ کو پتا ہے، وہ کون ہے؟“

”کون ہے؟“

”اس کو اس فوج میں دیکھ سکتے ہیں جو میں ساتھ لایا ہوں۔ یہ اس لڑائی کی اہم ترین فوج ہے اور یہ آپ کے اس خاکسار نے آج ہی حاصل کی ہے۔“

اس نے لیپ ٹاپ کے ”کی بورڈ“ کو استعمال کیا اور چند سیکنڈ بعد سی ٹی وی کی ایک فوج اسکرین پر پلے ہونے لگی۔ یہ کافی صاف فوج تھی۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ اسی خوبی سے پہر کی ہے جب ہم ڈی پیکس پر ہلا بول رہے تھے۔ اسکرین پر مین گیٹ کے کنٹرول روم کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک کیمرے نے ایک جواں سال عورت کو عقب سے دکھایا جو سیکورٹی اہلکاروں سے بات کر رہی تھی اور انہیں اپنا کارڈ دکھا رہی تھی۔ رائے زل کی فورس کے ان مسلح اہلکاروں نے اسے آگے جانے دیا۔

جب دوسرے کیمرے نے عورت کو دکھایا تو میں دمک رہ گیا۔ وہ ڈاکٹر ماریہ تھی۔ وہ کنٹرول روم کے خاص حصے میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ جب اس نے دروازہ بولٹ کیا، گیٹ کو کنٹرول کرنے والے دو آپریٹرز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے اپنے سفید کوٹ کے اندر سے ایک سائنکسر لگا بریٹا پہن لایا۔ اس سے پہلے کہ آپریٹرز کچھ سمجھ پاتے، ڈاکٹر ماریہ نے تین فاز کیے اور دونوں گیٹ آپریٹرز اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے۔ کنٹرول تختل کے اوپر لگی دو اسکرینز پر گیٹ کے باہر کے دھندلے مناظر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ان تھمکے خیز لمحات تھے جب کسی جانب سے گولی چلی تھی اور اسے کچھ کنٹرول سے باہر جو گیا تھا۔ ہزاروں افراد وہاں پر چڑھ دوڑے تھے۔ ہم نے فوج میں دیکھا کہ انڈول تختل کے سامنے کھڑی ڈاکٹر ماریہ زخمی شیرنی کی طرح نظر آ رہی ہے۔ وہ کنٹرول تختل پر چھٹی..... اور اسے بھٹک گئی۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گیٹ کے لمبے اس طرح نقصان پہنچائے۔ پھر اس نے آہنی ناگوں

جیسی فلموں پر رویا برباد کرنے کے بجائے ان کرداروں پر کوئی ڈھنگ کی فلم بنادیں تو کروڑوں میں کھیلیں۔“
میں نے کہا۔ ”دیکھو، ابھی تم نے لات کا ذکر کیا تھا، اور لات تمہیں پڑنے والی ہے۔“
وہ جلدی سے پٹری پر آگیا اور بولا۔ ”ڈاکٹر ماریہ نے کل وہ فون اپنے ایک مریض کی بیوہ کو کیا ہے اور مریض کے وفات پانے پر اسے کئی ٹکفی دی ہے۔“
”مریض کون تھا؟“

”ڈی پبلس کی نگرانی کے ڈپارٹمنٹ کا ایک چالیس سالہ لیکنیٹن شکور آصفی، وہ پرسوں شام ایک بارودی سرنگ کے پھٹنے سے مارا گیا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے دوسری سی... فیوٹی کیمروں سے ڈاکٹر ماریہ کی فوٹیج نکالی۔“

ایق نے اس حوالے سے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔۔۔۔۔ معمولی حیثیت کا مالک شکور ہیٹائٹس سی کا پرانا مریض تھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے طویل عرصے تک بلامعاوضہ اس کا علاج کر کے اسے اس بیماری سے چھٹکارا دلایا تھا۔ اس بنا پر وہ ڈاکٹر ماریہ کا بے حد احسان مند تھا۔ پرسوں سہ پہر حملے کے وقت جب ڈاکٹر ماریہ کنٹرول روم میں تھی اور اس نے دو افراد کو ہلاک کر کے گیس کا میکینزم جام کیا تو شکور نے دیکھ لیا۔ تب تک کچھ پتا نہیں تھا کہ اس لڑائی میں ایجنسی اور گرے فورس کو کامیابی ملنی ہے یا گرین فورس کو۔ اس خیال سے کہ ان سی سی بی وی کیمروں کی وجہ سے ڈاکٹر ماریہ پر کوئی مصیبت نہ آئے، شکور آصفی نے بڑی مہارت اور تیزی سے دونوں کیمروں کے ریکارڈنگ باکس کھولے، ان میں سے میموری کارڈز نکالے اور اپنے گھر لے گیا مگر ایک دو گھنٹے بعد اسی شام شکور کی زندگی کا سفر ختم ہو گیا۔ ڈی پبلس کے قریب بارودی سرنگ کے ایک دھماکے میں تین شہری جاں بحق ہوئے ان میں سے ایک لیکنیٹن شکور بھی تھا۔
نیز میں اس کی تصویر بھی آئی تھی۔ اسی دوران میں ایق ایک مقامی سراغ رساں کے ہمراہ گمشدہ میموری کارڈز کا کھوج لگاتا ہوا شکور کے گھر جا پہنچا، جہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ شکور کی بیوہ بے چاری کو کچھ پتا نہیں تھا کہ گھر کی ایک الماری میں جو الیکٹرونکس کی اشیاء پڑی ہیں وہ کس قدر اہم ہیں۔ ایق نے وہ ایس ڈی میموری کارڈز، آج صبح ہی شکور کی بیوہ سے حاصل کر لیے۔ شکور کی بیوہ نے ایق اور مقامی سراغ رساں کو بتایا تھا کہ اس کے لیے ڈاکٹر ماریہ کا تعزیتی فون بھی آیا ہے۔ اب ایق، مقامی سراغ

رساں کے ساتھ مل کر اسی فون نمبر کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب قسطنیا کا پرنسپل سیکریٹری اندر داخل ہوا اور مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد بولا۔ ”جناب! ہرپاؤ نس تشریف لارہی ہیں۔“
میں نیم دراز تھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سیکریٹری نے کہا کہ وہ آج آئیں۔

قریباً پانچ منٹ بعد قسطنیا تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ یونین فارم ایک بار پھر اس کے جسم پر نظر آ رہا تھی۔ (یہ وہی فوجی یونین فارم تھی جسے ایک موخ پر قسطنیا نے مایوسی کے عالم میں خنجر سے کلنے سے کلنے کر دیا تھا۔ ”ہیلوشاہ زاب! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”میں اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ بیٹھ گئی۔ ایق اسے سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اسے جاتے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”یہ تمہارا دوست بھی بہت اونگھی چیز ہے۔ دیکھو تو ایک عام ساجے قوف لڑکا نظر آ رہا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وقت پڑنے پر یہ کتنا خام الخصاص اور اپنے دشمن کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”شاید ”چپارتم“ کا لفظ ایسے ہی لوگوں کے استعمال ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں قسطنیا! اس کا یادداشت فوٹو اسٹیٹ کی طرح ہے۔ آپ کو بتایا تھا نا کہ یہ دنیا کی بہت سی زبانیں جانتا ہے، کوئی نئی زبان سیکھنا بھی اس کے لیے ہفتوں کی بات ہوتی ہے۔ اس کا یہی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کمانڈر قافرس جارج کے دل کا حال بھی معلوم ہوا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی ڈائری پڑھ پائے۔“

قسطنیا کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ اس سرخی میں رومانیت کی ہلکی سی جھلک تھی۔ وہ جلدی سے سنجیدہ ہو گئی اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ ”اچھا اس بارے میں بھربات کر پس گئے۔ ابھی میں تمہیں ایک خاص اطلاع دینے کے لیے آئی ہوں۔“

”خیریت کی اطلاع ہے؟“
”ہاں۔“ اس نے کہا اور اپنے موبائل فون پر آیا ہوا ایک طویل ٹیکسٹ میسج میرے سامنے کر دیا۔
یہ میسج ڈاکٹر ماریہ کی طرف سے تھا۔ اس نے قسطنیا کو مخاطب کرتے ہوئے جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ ”پیارے

”ان سی سی ٹی وی کیمروں کی فوج جو کنٹرول روم میں تھے..... اور یہ فوج اسی ”چیپے رستم“ نے حاصل کی ہے۔ آپ ابھی جس کا ذکر کر رہی تھیں۔“

میں نے فوج دکھانے کے لیے لپ ٹاپ آن کر دیا۔ قسطنطیا کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ حیرت کی پرچھائیاں گہری ہونے لگیں۔

☆☆☆

رائے زل کی سٹخ لاش ایک تابوت میں ڈال کر نیوشی کے سرحدی محافظوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عارفو خاتون اور ناظم باذان کی تدفین ہو چکی تھی۔ بیگم نورل کی میت ڈی پیلس میں رکھ دی گئی تھی۔ جامانی کے ہزاروں لوگ اس کا دیدار کر چکے تھے۔ اگلے روز بیگم نورل کی آخری رسومات میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی۔ قریبی ممالک سے بھی کئی اہم شخصیات نے اس میں شرکت کی۔ مقامی میڈیا کہہ رہا تھا کہ جامانی کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ محترم حاذق ذکری نے خود یہ نماز جنازہ پڑھائی۔

بیگم نورل کی آخری رسومات میں، میں نے بھی شرکت کی مگر ویل چپیر پر..... میرے پاؤں، پنڈلیوں اور ٹانگوں کے زخم، مجھے ابھی تک یہ آسانی چلنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ کلائیوں اور پسلیوں کی جلد والے زخم اب بتر تھے۔ ابراہیم کا علاج بڑی تندی سے ہو رہا تھا۔ اس کی حالت کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاجو بھی ڈی پیلس میں تھی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ ہم جنگ کی حالت سے نکل آئے ہیں مگر میری تسلی کے باوجود یہ بات اسے پریشان کرتی تھی کہ ہم جلد از جلد پاکستان روانہ کیوں نہیں ہوتے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ زینب کے پاس اسپتال گئی تھی جہاں ابراہیم زیر علاج تھا۔

آخری رسومات میں شرکت کے بعد میں تھکا تھکا سا کمرے میں بیٹھا تھا کہ انیق آدم کا کسی حالت میں بھی اس کی خوش گفتاری پر مثنیٰ اثر نہیں پڑتا تھا، بولا۔ ”انتاشا شاندار جنازہ دیکھ کر تو میرا اپنا دل مرنے کو چاہ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری یہ خواہش جلد ہی پوری ہو جانی ہے۔ سجاد سے تمہارے تعلقات ٹھیک نہیں اور اس کا آخری نتیجہ بہر حال تمہاری رحلت کی شکل میں نکلتا ہے۔ ویسے..... حیرانی کی بات ہے..... لڑائی میں تم دونوں نے کدھے سے کدھا مالے رکھا تھا؟“

اٹھایا یہاں میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد میرا یہاں سے چلے جانا ہی بتا ہے لیکن وقت رخصت مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ..... جامانی کے لوگوں کی نظروں میں اہل و رسوا کرنے والا جس زندہ غیبت (رائے زل) اپنے اہام کو بچا چکا ہے۔ میں جانتی ہوں انیکسی کی جھپٹ پر اس کے کٹے ہوئے سر کو فٹ پال کی طرح لڑھکا یا گیا ہے۔ وہ اس سے بھی بڑی سزا کا مستحق تھا۔ اس نے ڈی پیلس میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں جو شرمناک کھیل کھیلے ہیں بہت سی خواتین اس کی گواہ ہیں۔

میری پیاری دوست! میں اپنے بچے کو اپنی گود میں سمیٹ کر یہاں سے دور جا رہی ہوں۔ کسی ایسی جگہ جہاں اس کی ماں کے ساتھ ہونے والا سلوک ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے اور وہ ایک باوقار زندگی جی سکے۔ مجھے معاف کرنا۔ اب ہم بھی نہیں ملیں گے..... لیکن ایک دوسرے کی یادیں تو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ آخر میں ایک بات اور..... مجھے تھوڑی سی خوشی بھی ہے کہ رائے زل اور ہانا وانی کی شکست میں تھوڑا سا کردار میں نے بھی ادا کیا ہے۔ تمہاری بڑی بڑی قربانیوں کے مقابلے میں یہ ایک بھونکی سی کوشش تھی لیکن..... خدا نے اسے کامیاب کیا۔ حملے کے وقت میں اس کنٹرول روم میں چلی گئی جہاں سے ڈی پیلس کا مین گیٹ کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ جب گیٹ کھلا ہوا تھا میں نے اس کے کنٹرول سٹم کو توڑ پھوڑ دیا۔

پیاری قسطنطیا! مجھے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہیں متج کرنے کے بعد میں یہ سب فون بھی سمندر میں پھینک رہی ہوں..... تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جہاں ہمارک۔ آئندہ زندگی میں اللہ تمہیں بڑی کامیابیوں سے نوازے۔ زندگی کی آخری سانس تک تمہاری دوست

اریہ۔“

”متج پڑھ کر میں قسطنطیا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ ہم ماریہ کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ قسطنطیا بولی۔ ”یہ بھی ایک انکشاف ہے کہ مین گیٹ کے سٹم کو جام کرنے والی ڈاکٹر ماریہ تھی۔ جتنا کہ وہ کس طرح اور کیسے اس جگہ تھی؟“

”میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ وہ کس طرح اور کیسے تھی۔“ قسطنطیا سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔

”میں نے کہا۔“ ”میرے پاس ایک فوج ہے جس میں سب کچھ لڑتا ہے۔“

”فوج..... کیسی فوج؟“

کڑا کر کے پوچھا۔

”چھوٹے صاحب..... ابراہیم..... کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کے دل کی حرکت بھی وقت بند ہو سکتی ہے۔“

مجھے لگا کہ میری رگوں میں خون جم رہا ہے..... تو کہہ براقت آگیا تھا جس کے اندیشے ہمیں دن رات ڈرار تھے۔ کیا ابراہیم..... نیک دل، سادہ مزاج، نرم ابراہیم..... موت سے اپنی جنگ ہار رہا تھا؟

ابھی وقت تھا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ گلی۔ دوسری طرف تاجور گلی۔ وہ اشک بار آواز میں بولا ”شاہ زیب! کہاں ہیں آپ..... کیا آپ اسپتال آ سکتے؟“ م..... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ ابراہیم کی حال بہت خراب ہو گئی ہے۔ زیب نے درود کر بڑا حال کہہ ہے۔ وہ آپ کو بلا رہی ہے۔ کہیں اس کو بھی کچھ ہو جائے۔“

پھر ایک دم پس منظر میں رونے چلانے کی آواز سنائی دیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ زیب آوازیں ہیں۔ مزید کچھ سننا میرے بس میں نہیں رہا۔ نے فون آف کر دیا۔

”کیا ہوا بھائی؟“ انیق نے پریشان لہجے پوچھا۔

”انیق! مجھے اسپتال لے چلو..... ابھی اسی وقت ابراہیم کی حالت خراب نہیں۔“

”دل..... لیکن آپ تو.....“

”چلو، جلدی کرو۔“ میں دھاڑ کر بولا۔

انیق نے ویل چیئر کو انیسکی کے بیرونی دروازے طرف حرکت دی۔ اسی دوران میں سیل فون پر پھر کال آئی اس مرتبہ قسطنطنیہ مگر اب کال ریسو کرتے ہوئے میرا لرز رہا تھا۔ میں کوئی کال سننا نہیں چاہتا تھا۔ میری آنکھ کے سامنے پانی کی چادر سی تھی..... موت کا کوئی وجود ہوتا۔ وہ ایک پرچھائیں کی طرح آتی ہے.....

آنسوؤں، آہوں، دعاؤں اور التجاؤں کے درمیان۔ اپنے دکار کو اچک کر لے جاتی ہے۔ کیا اب بھی وہ ایسا کرنے والی تھی؟

”وہ مجبور تھی جی، جس کی وجہ سے شیر اور بکری نے ایک گھاٹ پانی پیا ہے۔ دشمنی اسی جگہ پر ہے اور اس کا ثبوت میری کمر کا یہ زخم بھی ہے جس کی وجہ سے میری ساری دلیری مشکوک ہو گئی ہے۔ بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں لڑائی میں کسی موقع پر بھاگا ہوں۔“

”سجاد سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

”مجھے پورا شبہ ہے جی کہ یہ زخم دقتی بم کے دھماکے میں نہیں آیا۔ موقع تاک کر آپ کے امریش پوری نے ہی اپنی کرپان وغیرہ ماری ہے۔ اس قسم کی عیاریاں وہ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ اب دیکھیں کہ خورد سہ صاحبہ کو نرس کے لباس میں دیکھ کر اس نے اپنی ران بھی تو زخمی کر ہی لی تھی نا۔“

”دبھی دبھی بالکل کوئی لڑائی سوکن لگتے ہو۔ اگر بدگمانیوں کا مقابلہ ہو تو تم ضرور عالمی تائسل جیت جاؤ۔“

”آپ کو تو دبھی یقین نہیں آئے گا۔ اب آپ دیکھ لیں اس کی کوئی عمر ہے عشق لڑانے کی؟ کل کل رگڑ کر شیو کی ہے اس نے اور مونچھیں بھی چھوئی کی ہیں اور یہ سب کچھ خورد سہ کی فرمائش پر ہوا ہے۔ میں بھی اڑتے کونے کے پُر کن لیتا ہوں۔ وہ کیا زبردست محاورہ کہا کرتے ہیں پہلوان شہت صاحب، بوڑھی گھوڑی اور شہتیروں کو چبھے۔“

میں نے کہا۔ ”اتنی زیادہ عمر بھی نہیں اس کی اور طاقت بھی چھ بندوں جتنی ہے۔“

”ہاں اس بات سے تو میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔“

”یعنی تم مانتے ہو کہ طاقت چھ بندوں جتنی ہے؟“

”اوہ..... آپ طاقت کہہ رہے ہیں؟..... میں سمجھا خباثت کہہ رہے ہیں۔“ پھر منہ بنا کر بولا..... ”یہ بہت کھوچل ہے جناب! ایسے بندے بکری میں سے بھیجنس جتنا دودھ نکال لیتے ہیں۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی اگر خورد سہ جیسی معقول خاتون اس نامعقولیے کے ساتھ پاکستان جانے کو بھی تیار ہو جائے۔“

ہم بہت دنوں بعد ہلکے ہلکے اعزاز میں بات کر رہے تھے۔ کڑکیوں سے باہر بھاری ایک چمکیلی شام کے غائے طویل ہو رہے تھے۔ مگر قدرت کو شاید ابھی ہماری مسلسل مشکلات میں خوشی کا کوئی طویل دورانیہ منظور نہیں تھا۔ ہمیں باتیں کرتے ہوئے دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ بن مشہد دھواں دھواں چہرے کے ساتھ ہمارے پاس پہنچا۔ دھیان فوراً ابراہیم کی طرف گیا۔ ”کیا ہوا بن مشہد؟“ میں نے دل

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

قاتل تکون

محمد اسرار اعوان

اُن مجرموں کا قصہ جنہیں طویل قید کا ثنی تھی... مگر شاہراہ
حیات پر آزادانہ گھومنے کی خواہش نے انہیں فرار پر مجبور کر
دیا... شہر کی سڑکیں تھیں اور کہیں جائے امان نہ تھی... وہ
بد باطن ایک ایسے گھر میں داخل ہو گئے... جو معصوم اور بے
ضرر مکینوں کا آشیانہ تھا...

سفاک قاتلوں کی تکون..... جو مفاہکی ڈور سے بندھے تھے.....



سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی کار انتہائی تیز رفتاری
سے شہر کے بارونق بازاروں سے گزر رہی تھی۔ ڈرائیور کی
نشست پر گہرے سیاہ رنگ کی شرٹ پہنے بیٹھا شخص چہرے
سے عادی مجرم دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے داہیں رخسار پر
گہرے زخم کا نشان تھا۔ اس کا ایک کان کٹا ہوا تھا اور ہونٹ
سیاہی مائل تھے۔ غصے سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں
اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔
ساتھ والی سیٹ پر بیس بائیس سال کا ایک نوجوان

بیٹھا تھا جو شکل و صورت سے محسوس نظر آتا تھا۔ وہ شہر کے اس چھپے ہوئے بد معاش کرسٹن کا چھوٹا بھائی تھامسن تھا۔ تھامسن اپنے بڑے بھائی سے بے حد خوف کھاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ذاتی طور پر جرم سے نفرت کرنے کے باوجود چار سال پیشتر اسے ایک شخص کو قتل کرنے میں کرسٹن کی مدد کرنا پڑی۔ بد قسمتی سے دونوں بھائی موقع واردات ہی پر گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور عدالت نے انہیں دس دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی۔

پچھلے تین سال سے وہ یوسٹر کے تنگ و تاریک قید خانے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر آج انہیں موقع مل ہی گیا اور وہ پہرے دار کا گلا گھونٹنے کے بعد کوٹھڑی سے بھاگ نکلے۔

اس کوٹھڑی میں ان کے ساتھ رہڑٹا نامی ایک مجرم بھی تھا جو اس صفائی سے پیٹ میں چھرا گھونپتا کہ متقل کے سوا کسی کو کانوں کا خبر نہ ہوتی، وہ بھرے بازار میں اپنے دشمن کا پیٹ بھاڑنے کے بعد صاف بیچ نکلتا۔ فرار ہوتے وقت وہ بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ تھا۔ عملے اور قیدیوں کی نظروں سے چھپتے چھپاتے وہ تینوں قید خانے کی عمارت سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔ گیارہ بجے تک قید خانے کے عملے کو ان کے فرار کی خبر نہیں ہوئی کیونکہ اس سے پہلے ان کی کوٹھڑی میں کوئی نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس فرار ہونے کے لیے صرف آدھا کھٹا تھا۔

جیل سے باہر نکلنے ہی کرسٹن کی نظر دیہاتی طرز کے ایک قلعہ نما مکان پر پڑی جس کے آگٹن میں خشک گھاس کے بڑے بڑے گھڑ پڑے تھے۔ کچھ دیر بعد سامنے سڑک پر ایک جیب آتی دکھائی دی۔ انہوں نے ایک جست لگائی اور خشک گھاس میں جا چپے۔ مکان سے باہر دور دور تک جیل کی زمین بھی جس میں قیدی کا شت کیا کرتے تھے۔ وہ خود بھی کئی مرتبہ یہاں آچکے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ قید خانے کی بیرونی چار دیواری پر پولیس کا ایک سپاہی بندوق لیے گھڑا ہوتا ہے۔

ابھی وہ اسی آدھیز بن میں تھے کہ۔۔۔ انہیں دو آدمیوں کی گفتگو سنائی دی۔ کرسٹن نے گھاس کے پٹے میں سے سر نکال کر دیکھا کہ جیل کا سرخ و سفید ڈاکٹر اپنے ڈرائیور سے باتیں کر رہا ہے۔ گیراج کے سامنے بیچ کر وہ رگ گئے۔ اب ان کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ایک بچے میٹنگ میں جانا ہے، تم فوراً گاڑی لے جاؤ اور اسکول سے بچوں کو لے آؤ۔“

”بہتر جناب۔“ ڈرائیور نے مودب لہجے میں کہا دیا۔ اسی وقت ایک خیال بجلی کی طرح کرسٹن کے ذہن کو ندا۔۔۔ ”اگر کسی طرح یہ گاڑی مل جائے تو۔۔۔۔۔“ اس جلدی سے اپنے ساتھیوں کو منسوب سمجھایا اور تینوں بچوں مل چلتے ہوئے پھانک تک پہنچ گئے۔ کار اسٹارٹ ہوئی سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی کار گیراج سے باہر نکلی۔ جو پھانک پر پہنچی، کرسٹن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لیا۔ اگلے ہی لمحے رہڑٹا ڈرائیور کے سر پر تھا۔ اس سے کہ ڈرائیور کے منہ سے کوئی آواز نکلتی، رہڑٹا اس کا گلا دھرتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سرکاری ڈاکٹر کی کار میں مزے بیٹھے تھے۔ کرسٹن دھول سے اٹی ہوئی مچی سڑک پر انتہائی رفتاری سے کار چلا رہا تھا۔ بیرونی پھانک سے گزرتے اس نے کار کی رفتار مزید تیز کر دی۔ اس طرح پہرے کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی شکل نہ دیکھ سکے۔ ویلے ڈاکٹر کی گاڑی دیکھ کر وہ ایک طرف کھٹ گئے تھے۔

ابھی وہ بڑی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انہیں پیچھے سیٹیاں سنائی دیں۔ تھامسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پولیس ایک جیب ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ خوف سے اس کی آٹھ میں خون جمنے لگا، اس نے چلا کر کرسٹن سے کہا۔ ”پولیس چھپا کر رہی ہے، جلدی چلو۔“

”اب صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ کرسٹن نے فقرہ اودھوا چھوڑ کر انتہائی بھرتی سے کار سے ہٹا کر ایک تنگ گلی میں ڈال دی۔

☆ ☆ ☆
جیل سے ان کے فرار کی خبر ہر جگہ پہنچ گئی تھی۔ پراسٹیشن میں انسپکٹر مارٹن، فون پر شہر سے باہر نکلنے والے راستوں کی ناکا بندی کا حکم دے چکا تھا۔ اب وہ جیل سپرنٹنڈنٹ سے تینوں قیدیوں کی تصویریں طلب کر تا کہ شام کے اخبارات میں شائع کرائی جا سکیں۔ ٹر پولیس کے عملے کو کار رنگ اور نمبر بتایا جا چکا تھا۔ اگر علاوہ پولیس کی گاڑیاں شہر کے مختلف علاقوں میں سرخ کی کار کو تلاش کر رہی تھیں۔ شہر کے تمام ہوٹلوں کو خبردار کیا گیا تھا کہ اگر اس جیلے کے تین آدمی ان کے پاس آئیں قریبی پولیس اسٹیشن کو فوراً اطلاع کریں۔ مارٹن کا خیال تھا جلد سے جلد کار سے نجات پانے کے لیے وہ کسی ویران انتخاب کریں گے۔ اس نے پولیس کی تمام چوکیوں میں کر دیا کہ اپنے اپنے علاقے میں جتنے زیادہ سپاہی ممکن،

مہانوں کو پہچان نہ سکے۔ جوزف نے دروازہ کھولا، تو اس کے سامنے ایک کئے کان والا لہا ترنگ آدمی کھڑا تھا۔
 ”فرمائیے۔“ چھوٹے جوزف نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔
 ”لے آؤ نے اسے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور لے لے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم کے وسط میں پہنچ کر رک گیا۔

”دیکھیے، مسٹر ڈیوڈ گھر میں موجود نہیں ہیں، آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“ روزی نے نودارو سے پوچھا۔
 ”جہنم سے، اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پستول کا رخ جوزف کی طرف کر دیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر گھس آئے، دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔
 ”خاتون آپ اپنا کام کیجیے۔ یہ بچہ ہمارے پاس موجود رہے گا۔ اگر آپ نے گھر کے کسی فرد کو جبردار کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے ختم کر دیں گے۔“
 ”گھر میں اس وقت کوئی موجود نہیں ہے۔“ روزی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے، ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“
 روزی ڈیوڈ خاموش کھڑی رہی۔ لے آؤ نے باقی دونوں کو سارے گھر کی تلاشی لینے کے لیے اوپر بھیج دیا۔
 تھوڑی ہی دیر میں وہ ڈیوڈ کی شکاری بندوق اور پستول لے کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ لے آؤ نے ڈیوڈ کا پستول پکڑتے ہوئے اپنا پستول زمین پر پھینک دیا اور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اس نکلی پستول نے خوب کام دیا۔ خیر، اب تو ہمیں اصلی پستول مل گیا ہے۔“
 روزی ابھی تک دروازے میں کھڑی حیرت سے ان اجنبیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو دن دھاڑے اس کے گھر میں گھس آئے تھے۔ لے آؤ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تھامسن! تم بندوق لے کر اوپر والی منزل پر چلے جاؤ اور چوٹی کوئی شخص مکان میں داخل ہو، ہمیں اطلاع دو۔ رچرڈ تم جہنم سے چاقو لے کر سیزھیوں میں بیٹھ جاؤ، اگر تمہاری ضرورت پڑی، تو میں سیٹی بجا دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور خوف زدہ روزی سے مخاطب ہوا۔
 ”کیا آپ ہمیں کھانا کھلا سکتی ہیں؟“

”جی، جی ہاں۔“ روزی لڑکھائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لیکن یہ سب کیا ہے، آپ چوروں کی طرح میرے گھر میں گھس آئے ہیں؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

اس سرکاری ڈاکٹر کی کار کی تلاش میں بھیج دیے جائیں۔
 ان سب انتظامات سے مطمئن ہو کر وہ کرسی پر بیٹھا اے سے پائپ پنی رہا تھا جب بھی فون کی گھنٹی بجتی تو وہ لہجوں کے پکڑے جانے کی خبر سننے کی خواہش لیے فوراً بیہوش ہوتا۔ وہ اپنے انتظامات سے بہت خوش تھا، اسی کے ام و لگان میں بھی نہ تھا کہ یہ تین مجرم اس کے لیے در در سرین میں گئے۔

☆☆☆

ڈیوڈ ہاؤس میں اس وقت دو پہر کا کھانا پک رہا تھا۔ نرڈیوڈ جہنم میں تھی۔ اس کا دس سالہ بچہ جوزف چو لھے کے لٹ بیٹھا تھا۔ جوزف کے بال سنہرے اور ٹھنڈے تھے برا کھیں بھوری۔ عام حالات میں وہ بے حد شرارتی لڑکا تھا لہجی ٹیک کے نہیں بیٹھتا تھا لیکن اس وقت اسے سخت ہموک ل رہی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے کھانا پکنے کا انتظار کر رہا تھا۔

مسٹر ڈیوڈ حسب معمول ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ باج چھ بچے کے قریب گھر پہنچتے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی آدم نہیں تھا۔ ہاں البتہ ایک لڑکی ملازمتی جو ہفتے میں دو بار ٹی کی کیونکہ تمام محلے کے برتن دھونا اسی کی ذمہ داری تھی۔ اس کا نام جوزی تھا اور وہ بڑی ہنس کھ اور موٹی تازی لگی۔ جوزف کے علاوہ ان کی ایک بیٹی جین تھی جس کی عمر لیس سال تھی اور وہ ایک فرم میں ٹائپسٹ تھی۔ وہ بھی پانچ بچے کے بعد ہی گھر آیا کرتی۔ مسٹر ڈیوڈ ایک اسٹور چلاتے تھے۔ اچھا کھانا بیچتا تھا۔ باپ، بیٹی کے پاس اپنی اپنی اڑی تھی۔ ڈیوڈ گھرانے کی ایک نمایاں خصوصیت افراد خانہ لے مائیں بے انتہا محبت تھی۔ سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے کسی شام ڈیوڈ کو ذرا سی دیر ہو جاتی تو سارا گھر ان کے انتظار میں کھانا کھاتا تھا۔

اس روز دو پہر کافی سرتھی۔ باہر دھند پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بچے کے قریب مسٹر ڈیوڈ (روزی ڈیوڈ) کو باہر کسی کار کے لالہ کی آواز سنائی دی۔ اس وقت ڈیوڈ یا جین کے آنے کا حال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو اسے سرخ رنگ کی کار گیراج میں داخل ہو رہی تھی۔ ”یہ کون آیا ہے؟“ روزی ڈیوڈ نے سوچا۔ اگر یہ کوئی مہمان ہوتا تو اسے کار گیراج میں بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اسے پتہ نہ چلا کہ یہ موقع نہیں ملا۔ باہر دروازے پر کوئی زور زور سے تل بھا رہا تھا۔ جوزف دروازے کی طرف بھاگا۔ اسے اس خیال سے اس کے پیچھے چل دی کہ شاید وہ

اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا اور وہ دھڑام سے فرش پر گر گئی۔

”بلکواس بند کردو جس طرح ہم کہتے ہیں، ویسا ہی کرو، ورنہ بچکانہ گی۔ اطمینان رکھو، ہم مال و دولت کے بھوکے نہیں، ہمیں صرف ایک رات آرام کرنے کے لیے بستر چاہئیں۔ صبح ہوتے ہی ہم رخصت ہو جائیں گے۔ اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو اپنے بچے سے ہاتھ دھو بیٹھو گی لیکن اگر تم نے غلوں دل سے ہماری خدمت کی، تو ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

شکر روزی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اوپر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد ہی تینوں قیدی کھانا کھا رہے تھے۔
نخا جوزف سیز جیوں پر بیٹھا حیرانی سے ان اجنبیوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے آپ کو اس گھر کا مالک سمجھ رہے تھے۔
کھانے سے فارغ ہو کر کرشن نے روزی سے ڈیوڈ اور جین کے بارے میں چند سوالات کیے اور پھر خاموشی سے صوفے پر دراز ہو گیا۔

شام ساڑھے پانچ بجے جین کی سفید رنگ کی چھوٹی سی کار بھانک سے اندر آئی دکھائی دی۔ سب سے پہلے رچرڈ نے اس کی آمد کی اطلاع دی۔ کرشن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اٹھارہ، انیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

”سسر ڈیوڈ! جین کو ایک طرف لے جا کر سب کچھ سمجھا دو۔“ کرشن نے حکم جھاڑا۔

روزی نے حیرت زدہ جین کا بازو پکڑا اور ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ اچانک چھت سے رچرڈ کی آواز سنائی دی۔

”کرشن! خبردار ہو جاؤ، شاید مالک مکان آرہا ہے۔“ کرشن نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔ ایک لمبی سی کار مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ گیراج کے سامنے پہنچ کر کار رک گئی اللہ بیٹیا لیس چمپا لیس برس کا ایک خوش پوش مرد دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ کرشن نے سانس روک لی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ کچھ فرس پر ڈیوڈ کے فوجی یوٹوں کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے۔ کھلے دروازے میں مالک مکان مسٹر ڈیوڈ کھڑا آنکھیں جھپک رہا تھا۔

سب سے پہلے اس کی نظر روزی پر پڑی، جس کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ پھر اس نے جین کو دیکھا جو تپائی پر دیوار کی طرف منہ کیے چپ سا دھمے بیٹھی تھی۔ ان کے علاوہ

اسے کالا، گلوٹا اور خوفناک مونچھوں والا کرشن دکھائی پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف کیے مسکرا رہا سیز جیوں پر ایک اور نو جوان بندوق لیے کھڑا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ڈیوڈ کے سوچے سمجھے کی جواب دے گئی۔ اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا اور پھر ساری بات اسے سمجھ آ گئی۔ شام کے اخبار میں جیل بھاگے ہوئے تین قیدیوں کی تصویریں اس کی آنکھوں سامنے لہرائیں۔ اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بڑی سے بولا۔ ”مسٹر کرشن! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے ہے کہ تم پستول رکھ دو ورنہ۔۔۔۔۔“ اس نے فقرہ ادھر اہم قریبی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ نیچے پڑ مکان نظر آرہا تھا۔ بیگم گراہم محن میں دانہ چلتی مرغی پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کا چھ سالہ بچہ جنگل کے گھوڑے پر سواری کر رہا تھا۔ قریب ہی مسٹر گراہم میں کرسی ڈالے شام کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

”انہیں بلانا زیادہ مشکل نہیں۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ کرشن نے آگے بڑھ کر پستول کی نال جین کی رکھ دی اور غراتے ہوئے بولا۔ ”بڑے شوق سے پڑھ بلائے لیکن یاد رکھیے کہ ان کے آنے سے پہلے آپ کی بیٹی کا جسم فرش پر تر پڑ رہا ہوگا۔“

روزی نے ایک جھرجھری لی اور بے تاب ہو کر ڈ طرف دوڑی اور بولی۔ ”خدا کے لیے ڈیوڈ! ایسی حما کرنا، ورنہ یہ عالم میری بیٹی کو مار ڈالیں گے۔“ ڈیوڈ کی پیشانی سینے سے تر ہو گئی۔ اس نے آہستہ کھڑکی بند کر دی اور دم سے صوفے پر گر گئے ہونے ”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

”ہم صرف ایک رات گزارنا چاہتے ہیں۔ ہمار وعدہ کرتے ہیں کہ ریم ملنے ہی یہاں سے رخصت ہو گئے۔“

”کون سی رقم؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔
”ابھی بتاتا ہوں، تمہارے ہاں فون ہے؟“

”ہاں، وہ رہا۔“
کرشن ڈائریکٹری پر جھکا ہوا تھا اور ڈیوڈ خاموش پاس بیٹھا تھا۔ آخر کرشن مطلوبہ فون نمبر تلاش کرنا کامیاب ہو گیا۔

”لو بھائی صاحب، یہ رہا ہمارا۔“ اب تم اس نمبر فون کر دو۔ ابھی سارا معاملہ طے ہو جاتا ہے۔“
”تم یہ کام خود کیوں نہیں کرتے؟“ ڈیوڈ نے نام

اگلے لمحے اس نے رچڑ کو جیب سے تیز دھار چاقو نکالتے دیکھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پیٹ میں ٹکے ہوئے گھونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ رچڑ کا چاقو والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، ڈیوڈ نے آنکھیں بند کر لیں۔ روزی اس منظر کی تاب نہ لاسکی اور چکر مار کر فرش پر گر پڑی۔ اسی اثنا میں جین کے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ اس نے لکڑی کی تپائی اٹھا کر پوری قوت سے رچڑ کے سر پر دے ماری۔ رچڑ کے منہ سے گراہنے کی آواز نکلی، اس نے چاقو کا رخ جین کی طرف پھیر دیا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ غصے سے لالہ بھبھوکا ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جین کو قتل کر کے دم لگا۔ مارے خوف کے جین کا جسم نہ ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ عین اس وقت دروازہ کھلا اور کرشن ہاتھ میں پستول لیے اندر آیا۔

”دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ ہمیں گولی مار دوں گا۔“ کرشن کا یہ کہنا تھا کہ رچڑ نے چاقو زمین پر پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

”میں نے تمہیں اس لیے اوپر نہیں بھیجا تھا کہ تم عورتوں پر ہاتھ اٹھانے لگو۔“ کرشن غرایا۔

”میں میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں کر سکتا۔“ رچڑ نے غصے سے کہا۔

”جبکواس بند کر دو اور سیدھی طرح نیچے چلو، تمہاری ذرا سی بے احتیاطی سے بتا بیٹا کیسیل بگڑ سکتا ہے۔ یہ مت بھولو کہ سختی سے تنگ آ کر یہ لوگ تمہیں گرفتار کروانے پر جمل جائیں گے، خواہ ان میں سے ایک آدھ کو مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں۔“ کرشن نے معذرت خواہ لہجے میں ڈیوڈ سے کہا۔

”مسٹر کرشن، میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن میری عزت پر حملہ کر کے تم لوگ کچھ عقل مند کی کا شوت نہیں دے رہے۔ اس قسم کی بدبیزاری دوبارہ ہوئی تو میں ہر قیمت پر پولیس کو اطلاع کر دوں گا خواہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔“

”مسٹر ڈیوڈ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، آپ لوگ صبح تک نیچے ڈرائنگ روم میں رہ سکتے ہیں لیکن اگر آپ کی طرف سے دوبارہ کوئی شرارت ہوئی تو یہ آپ لوگوں کے لیے بہتر نہیں ہوگا۔“ ڈیوڈ نے حتیٰ لہجے میں بات ختم کی۔

☆☆☆

”زیادہ باتیں مت بناؤ، ورنہ ہم سختی کرنے پر مجبور ہوں گے۔“ یہ کہہ کر کرشن نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے قاسم کو آواز دی۔

”قاسم! ذرا اس چھو کرے کو یہاں لے آؤ۔“ قاسم نے غصے جوف کا بازو پکڑے کرے میں آدھمکا۔ ڈیوڈ نے اسے چھڑانے کی کوشش کی مگر کرشن نے ایک جست لگا کر اسے دباؤ لیا اور قاسم، جوف کا بازو مروڑنے لگا۔ جوف درد کے مارے بری طرح چیخ رہا تھا۔

”میں فون کرنے کے لیے تیار ہوں، تم جوف کو چھوڑ دو۔“ ڈیوڈ کی بات سن کر قاسم نے جوف کو چھوڑ دیا۔

☆☆☆

سات بجے کے قریب انہوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے بستر میں دبک گئے۔ کرشن پستول ہاتھ میں لیے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رچڑ اور قاسم کیل لے کر فرش پر لیٹ گئے۔ ڈیوڈ دوسری منزل پر اپنے پٹنگ پر لینا کر دیکھ رہا تھا۔ ساتھ والے پٹنگ پر روزی بیٹھے میں منہ چھپائے آنسو بہا رہی تھی۔ ”ہائے میرا جوف، اس کا کیا بچے گا؟“

”اطمینان رکھو روزی! وہ اسے نہیں ماریں گے، وہ ہانتے ہیں کہ اُسے مارنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ انہوں نے جوف کو اپنے پاس اس لیے رکھا ہے کہ ہم پولیس کو اطلاع نہ کر سکیں۔“

”انہوں نے ٹیلی فون والے کمرے کو تالا لگا کر چابی اپنے پاس رکھ لی ہے۔“

”کوئی بات نہیں روزی، تم اتنی مت فکر کیوں ہو۔ صبح اُن کی رقم پہنچ جائے گی اور وہ یہاں سے دفع ہو جائیں گے۔“ مگر روزی مطمئن نہیں تھی۔ اس کا بچہ جوف نیچے ڈرائنگ روم میں سو رہا تھا جہاں تینوں بد معاش آپس میں کھس پھس کر رہے تھے۔ اچانک اسے جین کی چیخ سنائی دی، وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ وہ فوراً ڈیوڈ کے ساتھ جین کی لواب گاہ میں پہنچی۔ خواب گاہ میں رچڑ، جین کے ساتھ سہم گھٹا تھا۔ ڈیوڈ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جست لگائی اور رچڑ کو فرش پر گرا دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے زور آزمائی کرتے رہے۔ ڈیوڈ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی لیکن رچڑ جیسے پیشہ ور بد معاش سے لڑنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں وہ رچڑ کے سامنے چاروں شانے پہلے سر پر پڑا تھا۔

رات سرد اور نم آلود تھی۔ بخ بستہ ہوا کھڑکیوں سے نکراتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی سیٹیاں بجا رہا ہو۔
ڈیوڈ ہاؤس میں باہر کی طرف کھلے والی کھڑکیاں اور روشن دان مضبوطی سے بند کر دیے گئے اور ان پر گہرے نیلے رنگ کے پردے گرا دیے گئے۔ سات بجے کے قریب ایک ٹرک بیرونی پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ چالیس سالہ ہنس کچھ بیئر ماسٹر دروازہ کھول کر باہر نکلا اور دودھ کی بوتل پھاٹک کے اندر لڑھکاتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔ ”یار! ہماری بھی کوئی زندگی ہے۔ کتنا جاڑا پڑ رہا ہے اور ہم کتوں کی طرح مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ادھر دیکھو، ڈیوڈ کیا مزے سے سو رہا ہے، ہاں کیا مزے کا آدمی ہے۔“ اس نے اونچے ہوئے ڈرائیور پر ایک نظر ڈالی اور پھر خفا ہو کر بولا۔ ”یار سو گئے کیا، عجیب ایسی سے بالا پڑا ہے۔“

اس دوران میں ڈیوڈ ہاؤس کے کونے کونے میں زندگی بیدار ہو چکی تھی۔ کرسٹن، تھامسن اور رچرڈ اپنی اپنی جگہ پر مستعد تھے۔ روزی پچھلی پچھلی نظروں سے انہیں دیکھے چلی جا رہی تھی۔ آخر ڈیوڈ نے مہر سکوت توڑی اور دھیرے سے بولا۔

”بیئر دودھ والا ہے، فکر نہ کرو، وہ اندر نہیں آئے گا۔“
”عین ممکن ہے، وہ بیل وصول کرنے اندر چلا آئے؟“ روزی نے فوراً جواب دیا۔

”کچھ بھی ہو، ہم اسے سنبھال لیں گے۔“ کرسٹن نے غراتے ہوئے کہا۔ لیکن ان کا یہ خوف جلد ہی دور ہو گیا۔ ٹرک کے ہماری انجن کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر رات کے بیکراں سکوت میں گم ہو گئی۔ عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، وہ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ گھنٹی دوبارہ بجی اور دیر تک بجتی رہی۔ آخر جین نے ریسیور اٹھالیا۔

”کون؟ جاسن، ہاں میں جین بول رہی ہوں۔ نہیں، اس وقت نہیں، ہاں میری طبیعت ذرا خراب ہے۔ نہیں، نہیں تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک نظر اپنے باپ کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”ڈاکٹر، ہاں میں ڈاکٹر سے دوا لے چکی ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ اب میں آرام کروں۔ نہیں، تم ہرگز نہ آنا، تمہارے آنے سے پہلے میں سو چکی ہوں گی۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے، صبح ملیں گے، خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

”شاباش لڑکی! تم نے بڑی خوبی سے اپنا کردار ادا کیا، میں تم سے بہت خوش ہوں، کس کا فون تھا؟“ کرسٹن

نے اپنے بھدے اور میلے دانتوں کی نمائش کرتے ہو پوچھا۔

جین خاموش رہی، البتہ اس کے کالوں کی لہریں ہونگیں۔

”یہ جاسن تھا، جین کا منگیترا۔“ جین کی ماں نے بتا ”اچھا، اچھا۔“

اچانک جوزف نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا اور زور زور سے رونے لگا۔ روزی نے جلدی سے اسے گود میں اٹھالیا چکارتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہوا جوزی بیٹا؟“

جوزف۔۔۔ جواب دینے کے بجائے اور زور زور سے رونے لگا اور اب تو وہ چیخ بھی رہا تھا۔ روزی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے سختی ہوئی اوپر لے گئی۔

”مسٹر ڈیوڈ! آپ ذرا اس بچے کو خاموش رہنے نصیحت کریں، اگر اس کی وجہ سے ہمارا کام بگڑ گیا تو۔۔۔ کرسٹن نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈیوڈ کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے بیڑھیاں چڑھتا ہوا جوزف کے کمرے میں چلا گیا۔ جوز ابھی تک پوری قوت سے چیخ رہا تھا اور روزی دونوں ہاتھ سے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈیوڈ کو دیکھ ہی جوزف خاموش ہو گیا اور بڑی رازداری سے بولے ”کیوں ابو! کیسی رہی؟“

”کیا مطلب؟“
”مطلب یہی کہ میں اس وقت تک چیختا رہوں جب تک اڑوس پڑوس کے سب لوگ یہاں نہیں پہنچ جاتے۔ جب بہت سے لوگ یہاں آ جائیں گے، تو وہ ان بد معاش کو ہمارے گھر سے مار بھاگیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ ٹھٹھکا ہنس پڑا۔

”کیوں اسے بند کرو۔ جوزف، کیا تم چاہتے ہو تمہاری تمہاری آنکھوں کے سامنے گولیوں سے بھون دی جائے؟ تم پسند کرو گے کہ وہ لمبا ترنگا آدمی تمہاری امی کے پیٹ چاقو گھونپ دے؟ اگر تم یہ سب کچھ چاہتے ہو تو ٹھیک یہ جی میں آئے کرو، لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہ لوگ جو اس ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، آٹھ آدمیوں کو قتل کر چکے ہیں ان کے لیے کسی شخص کو قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے تمہارے قتل کے پروردہ بننا۔“

جوزف سسکیاں بھرتے ہوئے باپ کی گود آگرا۔ ڈیوڈ نے اسے اپنے ساتھ چٹالیا اور چٹکیاں دے سلاتے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جوزف گہری نیند سو گیا۔ ڈیوڈ

ڈیوڈ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پہلے تو وہ اسے اندر جانے سے روکنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ نہیں، نہیں وہ اندر نہیں جاسکتا۔ اسے اندر نہیں جانا چاہیے، ورنہ سارا معاملہ خراب ہو جائے گا۔ ابھی وہ اڈھڑ بن میں تھا کہ جاسن بولا۔ ”اٹکل! آپ کس سوچ میں پڑ گئے شاید آپ میرے لیے کرا تیار کرانے کی فکر میں ہیں۔ میں کوئی غیر ہوں، کسی انتظام کی ضرورت نہیں۔ بس میں جین کو ایک نظر دیکھ کر ڈرانگ روم میں صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔“

ڈیوڈ کی آنکھوں کے سامنے ڈرانگ روم لہرا گیا۔ تین بد معاش، ایک بددوق، ایک پستول اور ایک تیز دھار جاتو۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے سوچا۔ ایک اور خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں آیا، اس نے جاسن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔

”جین کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔“

”اچھی نہیں، لیکن آپ تو کہہ رہے تھے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن تم اب آگئے ہو، تو اچھا ہوا، میری اپنی طبیعت ناساز ہے، ورنہ میں خود اسے اسپتال لے جاتا۔ دو تین مرتبہ ڈاکٹر کو فون کر چکا ہوں مگر وہ شاید کہیں باہر گیا ہے۔ میں نے اسے نیند کی گولیاں دی تھیں، اب اس کی آنکھ کھلی ہے اگر تم برا محسوس نہ کرو، تو اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“

”اس میں برا محسوس کرنے والی کیا بات ہے اٹکل ڈیوڈ، آپ بھی غضب ڈھا رہے ہیں۔ آپ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ چلے میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھا، ڈیوڈ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس وقت اسے روکنا اس کے بس سے باہر تھا اور اندر ڈرانگ روم میں تین خونی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”جاسن! ذرا میری بات تو سنو۔“ جاسن رک گیا۔ ڈیوڈ نے قریب جاکر کہا۔ ”تم قریبی چوک سے ٹیکسی لے آؤ، میں اتنی دیر میں جین کو نیچے لے آتا ہوں۔“

”ٹیکسی؟ اس کی کیا ضرورت ہے، میں جین کی کار لے جاتا ہوں۔“

”اس کی چمت نہیں ہے اور اس حالت میں جین کا مکمل چمت کی گاڑی میں جانا مناسب نہیں۔ میرا مطلب ہے، سردی بہت ہے مبادا اسے نمونیا ہو جائے۔“

”تو میں آپ کی کار لے جاتا ہوں۔“ جاسن بولا۔

آہستہ سے اسے بستر پر لٹایا اور روزی کو اس کے پاس چھوڑ کر خود نیچے چلا گیا۔

☆☆☆

جب دیوار پر لگے ہوئے گھڑیاں نے نو بجائے تو کرشن کرشن پر اونگھ رہا تھا۔ دس بجے کے قریب صدر دروازے کی ٹیل بجی، ڈیوڈ جلدی سے اٹھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے، اس نے سوچا اور شب خوابی کا لباس پہن کر تیزی سے سیزھیاں اترتا ہوا ڈرانگ روم میں آگیا۔ تھامسن اور رچرڈ اٹھ بیٹھے تھے اور آنکھیں مل رہے تھے۔ کرشن ابھی تک دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ ڈیوڈ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”لگتا ہے تم سے کوئی حماقت سرزد ہو گئی ہے، ورنہ اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے۔“

”کھنٹی دوبارہ بجی اور دریا بہتی رہی۔“

”غصہ وہیں دیکھتا ہوں۔“ ڈیوڈ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا، اس لیے چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ صدر دروازے پر لگے بلب کی روشنی میں اس نے ایک سائے کو دیکھا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ وہ سایہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ ”اٹکل! جین کیسی ہے؟“ یہ جاسن تھا۔

”اچھی ہے، اب تو بالکل اچھی ہے اور سو رہی ہے۔“

ایوڈ نے تھوک نچتے ہوئے کہا۔

”میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ سو چاہتا ہوں کہ آؤں۔ ممکن ہے کہ آپ لوگوں کو میری مدد کی ضرورت ہو۔“

”لیکن تم اس وقت کیوں چلے آئے، فون کر لیا ہوتا؟“ ڈیوڈ بولا۔

”اصل میں، میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔“

جاسن بے قراری میں لگ رہا تھا۔

ڈیوڈ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے بڑی بے چارگی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوجران کی طرف دیکھا جو رات کے دس بجے اپنی مگتیر کو اکھینے چلا آتا تھا۔

”تم پھیل آئے ہو، تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“ اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

”گاڑی میں پیٹرول نہیں تھا۔ میں ٹیکسی پر آیا ہوں۔ اب تو شاید واپس بھی نہ جاسکوں۔ کوئی بات نہیں، میں یہیں رہوں گا۔“

تھیں۔“ ڈیوڈ نے وضاحت کی۔

روزی نے اسے کبل اوڑھا دیا۔ اچانک جاسن نظر اس کے ننگے پاؤں پر پڑی۔ ”یہ کیا؟ اس نے جوتا نہیں پہن رکھا، آپ اسے پکڑ کر رکھیں، میں بھاگ کر اس جوتا اٹھا لاؤں۔ اس کے پاؤں کو سردی لگ گئی تو اچھا لگا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ڈرائنگ روم کی طرف لپکا پڑا جین کی ایک لمبی پیچ نے اسے واپس بلا لیا۔ وہ اپنا سرا نشست پر بیٹھ رہی تھی۔ ”دیر نہ کرو جاسن، اسے فوراً اپنے لے جاؤ۔“

”ہائے میری بیٹی!“ روزی نے ٹھکایا کر کہا۔ جاسن نے فوراً تعمیل کی اور ٹیکسی چل دی۔ ڈیوڈ روزی کچھ دیر تک دھند میں غائب ہوتی ہوئی سرخ پتیرو دیکھتے رہے اور پھر پوچھل قدموں سے واپس آ گئے۔ ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے کرشن نے اُن۔ پوچھا۔ ”سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں، آپ لوگ مطمئن رہیں، وہ صبح سے پہلے واہ نہیں آئے گی۔“

☆☆☆

گیارہ بجے کے قریب ڈیوڈ دوبارہ بستر پر لیٹا مگر اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار اس کا خیال ڈرائنگ روم میں بیٹھے ان تین بدعاشوں کی طرف چلا جا۔ جنہوں نے شام سے گھر میں آفت چار کھی تھی۔ ڈیوڈ کو ج سے سخت نفرت تھی، وہ ایک سیدھا، سادہ تاجر تھا۔ یہ احسا اسے بار بار تکلیف دے رہا تھا کہ اس نے انصاف کا سا دینے کے بجائے تین خطرناک مجرموں کو پناہ دے رکھی ہے ہر بار وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا کہ ہوتے ہی وہ چل دیں گے مگر حدمت کا احساس اس قدر شد تھا کہ وہ دوبارہ اسی مسئلے پر غور کرنے لگا۔ اچانک اس ذہن میں ان سے بدلہ لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت رچ اور کرشن سو رہے تھے اور تھامسن پہرا دے رہا تھا۔ اس نظروں کے سامنے تھامسن کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ اُسے چہ کرنا پاتا ہی دو مجرموں سے زیادہ آسان ہے۔ بستر پر لیٹے لی وہ اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ بیڑھیاں اترتے ہی آ وہ تھامسن کو اوپر بلا لے، تو وہ فوراً چلا آئے گا۔ بالا برآمدے میں پہنچ کر وہ بڑی آسانی سے اس کی بندوق چھین سکتا ہے۔ بندوق پاس ہوتو نیند میں ڈوبے ہوئے دو قاتلوں کسی کمرے میں بند کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس کے بعد پولیس اسٹیشن کو ایک فون کرنا ہوگا اور سارا مسئلہ حل،

”میری کار کے انجن میں کچھ خرابی ہے۔ آج راتے میں مجھے دو دفعہ رکنا پڑا۔ چلتے چلتے اس کا انجن بند ہو جاتا ہے، ایسا نہ ہو کہ راتے میں دھوکا دے جائے۔“

”ٹھیک ہے، آپ جین کو تیار کریں، میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ ڈیوڈ کی جان میں جان آئی۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں آ گیا اور ایک سانس میں کرشن سے سب کچھ کہہ ڈالا پھر اس نے اوپر جا کر روزی کو مصورت حال بتائی اور ساتھ لے جا کر جلدی سے جین کو جگا یا اور سارا منصوبہ سمجھا کر اسے شب خوابی کے لباس ہی میں پہنچے لے آیا۔

”تم کہنا میرے پیٹ میں سخت درد ہے اور ہاں، رات وہیں اسپتال میں رک جانا، واپس نہ آنا، ورنہ جاسن بھی تمہارے ساتھ آئے گا۔ جلدی کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ جاسن ٹیکسی لے آئے۔“

”لیکن ابو، میں جوتا تو پہن لوں۔“

”نہیں بیٹی، اس طرح دیر ہو جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے، ننگے پاؤں چلی جاؤ اور ہاں دیکھو، جاسن سے کچھ نہ کہنا۔ میرا مقصد ہے کہ اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ ہمارے گھر میں کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ دیکھنا تمہاری امی اور بھائی کی جانیں تمہارے ہاتھ میں ہیں اگر تم نے احتیاط سے کام نہ لیا تو.....“

”دیکھو لڑکی! ہم نے پہلے کافی قتل کیے ہیں، تین اور سبھی۔ اگر تم نے اپنے منگیز کو سب کچھ بتا دیا تو یہ بہت برا ہو گا۔ خواہ پچاس سپاہی ساتھ لے کر آؤ۔ ان کے آنے سے پہلے ہم تمہارے ماں، باپ اور بھائی کو ختم کر دیں گے۔“

کرشن نے جین کو سمجھایا۔

جین کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ اپنے آپ پر بشکل قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”آپ بالکل فکر نہ کریں۔ مجھے امی، ابا اور بھائی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔“

”صبح ہوتے ہی دفتر چلی جانا اور دیکھو! کل عین وقت پر گھر پہنچ جانا، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس گھر کے تمام کام حسب معمول ہوتے رہیں تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔“

باہر سے ٹیکسی کی آواز سنائی دی۔ روزی اور ڈیوڈ نے جین کو پکڑ لیا اور باہر لے گئے۔ جاسن نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور جین کو اندر لٹا دیا۔ جین بڑے غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔ بار بار اس کا سر دائیں بائیں ڈھلک جاتا۔

”میں نے کہا تھا کہ ہم نے اسے نیند کی گولیاں دی

قاتل تکون

غائب تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی گردن پر پستول کی ٹھنڈی نال کی بچھن محسوس کی۔

”بندوق پھینک دو مسٹر ڈیوڈ۔“ کرشن کی غصے بھری آواز سنائی دی۔

ڈیوڈ نے بندوق پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔

”تھامسن کہاں ہے؟“

”اوپر کمرے میں۔“

”اوپر چلو۔“ وہ خاموشی سے اٹھا اور کرشن کے حکم کی تعمیل میں آگے آگے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تھامسن سمیت دوبارہ نیچے پہنچ گئے۔

”مسٹر ڈیوڈ! تم نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب ہمیں تم پر اعتبار نہیں رہا۔ تھامسن! تم اوپر جا کر ٹیکم صاحب اور اس کے بیٹے کو لے آؤ۔ ہمیں تو موت کے گھاٹ اترنا ہی ہے لیکن انہیں ذرا مزہ چکھائیں اور دیکھو سرچڑ کو چکا دوتا کہ وہ اپنا چاقو تیار کرے، فائر سے آواز پیدا ہوگی۔“

ڈیوڈ کی آنکھوں کے سامنے روزی اور جوزف کی لاشیں اُٹھیں۔ ”خدا کے لیے اوپر مت جاؤ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

”تم نے پہلے بھی تو وعدہ کیا تھا۔“ کرشن نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اس مرتبہ میں اپنے بیٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسی غلطی دوبارہ نہیں ہوگی، پلیز مجھے معاف کر دو۔“ ڈیوڈ نے کرشن کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ٹھیک ہے، ہم تمہیں ایک آخری موقع دے رہے ہیں۔ اگر تم نے اس دفعہ بھی ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

☆☆☆

صبح بڑی حسین اور چمکیلی تھی۔ سورج کی رو دکھائی کر رہی ڈیوڈ ہاؤس میں بیکے ہوئے پھولوں سے کھیل رہی تھیں۔ باغ بچے کے قریب ڈیوڈ بستر سے اٹھا۔ رات بھر وہ سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن سونہ نہ سکا۔ شب بیداری کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نیچے ڈرائنگ روم میں خاموشی چھائی تھی۔ اس نے بستر سے نکل کر روزی کے کمرے کا رخ کیا، وہ بستر پر نہیں تھی۔ وہ بھام بھام کچن میں پہنچا، یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ روزی وہاں موجود تھی، لیکن اس حالت میں کہ ٹھنڈے فرش پر اس کا جسم ساکت و جامد پڑا تھا۔ ڈیوڈ نے اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے

جائے گا۔ ذرا سی دیر میں علاقے کا انسپکٹر مارٹن دس بارہ سپاہیوں کے ساتھ آجائے گا۔ چشم تصور سے اس نے تینوں مجرموں کو انسپکٹر کے ہاتھوں گرفتار ہوتے دیکھا اور مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور دبے پاؤں سیڑھیاں اترتا ہوا ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کرشن صوفے پر دراز تھا اور چڑخو فرش پر چاروں شانے چت سو رہا تھا۔ تھامسن بندوق کندھے سے لٹکائے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ نیند سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کا سر بار بار آگے کی طرف ڈھلک جاتا۔

”تھامسن ذرا ادھر آنا۔“ ڈیوڈ نے آہستہ سے کہا۔ تھامسن ہڑبڑا کر اٹھا اور بغیر سوچے سمجھے اوپر کی طرف چل دیا۔

”کیا بات ہے مسٹر ڈیوڈ؟“

”میں نے چھانک پر کسی شخص کا سایہ دیکھا ہے، سوچا جنہیں بلا لوں۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔

وہ جنگلے کے قریب جا کر رک گئے اور چمک کر نیچے دیکھنے لگے۔ ڈیوڈ نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس لیں اور پوری قوت سے تھامسن کی جگہ کی جگہ ہوئی کمر پر ضرب لگائی۔ ایک لمحے کے لیے تھامسن لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جوابی حملہ کرتا، ڈیوڈ نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو مروڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے بندوق کندھے سے اتار لی۔ اسے بندوق چلائے دس بارہ سال ہو چکے تھے۔ جوانی میں وہ شکار کا بے حد شوقین تھا لیکن یہاں بندوق چلانا درکار بھی نہیں تھا۔

تھامسن نے اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ ڈیوڈ نے اسے اسٹور روم میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا کر دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا تو اس نے سوچا کہ کرشن کے پاس ایک پستول بھی ہے لیکن اس خیال نے اسے تقویت دی کہ وہ اس وقت سو رہا ہوگا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک نظر چڑخو کی طرف دیکھا وہ اسی طرح مدھوش پڑا تھا۔ اس کے بعد اس کی نظر صوفے کی طرف اٹھی جہاں کرشن سو رہا تھا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے محتاط قدم اٹھاتا ہوا کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک گیا۔ اس نے کرشن کے منہ سے کھل پٹائی یا خوف کی ایک لہر اس کے ہارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے قطرے نمودار ہو گئے اور بندوق پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ کبل کے نیچے گول بکیہ پڑا تھا۔ کرشن

نے دودھ کی بوتلیں لے کر رکھ لیں اور اسے باہر ہی سے رخصت کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ بھی آ پہنچی۔ روزی نے اسے باہر ہی روک لیا۔ ”جوزی! آج ہم سب سیر و تفریح کرنے جا رہے ہیں، اس لیے گھر میں کوئی کام نہیں، آج تم آرام کرو۔“

اس کام سے فارغ ہو کر ڈیوڈ نے ناشتا کیا۔ اسپتال میں جین کو فون کیا کہ گھر آنے کے بجائے سیدی دفتر پہنچ جائے۔ جوزف کے اسکول میں اس کی فرضی بیماری کی اطلاع دی اور پھر دفتر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر مارٹن اپنے ماتحتوں پر غضب ناک ہو رہا تھا۔ ”میں کہتا ہوں وہ سب کہاں مر گئے۔ وہ شہر سے باہر نہیں نکلے، گاڑی ان کی نہیں مل رہی، آخر ایک کار سمیت تین آدمی کہاں غائب ہو سکتے ہیں؟ میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب کو یقین دلا چکا ہوں کہ آج شام تک انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ریڈیو پر اعلان کر دو، اشتہار چھپ چکے ہوں تو انہیں شہر کے کونے کونے میں تقسیم کر دو، دیواروں پر بڑی جسامت کے اشتہار لگوادو، جن میں ان تینوں مجرموں کی تصویریں بھی ہوں۔ شہر سے باہر نکلنے والی سڑکوں پر پہرا سخت کر دو، شہر کے ہر پل پر اچانک چھاپے مارو، ریڈیو اسٹیشن پر مقررہ سفید پوش سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کر دو۔ میں ہر قیمت پر انہیں آج شام تک گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔“

☆☆☆

گیارہ بجے کے قریب پہلی ڈاک موصول ہوئی۔ ڈیوڈ نے ٹکڑک کے بجائے خود ڈاکے سے بات کی لیکن اس میں رجسٹری لفافے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے فون پر روزی کو اطلاع کر دی اور خود دونوں ہاتھوں سے سر تھاڑے آرام کر رہے تھے۔ بارہ بجے جین اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ عام طور پر وہ دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا کرتے تھے مگر آج اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ ”ابو مجھے ایک تہیر سوجھی ہے۔“ جین نے کہا۔

”کیا؟“ ڈیوڈ نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”ہم ان لوگوں سے پوچھیں کہ انہیں کس قدر رقم کی ضرورت ہے اور انہیں خود ہی یہ رقم دے دیں۔ اس طرح یہ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“ ڈیوڈ کچھ دیر سوچتا رہا، تجویز معقول تھی۔ گھر میں اس طرح قاتلوں کو چھپانے رکھنے سے بہتر تھا کہ کچھ رقم دے کر اپنی جانیں محفوظ کر لی جائیں۔

”ٹھیک ہے۔ آج گھر چل کر اُن سے بات کریں

مارے، جب کہیں اُسے ہوش آیا۔“ چائے تیار کرنے لگی تھی کہ گر پڑی۔“ اس نے کمزور لہجے میں وضاحت کی۔

ڈیوڈ نے ایک نظر اس کے زرد چہرے پر ڈالی۔ ایک ہی رات میں وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ رخسار زرد اور چمکے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو۔ ڈیوڈ نے پیار سے اس کا کندھا چھو پتھایا اور سیدھا اس اترنے لگا..... ڈراٹنگ روم میں زندگی کے آثار بیدار ہو چکے تھے۔ کرسٹن اور تھامس ایک دوسرے سے کھسک پھسک کر رہے تھے۔ رچرڈ البتہ ابھی تک فرش پر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔

ڈیوڈ کے اندر آتے ہی کرسٹن بولا۔ ”مسٹر ڈیوڈ! اچھا ہوا آپ آگئے، ہم چاہتے ہیں ذرا تفصیل سے منصوبے پر غور کر لیں۔ سب سے پہلے آپ یہ بتائیے کہ اب اس گھر میں کون کون آئے گا؟“

”پہلے دودھ والا آئے گا، اس کے بعد شاید ملازمہ آجائے۔“

”ٹھیک ہے، آپ باہر کھڑے ہو جائیے اور یہ ظاہر کیجیے کہ صحن میں پہنچل قادی کر رہے ہیں۔ جو بھی دودھ والا آئے، اس سے دودھ لیجیے۔ اسے کسی قیمت پر اندر نہ آنے دیا جائے۔ روزی سے کہہ دو کہ وہ بھی صحن میں آجائے اور اگر ملازمہ آئے تو اسے باہر ہی سے واپس بھیج دے۔

”بہت بہتر۔“ ڈیوڈ نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

”جین واپس آجائے تو اسے دفتر بھیج دیجیے، اپنے معمولات جاری رکھیے، آپ کی کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے اور ہاں، جوزف کو اسکول نہ بھیجیے۔ وہ ابھی بچہ ہے، ممکن ہے کسی سے کہہ دے لیکن اس کے اسکول چھٹی کی درخواست ضرور بھجوا دیں تاکہ اس کے دوست یا استاد وغیرہ مشکوک ہو کر یہاں نہ آدھکیں۔ درخواست میں لکھ دیں کہ اسے بخار ہے اس لیے آج حاضر نہیں ہو سکے گا۔ اسے باہر کھیلنے کے لیے بھی نہ جانے دیجیے ورنہ ہمسایوں تک ضرور بات پہنچا دے گا۔ آج آپ کو ڈاک سے ایک رجسٹری ملے گی، اسے احتیاط سے وصول کر لیتا اور شام کو واپس آتے ہوئے بحفاظت یہاں تک لے آنا۔ رجسٹری ملنے ہی گھر کا رخ نہ کیجیے گا، ورنہ لوگوں کو خواہ مخواہ کاٹک ہو جائے گا۔“

ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور صحن میں نکل آیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دودھ والا جلد آ پہنچا۔ اس

کھولتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اپنی بڑی بہن کے پاس جانا ہے، ورنہ میں خود آپ کے ساتھ جاتی۔ میری رائے میں آپ اسے فوراً اسپتال لے جائیں۔ کل تک تو اچھا بھلا تھا، شاید بخار کی وجہ سے دماغ پر برا اثر ہوا ہے۔“

”جی ہمت، میں ابھی اسے لے کر جاتی ہوں۔“ روزی نے جواب دیا۔

دروازہ بند ہو گیا تو مسز ڈیوڈ کو کچھ سکون ہوا اور وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

پانچ بجے جین اور ڈیوڈ گھر پہنچے۔ کرشن کو علیحدہ کمرے میں لے جا کر ڈیوڈ نے اپنی تجویز پیش کی لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

”مسز ڈیوڈ! رقم وصول کیے بغیر ہم یہاں سے نہیں جا سکتے اور پھر آپ اتنی رقم ادا بھی تو نہیں کر سکتے۔ لائے، اگر آپ کے پاس ایک لاکھ ڈالر ہیں، تو ہمارے حوالے کیجیے۔“

کرشن نے دو ٹوک کہہ دیا۔

شام تک کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ جانشن نے دو تین مرتبہ فون کیا اور ہر دفعہ جین نے خود اسے تسلی دی کہ اس کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔ 8 بجے کے قریب ڈیوڈ کا کاؤنٹ اس سے چند کاروباری امور کے بارے میں مشورہ لینے آیا لیکن ڈیوڈ نے اسے باہر ہی سے واپس کر دیا۔ رات کے کھانے کے بعد کرشن نے ڈیوڈ کو بلایا اور شام کا اخبار دکھاتے ہوئے بولا۔ ”پولیس نے سرخ رنگ کی کار کی تلاش شروع کر دی ہے۔ صبح سے سارے شہر میں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے ٹھکانے لگا دیا جائے۔“

”وہ کیسے؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”آپ اسی وقت بازار جائیں، برش اور رنگ کے ڈبے خرید لائیں۔ ہم سب مل کر گاڑی کا رنگ تبدیل کر دیں گے۔ اس کے بعد آپ اسے رات کی تاریکی میں باہر چھوڑ آئیں۔“ کرشن نے حکم کے طور پر کہا۔

”میں چھوڑ آؤں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ڈیوڈ پریشان لہجے میں بولا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، موجودہ حالات میں آپ کے سوا یہ کام اور کون انجام دے سکتا ہے؟“

”لیکن.....؟“

”لیکن، ویکن کچھ نہیں، مسز ڈیوڈ آپ خاموشی سے تعمیل کیجیے ورنہ.....“ کرشن نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈیوڈ نے ایک نظر سہے ہوئے جوزف کی طرف دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ تینوں آستین

گئے۔“

ٹھیک دن کے ایک بجے ڈیوڈ ہاؤس کے بیرونی پھاٹک کی کھٹکی بجی۔ رچرڈ نے جنگلے سے جھانک کر دیکھا۔ تیس بتیس برس کی ایک عورت چشمہ لگائے اور ہاتھ میں چند کتابیں لیے باہر کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں عبور کیں اور کرشن کو اس کی اطلاع کر دی۔

”مسز ڈیوڈ، ہم خواب گاہ میں چھپ جاتے ہیں، آپ اس خاتون کو اندر بلائیے، لیکن دیکھنا، ہمیں جوزف اس سے سب کچھ نہ کہہ دے۔“

ذرا ہی دیر بعد مس ٹینا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”مجھے پتا چلا تھا کہ جوزف کی طبیعت خراب ہے، اب پھٹی ہوئی تو سوچا، اسے ایک نظر دیکھتی چلوں۔“ کچھ دیر تک وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر جوزف کے کمرے کی طرف چل دی۔ جوزف بستر میں لیٹا تھا، صبح سے اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اسٹانی کو دیکھ کر اس کا چہرہ جل اٹھا۔ اس اشامی روزی، کرشن کی خواب گاہ میں یہ بتانے لگی کہ ملاقاتی خاتون جوزف کی ٹیچر ہے۔ جب وہ واپس آئی تو مس ٹینا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا اب میں جاتی ہوں، اجازت دیجیے۔“

مسز ڈیوڈ اُسے دروازے تک چھوڑنے نکلیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ جوزف کے پاس اوپر پہنچیں تو وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

”کیا ہوا جوزف، دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟“

”کچھ نہیں امی۔“

لیکن ذرا سی دیر بعد ٹیگم ڈیوڈ کو پتا چل گیا کہ جوزف کے وحشیانہ قہقہوں کا مطلب کیا تھا۔ اچانک دروازے پر دوبارہ کھٹکی بجی اور مس ٹینا گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

”مسز ڈیوڈ، معلوم ہوتا ہے کہ جوزف کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”یہ دیکھو، اس نے میرے پرس میں یہ خط لکھ کر رکھا ہے۔“

”لکھا ہے۔“ ہمارے گھر میں تین قیدی چھپے ہوئے ہیں۔ ہمیں پولیس کو اطلاع کرنے نہیں دیتے۔ آپ یہ خط پولیس ایجنٹس پہنچا دیں، مہربانی ہوگی۔ اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ اہل عام میں کوئی صحیح الدماغ بچہ لکھ سکتا ہے؟“

روزی کے حیرتوں تلے سے زمین نکل گئی۔

مس ٹینا نے خط اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور دروازہ

چڑھائے کار پر گہرا سیاہ رنگ کرنے میں مصروف تھے۔ گیارہ بجے اندھیرا تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر لائٹ نہیں چلائی تھی کیونکہ اس طرح ہسپتال کو شبہ ہو سکتا تھا۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ کاری چمکیلی سطح پر اندھا دھند برش چلا رہے تھے۔ گیارہ بجے وہ اس کام سے فارغ ہوئے۔ اس دوران میں کرسٹن باہر پہنچا رہا تھا..... گرم پانی سے غسل کرنے سے ڈیوڈ کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ اس نے کپڑے بدلے اور زندگی میں پہلی مرتبہ ایک انوکھی مہم کے لیے تیار ہو گیا۔ اس اثنا میں کرسٹن کاری کی نمبر پلیٹ اتار چکا تھا اور اب جین کی چھوٹی گاڑی کی پینٹیں اس پر لگا رہا تھا۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو جین کو اپنی گاڑی میں میرے پیچھے بھیج دیں تاکہ وہ مجھے واپس لائے۔“ ڈیوڈ نے کرسٹن کو مخاطب کیا۔

”نہیں، دو گاڑیوں کے آگے پیچھے چلنے سے پولیس کو شک ہو سکتا ہے۔ تمہیں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ آج ہر چوک پر سرخ رنگ کی کار کو پولیس تلاش کر رہی ہوگی۔“

باہر بھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شاید کہیں ڈالہ باری ہوئی تھی۔ رات سوا بارہ بجے ڈیوڈ ہاؤس سے گہرے سیاہ رنگ کی ایک کار باہر نکلی اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ تھوڑی دیر تک وہ کنجاں آبادی سے باہر نکل آیا۔ اب صرف ایک دوکان کا مکان نظر آرہے تھے۔ دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ چراگاہیں اور باغات کے ساتھ ساتھ کھلے میدان تھے جو ہلکی چاندنی میں بڑے پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔

پولیس چوکی سے پہلے ڈیوڈ نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور چشم زدوں میں وہ آخری خطرناک مقام بھی عبور کر گیا۔ ایک بجے وہ دریا کے پل پر پہنچا۔ یہاں سے ایک مچی سڑک دریا کے بیچ میں اترتی تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور اسے مچی سڑک پر چلائے لگا۔ ایک دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں سڑک کے ساتھ ہی پانی شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں ارد گرد گھٹے درخت تھے، اس لیے دن کے وقت بھی یہ جگہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتی تھی۔ اس نے گاڑی کا رخ دریا کی طرف کر دیا اور خود باہر نکل کر اسے پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ گہرے سیاہ رنگ کی گاڑی سوکھی شاخوں اور گھاس کے تختوں کو پھلاتی ہوئی دریا کے گہرے پانی میں غائب ہو گئی۔ ڈیوڈ نے جیب سے برقی ٹارچ نکال کر اس کی روشنی میں دریا کی طرف دیکھا، وہاں کار کا نام و نشان نہ تھا۔ صبح سات بجے جب وہ دس میل کا فاصلہ طے کر

کے گھر پہنچا تو اس کا جوتوڑ دکھ رہا تھا۔

تیسرے دن آٹھ بجے ڈیوڈ تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ اس کی طبیعت نا سازھی۔ رات بھر جانتے رہنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور نوڈس نیل کی پیدل کی مسافت سے اس کا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا لیکن دفتر پہنچنا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ آج کرسٹن کی رقم پہنچنے کی قوی امید تھی اور ویسے بھی کرسٹن چاہتا تھا کہ ہر کام حسب معمول ہو۔ دس بجے کے قریب جب گھر میں تینوں مجرموں کے علاوہ صرف روزی اور جوزف رہ گئے تو مس جوزی ملازمہ، پھانک سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ موٹی تازی لڑکی بہت سے گھروں میں برتن وغیرہ دھونے کا کام کرتی تھی۔

”ہیلو مسز ڈیوڈ! کیسی ہو؟“ وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ چونکہ وہ سالہا سال سے گھر میں کام کر رہی تھی اس لیے بائیں دروازے سے داخل ہو گئی جو اتفاق سے اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ کرسٹن اور اس کے ساتھی سنبھل سکتے، وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

اس نے ایک نظر تینوں مجرموں پر ڈالی اور دھشت زدہ ہو کر واپس مڑنے لگی۔ کرسٹن نے اسے زبردستی کھینچتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے، تمہیں کس سے ملنا ہے؟“

”کسی سے نہیں۔“ وہ خوف زدہ ہو کر چلائی۔

اس اثنا میں روزی۔۔۔ یہاں اتر کر بیچے آچکی تھی۔

”کیا بات ہے جوزی، تم بیچ کیوں رہی ہو؟“

”کچھ نہیں، یہ لوگ کون ہیں؟“ جوزی بولی۔

”ڈیوڈ کے دوست ہیں، کیوں کیا ہوا؟“ مسز ڈیوڈ نے پوچھا۔

”آپ جلدی سے مجھے رقم دے دیں، مجھے تو ان سے خوف آرہا ہے۔ ان کی شکلیں قاتلوں جیسی ہیں۔“

روزی نے جلدی سے چیک کاٹ کر اس کے حوالے کیا اور وہ تو بہت کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی، اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا۔ ”مسز ڈیوڈ! بھلا دیکھیے، ان لوگوں کی شکلیں ان مجرموں سے کس قدر ملتی ہیں جو پوسٹنیل سے بھاگے تھے۔“

”میرا خیال ہے، جنہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو ڈیوڈ کے بچپن کے دوست ہیں۔“ مسز ڈیوڈ تھوک ٹنگتے ہوئے بولی۔

”اچھا تو مجھے اجازت دیجیے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

قاتل تکون

”جناب! مسٹر ڈیوڈ، جیلین چوک میں ایک بڑے اسٹور کا مالک ہے اور اوپل روڈ پر رہتا ہے۔ روزی مسٹر ڈیوڈ کی بیوی ہے۔ چیک پر اسی کے دستخط ہیں۔ بینک میں اس گھرانے کے چار افراد کے نام کچھ رقم جمع ہے۔ مسٹر ڈیوڈ، مسز روزی، جین ڈیوڈ اور جوزف ڈیوڈ۔ جین اور جوزف مسٹر ڈیوڈ کے بچے ہیں۔ جین انیس سال لڑکی ہے اور ایک دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔ جوزف کی عمر بینک کے کاغذات میں نو سال لکھی ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی اسکول میں پڑھتا ہوگا۔“

”ان سب کے پتے تلے ہو؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔
”جی ہاں، یہ لیجیے۔“ سارجنٹ نے کاغذ انسپکٹر مارش کے حوالے کر دیا۔

”ٹھیک ہے، تم یہیں بیٹھو اور جو نی کوئی تازہ خبر ملے مجھے اطلاع کر دینا۔ میں باری باری ان چوں پر لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔“

انسپکٹر مارش نے اپنی مہم پر نکلنے سے پہلے پولیس کی وردی اتار کر سادہ کپڑے پہن لیے۔ سب سے پہلے اس نے ڈیوڈ اسٹور کا رخ کیا۔ وہاں اس وقت منیجر اور کاؤنٹر کلرک کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

”کیا ڈیوڈ چلا گیا ہے؟“ مارش نے اُن سے پوچھا۔
”جی ہاں، وہ پانچ بجے گھر چلے جاتے ہیں۔“ منیجر نے ان کی بے تکلفی سے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”اب طبیعت کیسی ہے اُس کی؟ معاف کیجیے گا، وہ میرا بہت پرانا دوست ہے اس لیے میں اسے اسی طرح بلاتا ہوں۔ کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“ مارش نے اداکاری کی۔

”جی ہاں، دو تین دن سے اُن کی طبیعت واقعی ناساز ہے۔ دن بھر کھوئے کھوئے رہتے ہیں، بات بات پر رونا ہو جاتے ہیں۔ آج تو انہوں نے کمال کر دیا، کہنے لگے۔ صبح کی ڈاک میں خود دیکھوں گا، کچھ دیر بعد اپنے کمرے سے نکلے تو میں نے انہیں بلانے کی کوشش کی مگر انہوں نے میری طرف ذرہ برابر توجہ نہیں دی بس جیکے سے دونوں ہاتھ کر پر رکھے باہر نکل گئے، جناب! ایسا پہلے تو مجھے نہیں ہوا۔“

”اچھا تو مجھے اجازت دیجیے، میں اُس سے گھر پر ہی مل لوں گا۔“
یہاں سے نکل کر اس نے جین کے دفتر کا رخ کیا۔ جین بھی گھر جا چکی تھی لیکن جولڑکی اس کی جگہ کام کر رہی تھی، اس سے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کا کتب لیب یہ تھا کہ آج کل جین کی تفریحی پروگرام میں شرکت نہیں کرتی اور

کرشن نے رچڑ کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے رچڑ کمرے سے باہر لپکتا ہوا کھانکی دیا۔
جوزی تیزی سے کار چلا رہی تھی۔ ”اچھا تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے ہیں لیکن مسٹر ڈیوڈ کا ان سے کیا تعلق؟“ اس نے سوچا اور پھر متفکر انداز میں سر ہلانے لگی۔ ”مجھے ہر قیمت پر پولیس کو خبر دینی چاہیے۔“ یہ سوچ کر اس نے کار کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔

ڈبل روڈ کر اس کرتے ہی اسے اپنی کمر پر کسی تیز چیز کی چھین محسوس ہوئی، اس کے منہ سے ایک تھچ ٹکلی اور وہ اسٹیرنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ کار سڑک پر کنارے کھڑے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرانے والی تھی کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر کا آہستہ آہستہ چلتی رہی اور ایک دیر ان جگہ پر رک گئی۔ رچڑ نے دروازہ کھولا اور پھر تی سے باہر نکل کر درختوں کے چھند میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

بارہ بجے انسپکٹر مارش، اسپتال میں جوزی کی لاش پر جھکا اظہارِ افسوس کر رہا تھا۔

”جناب جب اسے اسپتال لایا گیا تو یہ بے ہوش تھی۔ ہوش میں آتے ہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ”مجرم تینوں مجرم“ اور پھر یہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا ہے۔“ ڈاکٹر بتا رہا تھا اور انسپکٹر مارش کا چہرہ حیرت سے متغیر ہو رہا تھا۔

”کیا اس کی تلاشی لی گئی ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔
”جی ہاں، یہ چیزیں اس کی جیب سے برآمد ہوئی ہیں۔“ ڈاکٹر نے وہ چیزیں انسپکٹر کے حوالے کر دیں۔

پچھلی شام کے تہ کردہ اخبار کے علاوہ کوآپر بیٹو بینک کا ایک چیک انسپکٹر مارش کے سامنے پڑا تھا جس پر مسز ڈیوڈ کے دستخط تھے۔

اچانک انسپکٹر کا چہرہ چمک اٹھا۔ مطلب یہ کہ آخری بار یہ مسز ڈیوڈ سے ملی تھی۔ ”میرا خیال ہے یہ نام میں نے سن رکھا ہے۔ سارجنٹ! تم فوراً کوآپر بیٹو بینک جاؤ اور مسز ڈیوڈ کا پورا نام اور پتا لے کر میرے پاس پہنچو۔“

”بہت بہتر جناب۔“ سارجنٹ نے سلیوٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔

مارش اپنی میز پر بیٹھا واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور سارجنٹ برکتے دوڑتا ہوا اندر آیا۔

”کمال ہے بھی، آپ اپنے مہمانوں کو نہیں پہچان سکتے۔“ ڈیوڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے خستک لیوں پر زبان پھیری اور پھر بیچنے کی کوئی راہ نہ پا کر ساری بات بتا دی۔ مارٹن خاموشی سے سن رہا اور پھر بولا۔ ”ابھی تک ان کی رقم نہیں پہنچی؟“

”نہیں، لیکن صبح بارہ بجے تک رقم ملنے کا قوی امکان ہے۔“

”کیا آپ اپنے گھر کا نقشہ بتا سکتے ہیں؟“

ڈیوڈ نے کاغذ پر مکان کا نقشہ بنایا۔ دو اطراف خالی تھیں اور دو جانب مکانات تھے۔ مارٹن کچھ دیر سوچتا رہا پھر ڈیوڈ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، کل میں آدی آپ کے پاس پہنچ جائیں گے اور کسی کوکانوں کا بن خبر نہیں ہوگی۔ پچاس آدی مکان سے کچھ دور چاروں طرف گھیرا ڈالیں گے تاکہ پھر موموں کو بھاگنے نہ دیں۔ میں خود اندر رہوں گا۔ عین سات بجے ہم دواہوا بول دیں گے۔ آپ پونے سات بجے کسی بھانے سب گھر والوں کو باورچی خانے میں لے جا کر بند کر دیجیے گا۔ میں دودھ والے کے روپ میں ہوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ آپ مجھے بھی پہچان نہ سکیں۔ اچھا اب خدا حافظ، یہ باتیں کسی سے نہ کہنا، اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ صبح سات بجے ملاقات ہو گی۔“ انسپکٹر نے اسے تمام باتیں سمجھا دی تھیں۔

انسپکٹر مارٹن پولیس اسٹیشن میں موجود تھا اور بڑا پُر جوش تھا۔ ”سارجنٹ! میں ڈیوڈ ہاؤس کا خود جائزہ لے چکا ہوں، اس کے مشرقی کونے پر بجلی کا ایک کھمبا ہے۔ صبح ساڑھے چھ بجے سے مزدور اس کھمبے پر کام کر رہے ہوں گے۔ دیکھو! ہوشیار آدی چننا پورے سات بجے دس اور مزدور، ایک نیا کھمبا، اتھھ گاڑی پر رکھے یہاں پہنچیں گے، پانچ سطح سپاہی سادہ کپڑوں میں ڈیوڈ ہاؤس کی مغربی دیوار کے نیچے ہوں گے اور پانچ شالی دیوار کے نیچے۔ اس کے علاوہ دونوں طرف ہسایوں کے ہاں بھی بجلی درست کرنے والے پہنچ جانے چاہئیں۔ رات تین بجے آپ اس علاقے کے بجلی گھر جائیں اور پورے علاقے کی بجلی بند کرادیں۔ چار بجے ڈیوڈ ہاؤس کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کی طرف سے شکایات درج ہونی چاہئیں اور چھ مزدوروں کو موقع پر پہنچ جانا چاہیے۔ سادہ لباس میں تیس سطح سپاہی چاروں طرف موجود رہیں گے۔ دس راہ گیروں کی شکل میں اور باقی اکاڈکا اور ادھر ادھر پھرتے رہیں گے۔ ٹھیک سات بجے میں دودھ والا بن کر مکان میں داخل ہوں گا۔ عین اسی وقت

سیدھا گھر کا رخ کرتی ہے۔“

”کمال ہے جناب، کل میں اس کے ساتھ چوک تک گئی تو وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔“ سیلی بہن! تمہارے پاس پستول ہے؟ سچ جائے، میں تو اس بات سے ڈر گئی تھی۔ بھلا اسے پستول کی ضرورت کیوں پڑ گئی لیکن اس نے بات بتاتے ہوئے کہا کہ وہ مذاق کر رہی تھی۔ مجھے تو یقین نہیں آیا، عجیب لڑکی ہے، صاحب۔۔۔۔۔“

جوزف کا اسکول بند تھا اس لیے مارٹن کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ ایک بار پھر غور و فکر میں ڈوب گیا۔ واقعات کو ابھی دے رہے تھے کہ مجرم ڈیوڈ کے ہاں چھپے ہوئے ہیں لیکن ان سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ آخر وہ کس پتہ پر اسے بلیک میل کر رہے تھے۔ اس کے دماغ میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا۔ اس نے کھنٹی بجائی۔ سارجنٹ برکلی کمرے میں داخل ہوا۔

”سارجنٹ، میں مسٹر ڈیوڈ سے ملنا چاہتا ہوں، تم اسے کسی بھانے اسٹور میں بلا سکتے ہو؟ ابھی اور اسی وقت؟“

”جی سر! میں کوشش کرتا ہوں۔“ سارجنٹ برکلی نے جواب دیا۔

ڈیوڈ ہاؤس میں فون کی گھنٹی بجی تو ڈیوڈ نے خود ہی ریسپونڈ کیا۔ ”کون صاحب ہیں؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”میں اسٹور سے بول رہا ہوں، سلیز ٹیکس والے اچانک آپ پہنچے ہیں، آپ فوراً اسٹور پہنچ جائیے۔“

”بہت بہتر، میں ابھی آ رہا ہوں، آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”جی میں صفائی کرنے والا۔ جی ہاں منیجر صاحب ان سے بات کر رہے ہیں۔“

دس منٹ بعد ڈیوڈ اسٹور میں داخل ہوا۔ عقبن کمرے میں مارٹن اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

”انسپکٹر صاحب، آپ“ ڈیوڈ نے گھبرا کر کہا۔ چونکہ وہ اس کے علاقے کا تھا نہ دار تھا اس لیے دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

”ہاں میں، مسٹر ڈیوڈ، تشریف رکھیے، میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“ ڈیوڈ ہکلاتے ہوئے بولا۔ مارٹن نے جیب سے ایک اشتہار نکالا اور میز پر پھیلا دیا۔ ”آپ ان مجرموں کو جانتے ہیں؟“

”جی، جی نہیں، مجھے ان سے کیا سروکار۔“

قاتل تکون

اچانک دروازے کی کھنٹی بج اٹھی۔ کرشن نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے پانچ سات مزدور ہاتھوں میں اوزار لیے کھڑے تھے۔ ایک نے کرشن سے پوچھا۔

”میں سوچ کہاں ہے؟“

کرشن نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ اسی وقت دودھ والا بڑا ہاتھ اٹھا کر آگیا۔

کرشن اُسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور درشتی سے بولا۔ ”کیا بات ہے؟ اندر کیوں گھے چلے آ رہے ہو؟“

”بھائی صاحب! مجھے آپ یہ بتائیں کہ میں نے آپ کو کب گندہ دودھ دیا تھا؟ آپ کو مجھ سے کیا دشمنی تھی جو آپ نے انجینیسی سے میری شکایت کر دی، یہ دیکھیے۔“ اس نے شکایت نامہ کرشن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی انجینئر کی عتابی نظروں نے بھانپ لیا کہ پستول کرشن کی دائیں جیب میں ہے۔ کرشن نے بائیں ہاتھ سے کاغذ پکڑا، اس کا دایاں ہاتھ بدستور جیب میں تھا۔ ابھی وہ کاغذ کی طرف دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ انجینئر مارش اس پر پل پڑا گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور بے شمار لوگوں کے قدموں کی آواز بھی، جو اس طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ مارش کا ہاتھ کرشن کی جیب میں پڑے ہوئے پستول پر تھا اور اس کی گرفت اس پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ پستول پر قابو پا چکا تھا۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور چھ سات مزدور ہاتھوں میں اسلحہ لیے اندر داخل ہوئے۔

”ہاتھ اوپر اٹھا لو اور پستول پھینک دو۔“ انہوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔

تین چار سپاہیوں نے کرشن کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ باقی دس مارش کے ساتھ بیڑھیاں چڑھنے لگے۔ گولی چلنے کی آواز سے خواب گاہ میں تھا مسن اور چڑبیدار ہو چکے تھے۔ لیکن پہلے سے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق ڈیوڈرات کے وقت ان کی بندوق میں سے ساری گولیاں نکال چکا تھا۔ انہوں نے بھاگنے کی ناکام کوشش کی لیکن کئی سپاہیوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

چند منٹوں میں ہی پولیس تینوں مجرم مہمانوں کو جیب میں بٹھائے پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی اور ڈیوڈرات کے تمام افراد کے ساتھ دروازے میں کھڑا انہیں الوداع کہہ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان خطرناک و خوفناک مجرموں سے چھٹکارا پا چکا ہے۔

کھجے کے نیچے کھڑے ہوئے پانچ مزدور بھی گھر میں داخل ہوں گے تاکہ بجلی درست کر سکیں۔ اس کے علاوہ پانچ آدمی اور تیار کرو جو اس وقت ڈیوڈرات ہاؤس جا میں اور مکان کا جائزہ لے کر کہیں نہ کہیں چھپ جائیں۔ دیکھو، ایک آدمی گیراج میں چھپ سکتا ہے، دوسرا اسٹور روم میں، تیسرا دوسری منزل کے ان کمروں میں جو اکثر خالی رہتے ہیں۔ باقی دو بھی ادھر ادھر چھپ جائیں، یہ لوگ مسلح ہونے چاہئیں۔“

”بہت بہتر جناب۔“ سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

صبح جب مسز ڈیوڈرات سے ابھی تو اس کے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ کام کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا لیکن ناشا تیار کرنا ضروری تھا۔ اپنے لیے نہ سکی، ان ”مہمانوں“ کے لیے جو ناشتے میں ذرا سی دیر پر آگ بگولا ہو جاتے تھے۔

اس نے جوزف کو اٹھایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس وقت تھا مسن اور رچرڈ اوپر خواب گاہ میں سو رہے تھے۔ بندوق ان کے سر ہانے رکھی تھی اور کرشن ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم دراز تھا۔ پستول اس کی جیب میں تھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا تھا اور اب نہانے کا سوچ رہا تھا۔

اچانک اُسے باہر کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔ اٹھ سے دس مزدور بجلی کے کھجے کے پاس کھڑے تھے۔ ایک شخص رسی کی سیڑھی کے ذریعے کھجے پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے جی جلا کر دیکھی تو بجلی غائب تھی۔ اس نے صبح کا اخبار اٹھایا اور کل والے قتل کی روداد پڑھنے لگا۔ ساڑھے چھ بجے ڈیوڈرات نیچے آیا۔ کرشن اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”مسز ڈیوڈرات! ان دونوں پوسٹیوں کو جگاؤ، آخر کب تک وہ ہوتے رہیں گے؟“

”میں..... میں نے جگایا تھا لیکن رچرڈ بگڑ گیا اور مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔“

”عجب احمق آدمی ہے، خیر سونے دو، اٹھ کر وہ کون سا قلعہ فتح کر لیں گے۔ ناشتے سے پہلے میں ذرا نہالوں۔“ یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔

ٹھیک سات بجے باہر شور سنائی دیا۔ کرشن نہادھو کر کرسی پر بیٹھا بال بتا رہا تھا۔ اس نے باہر جھانکا۔ بہت سے مزدور دو پھیوں والی ایک ہاتھ گاڑی دھکیل کر لا رہے تھے، جس پر بجلی کا ایک کھمبار کھایا ہوا تھا۔

دامِ صیاد

سلیم انور

ناگہانی کبھی اطلاع دے کر نہیں آتی... اچانک... دے پاؤں بنا آہٹ کے حملہ آور ہوتی ہے... سوچوں کی لہروں نے اسے سبک اور رواں منصوبے کی جانب دھکیل دیا تھا... شاندار منصوبے کے بعد عمل کی گھڑیاں بھی آگئیں... مگر پھر وہ کچھ ہو گیا جو سوچا تھا... نہ ملے شدہ تھا۔۔۔

اپنے ہی جال میں الجھ کر گر جانے والے صیاد کا دل دوزخِ انجام.....

سراغ رساں شرمین سارجنٹ ولسن کے آرام دہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

لیکن بے ترتیب دفتر میں اس کے ہمراہ موجود تھا۔ سارجنٹ ولسن قتل کے ایک کیس کا جائزہ لے رہا تھا جسے وہ پہلے ہی حل کر چکا تھا۔ وہ میڈیا کو اس سلسلے میں ایک پریس ریلیز جاری کرنے سے قبل یہ یقین کر لیتا چاہ رہا تھا کہ اس بیان میں کسی قسم کی کوئی خامی باقی نہ رہ جائے۔

اتنے میں قیمتی لباس پہنے ہوئے ایک نوجوان عورت اس کے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی اور پوچھنے لگی۔ ”ایکسیکوزی، کیا تم ہی سارجنٹ ولسن ہو؟“

سارجنٹ ولسن نے سر اٹھا کر اس عورت کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلادیا۔

”میں اپنے شوہر کو ملنے والی ایک دھمکی کے بارے میں رپورٹ درج کرانا چاہتی ہوں۔“ اس عورت نے کہا۔

”میرا نام امینڈا سامنڈز ہے۔ میرے شوہر کا نام جون سامنڈز ہے۔ وہ غیر منقولہ جائیداد کی ایک معروف شخصیت ہے اور کینسلر ٹی کے ڈاؤن ٹاؤن ڈسٹرکٹ کے متعدد بلاک کا مالک ہے۔“

سراغ رساں شرمین بھی توجہ سے اس عورت کی بات سن رہا تھا۔

”کل یہ ہمیں ڈاک سے موصول ہوا ہے۔“ امینڈا نے یہ کہتے ہوئے ایک کاغذ سارجنٹ کی جانب بڑھا دیا جس پر حروف کاٹ کر چپاں کیے گئے تھے۔ پیغام کچھ یوں تھا۔ ”تم موٹے سڑیل دوسروں پر بوجھ بنے ہوئے بڑھے، مرنے کے لیے تیار ہو..... دم دھادھم!“

”پیغام قدرے ناشائستہ ہے۔“ سراغ رساں شرمین نے پیغام پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد ناک بھونک کر کہا۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر اس کا شوہر دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا ہے تو پھر پولیس اس بارے میں کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ اس نے امینڈا کو اس وارننگ کے ساتھ واپس بھیج دیا کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور اگر اسے کوئی بھی عجیب بات دکھائی دے تو پولیس کو فون کر دے۔

چند گھنٹوں کے بعد ایک فون کال ضرور آئی لیکن وہ امینڈا کی جانب سے نہیں تھی۔ یہ فون کال ایک ایسولینس ٹیم کی جانب سے تھی جو جون سامنڈز کی رہائش گاہ کے باہر موجود تھی۔ ”یہاں ایک کاریم کا دھماکا ہوا ہے۔“ ایمر جی

جب کرائم سین انویسٹی گیشن کا عملہ آگیا تو سارجنٹ ولسن اور سراغ رساں شرین انہیں جائے حادثہ پر چھوڑ کر حویلی کے اندر چلے گئے۔ جون سائمنڈ کا بھتیجا کونراڈ انہیں کوٹھی کے عقب میں سے ہوئے چکن میں مل گیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ قہم دان گھر ہی میں موجود رہا ہے۔ اس نے ڈاک میں موصول ہونے والے دھمکی آمیز پیغام اور گیراج میں نامعلوم شخص کی چوری جیسے آمد اور امینڈا کے اس سلسلے میں خوف اور ڈر کی تصدیق کی۔

”یہ کار آخری بار کب استعمال میں لائی گئی تھی؟“ سارجنٹ ولسن نے کونراڈ سے پوچھا۔

”وہ کار جس میں دھماکا ہوا ہے؟“ کونراڈ نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

گوگیراج کا بلبا وہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن کارنر کے اطراف میں دھواں اب بھی اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ ”یہ ان کی واحد کار تھی۔ دوسری بننے کے لیے ورکشاپ گئی ہوئی ہے۔ امینڈا نے صبح پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے لیے کار استعمال کی تھی۔ اس کے بعد سے اسے کسی استعمال میں نہیں لایا گیا تھا۔“ کونراڈ نے بتایا۔

”جب امینڈا سیزھیوں پر سے گری تھی تو کیا تم یہاں

در کرنے فون پر انہیں بتایا۔“ مسٹر جون اور مسز جون دونوں ہی اس دم دھماکے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔“

سارجنٹ ولسن اور سراغ رساں شرین دونوں ہی فوراً جائے حادثہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

جون سائمنڈ کی حویلی کا گیراج جل کر بکھنڈ ہو چکا تھا اور بلبے سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ کار میں موجود دونوں میاں بیوی کو فوج نکلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

ایمرجنسی میڈیکل سروس کا ایک ورکر سارجنٹ ولسن کے پاس آگیا۔ ”دھماکے سے قبل ہمیں مسٹر جون سائمنڈ کا فون موصول ہوا تھا۔ ان کی بیوی سیزھیوں پر سے لڑھک کر

بچے کر گئی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی۔ انہوں نے فون پر بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں اور انتظار کریں، ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ رہے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ

انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے۔“

سارجنٹ ولسن نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ”سو اس نے اپنی بے ہوش بیوی کو کار میں ڈالا، کار اسٹارٹ کی اور دھڑام..... دھماکا ہو گیا! جو کوئی بھی جون سائمنڈ کو مار ڈالنا

چاہتا تھا، اس نے دونوں میاں بیوی کو ہلاک کر دیا۔“



موجود تھے؟“ سارجنٹ ولسن نے پوچھا۔

پھٹ جائے گا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ امینڈا کی موت اپنے ہی ہم سے واقع ہو گئی۔“

سارجنٹ ولسن یہ سن کر گنگ رہ گیا۔
”اس معاملے میں امینڈا کا کوئی ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔“ سراخ رساں شرمین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اس پہلو کو بھی چیک کرنا ہو گا۔“

”اور تمہیں کس بات نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ امینڈا جون نے گیراج میں کسی اجنبی کی موجودی اور دیکھے جانے کے بارے میں کہانی خود گھڑی تھی؟“ سارجنٹ ولسن نے جانتا چاہا۔

”سیدھی اور سامنے کی بات ہے۔ اس نے ہم سے کہا تھا کہ وہ اپنے بچن کی کھڑکی کے پاس کھڑی کپ میں کافی انڈیل رہی تھی اور گیراج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس وقت اس نے کسی کو گیراج میں ادھر ادھر مٹلاتے ہوئے دیکھا تھا اور جون کے بیچے کو نراڈ کو فوراً ہی صورت حال معلوم کرنے کے لیے وہاں بھیج دیا تھا۔“

سارجنٹ ولسن نے تائید میں سر ہلا دیا۔
”لیکن ایسا نامکن تھا۔“ شرمین نے کہا۔
”وہ کیسے؟“

”ان کی حویلی کا گیراج بچن کی کھڑکی سے خاصے فاصلے پر کارنر سے گھوم کر پڑتا ہے۔ بچن سے گیراج میں نگاہ پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

☆☆☆

بعد ازاں سراخ رساں شرمین کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

”اس سازش میں امینڈا اور کو نراڈ دونوں ہی شامل تھے۔ ان کا ارادہ جون سامنڈ کے مرنے کے بعد اس کی دولت آپس میں بانٹنے کا تھا لیکن اتفاق سے امینڈا سیزھیوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی اور کو نراڈ نے اپنے انکل کو اس بات سے نہیں روکا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی کار میں ڈال کر اسپتال نہ لے جائے بلکہ ایبوسولنس کے آنے تک انتظار کرے۔ اسے ایک تیرے دو شکار کرنے کا بہترین موقع مل رہا تھا۔ جون سامنڈ کی تمام دولت اس کے ہاتھ آ جاتی اور وہ تنہا تمام دولت اور جائیداد کا مالک بن جاتا۔“ سارجنٹ ولسن نے شرمین کو بتایا۔

”کو نراڈ نے سب کچھ اگل دیا ہے اور اب وہ حوالات میں ہے۔“

”ہاں۔“ کو نراڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے انکل جون سے کہا کہ وہ ایبوسولنس کے آنے کا انتظار کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے امینڈا کو کار تک پہنچانے میں انکل کی مدد کی تھی۔ میں اس وقت گیراج کے مین باہر کھڑا ہوا تھا جب کار میں دھماکا ہوا۔“ کو نراڈ کے منہ پر ابھی تک دھوئیں کی کالک موجود تھی اور اس کے چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں نمایاں تھیں۔

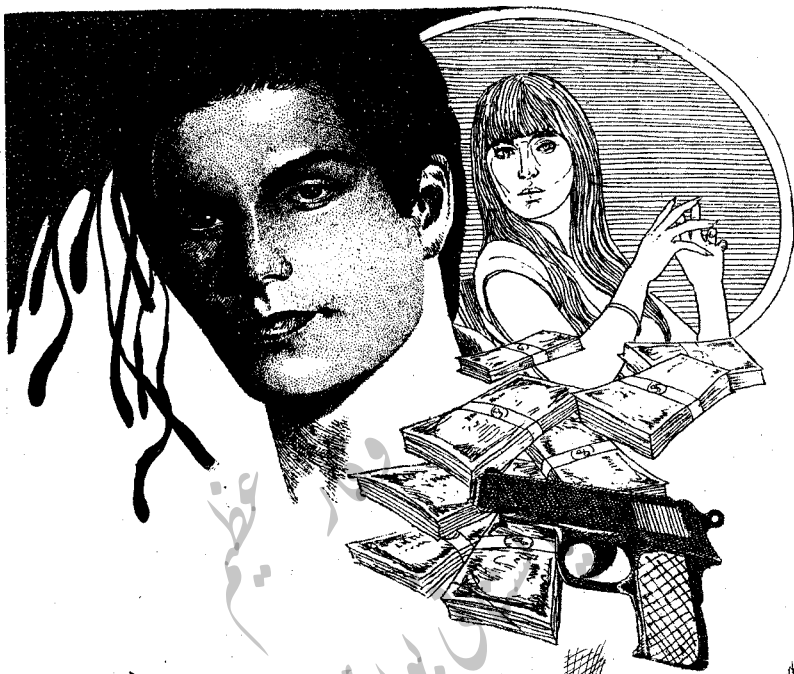
سارجنٹ ولسن اپنے دوست سراخ رساں شرمین کو ایک طرف لے گیا۔ ”مجھے بڑی تجالیت ہو رہی ہے۔ وہ عورت تحفظ کے لیے ہمارے پاس آئی تھی اور میں نے اسے گھر بھیج دیا اور وہ ہلاک ہو گئی۔“

”مجھے معلوم نہیں کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا۔“ شرمین نے کہا۔ ”لیکن مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ اس میں کون ملوث تھا۔ تم اس واقعے کو رونما ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔“

”مجھے امینڈا کی بات سن لینا چاہیے تھی۔“ سارجنٹ ولسن نے خود کو کوستے ہوئے کہا۔ ”لیکن انہیں جو دھکی موصول ہوئی تھی وہ ایسی تھی کہ قائل نہیں کر رہی تھی۔“
”وہ واقعی قائل نہیں کر رہی تھی۔“ سراخ رساں شرمین نے سارجنٹ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
”اس لیے کہ وہ اسی نے تیار کی تھی۔“
”کس نے؟“ سارجنٹ ولسن چونک پڑا۔

”میرا خیال ہے کہ امینڈا جون اپنے شوہر جون سامنڈ کو قتل کرنے کی پلاننگ کر رہی تھی۔ اس نے وہ تحریری پیغام اور گیراج میں کسی کے چوری چھپے داخل ہونے اور دیکھے جانے کے بارے میں داستان خود تیار کی تھی۔ جب اس کا شوہر ہم دھماکے میں مارا جاتا تو ہمیں یہ یقین کرنا پڑتا کہ یہ حرکت اس کے کسی دشمن کی تھی۔“
سارجنٹ ولسن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”لیکن امینڈا تو خود بھی اس دھماکے میں ماری گئی ہے۔“
”تو پھر؟“

”اگر ہم دھماکے کی پلاننگ اسی کی تھی تو اس نے خود کو دھماکے سے ہلاک ہونے سے بچایا کیوں نہیں؟“
”یہ یاد رہے کہ دھماکے سے قبل وہ سیزھیوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اپنے شوہر کو باز نہیں رکھ سکتی تھی کہ وہ اسے کار میں نہ ڈالے۔ اس کے شوہر کو علم نہیں تھا کہ اس کی کار میں ہم لگا ہوا ہے جو کار کو اسٹارٹ کرنے سے



پہچان

جمال دوستی

جنگ زدہ ماحول کسی بھی انسان کو ذہنی مریض بنا سکتا ہے... وہ طویل عرصے تک عسکری خدمات دیتا رہا تھا... آزاد ماحول میں آئے ہی اسے اپنی پہچان اور شناخت کے مسائل درکار تھے... جو عرصے تک اس کی نظروں سے پوشیدہ رہے تھے... ذہن و دل کی حالت میں تغیرات کی یلغار کا فسانہ عبرت...

اپنی ذات کے سرا رکھوج لینے والے فوجی کا ماجرا.....

میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا میرا باپ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ والدین اپنی اولاد سے نفرت کریں۔ خدا ہی جانتا ہے لیکن اس کے پاس مجھ سے نفرت کرنے کا جواز تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے میں خاصا خود سر اور بد نظیم ہو چکا تھا۔ اسکول سے میری شکایتیں آنے لگیں اور میں قانون شکنی کا مرتکب بھی ہوا۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ جب میری ماں کا انتقال ہوا تو بھی میں بچوں کی حوالات میں بند تھا اور ماں کی تدفین میں

وہ تین مختلف براعظموں میں لڑ چکا تھا اور کئی لحاظ سے میرے لیے باپ جیسا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈیڑی کے مرنے کے باوجود مجھے اپنا کام پورا کرنا ہوگا۔ میں دو جوگی کے الفاظ یاد کر کے اپنی سکراہٹ ندروک سا۔ ڈیڑی کا وقت پورا ہو چکا تھا لیکن دنیا کے کام تو نہیں رک سکتے تھے۔

دو جوئے وہ سکراہٹ دیکھ لی۔ اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں فوراً گھر جانا چاہیے، وہاں تمہاری ضرورت ہے۔“

”میں جا کر کیا کروں گا؟“ میں نے کہا۔

”وہی جو اس موقع پر ایک بیٹا کرتا ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے۔ میرے لیے زیادہ اہم یہ تھا کہ اپنے ہدف کے آنے سے پہلے واپس پہاڑوں پر چلا جاؤں لیکن دو جو مجھ سے متفق نہیں تھا۔

”یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ بیو ماؤنٹ۔ میں نے پہلے ہی تمہاری جگہ دوسرا آدمی بھیج دیا ہے۔ اپنا سامان باندھو اور روانہ ہو جاؤ۔ تم سے ایک ماہ بعد ملاقات ہوئی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی نہ ہو۔“

مجھے مجبوراً اس کا حکم ماننا پڑا۔ سامان باندھا اور ایک طویل سفر طے کر کے اپنے آبائی شہر لیکو ما پہنچ گیا۔ انرپورٹ دیکھنے میں پہلے سے دگنا اور کافی مصروف لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی بہن کو اسی میل کے ذریعے اطلاع کر دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی لیکن وہ وہاں نہیں تھی بلکہ میں نے اپنے کسی جاننے والے کو بھی نہیں دیکھا لیکن ایک چہرہ مجھے جانتا تھا۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملیں، سیاہ چشمہ لگائے، سیاہ بالوں والی ایک دبلی پتلی عورت تھی۔ جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا وہ میری طرف لپکتی ہوئی آئی۔

”سارجنٹ بیو ماؤنٹ۔ میں بیوری ڈیوس ہوں۔“ اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا تعلق کیپ مینارڈ کے پرسنل سیکشن سے ہے۔ ہمیں تمہارے باپ کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ کیا تمہارے ساتھ کچھ سامان ہے؟“

”نہیں صرف یہی ہے۔“ میں نے اپنے شولڈر بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”ان حالات میں واپس آنے والے سپاہیوں کو ہماری طرف سے مدد فراہم کی جاتی ہے۔“ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”ان دنوں یہی طریقہ کار ہے لیکن مجھے

شرکت کے لیے ڈیڑی کو میری ضمانت کروانا پڑی۔ ہمارے درمیان امن قائم ہونے کا یہ آخری موقع تھا جو ماں کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

میں اسی ہفتے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میری بنیادی تربیت فلکیاس میں ہوئی پھر مجھے افغانستان بھیج دیا گیا۔ اب میں ایک ناراض اور مایوس نوجوان کے بجائے ایک سخت گیر فوجی بن چکا تھا جو اپنے دشمنوں سے کوئی رعایت نہیں کرتا تھا۔ تین مرتبہ پہاڑیوں کا طویل سفر کرنے اور دو ہشت گردوں سے لڑنے کے بعد میں نے دنیا کو بالکل مختلف انداز سے دیکھنا شروع کر دیا بلکہ اب مجھے اپنا باپ بھی پہلے سے مختلف نظر آنے لگا تھا لیکن یہ بات میں نے اسے پہلے کبھی نہیں بتائی۔ اس دوران میں چند مرتبہ چھٹیوں پر گھر آیا لیکن وہ اپنا ٹرک لے کر کسی دور دراز سفر پر گیا ہوا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھے نظر انداز کر رہا ہو۔

میں اسے الزام نہیں دیتا اور نہ ہی مجھے اس بارے میں کوئی پریشانی تھی۔ جوانی میں ہر کوئی اپنے آپ کو صحیح سمجھتا ہے لیکن آنے والے وقت کا کسی کو پتا نہیں ہوتا۔ مجھے بھی اس کی موت کی اطلاع چار دن بعد ملی۔ مشکل کی شب مشی کن ہائی وے پر میرے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہوا اور مجھے کی صبح یہ خبر مجھ تک پہنچی۔ میں افغانستان کے صوبہ ہلمند میں ایک پہاڑ کی چوٹی میں چھپا ہوا ایک طالبان کمانڈر کا انتظار کر رہا تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ مجھے وہاں سے فوراً واپس آنے کا حکم مل گیا۔

سارجنٹ بیرک کے باہر ہی میرا انتظار کر رہا تھا اور اس کے چہرے سے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ پہلے تو میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا خبر ہو سکتی ہے لیکن جب اس نے انتقال کا لفظ استعمال کیا تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ تمہارے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ سارجنٹ دو جوگی نے مجھے ایک اخبار کا تراشہ دکھا جس میں جلا ہوا ٹرک ایک طرف الٹا پڑا ہوا تھا۔ میرے لیے اس خبر کو سننا بہت مشکل تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ پر قابو پایا اور اس کا شکر یہ ادا کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا ہدف عموماً رات کے وقت اپنی بیویوں سے ملنے اور سودا سلف دینے اپنے گاؤں آیا کرتا تھا۔ اس کی آمد دو دن بعد متوقع تھی اور مجھے اس کا انتظار کرنے کے لیے اپنی تیاری کرنا تھی۔

دو جوگی میرے پیچھے آیا اور مجھ پر اس طرح ناراض ہونے لگا جیسے کبھی ماضی میں میری اسکول بچہ ہوا کرتی تھی۔

پہچان

ہوئے بولا۔ ”کیسا محسوس کر رہے ہو لڑکے؟ شاید تم مجھے نہیں پہچانتا؟“

میں خاموش رہا تو وہ بولا۔ ”سڈ کیلس۔“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں بعض اوقات تمہارے ڈیڑی کی کومینٹوں میں لے جاتا تھا۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”پھر تو تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے جو ایک طرح سے ٹھیک نہیں۔“

”وہ کیوں؟“

”کیونکہ مقامی لوگوں کے لیے یہ بہت آسان ہو جائے گا اگر تم چند چیزیں بھول جاؤ۔ جیسا کہ تمہارے باپ نے گزشتہ چند ماہ میں تمہیں بتایا ہو گا۔ وہ کتنا خطرناک کام کر رہا تھا۔“

”خطرناک کام؟“

”تم نے زیادہ عرصے ملک سے باہر گزارا لیکن یہیں بے پلے بڑھے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بہت سے لوگوں کا گزارا کس طرح ہوتا ہے۔“

میں نے سر ہلا دیا۔ مٹی میں کینڈا کی سرحد کا زیادہ حصہ ایک تصوراتی لائن پر مشتمل تھا جو جیل کی یہ میں چھٹی گئی تھی جبکہ خطی سرحد عود کرنے کے کئی راستے تھے جہاں نہ کوئی چیک پوسٹ تھی اور نہ ہی کوئی کاغذی کارروائی ہوتی تھی۔

”کیا پاپا سرحد کے پار جاتے تھے؟“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہی اس سوال کا جواب ہے اگر کوئی تم سے اس بارے میں پوچھے تو لاعلمی ظاہر کرنا۔“

”بالکل۔“ میں نے کہا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ڈیڑی کیا کر رہے تھے۔ لیکن میرا ارادہ اس بارے میں جاننے کا تھا۔ کیلس اپنے کچھ دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ باتیں کرنے کے دوران ان میں سے دو نے مجھے ترجمانی نظروں سے دیکھا جیسے میرا چہرہ یاد کر رہے ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ انہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

میں کمرے کے عقبی حصے میں کھڑے ہو کر لوگوں کو دیکھنے لگا۔ ان کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ غالباً تیس چالیس لوگ تو ہوں گے۔ زیادہ تر نے فلائین کی قمیصیں اور جینز پہن رکھی تھیں جبکہ کچھ بوڑھے ڈھیلے ڈھالے سوٹوں میں لباس تھے۔ میں ان میں سے چند ایک کو بھی پہچانتا تھا جبکہ زیادہ تر چہرے اجنبی تھے۔ بہت سے لوگوں کو میں بھی یاد نہیں تھا یا پھر وہ میرے اور ڈیڑی کے اختلافات کے بارے میں جانتے

لہذا ہے کہ کچھ دوسرے مسائل بھی سامنے آئے ہیں۔“

”کیسے مسائل؟“

”ابتداء میں بتایا گیا کہ تمہارے باپ کی موت ایک حادثہ تھی لیکن اب یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کوئی ڈبکتی کی واردات تھی جو ناکام ہوئی۔ اس صورت میں پولیس تم سے بھی پوچھ سکتی ہے۔“

”کیسی پوچھ کچھ؟ میں تو یہاں موجود نہیں تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”بہر حال تم ایک ناخوشگوار صورت حال میں گھر واپس آئے ہو اور میں یہاں تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں۔“

”کیسی مدد؟“

وہ اس سوال پر حیران ہو گئی۔ ”باپ کی موت بہت بڑا صدمہ ہے اور تمہیں اسے برداشت کرنا ہے۔“

”دیکھو خاتون، مجھے اپنے باپ سے بات کیے ہوئے کئی برس ہو گئے۔ مجھے اس کی تدفین میں شرکت کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس لیے آگیا لیکن شاید اس کے فوراً بعد ہی واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے کسی گنہگار کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن تمہیں ایک ڈرائیور کی ضرورت تو ہو گی۔ تم نے زیادہ وقت محاذ پر گزارا ہے سارا جنٹ اور تمہارے لائسنس کی میعاد گزشتہ سال ختم ہو چکی ہے۔ تم کرائے پر بھی گاڑی حاصل نہیں کر سکتے جبکہ ٹھوڑی دیر بعد تمہارے باپ کی آخری رسومات شروع ہونے والی ہیں۔ کیا تم لباس تبدیل کرنا چاہو گے؟“

”وہ کس لیے؟“

”شاید وہ موقع کی مناسبت سے زیادہ موزوں ہو۔“ اس نے خود بھی ماتمی لباس یعنی سیاہ اسکرٹ اور سیاہ چیکٹ پہن رکھی تھی جبکہ میرے جسم پر چمڑے کی جیکٹ اور جینز تھی۔

”میرا باپ ٹرک ڈرائیور تھا۔ اسے سیاہ سوٹ اور ٹائی کہاں نصیب ہوئی؟“

الگو میں تجویز و تنقید کے دو مراکز تھے۔ دریا کے دونوں کناروں پر رہنے والوں کے ایک ایک مرکز مخصوص تھے۔ ہماری طرف والے کا کرایہ کم تھا اور میرے ڈیڑی والے تھے۔ پاکم ازم میں نے یہی فرض کر لیا تھا۔ تاہم بند تھا۔ اس میں کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے باکس پر ہاتھ رکھا اور کسی جذبے کے محسوس ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک عمر رسیدہ اور بھاری بھرکم شخص سیاہ سوٹ میں لباس میرے پاس آیا اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے

”کیا ہوا؟ کیا تم نے کوئی دلچسپ منظر دیکھ لیا؟“
جولین نے پوچھا۔
”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دراصل مجھے چرچ گئے
ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔“

”ہاں، کافی عرصے تک تمہاری کوئی خبر نہیں ملی۔“ اس
نے کہا۔ ”اور شاید اگلی بار تم اس سے بھی زیادہ عرصے کے
لیے غائب ہو جاؤ۔ اس لیے میں تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں۔“
یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک چیک بک نکالی
اور مجھے پڑا دی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں
ساتھ ہزار ڈالر سے زیادہ رقم موجود تھی۔
”یہ کیا ہے؟“

”پاپا کی بچت۔“ جولین نے جواب دیا۔ ”جو کچھ تم
بھیجتے رہے۔ وہ سب انہوں نے تمہارے لیے بچا کر رکھا
تاکہ جب تم گھر واپس آؤ تو تمہیں ایک معقول رقم مل
جائے۔“
”دفعہ کرو جولین۔ میں نے یہ پیسے اس لیے بھیجتے
تھے کہ تم لوگ ایک بہتر زندگی گزار سکو، تمہارے تعلیمی اخراجات
پورے ہوتے رہیں اور.....“

وہ بات کانٹے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے پیسوں
کی ضرورت نہیں تھی جوش۔ تمہارا بیجا ہوا ایک خط اس چیک
سے زیادہ اہم تھا اور تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ مجھے
سرکاری وظیفہ مل گیا تھا اور میں دو سال پہلے اعزازی نمبروں
سے گریجویشن کر چکی ہوں لیکن تمہیں یہ بات بھی معلوم نہیں ہو
گی کیونکہ تم رابطہ میں نہیں تھے۔“
”تمہارے بھائی کو فرائض کے سلسلے میں اکثر دور
دراز علاقوں میں جانا پڑتا تھا جہاں رابطہ بہت مشکل تھا۔“
ڈیوس نے ایک بار بھر مداخلت کی۔

”بھائی سے رابطہ اس وقت بھی مشکل تھا جب ہم ایک
کمرے میں رہتے تھے۔“ جولین نے جھلاتے ہوئے کہا۔
”کیونکہ تم اسے نہیں جانتیں۔ اس لیے خاموش رہو اور ہمیں
بات پوری کرنے دو۔ جوش! تم نے کتنے عرصے سے پاپا کو
نہیں دیکھا تھا؟“

”کئی سال ہو گئے۔“ میں نے اعتراف کیا۔
”دراصل مجھے اپنے باپ سے ملے ہوئے چھ سال ہو
گئے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب میں گھر آیا تو وہ ایک ہفتے کے
لیے ٹائریاں جارہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے درمیان
کیا گفتگو ہوئی لیکن اس وقت بھی ہمارے تعلقات خوشگوار
نہیں تھے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ ہم نے ہاتھ بھی ملایا تھا یا

تھے۔ ان میں سے چند ایک نے آکر مجھ سے ہاتھ ملایا اور
اظہار ہمدردی کیا۔ لیکن کسی نے بھی زیادہ بات نہیں کی اور یہ
ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ
وہ کون تھے۔

”جوش۔“ ایک نوجوان عورت مجمع سے نکل کر میرے
پاس آئی۔ مجھے اسے پہچاننے میں بالکل دیر نہیں لگی۔ وہ
ہو بہو میری ماں کی ہم شکل تھی۔
”جولین۔“ میں نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے
کہا۔ ”کیسی ہو بہن؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم
وقت پر پہنچ گئے اور تھوڑی سی حیرانی بھی۔ تمہیں دیکھے ہوئے
کانی عرصہ ہو گیا۔ کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟“

”ایک شریک کار۔“ مس بیورلی نے اپنا ہاتھ آگے
بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بیورلی ڈیوس۔“ میرا تعلق کیمپ مینارڈ
سے ہے۔ مجھے تمہارے نقصان پر بہت افسوس ہے۔“
”مجھ سے زیادہ بھائی کا نقصان ہوا۔“ وہ میرا ہاتھ
پکڑتے ہوئے بولی۔ ”تم نے تو مجھے پہچانا ہی نہیں۔“
”کانی عرصہ ہو گیا۔“ میں نے اقرار کرتے ہوئے
کہا۔ ”تم بڑی ہو گئی ہو۔“

”ہم نے چار سال سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں
سنا۔ میری شادی ہو چکی ہے اور دو بچے بھی ہیں۔ میں نے
تمہیں خط بھی لکھا تھا۔“

”مجھے تمہارا خط مل گیا تھا۔ میں نے تمہیں ایک چیک
بھی بھیجا تھا۔“
”ہاں، اور میں نے تمہیں شکریے کا خط لکھا لیکن وہ تم
تک نہیں پہنچ سکا اور واپس آ گیا۔“

”دنیا کے ہر خطے میں ڈاک کا ادھر ادھر ہونا کوئی غیر
معمولی بات نہیں۔“ ڈیوس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔
”کیا میں یقین کر لوں کہ تم دونوں شادی شدہ نہیں
ہو؟“ جولین نے پوچھا۔ ”تم میرے بھائی کی طرف سے
بول رہی ہو جبکہ میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو۔“
پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”جوش! کیا ہم
ایکے میں بات کر سکتے ہیں؟“

”اس طرف ایک عبادت گاہ ہے۔“ ڈیوس نے کہا۔
”ہم اس کے ہمراہ ہال عبور کر کے برابر والے کمرے
میں پہنچے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سامنے ایک دروسٹم اور کرسیوں
کی چھ قطاریں تھیں اور دروسٹم پر ایک صلیب بنی ہوئی تھی۔ نہ
جانے کیوں میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔“

نہیں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ بغل گیر نہیں ہوئے تھے۔
”کیا تم نے ان چند برسوں میں پایا کو کوئی خط لکھا یا
نیک خواہشات کا کارڈ بھیجا؟ وہ بیمار تھے۔ کیا تمہیں یہ معلوم
تھا؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”انہیں لیبیل کا سرطان تھا اور ان کا مرض آخری اسٹیج
میں داخل ہو چکا تھا۔ اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تب بھی وہ موت کے
قریب پہنچ چکے تھے۔“

میں نے وہ چپک چپک اس کے ہاتھ پر رکھی اور کہا۔
”میں نے یہ رقم بچت کے لیے نہیں بھیجی تھی جو میں بلکہ میں گھر
والوں کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔“

”ہم فیملی نہیں ہیں جوش، گھر والے ریلے میں رہتے
ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ ہماری فیملی تو ختم ہو چکی۔
اس گھرانے کا سربراہ برابر والے کمرے میں لفن دفن پہنے
لیٹا ہوا ہے۔ میں یہ رقم تم سے اگلی ملاقات ہونے تک اپنے
پاس رکھ لیتی ہوں۔ تمہارا قیام کہاں پر ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ اپنے گھر پر ہی رہوں گا۔“
”اس کے لیے تمہیں پولیس کے پاس جانا ہو گا۔
انہوں نے اسے سیل کر دیا ہے۔ پورے گھر کی تلاشی لی۔ ہر
چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔“

”کیوں؟ وہ کیا ڈھونڈ رہے تھے؟“
”میں نہیں جانتی۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔
”شاید انہیں کوئی ثبوت چاہیے، کیا تم ایک مہربانی کرو گے؟“
”بالکل، کہو کیا بات ہے؟“

”کیا تم یہاں ہونے والے واقعات سے منٹ سکتے
ہو۔ میرا شو ہر ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ میں
اپنے بچوں کو پڑوس میں چھوڑ کر آئی ہوں اور.....“

یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔ اس کی آواز میں ارتعاش
تھا۔ میں اسے تسلی دینا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں پڑی۔ نہ
جانے اس کا رد عمل کیا ہوتا۔

”میں یہاں کے معاملات دیکھ لیں گے۔“ ڈیوس نے
کہا۔ ”تم گھر جاؤ جو لین۔ بچوں کے پاس۔“

”شکریہ۔“ جو لین نے کہا۔ ”جب یہاں سے فارغ
ہو جاؤ تو جیری اور اپنے بھانجوں سے ملنے ضرور آنا۔ اب ہم
اسی تمہارے اپنے ہیں۔“

”یقیناً۔“ میں نے کہا۔ اس نے میرا ہاتھ چوما اور ایک
ٹارڈ دیتے ہوئے بولی۔ ”اس پر میرا پتا اور فون نمبر موجود
ہے۔ وقت مل جائے تو فون کرنا۔“

”ضرور۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے گہری سانس لی اور مسکراتے
ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔“

وہ عبادت گاہ سے باہر نکلی اور تیزی سے ان پولیس
دالوں کے پاس سے گزرتی ہوئی چلی گئی جو اسی وقت اندر
داخل ہوئے تھے۔ وہ دونوں یونیفارم میں اور سرخ تھے۔ ان
میں سے بڑے کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا منہ
شکاری کتے جیسا تھا جبکہ دوسرا دلا پتلا اور کم عمر تھا۔

”مشربہ ماؤنٹ۔“ بڑی عمر والے نے کہا۔ ”میرا نام
کیپٹن اسنڈر ہے اور یہ میرا ساتھی کارپورل بلیک تھرون
ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مناسب وقت نہیں ہے لیکن ہم تم
سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

”کس بارے میں؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے ڈیڑی اور ان کے حالات.....“

”اور ان کے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں بھی۔“
چھوٹے نے لقمہ دیا۔

”اگر تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چل سکو۔“

اسنڈر نے کہا۔ ”اس میں صرف چند منٹ ہی لگیں گے۔“
”اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ بیورلی ہمارے
درمیان آتے ہوئے بولی۔ ”سارجنٹ بیماؤنٹ امریکی فوج
کا حاضر سروس رکن ہے اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ سول
حکام کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے اپنے وکیل سے
قانونی مشاورت کرے۔“

”خاتون، اس معاملے میں فوج کو کھینچنے کی ضرورت
نہیں۔“

”کیپٹن، میرا عہدہ میجر کا ہے۔“ ڈیوس نے پھاڑ
کھانے والے انداز میں کہا اور اپنا شناختی کارڈ اس کے
سامنے لہرایا۔ ”میجر بیورلی ڈیوس۔ آری سی آئی ڈی۔ تمہیں
معلوم ہونا چاہیے کہ سارجنٹ بیماؤنٹ انسانی ہمدردی کی بنیاد
پر گھر آیا ہے اور.....“

”رک جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”یہ فوجی معاملہ نہیں اور نہ
ہی میں تمہارا ماتحت ہوں۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب
دوں گا اسنڈر لیکن مفت میں نہیں۔ ہمیں ایک سودا کرنا ہو گا۔
تم مجھے بتاؤ گے کہ میرے باپ کے ساتھ واقعہ کیا ہوا پھر
میں وہ سب کچھ بتا دوں گا جو اس کے بارے میں جانتا
ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اسنڈر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا بتایا گیا ہے؟“

”مرنے کے اس سے بھی زیادہ برے طریقے ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ٹرک میں ہی زندہ جل جاتا۔ کتنی گولیاں چلائی گئی ہیں؟“
”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ایک درجن یا اس کے

لگ بھگ۔“
”واقعی؟“

”ہم نے جائے وقوعہ سے ہتھیار برآمد کر لیا ہے۔“
بلیک تھرون نے کہا۔ ”اب میں سمجھتا ہوں کہ جواب دینے کا بار میری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ چار سال سے یہاں نہیں تھا اور میری اپنے باپ سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے بھی آتے جاتے تھے، ہم ایک دوسرے کو ہیلا خدا حافظ کہا کرتے تھے۔ بس میں اتنا ہی بڑھ سکتا ہوں۔“

”تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟“ بلیک تھرون ناراض ہوتے ہوئے بولا۔

”میں نے یہ نہیں کہا۔ جہاں میں رہ چکا ہوں۔ وہاں سو کر اور بڑکشی کے ساتھ ساتھ ہائی جینک بھی قوی کھیل رہے۔“

”کیا کہا تم نے۔ بڑ.....؟“

”بڑکشی۔ یہ پولو کی طرح کا کھیل ہوتا ہے لیکن اس میں گھڑ سوار گیند کے بجائے مری ہوئی بھیڑ کے لیے لڑتے ہیں اور وہاں سے دھواں اٹھ رہا ہوتا ہے۔ جب وہ سامان سرحد سے تیس میل دور تھا تو اسے ایک گھٹنا بوجھ کیڑا بھیج دیا گیا اور تم دونوں یہ بات جانتے ہو جو تم مجھے نہیں بتا رہے؟“

”تمہارا باپ ٹرک چلاتا تھا لیکن اس کے بینک اکاؤنٹ میں ساٹھ ہزار ڈالر سے زیادہ کی رقم موجود ہے۔“

اسنیڈرنے کہا۔ ”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس نے یہ رقم کہاں سے حاصل کی؟“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اسے یہ رقم کہاں سے ملی۔ یہ اسے ایک نامعلوم ٹرسٹ کی جانب سے بھیجی گئی تھی اور یونٹ نے اسے میرے لیے جمع کیا تھا۔“

”نامعلوم ٹرسٹ کیوں؟“ اسنیڈرنے پوچھا۔

”جب میں اسے نقد رقم کے چیک بھیجتا تو وہ انہیں واپس بھیج دیتا تھا۔ اس لیے اگر تم سمجھ رہے ہو کہ اس کی کوئی ناجائز کمائی تھی تو یہ غلط ہے۔ اسے رشوت لینے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے ناجائز پیسا کمایا۔ شاید اسی لیے اسے مار دیا گیا۔“

”مجھے افغانستان میں بتایا گیا کہ میرے ڈیڈی کا ایک حادثے میں انتقال ہوا لیکن یہاں منیجر کا کہنا ہے کہ یہ ایک ڈکیتی بھی ہو سکتی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا؟“

”سب سے پہلے کاؤنٹی کا ایک عہدیدار وہاں پہنچا اور اسے ایک حادثہ قرار دے دیا۔“ اسنیڈرنے کہا۔ ”یہ واقعہ بیک کاؤنٹی میں پیش آیا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک درخت سے پہلے سے ٹرک کے درمیان.... پڑا ہوا تھا۔ تمہارے ڈیڈی نے اس سے بچنا چاہا لیکن کنٹرول کھو بیٹھے۔ جس کے نتیجے میں ٹرک ایک کھجے سے ٹکرایا اور اسی میں ڈگ لگ گئی۔“

”یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟“
”ایسکو ما کے شمال میں تقریباً چالیس میل دور۔ کاؤنٹی لائن کے قریب۔“

”سرحد کے نزدیک؟“

”ہاں۔ زیادہ دور نہیں۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”اس کے ٹرک میں کیا سامان لدا ہوا تھا؟“

”اسنیڈرنے ہنسیکھاتے ہوئے کہا۔ ”دوا میں۔“

”لیکن اسپرین نہیں؟ تمہارا مطلب تیز دواؤں سے ہے۔ کس قسم کی دوا میں تھیں؟“

”آکسی کوٹین۔“ اسنیڈرنے اعتراف کیا۔ ”ہائیدرو

کوڈون اور اسی کلاس کی چند دوسری دوا میں۔“

”کیا یہ سامان بھی ٹرک کے ساتھ ہی نذر آتش ہو گیا؟“

”ہمیں ابھی تک اس کا یقین نہیں ہے۔ تمہارے

باپ کا ٹرک پورا جل گیا۔ مقامی پولیس اس کی راکھ کا کیمیائی تجزیہ کر رہی ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اور میرے ڈیڈی؟“ میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

”کیا وہ زندہ تھے جب ٹرک میں آگ لگی؟“

”ہم نے ابھی تک یہ معلومات کسی کو نہیں دیں۔“

اسنیڈرنے کہا۔ ”یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے گی۔“

ٹھیک ہے؟“

”اس کا انحصار..... ڈیوس نے کہا شروع کیا۔“

”تم اس سے دور ہو منیجر۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ذاتی

معاملہ ہے۔“

”ٹرک کے جلنے سے پہلے ہی تمہارے باپ کی موت

واقع ہو گئی تھی۔“ اسنیڈرنے کہا۔ ”کسی نے اس کے سر میں

گولی مار دی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ مجھے افسوس

ہے۔“

ہے۔“

”ایک اور سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”کیپ ہٹارڈ اب ایک اسپتال میں تبدیل ہو چکا ہے۔“ اسنڈر نے وضاحت کی۔ ”جہاں زخمی فوجیوں اور دوسرے لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔“

”ذہنی مریض۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”شاید وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی پاگل پن کا مظاہرہ کرے۔“

”وہ ایسا کیوں کرے گا؟“

”جیسا کہ تم نے کہا کہ ہم دونوں حال ہی میں افغانستان سے آئے ہیں اور تم تو جانتے ہو کہ وہاں سے آنے والے بالعموم ذہنی مریض ہوتے ہیں۔“

لیٹکو ما کا پولیس اسٹیشن کاؤنٹی کورٹ ہاؤس کے تہ خانے میں تھا۔ کنکریٹ کی دیواروں پر سلیٹی رنگ کیا گیا تھا۔ وہاں چند پرانی لوہے کی میزیں رکھی ہوئی تھیں اور چھ دیوار میں چار کوشطریاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دو کوشطریوں میں قیدی نظر آ رہے تھے ان میں سے ایک نیلے سوٹ میں بیٹھ کر دھاریاں مٹا رہا تھا۔ وہ کافی خوف زدہ اور بیمار لگ رہا تھا۔ غالباً اس پر کوئی سنجیدہ نوعیت کا الزام تھا۔ سامنے والی کوشطری میں بچہ جینز اور ڈنیم کی جیکٹ پہنے ہوئے موجود تھا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا اور دو جگہ زخموں پر نائکے لگے ہوئے تھے جبکہ دائیں آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں اس کی کوشطری کی طرف بڑھا تو اسنڈر نے کہا۔ ”زرد لائن سے پیچھے رہو سارجنٹ۔ اس کے قریب جانے کی ضرورت نہیں اور اونچی آواز میں بات کرو تا کہ ہم بھی سن سکیں کہ یہ کیا کہتا ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟“

”بچہ چرڈ۔“ بلیک تھرون نے کہا۔ ”میں تمہیں اس کا سیریل نمبر بھی بتا سکتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے حوالات کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں کس نام سے پکاروں دوست کیونکہ تم یقیناً بچہ چرڈ نہیں ہو۔ ہمیں تربیت کے دوران ایسے ہی فرضی نام دیے جاتے ہیں۔ تمہارے ساتھی کس نام سے پکارتے تھے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے لگا کہ دیوار سے

”تمہارے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے کہاں سے آئے؟“ اسنڈر نے پوچھا۔ ”تم کس یونٹ میں تھے؟“

”سارجنٹ کو انجیل آپریشن دیا گیا تھا۔“ ڈیوس نے کہا۔ ”اس سے زیادہ بتانا ممکن نہیں۔ اس کے لیے تمہیں اوپر سے اجازت لینا ہوگی۔ اس کے علاوہ کچھ اور پوچھنا ہے؟“

اسنڈر اور بلیک تھرون نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسنڈر نے کندھے اچکا دیے پھر بلیک تھرون مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”سارجنٹ! ایک اور بات۔ ہم نے ایک مشتبہ شخص کو اپنی تحویل میں لیا ہے۔ اس کا نام بچہ چرڈ ہے۔ کیا تم نے بھی یہ نام سنا ہے؟“

”میں کیوں سنوں گا؟“

”وہ چھ ماہ قبل افغانستان سے آیا ہے۔ شاید تم اسے یہاں سے جانتے ہو۔“

”ہزاروں فوجی وہاں تعینات ہیں اور وہ بہت بڑا لگ ہے۔ یہ شخص کہاں تعینات تھا؟“

”یہ اس نے نہیں بتایا۔“

”لیکن تم مجھے ہو کہ اس کا میرے باپ کی موت سے کوئی تعلق ہے۔“ میرا الجھ قدرے سہا گیا لیکن بیورلی نے اس میں جچھی ہوئی کئی کوشٹوس کر لیا۔ وہ میرے سامنے آتے ہوئے بولی۔

”تمہیں اس معاملے میں سوچ بچار کرنے کی رورت نہیں ہے۔ یہ پولیس کا مسئلہ ہے۔ اسے ان پر چھوڑ دو۔“

”میں پریشان نہیں ہوں مگر لیکن مجھے اس بارے میں جیس ہے۔ بچہ کیا کہانی ہے کیپٹن؟“

”وہ بے گھر ہے اور کئی مہینوں سے سڑکوں یا سایہ دار ہوں پر رہ رہا ہے۔“ اسنڈر نے کہا۔ ”دیکھنے میں بے رملوم ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ اس کا کوئی پس منظر ہو۔ م کی شب ہم نے اسے جانے حادثہ سے چند میل کے ملے پر ایک تباہ شدہ کار میں پایا۔ لگتا ہے کہ اس نے چرائی لی نشہ آور دوا لی اور کار میں جا کر لیٹ گیا۔ ہم امید رہے تھے کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ کچھ بتائے گا۔“

”پھر اس نے کچھ بتایا؟“

”صرف اپنا نام، عہدہ اور سیریل نمبر۔“ اسنڈر نے

”اس نے کیپ ہٹارڈ فون کر کے وکیل کے لیے کہا تھا

اسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ شاید وہ اس کی

اپنی کر رہے ہیں۔ شاید یہ ایک اور پاگل پن کا کیس

باتیں کر رہا ہوں۔ البتہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔
 ”ٹھیک ہے۔ تم مجھ سے بات مت کرو چڑ، صرف میری بات سنو، جب تمہیں عقل آئے گی اور محسوس کرو کہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے بولنا ضروری ہے۔ اس وقت میرے علاوہ کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ ہم دونوں آپریشنل آپریشن میں کام کر چکے ہیں۔ اس لیے تم جانتے ہو کہ میں راز کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

اس نے روکھے پن سے اپنا سر ہلایا اور زور سے جھنجھری لی جیسے وہ مجھے کچھ بتا کر کسی قانون کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس کے اس انداز نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔

”یہ آخری موقع ہے دوست۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کچھ بتا دو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے اپنے تک ہی رکھوں گا۔“
 اس نے اپنے سر کو نیچر کا کیا اور مجھے تجسس سے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔ وہ مجھے یا کسی اور کو کچھ نہیں بتائے گا اور اس سے پہلے ہی مر جائے گا۔

میں نے دل میں کہا کہ دفع کرو اور اپنا منہ پھیر لیا۔
 ”ووف؟“ اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔
 میں واپس مڑا۔ ایک لمحے کے لیے ہماری نظریں ملیں اور اس نے تائید میں سر ہلادیا۔
 ”یہ کیا تھا؟“ اسنیڈر نے پوچھا۔ ”اس نے کچھ کہا؟“
 ”میں نے کچھ نہیں سنا۔“ میں نے کہا۔ ”رچرڈ کیا تم نے کچھ کہا؟“

لیکن وہ میرے عقب میں کھڑی ڈیوس کو غصے سے دیکھ رہا تھا پھر اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”میجر!“
 ”تم میجر سے بات کرنا چاہتے ہو؟“ اسنیڈر نے پوچھا۔ ”ہم اس کا انتظام کر سکتے ہیں۔“
 لیکن رچرڈ سلاخوں سے پیچھے ہٹ چکا تھا۔ وہ اپنی کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں رانوں پر رکھ کر گنگنا شروع کر دیا۔ جب ہم واپس ہونے لگے تو اس نے ہمیں دیکھا تک نہیں۔
 ”اس نے تم سے کیا کہا تھا؟“ اسنیڈر نے دوبارہ پوچھا۔
 ”کچھ نہیں۔“

”کیا ہم واپس چرچ چلیں؟“ ڈیوس نے پارک لائٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے پوچھا۔
 ”دکس لیے؟“

”چند منٹوں بعد رسومات شروع ہونے والے ہیں۔“
 ”وہاں کسی کو میری کمی محسوس نہیں ہوگی۔ کم از کم ڈیڈی کو تو بالکل نہیں۔ کیا تم جانتی ہو کہ یہ حادثہ کس جگہ ہوا تھا؟“

”ہاں، مجھے وہ جگہ معلوم ہے۔“
 ”بہت اچھے۔ مجھے وہاں لے چلو۔“
 ”جائے وقوع پر، کیوں؟“
 میں جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہا۔ میری نظروں کا منہ ہوم سمجھ گئی۔

”کیا کوئی گزربڑے سار جٹ؟“
 ”لچ نے تمہارا نام لے کر پکارا تھا۔“
 ”وہ واضح طور پر ناقابل اعتبار ہے۔“
 ”تمہاری عمر کتنی ہے میجر؟“
 ”میں کچھ سمجھی نہیں۔“
 ”یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے۔“
 ”یہ اتنا شائستہ بھی نہیں۔“

”کسی نے میرے باپ کے سر میں گولی مار دی خاتون۔ ہم شائستگی کی حدود پار کر چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تمہاری عمر تین کے لگ بھگ ہے اور اس عہدے کے لیے تم بہت چھوٹی ہو۔ تم ابھی لیفٹیننٹ سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔ تمہارے پاس ضرور کوئی اعلیٰ ڈگری ہوگی۔“

”میں نے نفسیات میں بی ایچ ڈی کیا ہے۔ مائٹ فارنسک سائیکالوجسٹ ہوں۔ میں نے پوسٹ ٹرائیننگ اسٹریس ڈس آرڈر میں اسپیشلائز کیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔ ہماری یونٹ کے لوگوں کو ہر تین دن بعد اس مرحلے سے گزرنا ہوتا تھا۔ مجھے ہمیشہ ڈیوٹی جانے کے لیے کیئرٹنس مل گئی اور مجھ سے کبھی اس بارے میں سوالات نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ بار میرے آنے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔“

ڈیوس ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہارا ریکارڈ دیکھ لیا تھا جو کہ مثالی ہے۔ تمہارے کپتان کا کہنا ہے کہ بہترین فائبر ہو لیکن بہت زیادہ دباؤ کی کیفیت میں کم آ رہے ہو۔“

”دباؤ نہیں غم۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”مگر کسی دوست

بولاً۔ ”اودھ میرے خدا! تم اسی لیے میرے ساتھ ہو۔ تمہیں ڈر ہے کہ کہیں میں بھی بیلاگان نہ بن جاؤں۔“

”بیلاگان؟ یہ تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟“

”جنگ میں استعمال ہونے والے کتے۔ یہ غیر معمولی صلاحیت اور جارحانہ مزاج رکھتے ہیں۔ ایک بار ان کے منہ کو خون لگ جائے تو یہ مائل ہو جاتے ہیں اور انہیں انجنیوں بالخصوص بچوں کی موجودگی میں پٹا ڈال کر کرکھڑپاتا ہے۔“

”مجھے اب تک اس کے بھونکنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسا مذاق تھا؟“

”بات یہ ہے کہ جب ایک کتے کو سنبھالنے والے کا کام ختم ہو جائے تو وہ واپس امریکا آ جاتا ہے اور اس کا کتا کسی دوسرے سپاہی کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور ہم اس کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر کسی اور پر بھروسہ نہیں کرتے۔ تم اسی لیے یہاں آئی ہو کہ ہمیں میں بیلاگن نہ ہو گاؤں۔“

”تم کہتے نہیں ہوسار جنت۔“

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کتنا ہی ہوتا۔ ان کی آنکھیں بہت تیز ہوتی ہیں اور وہ ہم سے کئی گنا بہتر سنتے ہیں۔ اگر بیگانہ کو گولی چلا سکتے تو ہم سب گھر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے۔“

”لیکن تمہارا کوئی گھر نہیں۔“

”نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟“

”آج کل یہی طریقہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں
پاپائی اٹھارہ ماہ تک محاذ پر رہے جبکہ تمہاری یونٹ دس سال
سے افغانستان میں لڑ رہی ہے جس کی وجہ سے جنگ کی
لڑائی جھگڑے، گھریلو تشدد، یہاں تک کہ خودکشی
جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ہم اسی لیے وہاں سے آنے
والوں کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے ہیں جن میں بات
ییت سے لے کر دواؤں کا استعمال تک شامل ہے۔ تم کیونکہ
کامی طور پر یہاں آئے ہو۔ اس لیے تم نے تمام حفاظتی
نظامات نظر انداز کر دیے اور تمہارے باپ کی وردناک
دست کو دیکھتے ہوئے.....“

”گو یا تم کسے کو سنبھالنے والی ہو؟“
 ”بالکل نہیں..... میں صرف.....“
 ”عدو کرنے آئی ہو۔ میں سمجھ گیا۔ یہ بتاؤ کہ اب تک
 مرادویہ کیسا ہے؟“

۶۔ ”اور باپ کی موت.....؟“

”یہ ایک مشکل وقت ہے۔“ میں نے اس کی بات
 سن کر ہنسنے لگا۔ ”لیکن حیرت ہے کہ تم شہری لباس میں
 اس کے باوجود لچے نے تمہیں بھیج کر مخاطب کیا۔ وہ
 تمہیں جان گیا۔ کیا وہ تمہارا مریض رہ چکا ہے؟“
 ”ہاں، کچھ عرصے کے لیے۔“ اس نے اعتراف کیا۔
 ”وہ بہت پہلے وہاں سے چلا گیا تھا۔“
 ”اور تم نے اسے جانے دیا؟“

”وہ اسپتال ہے جیل نہیں جوش۔ کچھ لوگ شہری
ندگی میں ایڈجسٹ ہونے میں وقت محسوس کرتے ہیں۔“
”سچ نے اپنے آپ کو جیل کی کوشٹری میں ایڈجسٹ
کر لیا ہے اور اسے کار کے حادثے میں جوٹیں نہیں آئیں۔
لگتا ہے کہ کسی نے اسے بُری طرح مارا ہے۔“
”پولیس؟“

”نہیں، اس کے ہاتھوں یا بازوؤں پر کوئی خراش یا لکھ نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب اسے پٹیا گیا تو وہ بے ہوش تھا۔ ایسی صورت میں وہ اس کار کو نہیں چلا سکتا تھا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ اسے کسی نے ضرب لگا کر بے ہوش کیا اور اسے جائے حادثہ کے قریب پھینک دیا گیا۔ اسے مٹایا گیا ہے۔“

”بھروسہ کچھ بتا کیوں نہیں رہا؟“
 ”کیونکہ اس کی تربیت ہی اس طرح ہوئی ہے کہ وہ
 راحت کرے اور یقین کرو کہ اسپیشل آپریشنز کی تربیت اس
 فطری کے مقابلے میں کہیں مشکل ہے۔ کیا وہ اسپیشل
 آپریشنز میں رہ چکا ہے؟“

اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ ”ہاں۔“
 ”یہ اسی تربیت کا اثر ہے کہ وہ کچھ نہیں بتا رہا۔“
 ”کیسی بات نہیں ہے۔“ دیوس نے کہا۔ ”اس نے تم سے کچھ کہا تھا۔“

”اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔“
 ”اس نے کتے کے بھونکنے کی آواز نکالی تھی،
 ”کیوں؟“

”جو لوگ طویل عرصے تک افغانستان جیسے محاذ پر
 جتے ہیں۔ ان کے درمیان اس طرح کا مذاق چلتا ہے۔ ہم
 ل جنگ میں لڑنے والے کتوں کی طرح ہی ہیں۔“
 میں کہتے کہتے رک گیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے

اس نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی بلکہ پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ کوئی اہم بات ہے جو وہ مجھ سے جانا چاہ رہی ہے۔ کار کی رفتار آہستہ ہوئی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ہم بیک کاؤنٹی روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ میری نظر ایک درخت کے تنے پر گئی جو ایک کڑھے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جس کی تصویر میں اخبار میں دیکھ چکا تھا۔

”میں روک دو۔“ میں گاڑی سے اتر کر اس جانب چل دیا۔ درخت کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ زمین پر شیشے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں وہاں جا کر رک گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں میرے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل جبکہ کر خشک گھاس پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ میرے ہاتھ میں شیشے کے چند ٹکڑے آ گئے۔

”تم شیک تو ہو؟“ ڈیوس نے میرے قریب آ کر پوچھا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

”زمین کو دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے بڑی صفائی سے کام کیا۔ پہلے درخت کا تنا سڑک کے درمیان میں رکھا اور ایک اونچی جگہ پر درود بین لگا کر بیٹھ گئے جب انہوں نے ڈیڈی کے ٹرک کو آتے ہوئے دیکھا تو ان میں سے ایک نے درخت کے تنے پر پوری لمبائی میں مٹی کا تیل چھڑک دیا اور اسے آگ لگا دی۔ اس طرح سڑک مکمل طور پر بند ہو گئی۔ ڈیڈی کو روک جانا چاہیے تھا لیکن وہ آگ اور دھوئیں سے آگے کچھ نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے کوشش کی کہ جلتے ہوئے درخت سے ہٹ کر ٹرک کو نکال لیں لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار بیٹھے ہوئے تھے۔“

میں نے نظر ہٹا کر دیکھا اور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس جگہ گولی چلانے والا چھپا ہوا تھا جبکہ دوسری جھاڑی میں اس کا ایک اور ساتھی بھی تیار بیٹھا تھا اگر پہلے کا نشانہ چوک جاتا تو وہ گولی چلا دیتا۔“

”تم یہ سب کسے جانتے ہو؟“

میں نے اپنی معمولی کمر اسے جکتے ہوئے شیشے کے ٹکڑے دکھائے۔ ”پولیس نے زیادہ تر ٹکڑے اکٹھے کر لیے لیکن اب بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ ایک سنگل اسپینڈر ویب تھی، جو گولی چلائی گئی اس سے غالباً فوراً ہی ڈیڈی کی موت واقع ہوئی کیونکہ ٹرک سڑک کے کنارے جگ جگہ پر آگے بڑھتا گیا جہاں میدان ختم ہوتا ہے، اگر وہ

ہوش میں ہوتے تو ٹرک کو واپس کھانے تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ ایک طرف لڑھک جاتا۔“

”اور پھر اس میں آگ لگ گئی۔“

”نہیں، اس وقت نہیں۔ ڈیڈی فوراً ہی آگ نہیں پکڑتا۔ پہلے انہوں نے ٹرک کا سامان کسی دوسرے ٹرک میں منتقل کیا جس پر کینیڈا کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی اور جو کہ شیشے کے بغیر سرحد پار کر سکے پھر انہوں نے ڈیڈی کے ٹرک کا آگ لگا دی اور بے چارے سچ کو چند میل دور کھڑی ہو کر کار میں ڈال دیا۔“

”پولیس کا خیال ہے کہ وہ بھی اس میں شامل تھا۔“

”یہی بات تو کچھ بتا یا وہ ملٹری آپریشن جیسا لگتا ہے۔“

”یہی بات تو کچھ میں نہیں آ رہی۔ انہوں نے درخت گرانے کے لیے سی فور کا استعمال کیا پھر انہوں نے فوراً اسلحہ اور بارود استعمال کیا جس کا آسانی سے سراغ لگایا جاسکتا ہے جبکہ وہ کوئی نامعلوم شکار یا بندوق بھی استعمال کر سکتے تھے۔ انہوں نے قانون کی توجہ حاصل کرنے کے لیے سرحد سے کچھ فاصلے پر ٹرک کو آگ لگائی اور آخر میں پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے سچ کو وہاں چھوڑ دیا۔“

”لیکن تمہیں کسے معلوم ہوگا وہ.....“

”کیونکہ سچ اچھل آپریشن میں رہ چکا ہے۔ وہ جانے ہے کہ اپنی طرف بڑھنے والے خطرے سے کس طرح نمونہ جاتا ہے۔ اس سارے معاملے میں سچ کو نہیں بلکہ ٹرک میں لدے ہوئے سامان کو اہمیت حاصل ہے۔ کینیڈا اس طریقہ کے سامان کی پہلے سے پہچانی نہیں کرتیں۔ سچ حال ہی میں افغانستان سے آیا ہے، وہ کبھی نہیں جان سکتا کہ کس ٹرک میں کیا سامان جا رہا ہے یا کینیڈا کی سرحد پر کون سی گاڑی کو چیک نہیں کیا جائے گا۔ یہ کوئی مقامی شخص تھا جس کے پاس راستے اور سامان کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔“

”تمہارا خیال ہے کہ تم اسے جانتے ہو؟“

”مجھے معلوم ہے کہ کس سے پوچھنا چاہیے۔ اس کا نام مسٹر کیلس ہے اور وہ ڈیڈی کے ساتھ کام کر چکا ہے اور ہمیشہ سے ان ٹرکوں کی نقل و حرکت میں ملوث رہا ہے۔ یہ وہی ہی نہیں سکتا کہ وہ اس بارے میں نہ جانتا ہو۔ اگر وہ اس حملے میں شامل نہیں تو یہ ضرور جانتا ہوگا کہ کس نے کیا ہے۔“

یہ سننے ی ڈیوس غصے میں آ گئی اور اس نے اپنی جیکٹ سے ایک سیل فون نکال لیا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”پینشن سینیڈر کو فون کر رہی ہوں۔“

گزارنے لگوں۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں چند منٹوں کی چھٹی پر ہوں۔ کل ہی اسٹیڈیو کو فون کر کے بتاؤں گا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ وہ خود اسے دیکھ لے گا۔“

”یہی صحیح طریقہ ہے۔“ وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہمارا نہیں، اس کا کام ہے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ گیا۔ اگر تم برا نہ مناؤ تو فی الحال میں کچھ وقت یہاں گزارنا چاہتا ہوں اپنے فیڈی کے ساتھ۔“

”میں تمہیں اس طرح یہاں نہیں چھوڑ سکتی۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنے ایک دوست کو فون کروں گا۔ وہ مجھے آکر لے جائے گا۔ اب میں اپنے وطن میں ہوں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن.....“ وہ کچھ ہنپکاتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ ٹھیک رہو گے؟“

”بالکل۔“ میرا خیال رکھنے اور سچ بتانے کا شکر یہ مجھ کو کہ میں کس قسم کا کتا ہوں؟“

”تم کتے نہیں ہو.....“ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”جائے دو میجر، میں مذاق کر رہا تھا۔“

اس نے مجھے آخری بار غور سے دیکھا اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اوپر کے لیے فون کیا تاکہ ترفین میں شرکت کر سکوں۔ ٹیلیس ضرور یہ جانتا چاہے گا کہ پولیس نے مجھ سے کیا پوچھا۔ میں اسے تہائی ملے پر سب کچھ بتا دوں گا اور اسے بھی مجھے بتانا ہوگا کہ میرے باپ پر حملہ کرنے والا کون تھا اور وہ مجھے کہاں لے گا۔ اسے اپنی زندگی بچانے کے لیے سب کچھ بتانا ہوگا۔

اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں ان لوگوں سے اپنا حساب چکانے کے بعد دوبارہ پہاڑوں پر چلا جاؤں گا۔ میجر کو ڈر تھا کہ اس نے میرے بارے میں جو جج بولا، وہ میری زندگی برباد کر دے گا۔ لیکن وہ غلطی پر تھی۔ اس سچ نے مجھے آزاد کر دیا۔ میں بالآخر اٹھائیس سال کی عمر میں جان گیا ہوں کہ میں سچ معنوں میں کیا ہوں۔ میں بیلگٹن ہوں۔ جنگ میں استعمال ہونے والا کتا۔ اور اب میرا پناہ مل گیا ہے۔ کسی نہ کسی کو تو روٹنا ہی پڑے گا۔ تباہی اس کا مقدر ہے۔ اب وہ سچ نہیں سکتا۔ مجھے اپنے باپ کے قاتل کا پتا چل گیا ہے اور وہ ٹیلیس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

”نہیں۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے فون چینیٹے ہاتھ سے فون نہیں کر سکی۔ اگر انہوں نے اسے بلا لیا تو وہ کسی دیکل کی خدمات حاصل کرے گا اور اپنے اہل کو خبردار کر دے گا۔ وہ کنیڈا بھاگ جائیں گے اور یہاں سے بھاگ کر اپنا کام شروع کر دیں گے لیکن اگر میں اس سے بات کروں گا تو وہ مجھے ان کے نام بتا دے گا۔ یہ سچ میں انہیں کہاں تلاش کر سکتا ہوں۔“

”یہ امریکا ہے سار جنت، اس طرح تم یہاں لوگوں کو لالہ نہیں کر سکتے۔“

”ہم نے اپنے ملک کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچانے کا عہد کر رکھا ہے۔ یہ اندرونی دشمن ہے اور اس سے لانا جائز ہے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے میجر۔ مجھے انہی لوگوں کے خلاف لڑنے کی تربیت دی گئی ہے اور میں تمہارا مریض بھی نہیں ہوں۔“

”تم مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو اور گزشتہ آٹھ سال سے تمہارا تریب سے معائنہ کیا جا رہا ہے۔ تم نے خود ماہانہ ایک آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“

”شاید جنگ میں مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے ہوا معائنہ ہوتا تھا ورنہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔“

”تم نہیں سمجھ سکو گے۔ تمہارا کردار غیر سائنسی ہے اور ہمارا کوئی ایک عضو درست کام نہیں کر رہا۔ یہ بات پہلی بار ہماری آپٹیکل آپریشن کی تربیت کے دوران نوٹ کی گئی۔“

”یہ غلط ہے۔ میں نے وہ تربیت کامیابی سے مکمل کی تھی اور اس میں اول رہا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو وہ مجھے نکال دیتے۔“

مجھے یوں لگا جیسے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”تم اس کیفیت کو کوئی بھی نام دو لیکن انسان میں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ہمیں جنگ میں استعمال ہونے کے لیے بہتر کتے بناتی ہے۔ ہم واقعی بیلگٹن ہیں جو کوئی بھی چلا سکتے ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے سار جنت.....“

”نہیں کوئی بات نہیں۔ میں نے اس کی معذرت کو طر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سچ سن کر مجھے سکون ملا ہے۔“

”سے جانتا تھا کہ دوسروں سے مختلف ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ مضبوطی سے میرا بازو پکڑتے ہوئے اٹھ اٹھی۔ ”تمہیں طویل رخصت کی ضرورت ہے۔ میں تمہاری رائے کے لیے تیار ہوں۔ تم ایک بار پھر معمول کی زندگی



آوارہ گرد

ڈاکٹر عبد الباقی

قسط 41

مندن کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور انا تھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنٹھانے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ پورپا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گہات لگا کر ان کو نیچا دکھانا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھادیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر توت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمود کے دماغ کا مجھڑ بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

حیرت انگیز اور آتشیں سین افسر توت اولپ سلسلہ...



ستمبر 2017ء

۱۹۲۰ء میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے جی بھجوانی کو تیار کر رہا تھا۔ اس اثنا میں کوریلانوں پر بریتانیہ کے کیتوں کو ۱۹۲۰ء میں ہتھیادیا گیا ہے۔ یہ تمام سن کر شہزئی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزئی کی ۱۹۲۰ء میں ناٹھکسور سے ہوتی ہے، جو بمبئی کا ایک بڑا منسلک تھا۔ ناٹھکسور شہزئی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزئی، سوشیلا اور ناٹھکسور کے ہر اوکھی خانہ کی طرف ۱۹۲۰ء میں ناٹھکسور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چٹائی کے گھٹنے دلدلی جنگلی کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہر لے لے کر حملہ کرتے ہیں۔ ناٹھکسور کے گاؤں اور ڈرائیو ر مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے سر میں تیرنگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزئی اپنی کن سے جوابی دنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو قتل کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگتے ہیں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناٹھکسور دلدلی میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اب شہزئی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلانوں سے جی کو ہارے سے گزرا ہو جاتا ہے۔ شہزئی مدد کے طور پر اڑو سے کوریلانوں اور سی جی ادا کر کے تھیں آ جاتے ہیں۔ شہزئی سوشیلا کے ساتھ سے جی کو ہار کی جیب میں بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور سوشیلا کے علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں ۱۹۲۰ء کی چٹائوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیب میں چھوڑ کر خود ایک قریبی گاؤں میں جا کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی کے لیے پلٹے سے تھوٹھک روک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ بھاری بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزئی کے سامنے خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بیٹھنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھولان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹائی بھرے سے لڑا کر بے آل ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لالچ میں پاتا ہے۔ وہ لالچ منجھڑیکہ کھلا اور اس کی بیٹی سوگ کھلائی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور لوگوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سوگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزئی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزئی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سن کر باپ بیٹی کو احاطہ میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسگر گروپ کا مہاجر لوہا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزئی اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ناسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر ناتھ ایمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجاریں سے نہ ٹاکر ہو جاتا ہے۔ شہزئی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قتل کر لیتا ہے اور اس کا مہیں بھر ران میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے پکڑ میں جزل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لکڑیے اڑی کے مہیں کیم لیل دیال داس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر شہزئی حیران رہ جاتا ہے۔ لیل دیال داس کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی اور پورٹ پر بھارتی خفیہ بیسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو کس کے ہینڈ گارڈ پر ہتھیادیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر وورلڈ ڈالیا بھولا تھ کے قیدی خانے میں بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بڑا مباحش دادر کھیلے پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت کھیلے دادر کو کھانے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ وہ دادر کو دیکھ کر قیدی خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اچانک میں دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھرجاتی ہے اور پھر میں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آنے پر خود کو زخمی و زخموں میں بند پاتا ہوں۔ ایک بیگ پر کھپ ہاتھ کی کمانڈر بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جزل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور کھانے کو فروغ دینے کے لیے ڈاکر کیم لیل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے منکرہ مفادات کے لیے کلی منجاریں سے مل لہا اور قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزئی کو دیال داس کے بہرہ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا ہتھ بھال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزئی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈاکر کیم لیل سے موٹوٹ کے ذریعے فرار کی اطلاع کرتا ہے۔ شہزئی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور بیر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر مقامی قبائلیوں کی رازداریں اور ڈاکر کیم لیل ان کے حوالے کر کے ہندوستانی مجبوروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں گلوں کے کوسٹ گاؤں ڈھنڈے اپنی سرزمین پاکستان پہنچنے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڈکانہ پہنچ کر کشمک کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا میڈمرشاد ہوا واز ۱۹۲۰ء میں پہلے ہی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں کشمک کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزئی وغیرہ کی آمد پر شاہ واز خان دھوکے سے کشمک کی لال اور اس کی بیوہ ارم کے انوکھے کے جرم کی رپورٹ کر دیتا ہے۔ پولیس اول نمبر اور میل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزئی کو شاہ واز خان اپنا قیدی بنا کر لے آتا ہے۔ اچانک رات، سانسٹانے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈی جو پریل پر حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ اپنی میں شاہ واز کی بیٹی سوسنیز بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزئی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لالچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کر کر خود دارانہ بیٹھتا ہے اور سوسنیز کو تادان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزئی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قتل کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے آل کر کے ایک کمرے کے گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ سچ کچھ سننے کے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزئی، پریل کو کچالانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل شہزئی کا ایمان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزئی کے ساتھیوں اور سوسنیز کی کچھڑنے کے لیے تھانے پر مل کر رہتا مگر رنجش کی انتہی ڈکیت فوس وہاں پہلے سے اٹھوٹی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزئی اور اس کے ساتھی رنجش کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزئی، منجھڑیکہ کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، منجھڑیکہ پر راجہ کرتے ہوئے ہماری نظری کے ساتھ شاہ واز کی حویلی کی کٹائی لیتے ہیں مگر وہاں نہ شاہ واز تھا نہ طلسم دھیرا۔ وہ اپنی میں شہزئی رنجش کی تحویل سے فرار ہو جاتا ہے اور چھپتا چھپتا شاہ واز کی حویلی پہنچتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بلاشبہ اندر کا منظر میرے لیے چونکا دینے والا تھا۔
 وہ کوئی سیاہ گہر والی شلوار قمیض میں ملفوف تھا اور ہاتھ
 میں سیاہ پستول تھا۔ اس کی نال کا رخ صالح جان کی طرف
 لگا ہوا ہوتا تھا اور اس کی پیشانی سے خون کی
 لکیر بہہ رہی تھی جبکہ اس کا سلی فون نیچے قالین پر گر انظر آ رہا
 تھا۔ میری نظر پستول بدست پر جمی ہوئی تھی۔
 ”کون ہو سکتا تھا یہ؟“ میرے سنسناتے ہوئے ذہن
 میں ایک ہی سوال نے گردش کی۔

”پرل کے گروہ کا کوئی ساتھی؟“

طرح چونک کے میری طرف پلٹی اور یہی مجھ سے بھی غلط گئی کہ صالح جان نے موقع پا کر بڑی غیر معمولی اور بہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، صوفے پر پڑے پڑے کے پتوں والے ہاتھ پر اپنی ٹانگ چلا دی۔ پتوں کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں جا پڑا۔ میری اچانک آمد پر صالح بھی سمجھا تھا کہ اس آدمی یا ملازم بے خیالی میں اندر کھس آیا ہے اسی نے میری طرف گردن اور نظر اٹھا کر دیکھا تھا مگر تب تکلیف اور بعد میں صالح جان مجھے پہچان چکے تھے۔ جان کے لیے تو یہ صورت حال یک نہ شد و شد والی بات، جبکہ تکلیف تو مجھے دیکھ کر مسرت بھرے انداز میں چونکھی۔

صالح جان نے دوبارہ پھرتی دکھائی اور صوفے چھلانگ لگا کر ایک دوسرے دروازے کی طرف لپکا۔ ”تھکلی! پکڑو اسے..... جانے نہ پائے.....“ چنٹا۔ صالح جان کے کامیاب وار کے بعد وہ بھی جانب پلٹی مئی، لیکن تب تک صالح جان اندرونی گوشے کھلنے والے اس دروازے کے قریب جا پہنچا تھا جبکہ جانب چھلانگتے ہوئے میں اور تکلیف دونوں ہی دوسرے سے ٹکرا کر قائلین پر گرے تھے۔ مگر اٹھنے میں نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا تھا۔

صالح جان اس لمحے کو موقع غنیمت جان کر اب چلاتا دوڑا تھا، تاکہ حویلی کے ملازمین وغیرہ اس کی متوجہ نہ ہو جاتے۔ میں اور تکلیف ای دروازے سے دوسرے گوشے کی طرف نکلے تو صالح جان کو ایک موٹی سی ادم عورت سے ٹکرا کر گرتے پایا۔ وہ عورت کوئی ملازمہ لگتی اس نے بوکھلا کر چیخ ماری اور ایک طرف کولہا کھک مئی۔

جان اسے گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور اسی وقت میں نے اچھلانگ لگا دی۔ اس پر گرتے ہی میں اسے رگبتا ہوا دوفرش پر لے آیا۔ وہ میرے قابو میں آچکا تھا مگر بد قسمتی کئی مئی کہ اس کم بخت کے شور شرابے سے حویلی میں بہ دوڑ چکے کئی مئی۔ حویلی میں صرف ملازمین کی فوج ہی نہیں بلکہ سب افراد بھی تھے جو زیادہ تر باہر پہرے پر تھے مگر اندر آنے میں بھلا کتنی دیر لگتی تھی۔ مجھے ایک بات کا پتہ تھا، تکلیف کا گرا ہوا پتوں نہیں اٹھا سکا تھا اور نہ ہی تکلیف اس طرف کوئی توجہ دی تھی۔ اب اگر شاہنواز خان کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو جاتا تو صورت حال سنگین ہو سکتی کوئی بعید نہ تھا کہ تھانے فون بھی کھڑا دیا جاتا اور میں

یہ جواب میں نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہ مجھے بعید از قیاس لگا۔ اول تو اس کے گروہ کے کسی ساتھی کا میرے ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا جبکہ پرل بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یوں میرا اب اس ڈاکو گروہ سے کوئی تعلق یا واسطہ نہ رہا تھا، سو نہ ہی اسے باپ کے پاس پہنچا دی گئی تھی اور وہ اپنی بیٹی اور غالباً گھر والوں سمیت کہیں غائب تھا۔

”تو پھر کون تھا یہ.....؟“

ایک ہی خیال بھائی دیا کہ ضرور یہ صالح جان کا ہی کوئی دشمن ہو گا، مگر اگلے ہی لمحے میرا یہ خیال بھی از خود ہی باطل قرار پایا جب میں نے اس کی آواز سنی۔ ”خبردار..... اگر ذرا بھی کوئی غلط حرکت کی تو.....“

ادھر ہی ہلاک کر دیے جاؤ گے۔“ یہ شیریں کی طرح غرائی ہوئی آواز تکلیف کی تھی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی جواز میرے ذہن میں تیزی سے آئے اور نکل گئے۔

”مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔“ وہ پھر غرائی۔ ”قدیوں کو کہاں رکھا گیا ہے؟“ تکلیف ہلکی آواز مگر غصیلے لہجے میں مخاطب تھی مگر مجھ تک نہیں اس کی آواز آ رہی تھی۔ وجہ یہی ہو گی کہ میں اس پر دھیان دیے ہوئے تھا اور دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

”قدیوں“ سے اس کی مراد یقیناً مجھ سمیت ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے ہی ہو سکتے تھے۔

”مجھے نہیں پتا..... میں تو خود دھمان ہوں یہاں.....“ بالآخر صالح جان نے جواب دیا۔ لہجہ اور آواز سے ذرا بھی خوف کا شائبہ نہیں محسوس ہوتا تھا۔

تکلیف کو یہی نہیں بلکہ مجھے صالح جان کی اس چالاکی پر سخت طیش آیا تھا۔ میں تو خود صالح جان کو اسی مقدمہ کے لیے چھاپے آیا تھا مگر تکلیف خود یہاں آ پہنچی تھی اور جانے اب تک وہ کہاں گھات لگائے چکی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے جسم پر اس کا اپنا لباس نہیں تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا وہ مردانہ شلوار قمیض میں ملفوف تھی جو اس نے شاید کسی خاص مقصد کے تحت ہی پہنا تھا اور یقیناً کسی سے چھینا ہوا ہی لگتا تھا۔

اب میرا یہاں زیادہ دیر دیکر رہنا مناسب نہ تھا جبکہ تکلیف بھی ایک طرح سے آزاد ہی تھی اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کی بھی ضرورت تھی، لہذا میں دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ تکلیف آہٹ پا کر..... بری

اس نے تیزی سے پہلے صالح جان کا گمراہ ہوا چلتا ہوا اور
قائین پر لڑکا پڑا ایل فون اٹھا لیا۔ اس کے بعد ہم کمرے
سے نکل گئے۔ میری ہدایت پر ٹھیکہ دار نے فوراً دروازہ بند کر
دیا۔ راہداری میں چند اور لوگ بھی جمع تھے۔ میں انہیں چلا
چلا کر راستہ چھوڑنے کا کہتا رہا پھر پھر ہم جوبلی سے باہر
آگئے۔ ایک جگہ کارکھڑی بھی جو مجھے اسی کی گلی کی
میں نے ٹھیکہ دار کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ
کر صالح جان کی تلاش لی تو کارکی چابی اس کے پاس سے
آ رہی ہوئی۔

میں نے بدستور صالح جان کو ڈھال بنا رکھا تھا اور پیری عقالی نظریں تیزی کے ساتھ گرد و پیش میں متحرک تھیں۔ پستول شکلیہ نے تمام رکھا تھا۔ اس نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر قبضہ جمایا اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔ میں صالح جان کو لیے عقی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ شکلیہ نے ایک طوفانی جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

”کسی دور ویرانے میں لے چلو اور جب تک میں نہ کہوں، کارمت روکنا۔ بیک بوپر نظرس ڈالتی رہنا کوئی ہمارے تعاقب میں نہ آ رہا ہو۔“ میں نے ہلکے سے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا اور اس کے بعد صالح جان کو آڑا چھوڑ دیا۔

وہ چند ثانیے اپنی گردن سہلاتا رہا اور پھر غصے سے بولا۔ ”تمہارا کام ہو گیا ہے۔ اب چھوڑ دو مجھے.....
ورنہ پچھتاؤ گے بہت.....“ میں نے غصے سے دانت پیس کر اس کے جڑے پر ایک مکارسید کر دیا۔ اس کے ہونٹ کا کونا پھٹ گیا اور وہاں سے خون کی لکیر بہہ نکلی۔ وہ کراہ کے رو رہا تھا۔

”اپنی زبان بند رکھو اور صرف میرے سوال کا جواب دو..... شاہنواز چوہے کی طرح کہاں چھپا ہوا ہے؟“

”بتایا تو تھا کہ وہ جا مشورہ گیا ہوا ہے۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں سے اب بیک وقت، خوف اور پریشانی کی جھلک بھی مترج ہونے لگی تھی۔

”تمہارا یہ محوٹ میں ریخیز زوالوں کے سامنے پہلے بھی سن چکا ہوں..... لیکن اب میں تمہاری زبان سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے قہر آلودہ لہجے میں کہا۔

۱۔ اس بد طبیعت شخص نے انھیں راج رجب دین کو کہاں بھولا تھا۔
۲۔ انور زمیندار شاہنواز خان کی پشت پناہی کرنے میں
مصدق تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب میں مغلوب صالح جان پر چھٹا
لگا کرے میں دوسرا افراد کو سیدھی کے داخل ہوئے
تھے۔ یہ دونوں خاصے قہار اور توہمند تھے۔ بڑی بڑی
میں اور وحشت بھری آنکھوں کو دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ
وہی میں اپنے دشمنوں کو اس طرح گتے پا کر یہ دونوں
بیرت و جوش میں پاگل ہو رہے تھے۔

”شکیلیہ..... اس طرف ہو جاؤ.....“ میں نے چلا کر کہا۔ شکیلیہ اشارہ بھانپ گئی اور میرے عقب میں ہو گئی۔ میں اور صاحب جان ان دونوں صاحب آدمیوں کی انہی گلیں گھر کی زد میں تھے۔

”خبردار! اپنی بندوقیں پھینک دو..... ورنہ ایک ہی منٹ کے اندر اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔“ میں نے غضب سے کہی۔

”چھوڑ دو اس کو..... تم بیچ کر نہیں جاسکتے۔“ ان میں
ایک خونخوار غراہٹ سے بولا۔

”میرے سر پہ خون سوار ہے اس وقت.....“ میں پھر
 بیانیہ لہجہ میں غرایا۔ ”آخری بار کہہ دیا ہوں..... اس کے
 یہ گیا۔“ کہتے ہوئے میں نے صالح جان کو ہلکا سا جھٹکا
 ۔ وہ کرا ہوا..... دونوں اسلحہ بدست قہر ناک انداز میں اپنے
 تئیں کر رہ گئے، اس میں بے بسی کا عنصر غالب تھا۔
 ا کے دونوں ہاتھ اٹھ اڑے ہوئے تھے اور وہ محض ان کی
 یوں کو حرکت دے رہا تھا۔

”ہمیں بس یہاں سے نکلنے دیا جائے، ہمارا کوئی لہ نہیں ہے، باہر نکلنے ہی ہم اسے چھوڑ دیں گے۔“ میں انہیں حذب پاکر دوبارہ کہا اور پھر صالح جان کی دن سے گرفت ڈاڑھیلی کی تو اس نے بھی پھنسی پھنسی اڑیں انہیں میری بات مان لینے کا حکم دیا۔

وہ دونوں اپنا اسلحہ زمین پر رکھ کر ایک طرف گئے۔ میں نے شکلیہ کو اشارہ کیا اور ہولے سے کچھ کہا۔

”تم نے شاہنواز سے ٹکڑے لے کر اچھا نہیں کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کیا شے ہے۔“ صالح جان پر ابھی تک شاہنواز کی طاقت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ میں دانت پیس کر بولا۔

”ٹکڑے ہم نے نہیں، اس نے ہم سے لی ہے اور یاد رکھنا معمولی لوگ ہم بھی نہیں ہیں۔ تمہارا یہ شاہنواز کوئی بڑی شے ہوتا تو اس طرح چوہے کی طرح چھپنے کے بجائے ہمارے سامنے آتا۔ اب میں صرف بچ سنوں گا، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ ہم شاہنواز سے خود ہی نمٹ لیں گے۔“ میں نے آخر میں سفاکی سے کہا اور ٹکلیہ کو ایک ویران جگہ پر کاررو کرنے کا کہا۔

ہمارے اطراف میں بخر ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم آبادیوں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ کسی نے ہمارے تعاقب میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی یا پھر وہاں کوئی اور گاڑی موجود نہیں تھی۔ شاہنواز کی بسی چوڑی جیب بھی میں نے وہاں نہیں دیکھی تھی۔

ٹکلیہ نے کار ایک ٹیکری کے قریب لے جا کر روک دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور صالح جان کو گردن سے دو بوج کر باہر نکالا اور زمین پوس کر دیا۔ دن چڑھنے لگا تھا اور گرم ہو رہا تھا۔ دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔ فضا میں جس بھی تھا۔

”بس، صالح جان! اب جھوٹ نہیں چلے گا۔ ہمیں صرف اپنی ساسھی ارم اور اس کے دونوں بچوں کی تلاش ہے۔ شاہنواز سے کبھی ہمیں کوئی سروکار نہیں ہو گا۔“ بولو کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ۔ یا پھر اس ویرانے میں تمہاری لاش چھوڑ کر ہم کوئی اور راستہ دیکھیں۔ میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔“

”جامشورو چلے چلو، وہاں تمہاری ملاقات میں۔“ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا، دوسرے ہی لمحے میرا گھونسا اس کے جیزے پر پڑا۔ وہ بھر بھری مٹی والی زمین پر بری طرح لوکھڑا کر گرا، میں آگے بڑھا اور اس کی گردن پر اپنا بھاری بوٹ رکھ دیا۔

”بس صالح جان! تم نے جتنا بولنا تھا، بول لیا۔ اب چھٹی کرو۔“

”ٹکلیہ! کار کی ڈکی سے کوئی بھاری آہنی شے نکالو۔ میں اس کے سر کا کچھور بنانا چاہتا ہوں، گولی میں نہیں مارنا چاہتا، اس طرح اسے موت کی اذیت کا احساس نہیں ہوگا، جلدی کرو، وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“

ٹکلیہ نے ایسا ہی کیا اور پھر ایک بھاری پانا نکالا۔ وہ میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ میرا چہرہ سر ہو رہا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے پستول پینٹ کی بیٹ میں شرٹ کے نیچے اڈس اور پوری قوت سے بھاری پانے کی ضرب صالح جان کے سر پر رسید کرنا چاہی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ تیزی سے تڑپ کر ہٹا تھا۔ بھاری پانے زوردار ضرب زمین پر پڑی تھی۔ میں نے یہ دانستہ حرکت تھی کہ وہ خود کو ضرب سے بچالے۔ اور یہی ہوا تھا، میں نے دشتیانہ غراہٹ کے ساتھ دوبارہ پانے کی ضرب اس کے سر پر رسید کرنا چاہی تو اس نے دونوں ہاتھ آگے دیے۔

”ٹھٹ۔۔۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں بب۔۔۔۔۔ بتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ ٹکلیہ کر بولا۔

”میں صرف بچ سنوں گا اور یاد رکھنا۔ اس تصدیق بھی تم سے ہی کرواؤں گا۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ اسی گوشہ میں ہے۔“

”اس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ یہ بتاؤ کہاں چھپتا ہے وہ۔۔۔۔۔ اور کیا ہماری ساسھی لڑکی ارم اور اس۔۔۔۔۔ دونوں بچے بھی اسی کے قبضے میں ہیں؟“

”ہاں!“

”وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میری ہی رہائش گاہ پر ٹھہرا ہے۔“ اس نے بتایا اور میں چونک سا گیا۔ یہ خیال میرے ذہن میں آنا چاہیے تھا۔

”وہاں اور کون کون ہے؟“ میں نے کسی خیال۔۔۔۔۔ تحت پوچھا۔

”شاہنواز اور اس کے گھر والوں کے سوا اور کو نہیں، میرے بچے جامشورو گئے ہوئے ہیں۔“

”ہماری ساسھی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی وہاں اس کے قبضے میں ہیں؟“

”ہاں!“

”وہاں شاہنواز کے ساتھ موجود مسلح حواریوں اعداد بتاؤ۔“

”کوڑا خان اور بخشعل کے علاوہ دو اور آدمی ہوئے ہیں۔“

”ہمم۔۔۔۔۔“ میں نے ایک خیال انگیز ہکاری خارہ کی اور ایک بار پھر اسے تہدید کرتے ہوئے بولا۔ ”یاد رکھو۔۔۔۔۔“

چندناں دیر نہ لگی ہوگی کہ ہم بھی سوا سیر کا وزن رکھتے تھے۔ نصف گھنٹے کے اندر اندر ہم ایک نسبتاً چھوٹے سے قریبی قصبے میں جا پہنچے۔ ہماری کار کھیتوں کے درمیان بنے کچے دھول اڑاتے راستے پر دوڑی جا رہی تھی، یہاں سے صالح جان کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔

اس چھوٹے سے دیہاتی قصبے میں داخل ہوتے ہی ہمیں دور نزدیک کسان اپنے کاموں میں مشغول نظر آئے۔ سامنے کھیت بار آبادی تھی اور کچے کچے مکانوں کے سلسلے اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں کی بے ترتیب قطاریں دور تک جاتی نظر آرہی تھیں۔ راستہ کھیتوں سے نکل کر اسی طرف جاتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق ٹھیکہ کار کو اسی طرف لے جا رہی تھی۔ کھیتوں سے نکلے تو اُپلے تھیں دیواروں کے جھونپڑ نما گھر کو کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں داخل ہو گئے، ان کے درمیان سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے، وہاں ایک آنے کی چکی بنی نظر آئی جس کی چمنی سے ”پک..... پک..... پک.....“ کی مخصوص دیہاتی آواز کی ’لے‘ کے ساتھ دھواں اٹھ رہا تھا۔

میں کھڑکی سے باہر کوئی مناسب جگہ ٹاڈنے میں لگا ہوا تھا کہ اچانک صالح جان نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے سر کی ٹکڑ بڑے زور سے میری ناک پر رسید کی تھی۔ مجھے اس موٹے آدمی سے ایسی پھرنی اور ”زور“ کی امید نہیں تھی۔ مگر چونکہ اچانک اور زوردار تھی جس کے باعث میرا دماغ بری طرح گھنجھنا سما گیا اور تکلیف کے مارے میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ وہ مجھے لڑائی بھڑائی والا آدمی نظر تو نہیں آتا تھا تاہم نچانے کیا بات تھی کہ اس نے عین آخر میں کس بات سے مجبور ہو کر مجھ پر حملہ کر ڈالا تھا۔ مجھے ٹکر مارنے کے بعد اس نے کار سے اترنے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کو ٹکر ماری، وہ لاک تھا۔ ٹھیکہ بولھلا گئی اور بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صالح جان کو اس حرکت پر خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہی تھی۔ مجھے بھی ہوش دلا نے کی غرض سے یکار رہی تھی۔ میں نے سنبھالا لینے کی غرض سے اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور پھر صالح جان کی طرف متوجہ ہوا، جواب دروازہ کھولنے کی کوشش سے مایوس ہو کر کھڑکی کا شیشہ نیچے کر رہا تھا اور میرے دوپٹے تک وہ اپنا آدھا دھڑکڑی سے باہر نکال چکا تھا، مجھے اگر اسے دوپٹے میں ایک لمبے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ کسی طرح سکڑ سٹ کر خود کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔ کار کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وہ اسی کوشش میں تھا کہ کسی

قہاری اس بات کی تصدیق میں خود کروں گا۔ اگر مجھے اس میں ذرا بھی جھوٹ اور غلط بیانی محسوس ہوئی تو سب سے پہلے تم میرے عتاب کا نشانہ بنو گے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں.....“ وہ بولا۔

”اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میکھو! یہ جنگ خود شاہنواز نے ہم پر مسلط کی ہے اور ہم بھی نہیں چاہتے کہ کسی قسم کا خون خرابا ہو، اگرچہ شاہنواز نے اپنی طرف سے ہمارے خلاف کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اب تک..... ہم چاہتے تو اب بھی اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں، وہ ہوگا اپنے علاقے کا تیس مار خان..... اگر وہ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور بدستور یہ جنگ ہم پر مسلط رکھی تو پھر ہم بھی دشمنوں کی گردنیں اڑانا اچھی طرح جانتے ہیں، کیونکہ اب تک ہماری جوابی جنگ صرف اپنے دفاع کی حد تک ہے۔ ہم اسے بڑھا نا نہیں چاہتے۔“

میں نے ایک لمبے کی دیر نہ کی اور اس کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کار بدستور ٹھیکہ بلی ڈرائیو کر رہی تھی۔ صالح جان کے مطابق اس کی رہائش گاہ ایک دوسرے قریبی گوٹھ میں تھی جو یہاں سے پندرہ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

میں نے ٹھیکہ سے ہیرے کے متعلق پوچھا۔ صالح بان کے بھی کان یقیناً اس سوال پر کھڑے ہوئے تھے۔

ٹھیکہ نے مختصر الفاظ میں اپنی اس رات والی کہنا سنا لی۔ جس میں میرے لیے سب سے زیادہ پُرطمانیت بات یہ تھی کہ وہ ہیرا شاہنواز کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ اگرچہ ٹھیکہ نہیں اس مقام تک لے کر ضرور گئی تھی، مگر وہاں پہنچتے ہی ٹھیکہ نے انہیں ہاتھ دکھا دیا تھا، وہ اسے عام سے لڑکی سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے تھے اور ٹھیکہ نے اسی بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ان پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پہلے کوڑا خان لی گن پر قبضہ جمایا، اس کے بعد وہ اسے اور اس کے ایک برسا بھی کوڑی کر کے فرار ہو گئی تھی۔ وہ شاہنواز کو بھی نشانہ بنا جاتی تھی مگر وہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لہجے گھات لگا کر غائب ہو گیا۔

بہر طور ٹھیکہ نے انہیں خوب اچھی طرح سے جیل دیا۔ یہی نہیں اس نے ایک اور عقل مند کی کام بھی کیا تھا۔ اس نے طلسم نور ہیرا وہاں سے نکال لیا تھا اور اب وہ اس کو پاس ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی ٹھیکہ کو مختصر الفاظ میں نکال دیا اور اول خیر کے بارے میں بتا دیا۔ صالح ان ہماری باتیں شاید غور سے سن رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں

طرح باہر گر جائے اور بھاگنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگ بس، یہاں تک ہی حرکت کر سکتے ہیں کیونکہ باقی ”حرکت“ ان کے حواریوں کو آتی ہے، صالح اور زمیندار شاہنواز جیسوں کو نہیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ہمینس جیسی ”پٹھک“ کو دو پاؤں اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ تڑپا تو میں نے اس کی رگب حساس مثل ڈالی۔ وہ وہیں سیٹ پر لمبا پڑ گیا۔

”روانہ ہوتے وقت ہمیں اسے رسی سے باندھ لینا چاہیے تھا۔“ ٹھیکلے نے کہا۔

”گزرے ہوئے پر پھٹتا ناکیسا..... تم ڈرائیو تک پر اپنا دھیان رکھو۔“ میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اگلی سیٹ پر ٹھیکلے کے برابر آ بیٹھا۔

”اس طرف موڑ لو گاڑی۔“ میں نے سامنے وینڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ یہ سارا اب میدانی راستہ تھا اور اس طرف نسبتاً کچھ پختہ اور بڑے مکان نظر آرہے تھے۔

”مگر..... ہمیں صالح جان کے گھر کا راستہ نہیں معلوم.....“ ٹھیکلے نے میری توجہ دلائی۔

”کوئی پروا نہیں..... تم چلتی رہو اور وہ دیکھ رہی ہو ایک ٹیکر کا درخت ہے شاید..... اس کی چھاؤں میں کار روک لیتا۔“

ٹھیکلے نے ایسا ہی کیا۔

”کی چین میں الارم لاک ہے، ڈکی کا بیٹن پش کرو جلدی۔“ میں نے ٹھیکلے سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترتا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں صالح جان کے بے ہوش وجود کو ڈکی میں بند کر چکا تھا۔

”تم اِدھر ہی ٹھہرو..... میں ابھی آتا ہوں.....“ ٹھیکلے سے کہہ کر میں آگے بڑھا، جہاں کچھ ہاری (مزارے) اجروں کے پگڑا بنے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے انہیں سلام کیا اور صالح جان کے بارے میں پوچھا۔

”سامیں.....! شہری بابو لگتے ہو.....“ ایک مدقوق سے ہاری نے کہا پھر سامنے بنے پختہ مکانوں کی ترتیب وار قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ دیکھ رہے بابو سامیں!..... پہلی قطار کا تیسرا مکان..... نیلے رنگ والا جس کا کالا لوہے کا گیٹ ہے، یہی صالح جان کا ہے۔“ یہ بتانے کے بعد وہ اپنے کان میں انکی ہوئی بیڑی نکال کر سلگانے لگا۔

”وڈی مہربانی بابا!“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس کار کی طرف پلٹا۔ مجھے اندازہ تھا کہ صالح جان جیسے آدمی کو اس چھوٹے سے قصبے میں بھی جانتے ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر میں نے ٹھیکلے کو سرکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک دم برابر والی سیٹ پر جا ٹھکی۔ اسٹیرنگ میں نے سنبھال لیا اور کار اسٹارٹ کر کے ایک جھپٹکے سے آگے بڑھ لی۔

میں نے مطلوبہ مکان کا رخ کرنے کے بجائے دوسری طرف کار لے گیا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ان تمام نظر آنے والے پختہ مکانوں کا عقبی حصہ تھا۔ تھوڑا اور دور لے جا کر ایک پرانی سی عمارت نظر آئی۔ کار اس کے پیچھے لے جا کر روک ڈی۔

”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ ٹھیکلے نے فوراً کہا۔

”نہیں، تم اِدھر ہی رہو گی۔ صالح جان کو اگر ہوش آ گیا تو وہ اندر سے ڈکی بجانا شروع کر دے گا۔ کوئی قریب سے گزرنے والا سارا کام خراب کر دے گا۔“

”تو کیا مجھے اسے دوبارہ بے ہوش کرنا پڑے گا؟“ ”ظاہر ہے..... تم جیسے ہی غصوں کرو کہ وہ ہوش میں آ گیا ہے تو ڈکی کھول کر ایک بیچ اس کی ٹیٹی پر جڑ دینا۔ خیال رہے ہتھ ہولا ہو..... مرنے نہ پائے۔ یہ شاہنواز خان کا کوئی قریبی رشتے دار ہے۔ نیا سا پا پڑ جائے گا۔“

میں پلٹا اور اِدھر اُدھر نظر میں دوڑاتا ہوا مطلوبہ مکان کی عقبی دیواری کی طرف بڑھنے لگا۔

گرمی شدید پڑنے لگی تھی۔ دھوپ الگ تپائے دے رہی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

یہاں سارے مکان ایسے تھے کہ ان کے صحن کھلے اور گیٹ بڑے تھے، عقب میں کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ایک دور وشن دان بھی تھے، مگر وہ ”آدم گزار“ نہ تھے۔

مکان ایک ساتھ جڑے ہوئے نہ تھے جیسا کہ عموماً شہروں میں ہوتے ہیں۔ دیہاتی علاقہ تھا اور زمین بہت سہمی۔ ہر مکان کے درمیان ایک گلیاں رہتا ہوا تھا، میں ایک ایسے ہی گلیارے میں جا ٹھکا اور..... وہاں سے مجھے کچھ سیوریج کی لائیں اُوپر تک جانی دکھائی دیں۔

یہ مکان ایک منزلہ تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، کوئی نہ تھا اور پھر ایک بائپ کو پکڑ کر جنگلی پلے کی طرح اُوپر چڑھ گیا۔ صحن کی دیواری منڈیر پر پہنچ کر تھوڑا اندر جھانکا۔

پہچان کیا تھا، جوش اُبال سے میرا داغ گھوم گیا۔ وہ مردود شاہنواز ہی تھا۔

”اڑے او..... بخصل!“ معاً اس نے کھرکراتی مگر تحکمانہ انداز میں آواز دی، تو ساتھ والے کمرے سے بخصل باہر نکل آیا۔

”حاضر سامیں وڈا.....!“

”اڑے! یہ صالح جان فون نہیں اٹھا رہا ہمارا..... جا..... اس کی کھرکیریت تو معلوم کر حوبلی جاکر.....“ شاہنواز نے اس سے تحکمانہ کہا۔ میں سمجھ گیا تھا، صالح جان اس کی کال ریسپونڈ کیوں نہیں کر رہا تھا، کرتا بھی کیسے۔ ایک تو وہ کار کی ڈکی میں بے بس پڑا تھا، دوسرے میں نے اس کا سل فون کسی متعقد کے تحت آف کر رکھا تھا۔

”سامیں بھوتار.....! ہو سکتا ہے، موبائل چارج نہ ہو، ویسے صبح ترکے میں نے یارو کو حوبلی روانہ کیا تھا اور اپنے موبائل سے صالح صاحب سے بات کر کے کھرکیریت معلوم کر لی تھی۔ رنخبر زوالے آئے تھے، ان کے ساتھ وہ..... اوجھا لہبا چھوکر ابھی تھا، برسامیں وہ بری طرح ناکام ہو کے واپس لوٹ گئے تھے اور کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی، لیکن صالح صاحب کا یہی مشورہ تھا کہ ابھی آج کا دن اور ادھر ہی رہا جائے تو بہتر ہے۔“ بخصل نے گویا ایک ہی سانس میں ساری مصراحت بتا دی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے زمیندار شاہنواز ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ کیونکہ بخصل نے دوبارہ کہا۔

”سامیں بھوتار کے لیے ناشتے یا چائیں پاڑیں کا بندوبست کیا جائے؟ یا ابھی شغل پاڑیں (شراب نوشی) فرمائیں گے؟“

”اڑے نہیں بابا! خالی پیٹ شغل پاڑیں کا بھلا کیا مزہ آئے گا، ایسا کر اس چھوکر سے کہو فوراً ہمارے لیے دیسی انڈوں کا آلیٹ اور ایک انڈا قیمہ (خاگینہ) تیار کرے.....“ شاہنواز بولا۔ ”اور..... ہاں..... سن!“

”جی سامیں حاضر.....!“ بخصل نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

”سچے کھی کے پر اٹھے بھی بنو لیتا۔ لسی اور دہی کا بھی بندوبست کرے۔“

”برابر سامیں بھوتار..... برابر!“

”یہ پاڑاں کوڑا خان کدھر ہے؟“

”سامیں وڈا! وہ اندر سو رہا ہے۔ رات دیر تک جاگے تھے ہم دونوں۔“ بخصل نے جواب دیا۔

محن میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر رلی پڑی تھی۔ یہ وہی رلی تھی جو میں نے پریل کے جنگل ڈیرے والے جھونپڑ میں بھی دیکھی تھی۔ اس کے متعلق اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ سندھ کا مشہور ”بچھوتا“ تھا۔ چارپائی خالی تھی۔ محن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کمروں کی دیواروں میں اے سی نظر آرہے تھے۔ ایک سنگی زینہ اوپر کی منزل کی طرف جاتا تھا۔ میدان صاف پا کر میں اندر کود گیا اور کچھ سوچ کر زینے پر لے کر ہوا اوپر آ گیا۔ یہاں ایک لکڑی کا دروازہ تھا جو بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی چوڑی جھری سے دوسری طرف جھانک۔ کشادہ سی جگہ پر دو کھری چارپائیاں نظر آئیں۔ یہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ کیا مکان میں کوئی نہ تھا؟ ایک خیال آیا کہ مجھے مین گیٹ کا جائزہ لینا چاہیے تھا کہ کہیں اس پر تالا وغیرہ تو نہیں لگا ہوا تھا؟ اب تو میں اندر آ گیا تھا پلٹنے کا وقت نہ تھا۔

یہاں مجھے دو کمرے نظر آئے، ان کی دیوار پر ایک ہی اے سی لگا ہوا تھا۔ دونوں کے دروازے بند تھے۔ دیہاتی طرز کے کشادہ مکان تھے جن کی طرز تعمیر سادہ سی نظر آتی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ آہستہ سے دھکیلا اور دبے پاؤں چلتا ہوا پہلے ایک کمرے کے دروازے کے قریب آ کر رکھا، اس کے چوپی پٹ سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینا چاہی مگر خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف سرکا۔ اس کے اندر مجھے کسی کے سینکے اور دبی دبی سی آوازیں آتی سنائی دیں، دوسری بات یہ تھی کہ اس کے دروازے پر باہر سے تالا پڑا ہوا تھا۔ یہی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھکا تھا۔ کامیابی میرے قریب تھی۔ میں نے اس کی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی، اندر نیم تار کی تھی۔ گویا اس کی کھڑکیاں اور روشن دان تک بند کیے ہوئے تھے۔

اسی لمحہ ہی روشنی میں مجھے ایک طرف کونے میں فرناں نصیب ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے بیٹھے سیکھے ہوئے نظر آ گئے، جی میں تو آئی کہ اسی وقت انہیں پکار کر کھلی۔ بے ڈالوں مگر ابھی یہ قبل از وقت ہوتا۔ کیونکہ میں کچھ اور سی حکمت عملی تیار کیے بیٹھا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ لڑی سے نیچے آیا اور ابھی میں نے آخری زینہ ہی پر لے کیا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی پانی کا گلاس ہاتھ میں نامے باہر نکلا اور کھلی کر کے پچکاری محن میں ماری۔ میں یک دم زینے کے پچھلے خلا میں جا دیکھا۔ میرا دل تیز تیز مرنے لگا، نظریں اسی شخص پر جمی ہوئی تھیں اور میں اسے

”جناب! میجر صاحب! میں بات کر رہا ہوں
شش..... شہزاد احمد خان..... شہزی۔“ میں نے اپنا
بتایا۔ فرط جوش سے میرا لہجہ مرتعش تھا۔
”ہم..... کیا معرکہ انجام دیا ہے اب تم نے.....“

دوسری جانب سے میجر صاحب کی ایک کیمبر تاسی ہمارا
کے ساتھ آواز ابھری۔ میں ان کی بات اور بالخصوص لہجے
پر قدرے چونکے، پتا نہ رہا کہ کیا تھا۔ کچھ معنی خیز ساری لہجہ خان
کا۔ میں نے سب سے پہلے ان سے اپنے فرار کی معذرت
چاہی اور جب اصل بات کی صراحت بتانے لگا تو انہوں
نے میری بات کاٹ کر فوراً کہا۔

”معذرت کی ضرورت نہیں، جو کام خود کسی سے کروانا
چاہتے ہیں وہ اسی طرح ہی کر داتے ہیں.....“ میں ان کی
اس بات پر بری طرح چونکا۔

”تنت..... تو کیا سرا..... آ..... آپ.....“
”مجھ گئے کافی ہے۔“ انہوں نے پھر میری بات
کاٹی۔ ”ایسی باتیں فون پر نہیں کہی جاسکتیں۔ کمال ہے تم خود
ایک پاؤر ایجنٹ رہ چکے ہو، کیا طریقہ کار بھول گئے ہمارا.....
لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا..... ملک و قوم کے وسیع
تر مفادات کے لیے ایسی کڑوی گولیاں ہمیں گھنی پڑتی
ہیں..... یہ بھی مصلحت کا ایک تقاضا ہے۔“

”مگر یہ سرا!“ میں نے مسرت و جوش سے کہا۔ ورنہ
تو میں یہی سمجھا تھا کہ مجھے ریجنرز کے قبضے سے اس طرح
فرار کے لیے کوئی سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ
مجھے اُس رات ریجنرز کی گرفت سے فرار ہونے کا یہ والہ
موقع فراہم کیا گیا تھا کیونکہ شاید میجر ویم کو میرے اندر
تپش کا اندازہ ہو چکا تھا اور شاید یہ بھی کہ میں..... اس مہم
منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کس قدر پُر جوش ہو رہا تھا۔
”اب کام کی باتیں کر لو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ دوسرے
جانب سے دوبارہ ان کی آواز ابھری اور میں نے پھر انہیں
”کام“ کی ساری باتیں بتا دیں۔ انہوں نے مجھ سے میرے
لوکیشن کوچھی اور پھر مجھے کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد
رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے یاد تھا کہ میجر ویم بھی نے مجھ سے کہا۔ اگر وہ
طلمس نور ہیرا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو انہیں میری کچھ
ایسی باتوں کا بھی یقین آ جاتا جو ان کے لیے اب تک میرے
طرف سے شکوک کا سبب بنی ہوئی تھیں اور اب وہ ہیر
میرے پاس (شکلیہ کے پاس) موجود تھا۔

یہ قصہ سننے میں کم و بیش پون گھنٹا لگا تھا۔ ریجنرز کی

شاہنواز واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے نہیں
معلوم تھا کہ..... اپنی بیٹی سونہریں کو اس نے کہاں رکھا تھا؟ پتا
نہیں یہاں بھی یا نہیں اور جگہ منتقل کر دی گئی تھی۔ تاہم اب
اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہا تھا مگر دیکھی دل سے یہ ضرور
سوچتا تھا کہ جب اس بے چاری کو یہ پتا چلے گا کہ اب اس کا
محبوب پر ریل چائنہ یواس دنیا میں نہیں رہا ہے تو اس پر کیا بیٹے
گی؟

مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ شاہنواز اور اس کے دونوں
مقرب خاص یعنی کوڑا خان اور منتقل یہاں سے آج رات
تک ملنے والے نہیں، میں خاموشی سے مگر اسی احتیاط کے
ساتھ واپس پلٹ گیا اور تقریباً دوڑتا ہوا..... کار کے پاس
آ گیا۔

”لگتا ہے کامیاب لوٹے ہو.....“ ڈرائیونگ سیٹ پر
بیٹھی شکیلہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے
بولی۔

”ہاں!“ میں نے اس کی برابر والی سیٹ کا دروازہ
کھولا اور سیٹ پر براجمان ہوتے ہی فوراً صابح جان کا سیل
ہاتھ میں لیا اور اسے آن کرنے کے بعد ڈی جی ریجنرز میجر
ویم بھی سے رابطہ کیا۔ ان کا سیل نمبر تو مجھے معلوم نہ تھا البتہ
ضلعی ہیڈ کوارٹر کا لینڈ لائن نمبر مجھے پتا تھا۔ کسی اور نے کال
ریسیو کی۔

”ہیلو ریجنرز کارپس (corps) ہیڈ کوارٹر.....“
دوسری جانب سے کہا گیا۔

”جناب! مجھے میجر ویم بھی صاحب سے بات کرنی
ہے، فوراً.....“ میں نے کہا۔

”اپنا تعارف کرواؤ اور کس سلسلے میں بات کرنی
ہے؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”اُس ٹاپ سیکریٹ سرا! وقت کم ہے..... مجھ سے
بات کرتے ہی وہ مجھے فوراً پہچان جائیں گے کہ میں کون
ہوں اور اُن سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

دوسری جانب چند ثانیے کے لیے پرسوج سی خاموشی
طاری رہی، اس کے بعد اس نے مجھے ہولڈ کرنے کا کہا اور
دوسری جانب سے قومی ترانے کی موسیقی سنائی دینے لگی۔
شاید بات کرنے والے نے انٹر لنک کال سسٹم کے ذریعے
میجر صاحب سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ چند ہی سیکنڈوں
بعد مجھے دوسری جانب سے میجر ویم صاحب کی بارعب آواز
سنائی دی۔

”ہیلو، کون.....؟“

بھاری تعداد نے صالح جان کے مکان پر ریڑ کیا اور وہاں سے اس بد طینت اور خود کو بڑی ”شے“ سمجھنے والے فرعون صفت دؤرے شاہنواز خان کو اس کے قریبی ساتھیوں کے ذریعے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی بازیاب کرا لیے گئے۔ صالح جان کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ ان سب کو خبر خیز ہیڈ کوارٹر اور وہاں سے ایجنٹل انٹر ویکشن سیل میں منتقل کر دیا گیا۔

کیمیل دادا اور اول خیر میری اس کامیابی پر بے حد خوش تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں نے یہ ساری مہم بازی اپنے اوپر ایک خطرناک رسک لے کر ہی ماری تھی۔ میری ذرا سی غلطی مجھے ہی نہیں میرے ساتھیوں کو بھی کئی قسم کی قانونی پیچیدگیوں میں پھنسا سکتی تھی۔

البتہ ظلم نور ہیرے سے متعلق تفصیلی گفت و شنید کے لیے ہم دونوں کی ایک کمرے میں دن نوون خبیہ نوعیت کی ایک میٹنگ ہوئی۔

”مسٹر شہزاد! میں اب اس قومی امانت کے سلسلے میں تمہارا آئندہ کار پروگرام جاننا چاہوں گا۔“

”میں سرا“ میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے میں اس اہم اور قومی امانت کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاؤں، یہ ظلم نور ہیرا ہمارے وطن کی ایک مقدس اور قابل فخر امانت ہے۔ کوشش تو میری یہی تھی کہ میں اسے آپ جیسے ہی کسی ذمے دار، محترم وطن افسر کے حوالے کر دوں، لیکن اس کے علاوہ میرے کاندھوں پہ ایک اور اہم ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، اخلاقی فرض سمجھ لیں اسے اگر وہ بھی آپ کے توسط سے پوری ہو جائے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا۔“ میری بات پر مسٹر وسم بولے۔

”ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس ذمہ داری کو جلد سے جلد نمٹا دیا جائے اور ظلم نور ہیرے کو بعض حکومتی افسروں کے توسط سے اسے ذمے داران کے سپرد کر دیا جائے، کیونکہ مختصر یہ ملک میں ایک بڑی عظیم الشان نوادراتی نمائش نکلنے والی ہے، یہ ایک بین الاقوامی سطح کی نمائش ہے جس میں بیرون ممالک کے مندوبین، کچھ اعلیٰ افسر اور عالمی مالیاتی فنڈ کے افسران شرکت کرنے والے ہیں۔ یہ نمائش ملک کی ترقی اور اقتصادیات میں نہایت اہم رول ادا کرے گی، ایسے میں ظلم نور ہیرے کی نمائش میں موجودگی۔۔۔۔۔ اس کی اہمیت اور افادیت کو دو چند کر دے

گی۔ وہ اس نادر و نایاب ہیرے کو دیکھ کر رنگ رہ جاوے گا، اس کی شہرت چار دانگ پھیلے گی، ملک کا نام روشن گا۔ اس کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی تنظیمیں خطرہ دس گی اور بھی بہت سے فائدے متوقع ہوں گے۔ لیکن ان عظیم کارنامے کا سہرا تمہارے سر ہوگا۔۔۔۔۔ اور یہی خبیہ ہماری مصدقہ اطلاعات اور معلومات کے مطابق تم نے کا عرصہ پہلے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندراس سکین بھی گرفتار کروا دیا تھا۔ جس پر مقدمہ چل رہا ہے اور اس پھانسی کی سزا دی گئی ہے، یہ دو کارنامے تمہارے معمول نوعیت کے نہیں ہیں، لہذا تمہیں اس نمائش میں خاص طور شامل ہونا پڑے گا، تاکہ وہاں تمہیں ایک بڑے اور قوی اعزاز سے بھی نوازا جائے گا۔“

”سرا! یہ میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہر محب وطن پاکستانی کے لیے یقیناً فخر کی بات ہوگی مگر جس اعزاز آپ بات کر رہے ہیں، اس کا میں نہیں کوئی اور حق دا ہے۔“ میں خوش تو ہوا تھا مگر اصل بات یہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ مسٹر وسم چونک کر بولے۔

”میں سرا! میں نے کہا اور پھر انہیں سب سے پہلا بشام جھلکری کے بارے میں مختصر تفصیل سے آگاہ کیا ہے اس کی بیوی ارم اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کا ذکر بھی کرتے ہوئے مسٹر وسم بولے۔

”جناب! مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر آپ حکومت کی طرف سے اس کا کریڈٹ بشام کی بیوہ اور اس کے دونوں بچوں کے نام کر دیں، انہیں تحفظ اور مالی مدد کی ضرورت ہے، دونوں بچوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے، ارم کے لیے باعزت اور اچھی نوکری کا بھی بندوبست کر دیا جائے۔ بس یہی میری آپ سے درخواست ہے۔“

میری بات پر مسٹر وسم چند ثانے کی گہری سوچ میں مستغرق رہے، اس کے بعد میرا کاندھا چھتیا کے بولے۔

”ویل مسٹر شہزاد! تمہاری اس اخلاقی ہمدردی اور اقدام کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ دیکھا جائے تو اس عظیم قومی امانت کے لیے بلاشبہ بشام نے ہی اپنی جان کی قربانی دی تھی لیکن بعد میں تو تم نے اس مقدس امانت کی اپنی جان سے بھی بڑھ کر حفاظت کی اسے خطرناک بین الاقوامی گروہ اور جنگی جنونی جرنیلوں سے جان پر کھیل کر حاصل کیا۔ نام تو تمہارا بھی آئے گا اور پھر تم ہو بھی وطن عزیز کے ایک گمنام سپاہی تاج دین کے بیٹے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سرا! لیکن مجھے اس کی ضرورت

پنجاب جانے والی ایک لٹری کوچ پکڑی اور ملتان کے لیے روانہ ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت ہم نے ہمام اور ہمیں کے دونوں بچوں سے بھی ملاقات کی۔ میں نے اسے سب بتا دیا تھا کہ اب اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ جہاں کے کسی کی اسے باعزت طریقے سے وہاں پہنچا دیا جائے گا اور نہ صرف یہ بلکہ حکومتی سطح پر اس کے لیے بہت کچھ کیا جانے والا تھا۔ خود منیجر صاحب نے بھی اسے بتائی کہ کمرلی اور اطمینان دلایا تھا۔ میں نے یہ بھی ارم سے کہا تھا کہ میں تمہارے سلسلے میں منیجر و سیم بھی صاحب سے ملنی فونک رابطے میں رہوں گا اور زندگی رہی تو لہنی پیاری بہن اور دونوں بھانجوں سے ضرور بھی ملاقات کروں گا۔

☆☆☆

ہم اسی طرح براستہ لاڑکانہ وادو سے پنجاب کی جانب جو سفر تھے۔ میں خود کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور بندے کی ثابت قدمی اور بلند ہمتی کو دیکھتے ہوئے اس کی پوری مدد بھی فرماتا ہے اور ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ بندہ خود حیران ہو جاتا ہے، میں خود بھی اس وقت ان تمام حالات پر غور کر رہا تھا۔ میرا سر سیٹ کی پشت کا گاہ سے ٹکا ہوا تھا۔ سیٹ خاصی آرام دہ تھی۔ تھوڑی دیر میں مجھے نیند نے آن لیا۔ صبح جاگا تو ملتان کے قریب تھے اور صبح ہو چکی تھی۔ میں نے دانستہ ایسے ہی وقت کا انتخاب کیا تھا کہ دن میں ہی ”نیگم دلا“ کا رخ کروں۔ رات میں دشمنوں کا پہرا غیر معمولی ہوتا ہے جبکہ دن میں وہ بات نہیں ہوگی۔ ایک خیال اور اندازہ تھا تو یہ ہمیں ہر وقت ہی مختار رہنے کی ضرورت تھی۔

ہم ملتان کینٹ کے قریب اتر گئے۔ اول خیر کا دل چائے کی چسکی لگانے کو چاہا تھا مگر میں نے منع کر دیا۔ ”اپنے منہ اور پیٹ کو ذرا سنبھال کر رکھو..... جانتے نہیں ہو کہ یہاں ہمارے کتنے خطرناک، دیدہ و نادیدہ دشمن پھیلے ہوئے ہیں.....“ بھکیلے نے اسے گھور کر کہا۔ ملتان میں اس وقت سخت گرمی پڑ رہی تھی، ملتان کی خشک گرمیاں دیے بھی بہت مشہور ہیں۔ اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان کوئی بحث پڑتی، میں نے فوراً ایک ٹیکسی والے کو روکا، ڈرائیور کو نیگم دلا کا پتا بتایا اور اس نے کرایہ..... اس کے بعد ہم چاروں اس میں سوار ہو گئے۔ ایک طویل عرصے بعد میں نیگم دلا میں قدم رکھنے والا تھا۔ میرا ذہن بہت سے احساسات اور خیالات کی آماجگاہ

نہیں، آپ کسی طرح ارم اور اس کے دونوں بچوں کے لیے محفوظ مستقبل کا بندوبست کرادیں، یہی میرے لیے بہت ہو گا۔“

”لوگ اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں، بد خود دار! مگر آفرین ہے تم پر کہ تم دوسروں کے لیے جیتے ہو..... انشاء اللہ میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن میں تمہیں اب ریجنرل فورس کا ایک ”آزیری“ عہدہ تفویض کرانے کا وعدہ کرتا ہوں..... جو تمہیں پاک آرمی کی طرف سے ایکشن ٹوڈ پر دیا جائے گا۔“ منیجر و سیم کی اس بات میں میرے لیے دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ کیونکہ میرے دشمنوں نے نیگم دلا اور زہرہ بانو کو اس کے ساتھیوں سمیت (جن میں، میں بھی شامل تھا) جھوٹے شواہد کے ذریعے ملتان ریجنرل فورس کے خلاف کر رکھا تھا، اس سلسلے میں یہ آزیری عہدہ جو یقینی طور پر پارڈ ایجنٹ کے مساوی ہو سکتا تھا، مجھے تفویض کرنا سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔

”میں تمہیں خفیہ ریجنرل کمانڈو کا عہدہ دینے کی سفارش کروں گا۔“ منیجر صاحب نے آخر میں کہا تو میں خوشی کے دے دے احساس تلے بولا۔

”سرا! گریبا ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری اپ نیگ کی منتوں کا صلہ مل گیا۔ لیکن ابھی اس میں ایک طویل پروکس کی ضرورت ہوگی، تاہم میں آپ سے ایک ایکشن فیلڈ کی درخواست کروں گا، چونکہ میں اب ملتان جانے کا قصد کیے ہوئے ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہاں کی ریجنرل فورس جب مجھ سے کسی قسم کی باز پرس کرے تو میں اپنا کوئی کارڈ کھیل سکوں۔“

”سمجھ گیا.....“ وہ مسکرا کر بولے پھر مجھے ایک خصوصی اٹ لائن کا نمبر اور کوڈ ازبر کر دیا اور بولے۔

”تم نقطہ یہ کوڈ اور اس نمبر پر ان کے کسی بھی بڑے نسر کو رابطے کے لیے کہہ دینا، وہ تمہیں منتوں میں تو کیا یکنڈوں کے اندر اندر نہایت عزت و احترام کے ساتھ چھوڑیں گے۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ سرا!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ناٹ میٹھنڈ! یو آر ڈیز روڈ.....“ وہ بارعب لہجے ما بولے اور کھڑے ہو کر مجھے سیلوٹ کیا تو میں نے بھی انداز میں ان کے سیلوٹ کا جواب دے ڈالا۔

ایک بڑی ذتے داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد باخود کو بہت ہلکا ہلکا تصور کرنے لگا تھا۔ لہذا ہم نے

بنا ہوا تھا۔ اماں جی اور باجی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کیسے ہوں گے؟ میرے انتظار میں تو ان کی یوزمی آنکھیں کس قدر تھک گئی ہوں گی۔ میں ان کا لبت جگر ان کی اب تک کی رفاقت کی وہ نشانی تھا جس کی خاطر ان دونوں بوزھوں نے اپنی پرمصائب زندگی کو بڑا خرچ عطا کیا تھا اور بالآخر میں نے اپنی چھاڑ دی اور انہوں نے اپنی آنکھوں کی ششک کو پایا تھا۔ زہرہ بانو بھی، جسے میری ذات میں ہر وقت لیت شہ شاہ کا ہی پرتو نظر آتا تھا اور وہ ایک بڑے گروہ کی سربراہ ہونے کے باوجود اسی ایک رشتے سے مجھے، اماں جی اور باجی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہوئے تھی۔ بعض رشتے کس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے کے باوجود تا عمر قائم رہتے ہیں، نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ تنہائے بھی جاتے ہیں اور زہرہ بانو یہی کر رہی تھی۔ یہی اس کی وہ نرالی ادائیگی جس نے اس کے لیے میرے دل میں از حد احترام پیدا کر رکھا تھا۔

انہی خیالات میں جب ہم بیگم دلا کی علاقائی حدود میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دل تھا کہ بے طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ اعصابی کیفیات بھی ایک عجیب سے ارتعاش کا شکار تھیں۔

کمبل دادا اور اول خیر، کھڑکی سے بڑی گہری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ خود میری عقائی نظریں تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ بہ قول زہرہ بانو کے، ہمارے بہت سے دشمنوں نے اس عمارت کو اپنی کڑی اور خفیہ نگرانی میں لیے رکھا تھا۔ کون آرہا ہے جارہا ہے، وہ سب ان کے علم میں تھا۔ البتہ یہ ابھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میری آمد کی خبر دشمنوں تک پہنچی تھی یا نہیں، اگر پہنچ جاتی تو ان میں تھر تھری مچ جانا لازمی ہوتا۔

بیگم دلا کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ہماری ٹیکسی رکی۔ کرایہ وغیرہ ادا کرنے کے دوران میں ہی گیٹ کھل چکا تھا۔ اندر بے گاڑ کھین بے دو افراد تیزی سے باہر کو لپکے تھے، ان کے فوراً بعد تین مسلح افراد بھی اندر سے برآمد ہوئے اور ہمارے دائیں بائیں محاط انداز میں الٹ کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں ہمارے بچائے تیزی سے ہمارے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اول الذکر دو محافظ ہمارا سامان سنبھال رہے تھے۔

اندر لگے خفیہ کمروں میں شاید انہوں نے گیٹ کے

سامنے ٹیکسی رکتے اور ہمیں اُترتے دیکھ لیا تھا۔ سب سے پہلے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے ہی گیٹ سے اندر قدم رکھا تھا اور سامنے ہی مجھے زہرہ بانو کھڑی دکھائی دے گئی، یوں کہ..... جیسے وہ اپنے آپ سے ہی بے گانہ پہنچی ہو۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی اور اسی رنگ کے دوپٹے میں اس کا گورا روپ گھرا ہوا لگتا تھا۔ وہ کچھ کمزوری نظر آرہی تھی، دل کش سی کشادہ آنکھوں میں جیسے کسی طویل انتظار کا عذاب تڑنے ہوئے آئینوں کی کرچیوں میں جھلما رہا تھا۔ گنار سا چہرہ کسی قدر کھلا ہوا نظر آتا تھا مگر یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک عرصے سے کملا یا ہوا بھی ہے۔ اس کے لبوں کا مذم مذم ارتعاش بہ زبان خاموشی ایک داستان غم کی کنی کنی..... کہانیاں سنارہا تھا۔ اس نے اپنے شہد رنگ بالوں کو بھی سنوارا ہوا نہ تھا، بے ترتیب سے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی بہت سی لٹیں، مہتابی چہرے پر لہرا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی حیرت میں ڈوبی اس کی آواز ابھری۔

”شش..... شہزی! کلک..... کیا یہ واقعی تم ہو.....؟“

میرے ہونٹوں سے بے اختیاری ایک مسکراہٹ کسی نوید سحر کی طرح طلوع ہوئی، جس نے گویا اُداس اور تاریک جھیل پر سویرا کر دیا۔ وہ متلاطم ہوئی، کسی طوفان کی طرح اُٹدی اور میری طرف بڑھی۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی اور اپنا سر جیسے میرے کشادہ سینے کے تحت پر رکھ دیا۔ وہ کھٹے کھٹے انداز میں سک رہی تھی۔ میں نے..... آنکھیں سے اسے سنبھالا دیا، ہولے سے اس کا کاندھا تھکا اور..... بہت دیر سے الگ کر کے مسکراتے لہجے میں کہا۔

”دیکھ لو..... زہرہ! سارے سارے سامنے میرے ساتھ ہیں، تمہارے سامنے ہنستے مسکراتے کھڑے ہیں، یہ سب یقیناً ماں جی اور تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

یہ کہہ کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔ ٹھیک، زہرہ سے لٹ گئی، اول خیر نے سر جھکا کر زہرہ بانو کو سلام کیا تو زہرہ بھیجی بھیجی سی آنکھوں اور اٹک آلودہ لہجے میں بڑی شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”اس شیطان کی مجھے زیادہ فکر تھی..... اور..... وہ

کون ہے.....؟ میں اسے پہچان رہی ہوں..... شاید۔“

اس کا اشارہ میرے عقب میں سر جھکائے کھڑے کمبل دادا کی طرف تھا۔

ہمیں صحیح سلامت، ہنستا مسکراتا اور خوش دیکھ کر زہرہ

آوارہ گود

نے بیوٹکسی اور اس کے سربراہ جی بھجوانی کے چنگل سے چھڑایا تھا تو اس وقت باپ کی یادداشت ایسی نہ تھی کہ وہ مجھے پہچان پاتا، تاہم ڈاکٹروں نے تسلی دی تھی کہ..... اب انہوں میں وقت گزارنے کے سبب عین ممکن ہے کہ گرجیوٹی (رفتہ رفتہ) وہ اپنی اصل یادداشتوں میں لوٹ آئیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں پھر فوراً ہی انڈیمان والے مشن پہ روانہ ہو گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوا جہاں اے سی آن تھا۔ فضا کمرے کی خاصی آرام دہ اور سکون پرور ہو رہی تھی۔ میں نے بہت دیر سے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں سانسے کے ماں جی اور اباجی بڑے سے جہازی سائز کے بیڈ پر نیم دراز سے پٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ ان دونوں کی مجھ پر نگاہ بڑی تھی۔ بادی انظر میں وہ مجھے کوئی ملازم ہی سمجھتے تھے مگر جب میں پوری طرح سے ان کے سامنے آ گیا تو ماں تو جیسے ایک ننگ مجھے دیکھتی ہی رہ گئی مگر انہیں شاید پھر بھی یقین نہیں آیا تھا، انہوں نے جلدی سے بیڈ سائڈ ٹیبل سے اپنا سیاحہ کمائی والا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا، تب ہی وہ جیسے ایک دم سکتے میں آ گئیں، میرا اور ان کا سامنا بلاشبہ اچانک اور غیر متوقع ہی تھا۔

”کک..... کون آیا ہے، نویدہ.....؟“ ٹو کے اتنے غور سے دیکھے جارہی ہے؟“ یہ اباجی کی آواز تھی، ان کی بیٹائی زیادہ متاثر تھی۔

”جج..... چشمہ پہننا تاجے.....! پھر دیکھ کہ کون آیا ہے!“ ماں جی نے اباجی سے کہا۔ میرے باپ نے رعشہ زدہ ہاتھ سے اپنی عینک بھی اٹھالی مگر وہ پھر بھی مجھے پہچاننے سے قاصر رہے۔

”شہزی پتر..... اوراں آ..... وہاں..... کیوں کھڑا ہے.....؟“ ماں نے کہا اور بیڈ سے اترنے لگیں کہ میں انہیں اس زحمت سے بچانے کی خاطر ان کی جانب لپکا اور بیڈ کے قریب آ کر ان کے پھیلے ہوئے قدموں کے قریب جا بیٹھا اور ان سے لپٹ گیا۔ ماں جی مجھے خود سے لگا کر رو دی۔ میرا باپ ہنوز ہکا بکا سا تھا، شاید کچھ سمجھ رہا تھا کچھ نہیں۔

ماں کی متا بھری چھاؤں تلے آتے ہی جیسے مجھ ابلہ پا آوارہ گرد کو تپتے ریگ زار میں کوئی نخلستان میسر آ گیا ہو..... میرے نادیدہ زخموں پر جیسے مرہم رکھ دیا گیا ہو۔

”تو بتاتی نہیں نویدہ.....! کون ہے یہ.....؟“ اباجی کی کپکپاتی آواز میرے کانوں سے پھر گرائی۔ کچھ اندازہ

بانو بھی اپنا بہت کچھ ایسا بھلائے ہوئے تھی جو اس کا متاثر جان بھی تھا اور..... سرمایہ حیات بھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور بذلہ سخی کا اظہار کر رہی تھی۔

”سلام بیگم صاحبہ.....!“ تب ہی کیبل دادا نے چند قدم آگے اٹھاتے ہوئے زہرہ بانو کو سلام پیش کیا۔ میں نے دیکھا۔ زہرہ بانو نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کیبل دادا کے اونچے لایبے کا نہرے پر اپنا نرم و ناک ہاتھ رکھ دیا۔ کیبل دادا نے سر اٹھا کر زہرہ بانو کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ زہرہ اس کے کھردرے اور بھاری چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

”مجھے اور کسی پر اتنا یقین نہیں کم از کم تم پر ضرور تھا کیبل دادا! کہ ہمیشہ کی طرح تم اپنی زندگی کو ساتھیوں کے لیے داؤ پر لگائے رکھو گے اور شہزی سمیت ان سب کو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کی ڈور سے باندھ کر ایک دن میرے سامنے لا کھڑا کر دو گے، تم نے مجھ سے وعدہ جو کیا تھا۔“

”بیگم صاحبہ! میں نے آج اپنا وعدہ پورا کر دیا..... لیکن کاش! میں اپنے یار! لیتق شاہ کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ اسے بھی اسی ڈور سے باندھ رکھتا، پردہ جھلا تو بہت جلدی میں تھا اور میں بھی اس کے لیے کچھ کرنے کا موقع ہی تلاش کرتا رہ گیا۔ یہی ایک ایسا بوجھ ہے، جو ایسے وقت میں مجھے زلا کر رکھ دیتا ہے کہ کاش! میں اس کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ معافی چاہوں گا سب سے کہ یہ وقت ایسے موضوع کا تو نہیں، پر کیا کروں، یہ نہ بھولنے والا سانچہ بھی ایسے ہی وقت میں یاد آ کر دل و جگر کو ترپا دیتا ہے۔“ کہتے کہتے کیبل دادا کا لہجہ زندہ گیا، آنکھیں ڈبڈبایں گئیں۔ بھلا اس میں کیا شک تھا کہ جسے میں اول خیر کا یا ر تھا اسی طرح میرا بڑا بھائی لیتق شاہ مرحوم کیبل دادا کا تھا۔ بھلا وہ کیسے اُسے بھلا سکتا تھا۔

لیتق شاہ کے ذکر نے فضا کو ایک دم ساکت اور مغموم سا کر دیا۔ تب ہی میں نے آہستگی کے ساتھ سب سے کہا۔

”اندر آ جاؤ.....“ نشست گاہ میں دو ملازم مرد و عورت موجود تھے۔ سب وہاں صوفوں پر بیٹھ گئے، میں نے ماں جی اور اباجی کے کمرے کا رخ کیا۔ بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی میرے دل و دماغ کی، ایک جذباتی کیفیت تھی، عقیدت و محبت کا ایک طوفان سا اُنڈنے کو چل رہا تھا، اپنے بوڑھے ماں باپ کا سامنا کرنے پر، ماں جی سے تو میری باتیں ہوتی رہی تھیں، اور ان کا ساتھ بھی رہا تھا، مگر اپنے باپ کو جب میں

کرنے کی وہ کوشش کر رہے تھے۔
 میں دھیرے سے ماں سے الگ ہوا اور باپ کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ جو ایک اچھا شوہر ہی نہیں، ایک بد شفیق باپ ہی نہیں، ملک و قوم کا سچا اور بہادر سپاہی بھی تھا جسے وطن عزیز کے ”گمنام سپاہی“ کے اعزاز کا فخر حاصل تھا۔
 ”اباجی۔۔۔“ میں نے دھیرے سے انہیں پکارا۔
 باپ کے جمریوں زدہ چہرے پر جیسے بہت سی لکیریں کھینچ گئیں۔

”تا بے ایہ ہمارا پتر۔۔۔۔۔ شہزاد احمد خان ہے۔“ ماں کپکپاتے سے لہجے میں بتانے لگی۔
 ”بتایا تھا میں نے تجھے اس کے بارے میں۔۔۔ یہ وہ پتر ہے ہمارا۔۔۔۔۔ جب تو ایک برستی طوفانی رات میں اپنے وطن کی پکار پر سرحدی چوکی پر چلا گیا تھا۔ ایک پتر وہ تھا جس نے میری انگلی پکڑ رکھی تھی، وہ لائق شاہ تھا۔۔۔۔۔ اور یہ شہزاد احمد وہ تھا جو دنیا میں آنے والا تھا۔۔۔۔۔ کتنے خوش تھے ہم دونوں۔۔۔۔۔ اس کی متوقع آمد پر۔۔۔۔۔ یاد نہیں، ہم نے تو اس کا نام بھی پہلے سے ہی رکھ ڈالا تھا، ہم دونوں میں لڑائی ہوئی تھی، میں چاہتی تھی لڑکی ہو، تم بیٹا چاہتے تھے، میں نے بیٹی کا نام سوچ رکھا تھا اور تم نے بیٹے کا، آخر کار تم جیت گئے تھے، پر میں تمہیں کیسے تمہاری جیت کی خبر سنائی، تم تو۔۔۔۔۔ دور چلے گئے تھے۔ ہاں! تا بے! یہ وہی اپنا شہزی ہے۔! ابھی وہ تیرا بہادر گرو پوت ہے جس نے تجھے دشمنوں کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ دیکھ لے آج اپنے اس کزلیل جوان پتر کو۔۔۔۔۔“

ماں یہ سب کہتے ہوئے جانے کیوں سک پڑی۔
 میرا باپ تو جیسے یک ٹک مجھے دیکھتا ہی چلا گیا۔ اپنوں کے قریب رچے ہوئے۔۔۔۔۔ ان سے ماضی کی باتیں کرتے ہوئے، اس کی یادداشت کافی حد تک شاید بحال ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی اپنا چشمہ اتارتا اور کبھی پہنتا، یہاں تک میں خود ہی اس کے پاس سرک گیا اور لپٹ گیا۔
 ”اڈے ٹھنڈ پے ٹھنی ٹیلے وچ۔۔۔۔۔ شہزی پترے۔! واہ میرے مولا۔!۔۔۔۔۔ یہ کیسا دن دکھا رہا ہے مجھ بڑے کو۔۔۔۔۔ شکر ہے تیرا میرے مولا! میں تو جوان ہو گیا۔۔۔۔۔ تھ۔۔۔۔۔ تو شہزی پتر ہے ناں۔۔۔۔۔؟“ اباجی کے لہجے میں فخر بھی تھا اور انبساط بھی۔۔۔۔۔ ماضی کے کم گشتہ حوالے بھی تھے اور پاور فکشن کے اُن پچھڑے جذبات کے ریلے بھی جنہوں نے کسی بے رحم طوفان کی صورت ہمیں بچھا کر رکھ دیا تھا۔ آج برسوں بعد ملے تو جیسے سارے بند ٹوٹ

گئے۔ میرا باپ تو جیسے مجھ سے بچوں ہی کی طرح لپٹ گیا۔
 وہ بار بار ”میرا پتر۔۔۔۔۔ میرا پتر۔۔۔۔۔“ پکارے جا رہا تھا۔ مجھے چوم رہا تھا۔ جب محبت اور شفقت کے ان جذبات کا طوفان تھا تو۔۔۔۔۔ وہ اپنے دونوں بوڑھے ہاتھوں کے پینالے میں میرا چہرہ لیے اماں جی سے بولا۔
 ”تو یہ۔۔۔۔۔! دیکھ یہ ہمارے لائق شاہ سے کتنا ملتا ہے۔۔۔۔۔ کاش! کاش! اوہ بھی زندہ ہوتا۔۔۔۔۔ میں دونوں لخت جگر کو اپنے بازوؤں میں سمولیتا اور پھر سے جوان ہو جاتا۔“
 ”میں بھی آپ کا بازو ہوں اباجی!“ میں نے بھی رقت بھرے لہجے میں باپ سے کہا۔
 ”ہاں! شہزی پتر! کیوں نہیں۔۔۔۔۔ تو تو میرا بازو ہی نہیں، میرا فخر بھی ہے، میرا امان بھی۔۔۔۔۔“
 اسی اثنا میں زہرہ بانو، کبیل دادا، اول خیر اور کھیلے بھی اندر آ گئے۔ وہ سب اباجی اور اماں جی کے قریب بیٹھ گئے۔
 میں اور زہرہ اباجی کو کبیل دادا، اول خیر اور کھیلے کے بارے میں بتانے لگے۔ ان کی جاں نثاری اور بے جگر یاری کے قصے بھی سنائے، غرضیکہ وہ سارا دن اسی میں گزر گیا۔ اباجی کو جب یہ معلوم ہوا کہ۔۔۔۔۔ انڈیا میں ”را“ کے ایک بڑے اور خطرناک ونگ ”بلو تسی“ جسے رانے خاص طور پر پاپا کستان میں تحریک کاری اور فحش سازشوں کے لیے پروان چڑھاتا تھا، میں اسے اس کے سربراہ سمیت نیست و نابود کر آیا تھا۔ تو اباجی کا سرفرے اُونچا ہو گیا اور بے اختیار اس کے بوڑھے کپکپاتے لبوں سے نکلا تھا۔
 ”آخر پتر کس کا ہے۔۔۔۔۔“
 ”بے شک۔۔۔۔۔“

وہاں موجود سب کے منہ سے بیک وقت برآمد ہوا۔
 ہم تھکے ہوئے تھے مگر ماں اور اباجی کے ساتھ دن بھر حتیٰ کہ رات گئے تک ایک چوپال کی ڈالے بیٹھے رہے، کھایا پیا بھی انہی کے پاس بیٹھ کر۔ بزرگوں کی محفل میں ایک عجیب روحانی سکون مل رہا تھا ہم سب کو۔۔۔۔۔ رات کے دو بجے کہیں جا کر سب نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی اور اگلی صبح دن چڑھے سوئے رہے۔

نہا دھوکہ ختم کیا۔ ناشے کا وقت تو بیت چکا تھا، لہذا دوپہر کا کھانا ہی کھایا گیا جو بڑا پر تکلف تھا۔ زہرہ بانو میری آمد پر بے حد خوش تھی۔ تاہم اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہم سے تازہ ترین حالات کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہو۔ اگرچہ ٹیلی فون پر ہماری گفتگو ہوتی ہی تھی، جب میں کراچی میں تھا گردہ زیادہ دیر نہیں رہ سکی تھی، لہذا

چاہیے۔“

زہرہ بانو نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔ عابدہ کے ذکر نے سب کو مغموم سا کر دیا۔ تاہم سب نے زہرہ بانو کی رائے پر صاف کر دئے کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا جو وہ میرے ساتھ بھی کر چکے تھے۔ اب اس سلسلے میں زہرہ بانو کو بھی سنجیدہ پا کر سب سے پہلے اول خیر نے زہرہ بانو سے کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ نے تو ہمارے منہ کی بات چھین لی، وڈے استاد جی (کیبل دادا)، ٹھیکہ اور میں نے ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی شہزی کو عابدہ بہن کی رہائی کے بارے میں جلد از جلد کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے زور دیا تھا، پر اسے تو پہلے یہاں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اب جبکہ آپ نے خود بھی اس اہم موضوع کو چھیڑا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت ہو جانی چاہیے۔“

ٹھیکہ اور کیبل دادا نے بھی زہرہ بانو کی بات کی تائید میں اول خیر کی حمایت کر دی تو زہرہ بانو ایک بار پھر سنجیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مستغفر ہوئی۔

”تمہارا کیا خیال ہے شہزی؟ ممکن ہے سوزی کے فون کے بعد تم نے اس بارے میں کوئی لائحہ عمل تیار کر رکھا

ممکن تھا کہ فحش رہ گئی ہو۔ یوں بھی کچھ نئے پلان، کچھ نئی حکمت عملی حالات دوران کی متقاضی تھی۔

کھانے وغیرہ کے بعد ہم پانچوں ایک دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر ہم نے اصل موضوع کی طرف آنے کی غرض سے دانستہ چند ثانیوں کے لیے خاموشی اختیار کی۔ میرا خیال تھا کہ اب زہرہ بانو نو شاہ اور روزیر جان وغیرہ سے متعلق بات چھیڑے گی مگر جب اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات کا آغاز کیا تو میں حیران ہوئے بتا نہ رہ سکا۔ وہ نہایت متانت کے ساتھ اور براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔

”شہزی! دشمنوں کے ساتھ ہر د آزمائی کا سلسلہ چلتا رہے گا، اسی لیے میں نے ایک حتمی فیصلہ کیا ہے کہ اس وقت یہاں کے تمام معاملات پس پشت ڈال کر ہمیں عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے آنسو خالدہ کی تو اور بات بھی مگر اب..... اس کی ایک فریبی ساتھی سوزی کے پچھلے دنوں نیلی فونک رابطے کے بعد، کہ اب اس کا بھی کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے، اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ عابدہ کی رہائی کے لیے باقاعدہ ایک مربوط حکمت عملی تیار کر لینی

ذرا سی بات

زندگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے درمیان کبھی کبھی ذرا سی بات کسی کی بھینٹ بھی لے لیتی ہے۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک پرنگر داستان

سانحہ

تاریخ اکثر چھوٹے اور بڑے طبقات کی تفریق کے بغیر صرف بڑے اور منفر د کام کرنے والوں کو اپنے اوراق پر رقم کرتی ہے۔ تاریخی صفحات پر علی اختر کی ایک چونکا دیے والی دلنشین تحریر

باغی

ثبت اور فنی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی..... خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم و بنیادت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان..... ایک یادگار تحفہ

وقت

اکثر لمحات پر لگا کر اڑ جاتے ہیں مگر..... کچھ سوچائیں بھی مطلوب لوگوں کے دامن میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ حسام بیٹ کے قلم کی روانی

ستمبر 2017ء کا ایف ریڈ شاہ ایک نظر میں



مرزا ابرار بیگ کا بیگ انوار

منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، محمد الیاس، نمر عباس اور ڈاکٹر شیر شاہ سیدی کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منتظر

اس کے علاوہ

رہنا..... اور بس، یہی میرے لیے تمہاری مدد بہت ہوگی۔“
میں نے کہا۔

میرے فیصلے سے سب کے چہرے اتر سے گئے،
بالخصوص اول خیر اداں ہو گیا بلکہ اس کا منہ بن گیا تھا۔

”چنگی یار یاں نبھایاں تو یار!.....! بھلا تیرے بغیر
میرا دل یہاں کیسے لگے گا۔ یہ کبھی سوچا تو نے..... کا کے!“

ایک تنہا موقع پر اس نے مجھ سے گلے شکوے شروع
کر دیے اور من بھر کا پوچھا سچا لیا۔ میں نے ہنستے ہوئے

اسے گلے سے لگا یا اور بولا۔ ”یار! تو بھی جھٹا ہے بالکل.....
سمجھتا نہیں ہے۔ میں اکیلا اس اہم مشن میں بہت ہلکا محسوس

کروں گا، اور یہ مشن ہے بھی اسی کا متقاضی، پھر تم سب
یہاں ہو گے تو مجھے بھی سلی رہے گی، اگر خدا خواستہ میں وہاں

کسی مصیبت میں پھنس گیا تو تم سب لوگ ہوتاں، کیا میری
مدد نہیں کرو گے.....؟“

”آخر..... کا کے! ابھی تو اتنا سیانا نہیں ہوا ہے کہ
یاروں کو بھلا لے.....“ اول خیر اسی سوچے ہوئے منہ سے

بولا۔

”مجھے پتا تھا تم ادھر ہی ہو گے..... شہزی کی
فتیں کرنے کے لیے..... بڑا شوق ہے ناں تمہیں گوریاں

دیکھنے کا.....“

میں اور اول خیر دونوں ہی اس آواز پر چونکے تھے،
پلٹ کر دیکھا تو ٹھیکلے کر کے میں داخل ہو رہی تھی۔ اول خیر کو

اس کی طرف سے ”چوٹ“ پڑی تو وہ منہ پتا کر بولا۔
”دخل در معقولات کی محذرت کیے بغیر یوں اندر

چلے آنا خلاف آداب ہوتا ہے محترم! اور خیر سے تمہیں
اخلاقیات تو چھو کر بھی نہیں گزریں..... تو اب کیا کہا

جائے۔“

چڑنے کے بجائے ٹھیکلے نے یوں اپنا منہ ہونٹوں تلے
دبایا تھا جیسے فنی روکنے کی ناکام کوشش کی ہو، یہ بھی

دوسرے کو چڑانے کا ایک انداز تھا۔ یہی سبب تھا کہ اول خیر
کی برہی کم نہیں ہوئی اور وہ دوبارہ بولا۔

”اور..... یہ آپ کیا فرما رہی ہو کہ میں شہزی کے
ساتھ محض امریکا گوریاں دیکھنے جا رہا ہوں..... شرم آتی ہے

مجھے تمہاری اس لغو کوئی پر..... اطلاعات بتا دوں کہ امریکا
گوریاں کا نہیں کالیوں کا ملک ہے۔“

”وہاں گوریاں بھی ہیں اور گورے بھی.....“ ٹھیکلے
فورا بولی۔

”تمہارے جیسی گوریاں ہوں گی، باہر سے سفید اندر

اس سے بات تو کر کے دیکھ لیں۔“

”لیکن اس سے بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ ڈیبا بن
کر لینا چاہیے کہ اس سے کتنے آدمیوں کی روادگی کی بات کی

جائے؟“ زہرہ بولی تو کمیل دادا بولا۔
”بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے کہ شہزی صحیح کہہ رہا ہے۔

یہاں بھی تو کی کو رہنا ہوگا، اسی لیے سب کا جانا مناسب نہ ہو
گا اور اس طرح کام بننے میں بھی تاخیر ہو سکتی ہے، صرف

میں شہزی کے ساتھ امریکا جاؤں گا۔“

”نہیں کمیل دادا!“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر
انکار میں سر ہلایا۔ ”تمہارا یہاں موجود رہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

بیگم صاحبہ کو تمہاری ضرورت ہوگی، انہیں یہاں اکیلا نہیں
چھوڑنا چاہیے۔ پھر ماں جی اور ابا جی بھی ہیں۔ دشمن گھات

میں اور مات دینے کی تاک میں ہیں۔ میرے ساتھ ابھی
کوئی نہیں جائے گا۔ میرے اکیلے جانے کے سلسلے کے کام

میں تاخیر بھی نہیں ہوگی اور میں آزادی سے اپنا کام بھی کر
سکوں گا۔ یہی میرا حتمی فیصلہ ہے۔“ اس کے بعد میں نے

زہرہ بانو کی طرف دیکھا اور اس سے مخاطب ہو کے بولا۔
”زہرہ! میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے عابدہ اور

میرے متعلق اس طرح نیک نیتی اور پورے خلوص کے
ساتھ سوچا۔ ایک احسان اور کر دو..... میرا جلد سے جلد

امریکا جانے کا بندوبست کر دو..... بس! ایک بار میں امریکا
پہنچ جاؤں..... عابدہ کے ساتھ ہی انشاء اللہ لوٹ کے آؤں

گا۔“ میرے لہجے کا استحکام میری پرجوش آواز سے مترشح
ہوتا تھا کہ میری بات پر سب پریشان ہو گئے۔ تب ہی ٹھیکلے

نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔
”شہزی! یہ سرحد پار انڈیا کا معاملہ نہیں ہے کہ ایک

باؤں ادھر بڑا اور اپنے ملک میں آگئے۔ یہ سات سمندر پار
ایک اور براعظم جانے کا معاملہ ہے اور ملک بھی کیا جہاں

نہارے خلاف پہلے ہی باسکل ہولارڈ، ناٹنگھم (سی آئی
ے)، اور اسپیکٹرم اور لودوش جیسے خطرناک بین الاقوامی

من دانٹ کو سے بیٹھے ہیں۔ انہیں پورا یقین ہوگا کہ تم عابدہ
لوچھڑانے کے لیے کوئی ایسا قدم ضرور اٹھاؤ گے..... اس

لیے بہتر ہوگا کہ تم کم از کم مجھے اور اول خیر کو اپنے ساتھ ضرور
لے جاؤ۔“

”اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے دور دراز ملک
ن، صرف میرا جانا ہی زیادہ محفوظ اور مناسب رہے گا۔ اس

رح کی مہمات میں اکثر ساتھی بھی بیروں کی زنجیر بن جایا
رستے ہیں، تم سب میری اور عابدہ کی کامیابی کی دعا مانگتے

ن، صرف میرا جانا ہی زیادہ محفوظ اور مناسب رہے گا۔ اس
رح کی مہمات میں اکثر ساتھی بھی بیروں کی زنجیر بن جایا

رستے ہیں، تم سب میری اور عابدہ کی کامیابی کی دعا مانگتے

بارے میں پوچھ سمجھ کی گئی تھی، لیکن جب زہرہ بانو نے انہیں اصل حقیقت اور میجر ریاض کے حوالوں کے ساتھ انہیں آگاہ کیا تھا تو ان کی جان چھوٹی تھی۔ نوشاہی کی ایک حد تک انہیں ہمارے خلاف گمراہ کرنے کی سازش تو کامیاب رہی تھی، مگر یہ زیادہ دیر نہ چل سکی تھی۔ تاہم اس نے پریس کانفرنس میں ہمارے بارے میں بہت کچھ غلط کہا تھا۔ اور اخبارات نے بھی اس کی باتوں کو اچھالا تھا۔

یہ اخباری تراشے زہرہ بانو نے ایک رجسٹر میں چسپاں کر کے بطور ریکارڈ محفوظ کر رکھے تھے۔ یہ تراشے اور اخبارات، ان پر کالم نویسوں کے تجزیے میرے لیے مشکل راہ ثابت ہوئے تھے۔ میں اب کہہ سکتا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہیے تھا اور کبسا "اسٹینڈ" لیتا تھا۔

امریکا جانے سے پہلے پہل میں بیگم ولا کو خطرہ پروف بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے لیے میں نے دشمنوں کو اسی کے ہر ہتھیار سے جواب دینے کا سوچا۔ اگلے دن ہی بیگم ولا میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔

وہاں میں نے علی الاعلان طلسم نور ہیرے کا انکشاف اور اس کی بازیافت کے سلسلے میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کی کوششوں کا بھی ذکر کر دیا اور ساتھ ہی اخلاقی طور پر اس کا کریڈٹ مرحوم بیگم ہتھکڑی کے سر کرنے کا بھی باضابطہ طور پر اعلان کیا۔ اس کے بعد میں نے آخر میں چوہدری ممتاز اور بالخصوص نوشاہی کے سابقہ بیانات کے حوالے سے بھی بات کی اور ساتھ ہی دشمنوں اور بالخصوص نوشاہی کو دھمکانے اور بے چین کرنے کی غرض سے اپنے ان عزائم کا بھی ذکر کر ڈالا کہ چوہدری ممتاز خان کی طور پر بھی رہائی اور ضمانت کا مستحق نہیں۔ اُسے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندھو اس سکینے کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بلکہ قانون نافذ کرنے والے ایک فعال ادارے نے میرے ساتھ اُسے ایک کمپائمنٹ آپریشن میں رکتے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ وزیر جان کا بھی ذکر ہوا، میجر ریاض کا بھی بعض مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کر ڈالا۔ تاہم اس میں، میں نے بلیوٹسی اور انڈیمان مہمات کا کوئی ذکر نہ کیا۔ جو اس کے کہ اشارتی زبان کا ہی سہارا لے کر یہ بتانے کی کوشش ضرور چاہی کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے کس طرح یہ ہم جان پر عمل کر سکی تھی۔ اگر نوشاہی..... نے اپنی گزشتہ کانفرنس میں میرے، زہرہ بانو، بیگم ولا اور میرے باپ کے خلاف ہرزہ سرائی نہ کی ہوئی تو میں بھی یہ جوابی کانفرنس نہ کرتا مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔ بہر کیف میری یہ دھواں دھار پریس کانفرنس خاصی

سے کالی۔" اول خیر کہاں چپ رہنے والا تھا۔
 "آؤ ٹھیکہ ایٹھو....." میں نے بڑی مشکل سے سنجیدگی کی آڑ میں اپنی ہنسی کو چھپانے کی کوشش چائی تھی، ورنہ اول خیر ہمیشہ کی طرح ٹھیکہ کو سر چڑھانے کا الزام میرے سر قہو پ دیتا۔

"شکر یہ شہزی! ٹھیکہ مسکرائی اور ہمارے قریب ایک صوفے پر براجمان ہو گئی۔

"اب تم ہی اسے سمجھاؤ، بچوں کی طرح ضد کر رہا ہے میرے ساتھ جانے کے لیے۔" بالآخر میں نے ٹھیکہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"او خیر..... کا کے! اب ہمارے بارے میں اس کم عقل سے مشورہ لیا جائے گا۔" اول خیر نے منہ بنایا مگر میں نے دیکھا اس بار ٹھیکہ بھی ذرا متانت سے بولی۔

"شہزی! میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ کم از کم تم اول خیر اور مجھے ہی اپنے ساتھ رکھ لیتے۔ آخر کو ہم نے بھی تمہارے ساتھ ہی کمانڈ ورننگ لے رکھی ہے پھر یہ مشن بھی اہم ہے۔ کیا تمہیں ہماری کارکردگی پر کوئی شبہ ہے؟"

ٹھیکہ کو یہ بات کرتے دیکھ کر اول خیر کو بھی سنجید ہونا پڑا۔

میری امریکا روانگی سے متعلق میرے جاں نثار ساتھیوں کی سوئیاں ابھی تک اسی بات پر اٹکی ہوئی تھیں کہ مجھے اکیلے اتنے بڑے اور اہم مشن پر امریکا چھٹی سرزمین پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

بڑی بحث کے بعد بالآخر میں انہیں اس وعدے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ..... مجھے جیسے ہی کسی سانحی اور مدد کی ضرورت پڑے گی، میں سب سے پہلے اول خیر اور ٹھیکہ کو ہی بلاؤں گا۔ زہرہ بانو کے کان میں یہ بات پڑی تو اس کا پہلا مشورہ یہی تھا کہ وہ زور آور خان سے مزید دو افراد کی متوقع روانگی کے سلسلے میں بھی بات کرے گی۔

میرے ساتھیوں نے دوسرا وعدہ مجھ سے یہ لیا تھا کہ میں مناسب موقع پر اپنی خیریت سے بھی مطلع کرتا رہوں گا۔

دو روز آرام اور اسی بحث میں لگ گئے تھے، جبکہ مجھے یہاں میجر وسم کی فصاحت کے مطابق ریجنر ز فورس کے تمان کروہس (corps) ہیڈ کوارٹر جا کر لیفٹیننٹ کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنا تھی۔ یہ میجر ریاض کی جگہ تعینات کیے گئے تھے اور انہی کی سرکردگی میں بیگم ولا میں ریڈ لگایا گیا تھا اور زہرہ بانو سے سختی کے ساتھ ہمارے

یہ بٹولی رکھتے ہو۔“ میں کیا جواب دیتا، بس مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

زور آور خان..... زہرہ بانو کی ایک ہی ٹیلی فونک کال پہ بیگم ولا آگیا تھا۔

وہ ایک عمر رسیدہ اور چرب زبان آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سولانا اور جسم فریبی مائل تھا۔ منہ میں بان کی گھوری دبی ہوئی تھی، جھیلنا چٹلن اور اسی طرح کی ٹھیکنی ٹکڑ ٹکڑ پٹنے ہوئے تھا۔ آدھا سر مچھا تھا اور باقی نصف پر جو بال تھے وہ ازراہ زحمت ہی نظر آتے تھے۔ یعنی اڑے اڑے اور خشک سے۔ اس کی بائیں کلائی پر سنہری کھڑی تھی جو خاصی قیمتی نظر آتی تھی۔ گلے میں طلائی چین تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تھا، گاڑی کی چابیاں بھی نظر آرہی تھیں۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا اور ہم سب ہی وہاں موجود تھے۔ چائے وغیرہ کی خرابی درمیان میں سبھی صحن اور وہ بسکٹ اور نمکو چبانے کے بعد چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

بظاہر تو مجھے اسے دیکھ کر ایسا ہی نظر آتا تھا کہ خود اس نے مشکل سے ہی کراچی کا سمندر دیکھا ہوگا نجانے دوسروں کو کس طرح اس نے سات سمندر پار لگایا ہوگا۔

زہرہ بانو نے اس دوران میں اسے میری ”ٹرم اینڈ کنڈیشن“ کے طور پر بتا دیا تھا کہ میں نہ تو مستقل طور پر امریکا رہائش اختیار کرنے کے مقصد سے جا رہا تھا نہ ہی کھونٹے پھرنے کے لیے..... بس ایک ضروری کام غٹنا تھا اور کسی کو تلاش کر کے اسے لے کر واپس لوٹنا تھا۔

”ہا..... ہا.....“ اس نے یہ سب سننے کے بعد اپنے حلق سے ایک بے ہنگم سا قہقہا لگا۔

”سیدھی طرح کہو ناں بیگم صاحبہ! مال کھپانا ہے اور ڈالریب میں رکھ کے لوٹ آتا ہے۔“

”تمہارا خیال ہے، ہم تمہیں اسمگلر نظر آتے ہیں؟“ زہرہ بانو نے اسے غمور..... تو وہ ایک دم خفیف سا ہو گیا پھر کھسائی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”آپ تو سنجیدہ ہو گئیں بیگم صاحبہ! میں تو مذاق کر رہا تھا، ویسے کہیں تو اسمگلر نہیں کہتے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، اب تم ذرا سنجیدہ ہو جاؤ تو کام کی بات کر لی جائے۔“ زہرہ بانو نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ وہ خاصا سنور تھا اور زہرہ بانو کا منہ چڑھا بھی نہ جانے زہرہ بانو نے ایسے اور کتنے عجوبے اپنی پٹاری میں بند کر

تھے خیر ہی۔ اس پریس کانفرنس کا فیصلہ میں نے اچانک اور بدگورہ اخباری تراشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا تھا۔ یوں اب اس کے بعد مجھے کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

سب سے پہلا فون میرے پاس خان جی کا آیا تھا اور اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”برخوردار! اپری تو انھیں چند حیا گئیں تمہارے انتظام میں..... ابھی ملی دی پر تمہاری پریس کانفرنس دیکھی تو دل خوش ہو گیا۔ تم نے آتے ہی دشمنوں کے دانت کٹے کرنا شروع کر دیے۔ تم سے کیسے ملا جائے؟“

وہ خاصے پرجوش تھے۔ میں نے کہا۔ ”خان صاحب.....“

”اُونہ..... نو خان صاحب! میں تمہیں برخوردار کہہ رہا ہوں تم.....“ انہوں نے میری بات کاٹی۔ ”صرف انکل کھو.....“

”جی انکل! آپ کی محبت ہے۔ میں کچھ دلوں کے لیے کہیں ضروری کام سے منحرف نہ ہوں۔“

”یہ سب جان چکے ہیں، تمہاری پریس کانفرنس میں اس کا ذکر آچکا ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ تم سے ملاکب اور کیسے جائے؟“

”میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کے پاس خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔“

”وعدہ.....؟“

”وعدہ۔“

”جیتے رہو، میں بے چینی سے تمہارا منتظر ہوں گا۔“

چند دنوں بعد بین الاقوامی نمائش میں باضابطہ سرکاری طور پر طلسم نور ہیرے کا ذکر کر دیا گیا۔ یہ نمائش اسلام آباد میں ہوئی تھی اور مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

اس کے بعد..... بیگم ولا، بیگم صاحبہ اور میری ملک گیر شہرت نے اسے ملکی احترام کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ بیگم ولا اور ہماری ایسی سا کھ قائم ہو جائے جس کے بعد کسی کو ہم پر پروپیگنڈا کرنے کی جرأت تک نہ ہو سکے۔

میرے اس عمل سے زہرہ بانو بہت زیادہ مطمئن اور فخر ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے میری ذہنی فراست اور

پابک دستی کی داد بھی دی۔

”شہزادی! تم ایک دم پریکٹس آدمی ہو..... کس وقت لیا کرنا اور بعد میں کس کام کو طول دینا ہے، اس میں تو تم گویا

رکھے تھے۔ چائے ختم کرنے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”کتنے دانے پار لگانے ہیں؟“

”تین۔“ زہرہ بانو نے بتایا اور میں چونکا مگر چپ رہا۔ اول خیر وغیرہ بھی ضرور زہرہ بانو کے اس جواب پر چونکے ہوں گے۔

کننیز کے ذکر پر مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔ کیونکہ پرانے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک ایسی اندوہناک خبر مجھ میری نظروں سے گزری تھی کہ ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ لوگ کننیز کے ذریعے بیرون ملک سپلائی کیے گئے تھے مگر بد قسمتی سے راستے ہی میں جیس دم کا شکار ہو کر بڑی بے بسی اور اذیت ناک موت کا شکار ہو گئے تھے۔

ہے۔“

میں اور زہرہ بانو، سوچتی نکاہوں سے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ہمیں ایک پُرسوج سی اُجھن آمیز سوچ میں نکاہیں ملاتے دیکھ کر زور اور خان ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ ”ہر کام میں رسک تو ہوتا ہی ہے، کوئی کام پرفیکٹ نہیں ہوتا دنیا میں، تمہیں چپک کرنے والے بھی پرفیکٹ نہیں ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج کل سخت چپکنگ صرف مسلم اور پاکستانی مسلم کے کھاتے میں ڈالی جا رہی ہے، عام لوگ اس سے مبرا ہیں۔ بالخصوص انڈین ہندو۔۔۔۔۔۔ اور تم تینوں ہندوؤں کے بھیس میں جاؤ گے تمہیں تمہارے جعلی ہندو نام بھی بتا دیے جائیں گے۔ بس اب اس سے زیادہ میں تمہیں مطمئن نہیں کر سکتا، سودا بھٹکو اور بات آگے بڑھے۔“ وہ آخر میں ٹھٹھ کارو باری لہجے میں بول کر چپ ہو گیا۔

اس کی بات میں کافی وزن تھا۔

”ہم۔۔۔۔۔۔“ زہرہ بانو نے ایک خیال انگیزی ہرکاری خارج کی اور اسی انداز میں میری طرف ایک ذرا نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر زور اور خان سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”تمہیں کب تک فائل جواب چاہیے؟“ زور اور خان نے اپنی کولڈن کلر کی رسٹ وائچ میں وقت دیکھا اور بولا۔ ”ابھی چھج رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ شام اور رات کافی ہے سوچنے کے لیے، صبح تک مجھے ڈن کر کے بتادو۔ تاکہ میں کل سے ہی کام کی ابتدا کر دوں، اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اس لیے نصف ایڈوائس رقم آپ کے فائل جواب کے ساتھ مجھے چاہیے۔“ اس نے پلے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ کل صبح تک تمہیں فائل جواب کے ساتھ رقم کا چیک بھی مل جائے گا۔“

”سوری بیگم صاحبہ! چیک نہیں، ڈائریکٹ کیش چلے گا۔“ اس نے شہادت کی انگلی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

”لیکن ایک دم اتنی رقم۔۔۔۔۔۔ بینک والے۔۔۔۔۔۔“ زہرہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے، منجبر سے میری واقعیت تو ہے ممکن ہے کام ہو جائے۔“

”کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ دو ایک روز اوپر پہنچے ہو سکتے ہیں۔“ زور اور بولا۔

اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

”ی۔ی۔۔۔۔۔۔ یہ دونوں کب میرے ساتھ جا رہے

اس کے منصوبے کو چند لفظوں میں سن کر ایک لمحے کو میں خود بھی متحیر رہ گیا۔ آدمی مجھے واقعی چلتا پڑھ لگا تھا۔

”آج کل کے حالات کا تو آپ سب کو علم ہو گا ہی کہ نائن الیون کے بعد امریکا کو ایک آسیب کھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ویزا پالیسی کسی قدر مشکل کر دی گئی ہے، مسلم تو ایک طرف، پاکستانی تک کے ذکر پر ہی۔۔۔۔۔۔ سو طرح کے آپیکیشن لگا کر کیس ریجیکٹ کر دیا جاتا ہے۔ میں نے ان ساری باتوں کو دیکھ کر ہی منصوبہ پلان کیا ہے، یعنی جعل سازی کی آڑ میں جینوئن کام۔۔۔۔۔۔ اور جینوئن کام بھی کیسا۔۔۔۔۔۔ وہ چنگی بجا کر رکھ جھاڑتے ہوئے آگے بولا۔ ”یہ تینوں مذکورہ افراد مر چکے ہیں، مگر ان کا نہ کوئی ڈیجھ سٹریٹجک ٹیٹ نہ ہی کوئی اور ایسی دستاویز ثابوت۔۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔۔ بھیس بھرنے کا یہ عمل پکڑا سکتا ہے۔“ میں نے اعتراض اٹھایا۔ ”اسکیٹنگ ہو سکتی ہے ہمارے چہروں کی۔۔۔۔۔۔“

”ارے بھائی! میں کیا تمہارے چہروں پر۔۔۔۔۔۔ عورتوں یا بیوی پالروں والا میک اپ کروں گا۔۔۔۔۔۔“ زور اور خان ہنس کر بولا۔ ”اس کام میں، میں اکیلا نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ ہر قسم کے ایکسپریٹ کی پوری ٹیم موجود ہے، پورا ٹیم ورک ہوتا ہے ہمارا۔۔۔۔۔۔ اسی لیے تو یہ کہانی ہزاروں کے بجائے لاکھوں پر ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹرز، پلاسٹک سرجن، دیگر ماہرین۔۔۔۔۔۔ اور بولو۔۔۔۔۔۔ ہاں! یہ میک اپ جتنا جاندار ہوگا اتنا ہی ناپاکدار بھی۔۔۔۔۔۔ جو سچی بات تھی، میں نے کہہ دی۔“

میں نے بھویں سیٹھ لیں۔ زہرہ بانو نے بھی چوٹک کر پوچھا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔۔؟“

”صاف بات ہے، میک اپ اپنا کام ایک محدود تک کرے گا، اس کے بعد یہ خود ہی صاف ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ ماسک اور فیل میک اپ ہوگا۔ پرفیکٹ۔۔۔۔۔۔“

”گو کیا یہ میک اپ چند دنوں بعد خود ہی صاف ہو جائے گا؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ”لیکن۔۔۔۔۔۔ تم اسی شکل اور نام کے ساتھ دوبارہ ریڈی میڈ میک اپ کر سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ تب تک تم امریکا کی سرزمین میں قدم رکھ چکے ہو گے، پھر کیا پروا ہوگی۔۔۔۔۔۔ آگے تمہارا مسئلہ ہے۔۔۔۔۔۔ میرا کام تم تینوں کو وہاں پہنچا دینا ہے۔ اب تم یہ کہو کہ وہاں دال روٹی کا بھی میں ہی ہندو بست کروں تو یہ ناممکن

ہیں.....؟“ میں نے گویا چھوٹے ہی زہرہ بانو سے کہا۔ میرے چہرے پر حیرت آمیز پریشانی کے آثار تھے جبکہ ٹھیکہ اور اول خیر خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے، خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زہرہ بانو..... کیا واقعی..... ان دونوں کو بھی میرے ساتھ روانگی کے لیے تیار کرنا چاہتی تھی یا یونہی اس نے کہہ دیا تھا۔

”شہزی! تمہاری یہی بحث تھی ناں کہ ایک آدمی کا کام نسبتاً آسان اور اس سے زائد کا مشکل ہو سکتا ہے، دیکھ لو..... تم تینوں کا کام پکا ہے۔“

”مگر.....“ میں نے کہنا چاہا۔

”دیکھو شہزی.....“ زہرہ بانو نے فوراً میری بات کاٹ دی۔ ”میں نے اور گھیل دادا نے ہی بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ..... اگر تینوں کا کام آسان ہو رہا ہے تو اس میں کوئی قحاح نہیں..... اول خیر اور ٹھیکہ تمہارے ٹریڈنگ پارٹنر بھی رہ چکے ہیں..... تم تینوں کمانڈو ایجنٹ ہو..... امریکا میں تم عابدہ کا کوئی قانونی یا عدالتی کیس لڑنے نہیں بلکہ فائٹ کرنے چاہے ہو..... وہ بھی عام لوگوں سے نہیں..... سی آئی اے کے ایک خطرناک دنگ ”ٹائٹلر فکٹ“ سے فائٹ لڑنے..... کورکوران کی جیل، بین الاقوامی دشمنوں کی کھار میں گھس کر تمہیں ان سے نبرد آزما ہونا بھی پڑے گا۔ تمہارا تباہی بڑا رسک غیر دانشمندانہ اقدام ہو گا، جس میں ناکامی کی صورت میں..... عابدہ کی جان اور اس کے تحفظات کو مزید خطرات لاحق ہو جائیں گے..... وہ ایک تاجپانے کے لیے سانس لینے کو کی بھر دو بارہ بولی۔

”پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہارے جاتے ہی، خاموشی سے اول خیر اور ٹھیکہ کو کچھ بھیج دوں..... جس طرح میں نے تمہاری انڈیا والی مہم میں کیا تھا، مگر اس بار بات اور تھی..... پلیز..... شہزی! یہ ضروری ہے..... وہ سب کہتے ہیں ناں کہ ایک سے دو بھلے.....“

میں نے سر جھکا دیا۔ اول خیر نے خوشی سے نعرہ بلند کیا تھا۔ ٹھیکہ بھی خوش تھی۔

زہرہ بانو میرا مزاج اور طبیعت کو سمجھنے لگی تھی۔ میں جو کہتا یا جس بات پر اڑ جاتا، وہ بظاہر اشات میں اپنا سر ہلا کر خاموش ہو جاتی تھی مگر کرتی وہی تھی جو اس کی مرضی اور میرے مفاد میں ہوتا تھا۔ نجانے بھر کیا ہوتا کہ میں بھی انکار نہیں کر پاتا تھا۔

زوردار خان کو صبح تک بتا دیا گیا تو اس نے کچھ طبع شدہ فارم بھجوا دیے جنہیں ہم تینوں نے ضروری خانہ پڑی کر

کے اس کے آدمی کو دے کر روانہ کر دیے جو ساتھ لایا تھا۔ اس نے دو سے چار ہفتوں کا وقت مانگا تھا۔ کام تیار ہونے کے باوجود یہ ایک بڑا عرصہ تھا مگر ہم کیا کر سکتے تھے، سوائے انتظار کے۔

اگلے روز میں، ٹھیکہ اور اول خیر، کرنل ریاض کی رہائش گاہ پہنچے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ایک دم خوش ہو گئے اور بڑے پرتپاک انداز میں ملے۔ وہ عام سی گھریلو شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ واقعی مکمل طور پر ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ایک آرام دہ اور خوب صورت نشست گاہ میں بٹھایا، ان کا وہ بیٹا بھی ہم سے ملا تھا جو اب ماشاء اللہ کافی بڑا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا، جسے میں نے دشمنوں کے زخموں سے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال میں حملے کے بعد اپنی جان بچا لیا تھا۔ ان کی تنگم بھی ہم سے ملیں۔

ریاض صاحب نے سب سے پہلے تو میری پریس کانفرنس اور مجھے ملنے والے ملکی اعزاز کے بارے میں توسیفی کلمات سے نوازا۔ اس کے بعد مجھ سے بھارتی مہم جوئی اور بلوچسمی کے خاتمے وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں انڈیمان تک سارے سنی خیر حالات و واقعات بتا دیے۔ جسے سن کر وہ بہت حیران اور ششدر ہوئے۔

”کاش! شہزی! میں تمہیں پاک آری میں کوئی اچھا اور بڑا عہدہ دلا دیتا۔ آری میں ایسے عہدے موجود ہیں جو محض اس طرح کی کارکردگی کی بنیاد پر بھی آئری تغویض کر دیے جاتے ہیں۔“ انہوں نے کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

”جی ہاں! میری اور میرے ان دونوں ساتھیوں کی پاور ایجنٹ کی حیثیت سے شمولیت اس کی مثال ہے۔“ میرا اشارہ اول خیر اور ٹھیکہ کی طرف تھا۔

”کاش! یہ ڈراپ نہ ہوتی۔“ انہوں نے ایک حسرت زدہ سی سانس خارج کی۔

”مجھے عہدے کا کوئی لالچ نہیں سرا“ میں نے کہا۔ ”میں اب بھی خود کو وطن عزیز کا ایک ادنیٰ سپاہی سمجھتا ہوں.....“

”آخر ایک گمنام سرفروش سپاہی کے بیٹے جو ہوئے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ان کے لہجے میں فخر تھا۔ میں بھی مسکرا دیا۔

”سرا! آپ سے چوہدری ممتاز کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔“ بالآخر میں اصل موضوع کی طرف آتے

کرتے رہتے ہیں۔ پھر چاہے جتنی بھی عدالتیں بن جائیں، احتسابی کمیٹیاں قائم کر دی جائیں، تحقیق اور تفتیشی جوڈیشل اکیڈمیاں بن جائیں، حد تو یہ کہ انہیں سزا بھی مل جائے مگر اصل احتساب وہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے ملک کی لوٹی ہوئی دولت بھی واپس لینی چاہیے۔ بس! سمجھو یہی معاملہ چوہدری ممتاز کے ساتھ دراز رکھا گیا۔ تاہم اس کی رہائی مشروط اور کچھ قدغنوں پر رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی پارٹی سے پندرہ سال تک علیحدہ اور ہر طرح سے غیر فعال رہے گا اور کسی بھی حوالے سے کہیں بھی اس کا نام تک نہیں آئے گا۔

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ”وزیر جان کے سلسلے میں کیا حکمت عملی جوڑی گئی تھی؟“

”ایک اشتہاری مجرم کی تلاش۔“

”کیا اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی؟“

”ہاں! جب تک میں اپنے عہدے پر رہا، میں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ انہی دنوں مجھے کچھ ایسے شواہد ملے تھے کہ وہ ملک سے فرار ہو چکا ہے۔“

”آپ کی رٹائرمنٹ ایڈمنسٹریشن کراؤنڈ میں کی گئی تھی یا جبری تھی؟“ میں نے پوچھا۔ وہ میرے سوال پر ہلے سے مگر ادا دیے۔

”مجھے تم سے اس سوال کی پوری اُمید تھی۔ بس! جانے دو اس بات کو۔۔۔۔۔ منہ کھلے گا تو بہت کچھ کھل جائے گا۔ یہاں پھر وہی مصلحت کوئی بات آجاتی ہے کہ ایسی کڑوی گولیاں کھنی پڑتی ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ میں وزیر جان کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اسپیکر نام کا ایک ذوق چف ہے۔ مقامی سطح پر وہ اسپیکر نام کو پھر سے فعال کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہی نوشاہی کی پشت پناہی اور اسے ہر طرح سے سپورٹ کر رہا ہے۔ چہرہ بدل گیا ہے، باقی سب وہی چل رہا ہے سر۔۔۔۔۔! مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ مجھے ایک دم جوش سا آ گیا۔

”میں اب بھی ایک پاور ایجنٹ ہوں۔۔۔۔۔ اور کسی مصلحت کو خاطر میں لانے بغیر ایسے ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کرتا رہوں گا۔۔۔۔۔ چاہے پردہ زنگاری کے پیچھے ہی سہی۔۔۔۔۔“

ریاض صاحب میری طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھتے رہے۔ تمویذ دیر بعد ہم وہاں سے نکل آئے۔

”اب کہاں کا ارادہ ہے؟“ اول خیر نے پوچھا۔ وہ کار کا اسٹیرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ ٹھیکہ عقبی سیٹ پر

ہوئے بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے رہائی کیسے مل گئی۔“

”مجھے تم سے اسی سوال کی توقع تھی۔“ وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولے۔

”سر! آپ خود اندازہ لگائیں، ہم صوبہ نے اپنی جانیں جو حکم میں ڈال کر اسے گرفت میں لیا تھا جبکہ وزیر جان کے کامیاب فرار پر مجھے آج بھی افسوس ہوتا ہے۔ تو یہ سب کیسے ہو گیا؟“

”بالکل اسی طرح برخوردار! جیسے پاور جیسے دنگ کو مصلحت ختم کرنا پڑا۔“

”میں سمجھا نہیں سکا! وہ تو ایک دوسرا معاملہ تھا۔ ہم اسے خفیہ نہ رکھ سکے تھے اور اس دنگ کی بنیاد ہی اسی پر تھی جو قائم نہ رہ پائی اور۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ کر فوراً بعد دوبارہ بولا۔ ”چوہدری ممتاز والا معاملہ اور تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں۔۔۔۔۔“

”شہری!“ ریاض صاحب نے میری بات کافی اور میں خاموش ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”گندہ بکسی جب بھی گندگی پر پیش ہے تو اپنا ایک پڑ بچا کے پیشتی ہے۔ اسی طرح ممتاز خان جیسے سیاست دان کرتے ہیں، وہ چاہے جتنا بھی گندگی میں تھڑ جائیں، اپنا ایک پہلو ہمیشہ بچا کر رکھتے ہیں اور وہ ہوتا ہے ان کا دوسرا چہرہ۔۔۔۔۔ جو سامنے ہوتا ہے، ہمارے آگے نہیں، اپنی اس عوام کے آگے جنہیں یہ بے وقوف بناتے ہیں اور پھر انہی کے کاندھوں پر بندوق رکھ کے گولی چلاتے ہیں۔ ان کے سامنے مظلوم بنتے ہیں دوہائیاں دیتے ہیں، فریادیں کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح دوٹ لینے کے لیے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں، بڑے بڑے ملکی مسائل کو حکومت میں آنے کے بعد منتوں میں بلکہ چنگیوں میں حل کرنے کے سنہری باغ دکھاتے ہیں۔ یہ بے وقوف عوام صرف اتنا سوچ لیا کریں کہ۔۔۔۔۔ چوہدری ممتاز خان جیسے سیاسی اور فصلی شیرے، ترقی بار حکومتوں میں آئے، ان کے ذاتی اثاثے کہاں سے کہاں جا پہنچے لیکن ملک کے لیے انہوں نے کیا کیا۔۔۔۔۔ ان کے اثاثوں کا گراف تو ہر دور میں اوپر جاتا رہا مگر ملک کی ترقی کا گراف مسلسل نیچے آتا رہا، کیا کرتے رہے یہ ملک و قوم اور اس کی عوام کے لیے؟ کہ آج عام طبقہ پانی اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتوں تک سے محروم ہے۔ مگر افسوس کہ یہی لوگ انہیں بچاتے ہیں۔ اپنی عوامی طاقت کو ایک غلط آدمی کے تحفظ اور اسے بچانے کے لیے صرف

براجان تھی۔

”نیل کوئی چلو.....“ میں نے کہا۔

”ادخیر.....“ وہ زیر لب بولا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی مسحتی خیز مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔

”کیا ہوا.....؟“ جاس اور کھاناور نیلی یاد آگئے.....؟“

”ادخیر.....“ کا کے! بڑا سانا ہے، بندے کے چہرے کے تاثرات بھانپ لینا خوب جانتا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ کوئی بڑی بات نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کسر نفسی سے کہا۔ ”خان جی کا جب بھی ذکر آئے تو یہ دونوں کردار از خود ذہنوں میں آتے رہیں گے۔“ میں نے کہا اور پھر دفعتاً مجھے ایک خیال آیا۔ میرا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”اول خیر.....! گاڑی موڑ لو.....“ میرے اچانک یہ کہنے پر وہ ذکر اڑا گیا پھر بولا۔

”ادخیر.....“ کا کے! کیا ہوا.....؟ ارادہ بدل لیا خان جی کے ہاں جانے کا.....؟“

”فی الحال تم عارفہ کی رہائش گاہ کی طرف چلو.....“

”ہم.....“ اول خیر کے منہ سے نکلا اور اس نے اسٹیرنگ موڑ کر راستہ بدل دیا۔

دن خوب چڑھا ہوا اور گرم تھا۔ کار میں اسے سی لگا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری کار عارفہ کی رہائش گاہ کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اول خیر کو ہدایت کی تھی وہ کار گیٹ کے بالکل قریب لے جا کر روک دے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا، میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ کار رکتے ہی، اندر بنے گاڑی کین کے چوکور خانے سے کسی نے کار کو اتنا قریب رکتے دیکھا اور فوراً ماؤزر ہاتھ میں تھاے گیٹ کے بٹنی دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے فوراً بعد اسی طرح کا دوسرا گن بردار بھی باہر برآمد ہوا۔ دونوں بٹنے کئے ”در بان“ تھے اور میرے لیے نئے تھے۔

”اوئے.....“ یہ کیا حرکت ہے؟ گاڑی اتنے قریب گیٹ کے کیوں روک دی ہے.....؟ پیچھے کرو.....؟“ وہ کوئی بد تمیز سا گاڑو تھا۔ یا پھر اسے کچھ زیادہ ہی ”با اختیار“ رہنے کا حکم ملا ہوا تھا۔

”ادخیر.....“ اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس نا بخوار اور بد تمیز گاڑو سے غصے سے لہجہ میں کہا۔

”کیا تم ہر آنے جانے والے مہمان سے اسی طرح

پیش آتے ہو؟“

”مہمان گیا بھاڑ میں.....“ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

”پہلے اپنی گاڑی پیچھے کرو اور پھر کار سے نیچے اتر کر بات کرو.....“ میں نے ایک سرد نظر اس پر ڈالی۔ اس کا دوسرا سانس ہی اس کے پیچھے نہایت محتاط انداز میں کھڑا ہمارے طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل گن تھی۔

میں نے اول خیر کو کار تھوڑا پیچھے سرکانے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریورس گیر ڈالا اور کار چند کڑ پیچھے ہو گئی۔

”اور..... پیچھے کرو.....“ وہ بد تمیز سا گاڑو پھر کڑک دار لہجے میں بولا۔ میں تب تک بھٹانے ہوئے انداز میں کار کا دروازہ کھول کر باہر اتر آیا اور اس تو مند گاڑو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”بس! اب بہت ہو گیا..... جتنی تمہاری اوقات ہے اتنا ہی پھیلو..... اندر میرا ایک بھتیجا اور سہیلی رہتے ہیں چلی اور دانی، ان سے کہو تمہارا چچا آیا ہے.....“

میرے جارحانہ انداز اور بارعب لہجے نے اُسے تھوڑا خفیف کر دیا پھر چچا اور بیٹی کے ذکر پر بھی وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ تاہم اس کی اگر پھر بھی کم نہ ہوئی۔ وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

”اپنا تعارف کرواؤ..... پہلے کبھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا گیا ہے.....“

”بچوں سے کہو تمہارا شہزی اکل آیا ہے..... وہ دونوں بھاگتے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔“

”شہزی.....؟“ وہ چونکا۔ میرا نام اس طرح زیر لب دہرانے پر میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگا کر اسے ”شہزی“ سے متعلق پہلے سے ہی کچھ بریفنگ دی جا چکی تھی۔ کیونکہ میری عقابانی نگاہوں نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ یہ دونوں رواجی قسم کے خان ٹائپ ڈنڈا بردار چوکیدار نہیں، بلکہ پروفیشنل گاڑو ڈیو بھی نہ تھے۔ ان سے مجھے ”کار پردازی“ کی بو آ رہی تھی۔

میری آہز رویش درست ثابت ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ چند قدم پیچھے بٹے اور اپنے ماؤزر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولے۔

”شہزاد احمد خان ہو.....؟“

”ہاں.....!“

”تب پھر آئے عیروں واپس لوٹ جاؤ.....“ اس کا

ماہنامہ سرگزشت کراچی مرگِ ناگہاں نمبر

**بے وقت موت نمبر نئے عنوان
اور نئی تحریروں کے ساتھ**

وہ جو بے وقت موت کا شکار ہوئے، جوانی میں
ملکِ عدم کے راہی بنے۔ نامور لوگوں کی روداد اور
کہانیاں، جو اپنی مختصر سی زندگی میں یادگار کام کر گئے۔

وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص

نا قابلِ فراموش خاص نمبر جسے مجلد کر آپ رکھیں گے۔

بہت جلد قارئین کی خدمت میں

”آپ کون ہو؟“ دوسری طرف سے اسی خاتون نے پوچھا۔ لہجہ سرد و سٹ تھا۔ یہ سب مجھے باہر سے اند تک کے کار پر دواز ایک ہی ”کلیئر“ کے گلے۔ یعنی ہدایت یافتہ۔

”میں ان کا اکل شہزی بول رہا ہوں۔۔۔۔۔“
 ”شٹ آپ! آئندہ فون مت کرنا۔“ خاتون نے ہم کو رابطہ منقطع کر دیا۔
 ”اسی وقت دوران کار میں اس کی سیٹ اس پر دواز ایک خاتون کو بین کراؤں۔“

”بھائی صاحب! بات کر رہی آپ نے؟“ مجھے اس طرح خالی فون تھا۔ یہ کچھ کر دوکاندار نے کہا۔

”جی، جی ہاں! شکریہ بھائی!“ میں نے قدرے چونک کر کہا۔ اسے پیسے دیے اور دکان سے نیچے اترا، اول خیر کار میں بیٹھا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
 ”خان جی کے ہاں چلو۔۔۔۔۔“ میں نے اسے فون والی خاتون کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

”او خیر۔۔۔۔۔ کا کے! یہ بھی کوئی لمبی کھیڑ معلوم ہوتی ہے۔“ اس نے کار ایک جھٹکے مئے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کھیڑ کیا ہوگی اول خیر!۔۔۔۔۔“ میں نے ایک گہری ہرکاری لیے ہوئے کہا۔

”عارفہ اپنے دونوں بچوں کو کرائے کے ٹوکے حوالے کر گئی ہے۔ انہیں سبق سکھانا کون سی معمولی بات ہے۔“

”او خیر۔۔۔۔۔ کا کے! ذرا ہتھ ہولار رکھ۔۔۔۔۔ ایک آئیڈیا ذہن میں آیا ہے میرے۔۔۔۔۔“ وہ پُرخیال سے لہجہ میں بولا۔

”بولو۔۔۔۔۔“

”آج خان جی کے ہاں جانے کا پروگرام بتوی کر دیتے ہیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”پہلے اس حرافہ عارفہ کی کٹھی میں داخل ہوا جائے اور پتا لگایا جائے آخر اندر وہ کون لوگ ہیں جو دونوں بچوں کے سر پرست بنے بیٹھے ہیں؟“

”کیا فرق پڑے گا اس سے۔۔۔۔۔؟“ میں نے پے پروا انداز میں کہا۔

”ایک بات کہوں شہزی کا کے! مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔“ اول خیر کی بات پر ہی نہیں اس کے لہجے نے بھی جانے کیوں مجھے لہجہ بھر کو چونکا دیا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اول خیر، بھیلہ کی

لہجہ پل کے پل جارحانہ ہو گیا۔ تب تک اول خیر بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔ وہ میری طرف سے اشارے کا منتظر تھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

”ستار! فوراً پولیس کو مطلع کرو۔۔۔۔۔“
 ستار نامی اس کا ساتھی۔۔۔۔۔ پلٹا۔
 ”اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے پل کے پل سوچے ذہن کے ساتھ کہا۔

”چلو۔۔۔۔۔“ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ ستار نامی وہ آدمی بھی جاتے جاتے رک کر پلٹا۔

اگلے چند سیکنڈوں میں ہم دوسری شاہراہ پر تھے۔
 ”او خیر۔۔۔۔۔! کچھ کڑ بڑکتی ہے کا کے!“ اول خیر نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم بولا۔

”کسی ایزی لوڈ والے کے پاس کار روکو۔۔۔۔۔“ اول خیر نے ایسا ہی کیا۔

”بی بی اوڈ کار وراج آج کل نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ورنہ گلی میں بی بی او نظر آیا کرتے تھے۔ ایزی لوڈ والوں کے پاس یہ سہولت بھی کھار دستیاب ہو جاتی تھی۔“

مجھے شبہ تھا کہ میں نے چونکہ بیکم دلا کے لیڈ لائن سے فون کیا تھا اسی لیے کسی نے جان بوجھ کر نہیں اٹھایا جس کا صاف مطلب تھا کہ اندران دونوں بچوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے ”کار پر داز“ مقرر کیے گئے ہوں گے، جنہیں خاص طور پر میرے سلسلے میں ”بریکنگ“ دی گئی ہوگی۔

ایزی لوڈ والے نے مجھے خبر ملا کر دیا۔ ان لوگوں کے پاس الگ تھلک بات کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ بس، وہیں کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے بات کرنا ہوتی تھی۔

دوسری طرف رنگ جاری تھی۔ نمبر اجنبی تھا اور یہی میں چاہتا تھا اسی لیے امید تھی کہ کال دوسری جانب سے ضرور ریسپونڈ جانی۔ تیسری تیل پر مجھے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ میرا غلط ذہن اس کی آواز اور لہجے سے کچھ ”اغذ“ کرنے لگا۔

”ہیلو، مجھے دانی سے بات کرنی ہے۔“

مجھے کچھ شیک اندازہ نہ تھا کہ گیٹ پر موجود اُن دونوں گاڑی نما کار پر دازوں نے ابھی میرے بارے میں اندر مطلع کیا تھا یا نہیں۔

بداد اس کو بھی کا انہوں نے کیا نام رکھا تھا)
 انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک اہم پارٹی اجلاس
 کے سلسلے میں نیلی کو بھی میں مقیم ہیں۔
 ڈرائیور جب تک ٹیکسی کو مین شاہراہ پر لے آیا تھا۔
 جب ہی میں نے اسے ملتان روڈ پر واضح نیلی کو بھی کے
 علاقے کا پتا بتایا اور اس نے رفتار بڑھا دی۔
 ”تقریباً نصف گھنٹے بعد ٹیکسی نے مجھے نیلی کو بھی کے پاس
 اتار دیا۔ میں نے کرایہ دے کر اسے فارغ کیا اور دیکھا کہ
 کو بھی کی شان ہی بدلی ہوئی تھی۔ جہاں پہلے نیلی کو بھی کے
 الفاظ کدھ ہوتے تھے وہاں اب کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔
 وہاں خان جی کی تصویر کے ساتھ پارٹی بینرز آویزاں نظر
 آرہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ خان جی پوری شدہ کے
 ساتھ دوبارہ سیاست میں اپنی دھڑی دے چکے تھے اور اپنی
 سیاسی ہم جوتی کا گڑھ اب شاید مستقل طور پر اسی جگہ کو بتایا
 تھا۔ وہاں سچ گاڑو کے علاوہ پارٹی ورکرز کی بھی چم چم
 دیکھنے میں آرہی تھی۔ عام انتخابات قریب تھے اور اسی لیے
 یہ سارا جوش نظر آتا تھا۔

لیکن..... اچانک مجھے چمکنا پڑا..... کچھ دوسرے
 زواہے سے مجھے چند ایک اور..... بھی پارٹی بینرز لگے دکھائی
 دیے جن پر دیگر پارٹی عہدے داروں کی بھی تصاویر نظر آتی
 تھیں، انہی میں مجھے ایک شناسا چہرہ بھی دکھائی دیا تھا اور
 مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں ڈرا اور قریب جا کے
 یہ غور دیکھنے لگا کہ کہیں یہ میری نظروں کا دھوکا نہ ہو۔ مگر ایسا
 نہیں تھا جو میں دیکھ رہا تھا، وہ سچ تھا۔

یہ ایک خاتون کا پڑجوش اور دھواں دھار تقریر کرتا
 ہوا چہرہ تھا۔ میں اس چہرے کو بھلا کیسے فراموش کر سکتا تھا۔
 اس چہرے کے ساتھ تو میری بہت سی..... ہمیائیک اور جاں
 کسل یادیں وابستہ تھیں۔ صرف یادیں ہی نہیں بلکہ اس کے
 ساتھ ایک اور..... مظلوم چہرہ بھی وابستہ تھا، اور اصل حوالہ
 وہی مظلوم چہرہ تھا۔ وہ بد نصیب آسیہ کا تھا۔ جو ہر سے مجھ
 سے سوال پوچھتا محسوس ہوتا تھا کہ..... ”شہزی! میں ظلم و
 جبر کی تاریک ہمیائیک راتوں میں بڑی بیدردی کے ساتھ
 روندھ دی گئی، ماردی گئی..... اور میرا قاتل چوہدری ممتاز
 ابھی تک زندہ ہے، اور..... تم بھی زندہ ہو.....“ بس! خط
 بھی ایک سوال ہوتا اس بد نصیب کے نظر آنے والے
 چہرے پر۔

جس خاتون کی تصویر میں نے بینرز پر دیکھی تھی، وہ
 آسیہ کی باقی یعنی اس کی بڑی بہن ایڈووکیٹ خانم شاہ کی

طرح ہی کبھی کبھی دور کی کوڑی لا تھا۔
 ”تم ایک فضول ہم جوتی میں وقت برباد کرنے کی
 بات کر رہے ہو اول خیر.....!“ پچھلی سیٹ پر کافی دیر سے
 خاموش بیٹھی ٹھیکہ نے پہلی بار لب کشائی کی۔
 ”یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے اور اتنا ضروری بھی
 نہیں۔ پہلے ہمیں خان جی سے مل لینا چاہیے۔ ممکن ہے
 نو شاہ وغیرہ سے متعلق کوئی نئی بات سامنے آئے۔“ اس کا
 مشورہ بھی غلط نہ تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ مجھے اول خیر کی
 دال میں کالا ہے والی بات نے شہجے میں ڈالی دیا تھا۔
 ”ٹھیکہ! اول خیر کی بات نے مجھے واقعی ایک بے چینی
 میں جھلک کر دیا ہے۔ اب پہلے اسی بات کا کوئی لگاتے
 ہیں۔“

”خیر اتو ہے ہی ایک بے چینی روح.....“ ٹھیکہ
 نے ہنس کر کہا۔ وہ اسے ”خیر“ ہی کہتی تھی، اور اول خیر اسے
 ’نازی کی نیگم یعنی نازک نیگم۔“
 ”جی نازی کی نیگم! اچھا بے چینی روح ہوں تو آپ کیا
 ہیں محترمہ! ایک چڑیل.....“

”چڑیل تو خیر میں نہیں ہوں، تم ایک بد روح ضرور
 دکھائی دیتے ہو۔“ وہ بولی۔
 ”اول خیر! گاڑی روک دو.....“ میں نے فوراً کہا۔
 ہم کو بھی سے دور آگئے تھے۔ یہاں ایک مختصر سا چرہا تھا۔
 میں نے دونوں سے کہا۔

”ایک کام تم دونوں کے سپرد کر رہا ہوں، بہت توجہ
 اور ہوشیاری سے انجام دینا ہوگا۔ کو بھی کی خفیہ عمرانی کرو اس
 وقت تک جب تک کچھ کوئی اندر سے گاڑو کے علاوہ برآمد نہ
 ہو..... اس کی تصویر اتارنا اور اس کا پیچھا کرنا، مزید اس
 سلسلے میں جو کر سکو کر کے مجھے نیگم ولا آکر رپورٹ دو.....“
 ”مگر تم.....؟“ ٹھیکہ بولی۔

”میں ٹیکسی لے لوں گا اور خان جی سے ملاقات کر
 کے پیگم ولا پہنچ رہا ہوں.....“
 ”او خیر.....!“

کار سے اترتے ہی مجھے اول خیر کے ہولے سے
 بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک ٹیکسی کروائی اور
 اسے مین شاہراہ پر آنے کا کہہ کر جب سے سب فون نکالا جو
 زہرہ بانو نے مجھے عارضی استعمال کے لیے دیا تھا۔ میں نے
 خان جی سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں مل سکتے
 ہیں؟ شکر تھا کہ وہ اپنی جاگیر کھلاں والی کے بجائے نیلی کو بھی
 میں ہی تھے۔ (مجھے نہیں معلوم تھا کہ نیلی کو طلاق دینے کے

تھی۔

نے جائے بنا کر ایک نفیس کپ میں نہایت احترام کے ساتھ مجھے تھمادی۔ یہ وہ کمر تھا جہاں خان جی اپنے خاص مہمانوں سے ہی ملاقات کرتے تھے۔ اسی اثنا میں فرید مسکراتا، داخل ہوا۔

”شہزی صاحب! خان جی ابھی تھوڑی دیر میں تشریف لاتے ہیں، آپ جب تک چائے پیئیں۔“
 ”شکریہ۔“ میں نے مختصر اُکھا۔ وہ لوٹ گیا۔ چائے ختم کر لی میں نے تو خان جی بھی آگئے۔ میں انہیں دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے پہلے سے خاصے کمزور نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو پھیلانے میری طرف بڑے اور میں ان کی طرف..... ایک گرجش معانہ ہمارے درمیان ہوا تھا جس کا دورانیہ کی منٹوں تک رہا تھا مجھے اپنے ساتھ لگان کا وجود ایک جذباتی سے ارتعاش محسوس ہوتا رہا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے یار..... تم.....؟ کتنا انتظار مجھے تمہارا.....“
 ”وہ مجھ سے الگ ہو کے میرے دونوں بازوؤں کو تھام کر مجھ سے بولے۔ میں جب بھی اسے اپنے ساتھ اس طرح کے پیار بھرے جوش انداز میں ملنے دیکھتا تھا تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ وہ کبھی ایک جوان بیٹے کا باپ ہوا کرتا تھا۔ شفقت راجہ کے اندر ہٹا ک قتل کے بعد یہ میرا جانی دشمن بن گیا تھا مگر آفریز ہے اس شخص پر کہ اس نے انتقام میں اندھا اور جوش جذبات سے کام لینے کے بجائے ہوش و حواس سے جلد ہی بہت چلا لیا تھا کہ یہ شخص اس کی غلط فہمی تھی، اس کے بیٹے کا قاتل میں نہیں بلکہ چوہدری ممتاز اور اس کے حواری تھے۔ تب اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس وقت کے بعد سے وہ مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔“

”میں نے تمہاری پریس کانفرنس سنی اور دیکھی تھی۔ بہت بڑے کارنامے انجام دے کر آئے ہو تم۔“ خاص کر طلسم نور ہیرا..... اور نو شاپ اور اس کے باپ چوہدری ممتاز کے خلاف اور اسے دوبارہ سزا سننے لانے کا عزم..... واہ بھی واہ..... دل خوش کر دیا۔ اُن دونوں باپ بیٹی کو تو بے چینی کھا گئی ہوگی۔“

ان کی بات پر میں مسکرا کر رہ گیا۔
 ”ارے تم نے کچھ کھایا ہی نہیں؟“ وہ چونک کر بولے۔
 ”بس! چائے کا ہی دل چاہا تھا، مجھے ذرا جلدی بھی

”ہم..... تو گویا اس نے خان جی کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔“ میں دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ جس پر مجھے حیرت تھی اور اتنی ہی اُچھن بھی کہ خان شاہ کی تو بائیس میں خان صاحب سے اچھی خاصی خاصیت چلی آ رہی تھی بلکہ وہ تو اس کے آدمیوں کے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر اسپتال بھی جا پہنچی تھی۔ اس لڑائی کی وجہ بھی اگرچہ میں ہی تھا جب خان شاہ اپنے مفاد کی خاطر مجھے پولیس کو رضا کارانہ گرفتاری کے لیے بہ ضد تھی مگر خان جی اور میں نے اس کی جو بڑھکاوادی تھی۔ وہ بھی اپنی ہٹ پر قائم تھی اور اس نے دھمکی دے ڈالی تھی وہ پولیس کو بتا دے گی کہ میں خان جی کی رہائش گاہ پر چھاپا بٹھا ہوں جس پر خان جی تپ گئے تھے اور یوں خان شاہ لڑائی میں زخمی ہو گئی تھی تب بھی میں نے ہی اس کی جان بچائی تھی۔ مگر..... اب اسے خان جی کی پارٹی میں ایک عہدے دار کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے شدید حیرت آمیز اُچھن ہوئی تھی۔ ایک ہی جواب اس کا میرے ذہن میں آتا تھا کہ کیا خان شاہ اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے..... کسی سیاسی پلٹ فارم کی ضرورت کو محسوس کر رہی تھی؟

مجھے گیٹ پر ہی شناخت کے لیے روک لیا گیا تو میں نے خان جی کے پرسنل نمبر پر اُن سے رابطہ کر کے اپنے بارے میں بتایا تو انہوں نے فوراً ہی اندر سے اپنا کوئی خاص بندہ باہر بھیج دیا۔ اسے دیکھ کر گارڈ فوراً دائیں بائیں ہٹ گئے۔ وہ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھ سے ملا اور اندر لے گیا۔

ایک طرف پارٹی در در کو کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا جا رہا تھا جہاں عارضی چولہے بنا کر دیکھیں چڑھا رکھی تھیں۔ مجھے لانے والا ایک دیلا پتلا مگر خاصا پُر جوش سا میری ہی عمر کا ایک گورا چٹا خوب رو جوان تھا۔ جس نے مجھے اپنا نام فرید بتایا تھا۔ وہ مجھے اندر ایک آرام دہ کمرے میں لے آیا۔ میں اس کمرے کو چھاننا تھا، یہ نشست گاہ سے ملحقہ کمر تھا۔ اس طرف سے مجھے لوگوں کے شور اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ خان جی نے مجھے اس کمرے میں کیوں بٹھایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک درمیانی عمر کا شخص ٹرائی دھکیلے اندر داخل ہوا۔ مجھے صرف چائے کی طلب ہو رہی تھی اسی لیے میں نے اس سے یہی فرمائش کر ڈالی، اس

خالہ

خاتون کو دہلیس بچے لیے فارمشی میں آئیں۔ وہ بچے کا وزن کرنا چاہتی تھیں۔ سلیزین نے بتایا کہ بچوں کا وزن کرنے کی مشین مرمت کے لیے گئی ہوئی ہے۔ بڑی مشین پر ماں اور بچے کا وزن کر کے اس میں صرف ماں کا وزن کھٹا دیا جائے تو آسانی سے بچے کا وزن معلوم ہو جائے گا۔

خاتون نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بے کار ہے..... کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میں بچے کی ماں نہیں، خالہ ہوں۔“

کراچی سے میونسٹریز کا عذر

موڈ میں نہیں تھے مگر میں پھر کبھی آنے کا وعدہ کر کے لوٹ آیا۔ انہیں حیرت تھی کہ میں ٹیکسی میں آیا تھا۔ دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئے تو انہیں یہ پتا چلا تھا۔

”کمال ہے، کیا زہرہ بیگم کے پاس گاڑیوں کی کمی ہو گئی ہے؟“

”ایسی بات نہیں، اکل!“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ کچھ سامی تھے، انہیں اچانک کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا، گاڑی وہ لے گئے تھے، میں ٹیکسی میں آ گیا۔“

خان جی نے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت مجھے دے دی مگر میں نے معذرت کر لی۔

”کیا بات ہے، بہت غیریت برتنے لگے ہو.....“ وہ

شکایتی لہجے میں بولے۔ میں مسکرایا اور رسان سے بولا۔

”ایسی بات تو نہیں اکل، دراصل مجھے دو ایک اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔ بلاوجہ فکر رہے گی، ٹیکسی کروا دیں یہی بہت ہے۔“

انہوں نے ٹیکسی کروادی اور ڈبل کرایہ ٹیکسی والے کو

دے دیا کہ میں اسے جہاں کہوں وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں ہسٹری

سائنس بھر کر رہ گیا اور ان سے رخصت ہو کے چلا آیا۔

میری توقع کے خلاف خان جی سے ملاقات بہت مختصر

رہی۔ شاید ایک وجہ تو یہی تھی کہ وہ اپنی انتخابی مہم میں مصروف

تھے اور میں نے بھی ان کا زیادہ وقت لینا مناسب نہیں سمجھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ انہوں نے مجھے کچھ خاص باتیں نہیں بتائی

تھیں جن کی میں توقع کیے ہوئے تھا۔ ان کی تاج میں سب

ہے، بس! ابھی آپ کو سلام کرنے آیا تھا، پھر کبھی تصدیق ملاقات ہوگی.....“ میں نے رخصت ہونے والے انداز میں کہا تو وہ پریشان سے ہو گئے، بولے۔

”ارے..... رہے..... نہیں بھی، تم اب کچھ روز

ادھر ہی رہو گے..... دیکھ نہیں رہے ہو..... کیسی ہنگامہ خیزی

پال رہی ہے میں نے..... کیسے کیسے لوگ میری پارٹی میں

شمولیت اختیار کرنے لگے ہیں..... سیاست میں بھی ہوتا

ہے، کسی کی مخالفت میں کسی کا فائدہ..... مجھ تو یہی فائدہ ہم

اٹھا رہے ہیں..... ہمیں سپورٹ بھی ہے.....“ آخر میں

انہوں نے مجھے مفتی خیز انداز میں آنکھ ماری تھی اور میں تھوڑا

چونکے پتا نہ رہ سکا۔ ذہن میں ہنوز خانم شاہ کا نام گردش کر رہا

تھا۔

”میں تو تمہیں بھی اپنی پارٹی میں ایک بڑا عہدہ دے

کر شامل کرنا چاہتا ہوں..... تمہاری انٹری بڑی دینگ اور

دشمنوں کی نیندیں اڑا دینے کے لیے کافی ہوگی اور اگلے

ایکشن میں ہماری جیت یقینی کی ضمانت بھی.....“

نجانے کیا بات تھی آج زیر خان المعروف خان جی

مجھے اور ہی رعب میں نظر آ رہے تھے۔ آخر انہیں کس کی

سپورٹ حاصل ہوئی تھی؟ یہ اتنے بڑا امید اور پرجوش کیوں

تھے؟ میری اور چوہدری ممتاز بہ شمول اس کی بیٹی نوشابہ کی

دشمنی سے یہ کس قسم کا فائدہ اٹھانے کی سوچے ہوئے تھے؟

میں ایک دم محاط ہو گیا اور بولا۔

”خان صاحب!“

”اوندہ..... تو خان صاحب! کتنی بار کہا ہے، مجھے

صرف اکل کہو.....“ وہ ہنسنے۔

”معافی چاہتا ہوں، اکل! میں سیاست بازی سے

ورہی رہتا چاہتا ہوں، یہ میرے قبیل میں ہے نہ ہی بس

میں.....“ میں نے جواب دیتے ہوئے فوراً موضوع بدلا اور

خانم شاہ کا ذکر کر ڈالا۔ وہ ہنسنے۔

”تو تم نے اس کی باہر بیئر پر لگی تصویر دیکھ لی.....

نہ حال ہی میں ہماری پارٹی جو ان کی ہے.....“

”بہت اچھی بات ہے.....“ میں نے کہا۔ ”لیکن.....

مرت ہوئی..... خانم شاہ تو آپ کو اپنے دشمنوں کی قطار میں

مشتاق آ رہی تھی اور آپ پر کیس ٹکرنے کی تیاری میں تھی۔“

”اُسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا تھا۔“

”اچھی بات ہے، خوشی ہوئی یہ سن کر.....“ میں نے

لے سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے رخصت کرنے کے

کچھ وہی تھا جو میں بھی جانتا تھا، جبکہ ایڈوکیٹ خانم شاہ کی ان کی پارٹی میں شمولیت نے مجھے جانے کیوں ایک ماسٹروں کی آجمن میں جتلا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خان جی نے کسی ”سپورٹرز“ کا ذکر کیا تھا اور اس بارے میں خود میں بھی جتس میں جتلا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بات بری لگی تھی کہ خان جی نے میرے استفسار کے باوجود مجھے اس کا نام بتانے سے گریز کیا تھا۔ وہ آخر اپنے سپورٹر کا نام مجھ سے کیوں مخفی رکھنا چاہتے تھے؟ کم از کم مجھے تو بتا دینا ہی چاہیے تھا جبکہ ہم نے پہلے بھی بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

چنانچہ اب یہاں کون سی نئی مچھڑی کینے لگی تھی، میں اپنے ذہن کو زیادہ الجھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کس وقت میرا امریکاروانگی کا پروانہ جاری ہونے والا تھا۔ میں کسی نئے جھڑے میں ٹانگ اڑانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کم از کم خان جی کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ میں نے اول خیر اور ٹھیکہ کے متعلق اندازہ قائم کرنا چاہا کہ انہوں نے اب تک اپنے حصے کا کتنا کام منٹایا ہوگا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ وہاں سے کوئی خاص پیش رفت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ مجھے انہیں عارفہ کی کوئی کے قریب چھوڑے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ لہذا میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو عارفہ کی کوئی کے علاقے کا نام بتا دیا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔

آدھے گھنٹے بعد میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ ٹیکسی والے کو میں نے روانہ کر دیا اور خود مشرگشت کے انداز میں چلتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں میں نے ان دونوں کو کارسیت چھوڑا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرانی ہوئی کہ کارسیت دونوں ہی وہاں سے غائب تھے جس کا صاف مطلب تھا انہوں نے یقیناً عارفہ کی کوئی سے کسی مٹھوک شخص کو نکلنے ہوئے دیکھا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ ضرور ان کے تعاقب میں گئے ہوں گے، لہذا اب وہ اپنا ”کام“ منٹانے کے بعد سیدھا ٹیکم و لا کا ہی رخ کریں گے۔

میرا اب یہاں کھڑے رہنے کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ میں ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑا ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار مجھے نظر آئی، اس کا رخ عارفہ کی رہائش کی طرف جانے والے راستے پر ہی تھا جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ اس میں دو افراد سوار تھے۔ میری محتاطی نظریں نے فوراً انہیں تاڑنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی ہنڈا سی تھی۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اندر شاید اسے سی آن تھا۔ ایک تو ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر میں

کوئی سوٹ پوش شخص بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بھاری لادو چہرہ پر کھنی موچیں تھیں، رنگ سالو لاف تھا، میرے لیے دونوں کی صورتیں اجنبی تھیں۔ کار ایک موٹر پر غائب ہو چکی تھی میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس طرف کو گیا تو میرا اندر درست ثابت ہوا۔ کار عارفہ کی کوئی کے گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔ میں ہونٹ پیچھے سوچتا رہ گیا کہ یہ دو افراد کس تھے؟ آخر عارفہ کی کوئی میں..... اس کی غیر موجودگی میں گل کھلایا جا رہا تھا؟ مجھے ماسٹروں سے جتس نے بے چھٹو دیا اور میں نے درست ٹیکم و لا جانے کا ارادہ لٹوی کر دیا مجھے جانے کیوں والی اور چکی کی فکر لگتی ہوئی تھی۔ والی اور چکی سے میرا رشتہ بڑا جذباتی تھا۔ وہ دلو بھی مجھ سے ایسا ہی لگاؤ رکھتے تھے۔ جبکہ سرد بابا (س منظور وژانج) کے الفاظ بھی مجھے یاد تھے کہ ”شہزی بے میرے ان دونوں بچوں (پوتے پوتی) کا خیال رکھتے، جب تک عارفہ جیسی ناکن اور نوید سانچے والا جیسا سانچہ زاحیہ یہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں..... اور میں نے سرد بابا سے وعدہ کر لیا تھا۔

یہ تو خیر حقیقت ہی تھی کہ عارفہ بھی اپنے بچوں کا نہیں سوچے گی مگر نوید سانچے والا ایک زہریلا سانچہ تھا۔ قول سرد بابا یا مرحوم کہ، وہ بد بخت ان کی بیوہ بہو عارفہ بھکائے ہوئے تھا اور وہ اس کے بھکادے میں آئی ہو تھی۔ جبکہ تنہائی کی ماری ہوئی عارفہ کی آنکھوں پر جذباتیت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مکار نوید اس کی کمزوری سے مہل رہا تھا۔

کار اندر داخل ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اب کیا کروں.....؟ بالآخر میرے اندر کی بے چھ نے مجھے دھکیلا کہ چاہے کچھ بھی ہو..... اندر جا کر دیکھ چاہیے کہ یہ سارا معاملہ کیا تھا؟ آخر عارفہ اپنے دونوں بیٹے ابھر بچوں کو کن لوگوں کے حوالے کر کے اپنے نئے شوہر۔ ساتھ ہیرون ملک ہئی مون کے لیے گئی تھی؟

یہ تہیہ کرنے کے بعد میں ابھی اپنی پیش قدمی کا جائز لے ہی رہا تھا کہ اچانک میں چونکا۔ گیٹ سے وہی کا دوبارہ پر آمد ہو رہی تھی۔ اتنی جلدی اس کی واپسی کی بجائے توقع نہ تھی، میں ایک اور پٹنگ کی دیوار کے سرے پر کھڑا تھا۔ پوش علاقہ ہونے کے باعث اطراف میں سناٹا پھیلنا ہوا تھا۔ کار میں وہی ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی جہاں میں نے اس سوٹ پوش موچیل کو براجمان دیکھا تھا۔ البتہ عقی سیٹ پر میں چکی کو بیٹھے دیکھ کر بری طرح چونکا۔

سمنے بعد بریک ہوگی تو دیکھا جائے گا۔

مجھے منتظم کا رویہ کچھ روکھا سمجھوس ہوا۔ وہ ایک ہماری جسامت کا عمر رسیدہ شخص تھا۔ کرخت مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر جانے کا کہا کہ آپ باہر کہیں کھڑے ہو کر انتظار کر لیں۔ مجھے غصہ تو آیا مگر میں پی گیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کمرے سے نکل کر باہر جانے کے بجائے دائیں جانب بنے کوریڈور کی طرف ٹھوم گیا، یہاں ٹھنڈے پانی کے دائرہ پھیر رکھے تھے، میں بظاہر پانی پینے کے بہانے اس طرف مڑا تھا مگر مقصد میرا اس کھڑکی کے قریب آنا تھا جو منتظم کے کمرے میں کھلتی تھی۔ جس کا نظارہ میں اندر سے کر چکا تھا۔ وہ حقیقت مجھے اس کے رویے نے چونکا دیا تھا۔ کچھ شے کی بو مجھے آئی تھی یا کوئی ایسی کھنک جانی تھی کہ یہ مجھے اپنے کمرے سے اس طرح روانہ کرنے کے بعد کیا کرتا ہے؟

”ہیلو، باہر ایک لمبا چوڑا اور اساتر سانو جوان کھڑا ملے گا تمہیں..... جس نے سیاہ جینز اور میرون کمر کی چست پینٹ پہن رکھی ہے۔ اس پر نظر رکھنا۔“ میں نے کھڑکی کے قریب سرک کر اس کی باتیں سنیں اور مجھے سانس سونگھ گیا۔

”ہاں..... ہاں! ابھی نظر آجائے گا، ابھی تو میں نے روانہ کیا ہے اسے اپنے کمرے سے.....“ منتظم بولا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہیل فون پر کسی سے رابطہ کیا۔

”ہیلو، ہاں، راضو صاحب! ابھی ابھی ایک مٹھوک سامعہ سحر سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ اپنا نام صرف شہزادی بتایا ہے۔ مگر میں نے اسے نہیں ملنے دیا ہے ابھی تک..... جی شیک ہے آپ آجائے، مگر خیال رکھیے گا کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہو..... آپ کی ہدایت بھی اسی لیے آپ کو اطلاع کر دی..... ساکھ کا معاملہ ہے یہ..... جی جی! بہت بہت شکریہ..... آپ کی مہربانی ہے۔“

اس کی باجھیں پھینکتی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کسی راضو نامی شخص نے اسے پنگی سے متعلق خطاط کر رکھا تھا اور اس میں یقیناً اس نے انجام کا بھی لالچ رکھا ہوگا۔ گویا میری جھنک کوئی سے نکل کر چار دایک پھیل گئی تھی۔ راضو نامی شخص کون ہو سکتا تھا؟ غالباً یہ نوید پا عارف کا ہی رکھا ہوا آدمی ہو گا۔ جو دونوں بچوں کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہو گا۔ مگر کیوں.....؟ ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ انہیں یہ قدم اٹھانا پڑا۔ ایک اور خیال ذہن میں آتا تھا کہ کیا خبر یہ عارف کے بجائے صرف سیٹھ نوید سانچے والا کی ہی کارستانی ہو مگر کیوں.....؟ اس کیوں کا جواب خاصا سراسر ابھرا محسوس ہو رہا تھا۔

”یہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟“ ایک دم میرے ٹھکے ہوئے ذہن میں سوالیہ نشان ابھرا۔ میں بے چین ہو گیا۔ کار میں شاہراہ کی طرف جارہی تھی، میں راستہ کاٹ کر دوڑا..... اور ایک ٹیکسی والے سے بات کر کے اسے ایک متوقع راستے پر پہنچنے کا کہا۔ وہ حیران اور پریشان ہوا کہ نجانے یہ کیا معاملہ تھا مگر میں نے اپنا کارڈ شوکر کے اس سے کہہ دیا کہ میں خفیہ پولیس کا تجربہ ہوں، وہ بے فکر رہے اسے منہ مانگا کرایہ ملے گا۔ وہ بھی کوئی من مو جی سا آدمی تھا، بولا۔

”ادبی..... سیدھا کرایہ ہی مل جائے، یہی بہت ہے۔“ وہ شاید پولیس والوں سے نالاں نظر آتا تھا۔

”ملے گا..... چلو۔“ میں نے فوراً کہا اور اسی وقت متوقع راستے پر میں نے اسی ہنڈا کار کو نمودار ہوتے دیکھا۔

”وہ دیکھو، سیاہ ہنڈا..... اسی کا بڑی ہوشیاری سے خائب کرتا ہے جہاں یہ رکے وہاں ذرا فاصلے سے مجھے بھی تار دینا، پھر تم فارغ.....“ میں نے اس سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔

کار میں روڈ پر آکر فرمائے بھرنے لگی۔ روڈ میں ریفک بھی تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اس کار کو کھونہ سے مگر وہ بھی ہوشیار آدمی تھا۔ ہنڈا کا تعاقب کرتا رہا۔ ایک دو بار تو کار نظروں سے اوجھل بھی ہوئی مگر ڈرائیور نے سے جلد ہی جا لیا تھا۔ یہ سفر کم دیش پندرہ سے تیس منٹ اری رہا اور جب میں نے دیکھا کہ کار ایک کوچنگ سینٹر کے سامنے رک گئی ہے تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ گویا ٹی کی کوچنگ کی کلاس تھی۔ میں نے ٹیکسی روکنے کا کہا اور ڈرائیور کا شکریہ کے ساتھ کرایہ ادا کر کے اسے چلتا کر دیا۔

ہاں اور بھی گاڑیاں موجود تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا رہا۔ ٹی کار سے اتری۔ اس کے کاندھے پر شو لڈر بیگ تھا وہ در چلی گئی تو کار حرکت میں آگئی۔ جب وہ نظروں سے بھل ہو گئی تو میں آگے بڑھا اور کوچنگ سینٹر میں داخل ہو لیا۔ یہ خاصا مہنگا اور مشہور کوچنگ سینٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس عمارت بڑی اور جدید اسٹائل کی بنی تھی۔

ایڈمنسٹریٹو کے کمرے میں پہنچ کر میں نے سحر سے ملنے کی درخواست کی۔ پہلے تو مجھ سے میرا نام اور پہلی سحر سے میرا تعلق پوچھا گیا۔ پھر کہا گیا کہ ہم اسے ملاز دے دیں گے۔ اگر اس نے آپ کو پہچان لیا تو شیک ہو ورنہ..... آپ چا سکتے ہیں۔

وہ پرسہل یا منتظم ٹائپ کا کوئی شخص نظر آتا تھا۔ تاہم مانے آخر میں یہ کہا تھا کہ ابھی تو کلاس ہو رہی ہے، ایک

”مجھے معلوم ہے اکل!“ وہ غمناک آنکھوں سے ہر چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

”اکل! اما اور اس گندے آدمی نوید نے ہمارے حفاظت کے نام پر مدعا ش لوگوں کو ہماری نگرانی پر رکھا ہے، یہ بات مجھے اور دانی کو بالکل بھی پسند نہیں۔ دانی تو جوڑ ہے وہ ان سے لڑ بھی پڑتا ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں، مگر ان کے منہ لگے لیکن شہزی اکل! مجھے ایک بات پر بڑا تشویش ہے۔“ اس نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا جہر میں چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”ہنکی مجھے کافی سمجھ دار نظر آ رہی تھی۔ وہ اب بچنے۔ لو کہیں... میں داخل ہو رہی تھی۔ بالکل ایک پیاری سی اور دارین ایچ لڑکی کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔“

”شہزی اکل! بھائی تو نہیں البتہ میں ان لوگوں کا باتیں چپ کر سکتی رہتی ہوں، چاہتی تھی کہ کاش کوئی ہمارا مدد کو آ جائے۔ آپ تو اس برے وقت میں بہت یاد آئے تھے ہمیں..... مگر میں نے یہ بات دانی ہی کو نہیں بتائی ہے کیونکہ وہ غصے والا ہے اور مجھے ڈر ہے کہیں جوش میں منہ نہ کھول دے، اس لیے میں نے یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھی تھی۔“

”کیسی بات.....؟ جلدی بتاؤ مجھے..... وقت کم ہے بی بی!“ میں نے بے چینی سے کہا۔ میں نے دیکھا اس معصوم سا چہرہ متفکر اور سراسیمہ سا نظر آنے کا جیسے وہ یہ بات بتاتے ہوئے بھی خوف زدہ ہو، تاہم ایک ایک کر بولی۔

”شہزی اکل! وہ..... مم..... اما کی جان سخت خطرے میں ہے.....“

”کیا.....؟“ میری دونوں بھوسیں سکڑ گئیں..... ٹھیک اسی وقت ہنکی کے حلق سے دہلی دہلی چیخ سی خارج ہو گئی، میں چونکا۔ اس کی آنکھوں میں ہل کے ہل خوف اُتر آیا تھا اور وہ میرے عقب میں لگا ہیں جھائے ہوئے تھی۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔

کورڈ کے سرے پر جہاں زینہ تھا، وہی سوٹ بوٹ والا موچیل شخص کھڑا ہماری طرف زہر خند نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہمراہ نیلی وردی میں ایک کارڈ بھی کھڑا تھا وہ دونوں بیک وقت ہماری طرف بڑھے تھے.....

میں نے اس راٹھور نامی شخص کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش چاہی، کہیں یہ وہی سوٹ بوٹ اور موچیل شخص تو نہ تھا جسے اسی کار میں، میں نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا؟

میں نے ہل کے ہل کچھ سوچا اور پھر جلدی سے پانی پینے کے لیے ایک واٹرڈ سنسری طرف بڑھا۔ کیونکہ میں نے وہاں ایک نیلی وردی والے چوکیدار کو دیکھا تھا جو اسی طرف آ رہا تھا۔ وہ مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف بڑھ گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، سمجھ نہیں آ رہا تھا مجھے کیا کرنا چاہیے، یہاں بھی دال کی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تب ہی میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور پلٹ کر تیزی سے زینے پر چڑھ چلا گیا، جہاں کلاس روم کے طور پر مستعمل کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں اب ایک ایک کمرے میں کھڑکی کے راستے جھانکنے لگا۔ کلاس ہو رہی تھی۔ میں اسی طرح کسی کی نظروں میں آئے بغیر ایک ایک کلاس میں جھانک رہا اور دفعتاً چونکا۔ کھڑکی سے دو بچپن چھوڑ کر میں نے ہنکی کو بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ ڈیسک ٹیبل پر جھکی کچھ لکھنے میں مگھی۔ لیکن ہورہا تھا۔ اس نے ایک بار سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف منہ لے جا کر ہولے سے اسے آواز دی۔ چند ایک اسٹوڈنٹس نے میری طرف دیکھ کر منہ بنایا۔ ہنکی پہلے تو مجھے پہچان ہی نہ سکی۔ پھر جب پہچانی تو اس کا منہ بکھٹ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میں نے اسے کلاس روم سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور درہٹ گیا۔

مجھے جلدی تھی۔ کسی وقت بھی راٹھور نامی وہ آدمی یہاں پہنچنے والا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ انتظامیہ کا کوئی آدمی بھی یہاں نکل آتا۔

شکر ہوا کہ ذرا سی دیر میں..... ہنکی باہر آ گئی۔ وہ بے اختیار ”شہزی اکل“ کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”شہزی اکل آپ کہاں چلے گئے تھے، میں اور دانی بھائی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔“ وہ روہانے لہجے میں بولی۔

”اما بہت گندی ہیں، انہوں نے ہماری ناراضی کے باوجود اس گندے آدمی سے شادی کر لی ہے“ وہ روہانے لہجے میں بولی۔

میں نے اُسے پیار کیا اور میرے سے الگ کر کے بولا۔

”ہنکی بیٹا! پریشان مت ہونا، اب میں آ گیا ہوں ناں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، میں نے تمہارے گھر آنے کی کوشش بھی کی تھی مگر مجھے نہیں آنے دیا گیا۔“

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پراسے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

دیکھا اور اس خوب صورت چٹان سے دور ہو کر اس راستے پر
چلنا شروع کر دیا جو سینٹ بیز کی طرف جاتا تھا۔ وہ ایک
الگ تھلک جگہ تھی۔ اگر میں کوشش کرتی تو بھی ایسی جگہ کا
انتخاب نہیں کر سکتی تھی جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس

اگا تھا کرسٹی نے کہیں لکھا تھا کہ قتل کرنا بہت
مان ہے جب تک کہ کسی کو آپ پر شبہ نہ ہو۔ واقعی یہ بہت
مان تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں نے انہیں قتل کر دیا
ہاں یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر

جرم کی انوکھی کہانیوں میں سے ایک منفرد سوغات.....

چاہت... محبت... وارفنگی... چاہے جانے والے شخص کے لیے
قدرت کا تحفہ ہوتی ہے... جذبات کی یہ فراوانی کسی کسی
شخص کے حصے میں آتی ہے... محبت... عقیدت اور چاہت سے
لبریز دل ربا کی کیفیات... وہ جس کا پرستار تھا... وہ کسی اور
کی اسیر تھی... جرم اور محبت کا سنگین امتزاج...

پرستار

سیرینا راض



وقت میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ مجھے لگا کہ میں نے اپنے عقب میں کوئی کھڑکھڑائی ہوئی آواز سنی ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ ایک بار پھر میرا قہقہہ لگانے کو دل چاہا۔

تھوڑی دیر بعد رات شروع ہو جائے گی اور پھر لاشیں ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔ میرا دل خوشی سے جموم رہا ہے۔ میں یہی چاہتی تھی اور مجھے میرے خواب کی تعبیر مل گئی مایوسی کے اندھیرے سے جھٹ گئے۔ ناامیدی اور بے عزتی کا احساس دور ہو گیا۔ اب میں دوبارہ کبھی نہیں جان سکوں گی کہ اگر غصہ آئے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ میں یہاں علاج کے لیے آئی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے چھل قدمی کرنے اور خوب صورت نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ ماحول کی تبدیلی میرے لیے خوشگوار ثابت ہوگی۔

ہوٹل پہنچی تو میرا موڈ ایک دم بدل گیا۔ یوں لگا جیسے میں رونا چاہ رہی ہو۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے کتنی آسانی سے انہیں قتل کر دیا بلکہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کی عادی ہو گئی تو کیا ہوگا۔ 'مقتانہ سوچ ہے میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مجھے کسی اور بارے میں سوچنا چاہیے، میں کل ہیر و گیت جا رہی ہوں جہاں کوئی بھی نہیں جان پائے گا کہ میں نے کیا کیا ہے۔

☆☆☆

یہ دو دن بعد کی بات ہے۔

مینیٹل ہیں پر لگے کلاک نے تین بجائے۔ انٹونیا کو توقع تھی کہ اولڈ سوان ہوٹل کے لاؤنج میں چائے پینے والوں کا جم غفیر ہوگا لیکن وہ تقریباً خالی تھا۔ یہ ہوٹل بھی ہیر و گیت ہائیڈرو کھلاتا تھا۔ یہ پرانے طرز کی جگہ تھی جہاں پام کے گیلے، ٹیس لگے کپڑے سے ڈھکی ہوئی گول میزیں، پرانے طرز کے آتش دان اور ایک سفید رنگ کا پیا نورکھا ہوا تھا۔ دراصل اسے جان بوجھ کر پرانے طرز کا بنایا گیا تھا۔ دسمبر 1930ء کی وردی پہنچتی تھیں اور وہاں آنے والے پرانے گاہک ہی نہیں بلکہ امریکی اور جاپانی سیاح بھی یہی توقع کرتے تھے۔ اس وقت ایک نوجوان پیا نواؤز چشمہ اور بوٹائی لگے پیا نوبجارا تھا۔

انٹونیا نے نظریں تھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ان کے قریب والی میز پر ایک عمر رسیدہ جوڑا بیٹھا تھا۔ عورت کا چہرہ بلڈاگ کی طرح خوفناک تھا اور اس نے اپنے نارنجی

لباس پر تین عدد بروچ لگا رکھے تھے جبکہ اس کا شوہر بلڈاگ کوٹ پہنے ہوئے کافی نمایاں لگ رہا تھا۔ اس کی نگاہ سے ترشی ہوئی مومچیں دیکھ کر انھوں نے ایڈن کی شکل ذہن ابھرتی تھی۔

ایک طویل قامت عورت سیلک کا لباس پہنے کھڑکے پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جسے انٹونیا نے پہچان لیا۔ وہ اگا تھا کرسی کی کتاب تھی جو ہوٹل لائبریری سے بڑھنے کے لیے لی گئی تھی۔ اس کے پر میں ایک دیلی پتلی عورت سفید لباس پہنے ہوئے بیٹھی تھی اس نے اپنے بالوں پر ہیر و گیت لگا رکھا تھا اور کہنوں کے دستانے پہن رکھے تھے۔ ان میں ایک سرخ اور دو سیاہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں چمڑے کے کور میں لپٹی ہ کوئی چیز پکڑی ہوئی تھی۔ غالباً آئی بیڈ یا کوئی ڈائری۔ مسلسل اپنا منہ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ جیسے کسی فیصلے پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔

ایک منجھا شخص بھی اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور عجیب و غریب انداز میں مسکرا رہا تھا۔ نہ جانے اسے وہاں کون سی دلچسپ چیز نظر آگئی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا تھا جسے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا اسی طرح اس لڑکی کے بارے میں بھی اس رائے ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی وجہ صرف دستانے نہیں۔ ممکن ہے کہ اس نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے رنگ کے دستانے پہن رکھے ہوں بلکہ اس لڑکی نے ک ساتھ بیٹھی ہوئی عورت پر اپنی نظریں مسلسل بجا رکھی جو بہت دلچسپ بات تھی اور انٹونیا اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے میز پر رکھی نوٹ بک اٹھائی اور اپنا کلم لکاتے ہوئے بولی۔ "معاف کرنا ہوگ، اب میں صبر نہیں کر سکتی۔ حم ایک ایسی عورت سے شادی نہیں کرنی چاہیے جو ہر سانی پر اپنی کہانیاں لکھتی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے کام کا کتنا دلہ ہوں اور پہلے سے ہی اس کہانی کو پڑھنے کے لیے تیار ہوں جو بالآخر منظر عام پر آنے والی ہے۔" سیمجر پائن عاشق انداز میں بولا۔ "اس بار تمہارا نمونہ کیا ہوگا؟"

وہ ہنسنے کی سہ پہر تھی۔ وہ دونوں جمعرات کی ٹرک ویک اینڈ گزارنے نے ہیر و گیت ہائیڈرو پہنچے تھے، دوا میں سے کوئی بھی اپنی اصلاح کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن انٹونیا کے دماغ میں یہ بات تھی کہ اس

پائین نے کوئی جواب دینے کے بجائے اس عورت کی طرف دیکھا جو کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ”میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پیانو نواز، عورتوں سے فلت کرنے کا ماہر ہے۔ اس عورت کو دیکھو، بالکل شہزادی کے مانند لگتی ہے۔“

انہوں نے برابر والی میز سے کسی کے کھڑکھڑانے اور پھر طوفانی خراٹے لینے کی آواز سنی۔ یہ وہی بلڈ اگ جیسے چہرے والی عمر رسیدہ عورت تھی اور محب عدسے کی مدد سے ہیر و گیت ایوننگ کلارین کا صبح شائع ہونے والا ایڈیشن پڑھ رہی تھی۔

”ہمیں کسی دوسرے سیارے پر چلے جانا چاہیے۔“ وہ مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”انگلستان اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ عجیب عجیب واقعات ہو رہے ہیں۔ مسٹر اور مسز گلبرٹ نے خودکشی کے لیے ایک دلکش جگہ کا انتخاب کیا تو دوسری جانب ایک ایسے شخص کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ عورتوں کا گلہ گوشتا ہے اور ابھی تک پکڑا نہیں گیا۔“

اس کے شوہر نے پیانی میز پر رکھے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ صرف عورتوں کو قتل کرتا ہے؟“

”اب تک اس نے ایک ہی قتل کیا ہے۔“ ”کیا اس نے اس عورت کے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی؟“

”اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ وہ اس کی سابقہ آیا تھی۔ شاید وہ دوبارہ حملہ آور ہو۔ زیادہ تر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں نے نہیں پڑھا تھا کہ انہیں اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے دوسرا قتل بھی کر کے لاش انہیں چھپا دی ہو۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ پولیس کیا کر رہی ہے؟“

”اخبار نے کچھ بتایا کہ تحقیقات کرنے والے پولیس افسر کا نام کیا ہے؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا تم اس پر لکھنا چاہ رہے ہو؟“ اس عورت نے طنزی انداز میں کہا۔ ”اس کا نام انکسٹر گوڈیس ہے۔ نہیں کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ صرف ڈرامے کے مرکزی اداکاروں کے نام دیتے ہیں۔ انکسٹر گوڈیس اور گلہ گوشتا والے کا نام ہے فیلون۔“

”مجھے یاد ہے کہ اسکول میں اس نام کا ایک لڑکا میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ وہی ہے؟“ ”میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ زیادہ امکان یہی

ہے اسے ایک جاسوسی کہانی لکھنے کی تحریک مل سکتی ہے جو 1928ء میں اگا تھاکرشی کی گمشدگی کے دوران اس کی پناہ گاہ تھی۔

”ابھی میں نے کوئی نمونہ منتخب نہیں کیا لیکن میرے ذہن میں کچھ عجیب باتیں آرہی ہیں۔“

”تمہاری کہانیاں ہمیشہ اسی طرح شروع ہوتی ہیں۔ ظہور و مجھے اندازہ لگانے دو۔ وہ لڑکی جس نے دستانے پہن رکھے ہیں یا وہ شخص جو چائے پی رہا ہے۔“ پائین کا اشارہ اس شخص کی جانب تھا جس کے چہرے پر کوئی شکن نہیں تھی۔ ”وہ کس طرح چائے پی رہا ہے؟“

”ایک ہی گھنٹ میں اس نے پیانی خالی کر دی۔ جس طرح کوئی جیگوز ہر کا پیالہ پیتا ہے۔“

”یہ جیگوز کی طرح نہیں دکھائی دیتا؟“ ”نہیں لیکن شاید یہ کسی وجہ سے اپنے آپ کو مارنا چاہا ہو۔“

”لیکن وہ ایسا کیوں چاہے گا؟“ ”یہ شخص لوگوں کو گلہ گوشت کر ہلاک کرتا ہے۔ وہ اتنا ہے کہ اس کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے اس لیے وہ اس نیچے پر پہنچا ہے کہ ان حالات میں خودکشی ہی بہترین طریقہ ہے۔“

”وہ ابھی مرا نہیں ہے۔“ انٹونیانے اس شخص کو دیکھتے دے کہا۔ ”اگر اسے اپنے آپ کو مارنا ہوتا تو وہ کوئی اور ریل الاثر طریقہ استعمال کرتا۔“

”شاید وہ اپنے آپ کو اسی اذیت کا مستحق سمجھتا ہو۔ بس، یہ وہ نہیں ہے بلکہ وہ پیانو نواز سے جو لوگوں کا گلہ گوشتا ہے۔ میں ان لوگوں پر بالکل اعتبار نہیں کرتا جو یونانی لگاتے۔ پیانو نواز ہی گلہ گوشتنے والا شخص ہے جو اس مقصد کے ہر اپنی یونانی استعمال کرتا ہے۔“

”اوہ میرے خدا! میں تو اس کے بارے میں بالکل بھول گئی۔“ انٹونیانے کہا۔ ”ہیر و گیت میں ایسا ہی ایک موجود ہے۔ گزشتہ روز اس کے بارے میں اخبار میں شائع ہوا تھا۔ قتل، حقیقی قتل، اس میں کیا ایسی بات ہے جو سے لیے کشش کا باعث ہو؟“

”تم یہ سوال پہلے ہی پوچھ چکی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ سے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔ ہمارے لیے اس قتل کوئی کشش نہیں۔“ پائین نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”لیکن تم نے اس پر ضرور غور کیا ہو گا کہ ہم جہاں لے لیں، ہمارا واسطہ کسی نہ کسی قتل کی واردات سے پڑ

ہے کہ شاید تمہارا فیلون مر چکا ہے، اس شخص کی عمر صرف تینیس برس ہے۔“ عمر رسیدہ عورت نے کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ اس کی نینی نے آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں بڑی باتیں بٹھا دیں اور اس کی زندگی تباہ کر دی۔ وہ اپنے والدین کو بھی الزام دیتا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ انہوں نے بھی نینی کا ساتھ دیا۔“

اس عورت نے کتاب نیچے کی اور مسکراتے ہو۔
 یوٹی۔ ”بالکل لیکن دوبارہ سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میں تو سمجھتی کہ ہمارے درمیان اس سے پہلے بھی کوئی گفتگو ہو ہے۔ کم از کم مجھے تو یاد نہیں۔“
 ”ہاں لیکن میں تمہیں تنگ کرتی رہی ہوں۔ مجھے اہ ہے کہ ہماری کزشتہ ملاقات کے بعد تم نے اپنا ذہن تبدیل کیا ہوگا۔“

”کون سی آخری ملاقات؟ مجھے شک ہے کہ تمہیں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 ”نہیں، کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔“
 ”پیاری لڑکی، مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ تم کو ہو۔“
 ”میرا نام ایریکا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔
 ”بہت پیارا نام ہے لیکن میں تم سے پہلے کسی نہ ملی۔“

”ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ البتہ غلط وقت اور جگہ پر ہوئی تھی۔ وہ بہت مختلف حالات تھے۔ تم اپنا ساما باندھنے میں مصروف تھیں اور تمہاری حالت کافی خراب تھی تم نے مجھے آؤگراف دینے سے منع کر دیا اور جب میں تمہیں اپنی سوسائٹی کے بارے میں بتایا تو۔۔۔۔۔“
 انٹونیا نے دیکھا کہ اس پُر وقار عورت کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس کے چہرے کے تاثرات یک لخت تبدیل ہو گئے جیسے اسے حیرت کا شدید جھٹکا ہو گا۔ اس لمحہ بھر کے لیے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھا پکا اس کے ہونٹوں سے ایک سرکشی ابھری۔ ”اود میرے خدا یہ تم ہو۔“ پھر وہ دفعتاً اپنی کرسی سے یوں کھڑی ہوئی کہ میز پر رکھے ہوئے چائے کے برتن کھڑکھڑانے لگے اور کتاب زمین پر گر گئی۔

اب تمام نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ لوگوں نے اسے لڑکھڑاتے ہوئے لاؤنچ سے جاتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کندھے جھٹکا اور لاؤنچ پارکر کے شیشے والے دروازوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ لوگوں کی توجہ حاصل کرنا چاہ رہی ہو۔ پیاؤنواز دوبارہ نمودار ہوا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھنے لگی والا تھا کہ وہ لڑکی اس کے پاس رکی اور فطرت کرنے کے انداز میں مسکرائی۔ اس نے بھی رسماً جھک کر تعظیم دی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ میجر پائٹ بڑبڑایا۔

”اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔“ عمر رسیدہ عورت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تک یہی معلوم ہو سکا ہے کہ اس شخص کا تعلق ایک امیر اور عجیب خاندان سے ہے جو ذہنی باتوں کی طرف رجحان رکھتا ہے۔ اسے ایک ماڈل مریض کے طور پر رکھا گیا لیکن اس نے اپنے پاگل ہونے کا بالکل بھی تاثر نہیں دیا۔ اسے اکثر مواقع پر پیارا، دعا باز، معتدل مزاج، ذہن پر چھا جانے والا، جو توڑ کا ماہر، آرٹسٹک اور بہت خطرناک کہا جاتا تھا۔“

”بلاشبہ اسے بہرہ دیا گیا ہو سکتا ہے۔“
 ”انہوں نے یہ نہیں لکھا لیکن مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ انہیں اس کی تصویر چھاپنی چاہیے گی۔ یہ جاننا لوگوں کا حق ہے کہ وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ وہ کہیں اور کوئی بھی ہو سکتا ہے کیا پتا ہے وہی پیاؤنواز ہو۔ مجھے یہ کچھ مشکوک لگتا ہے۔ ویٹرس کا کہنا ہے کہ اسے ایک ہفتہ پہلے ہی ملازمت پر رکھا گیا ہے۔ اس کا انٹرویو بھی برائے نام ہی ہوا۔ یہاں تک کہ اس سے کوئی حوالہ بھی نہیں پوچھا گیا جس پر عملے کے لوگ کافی ناراض ہیں۔“
 ”شاید وہ کوئی مناسب بندہ نہ ملنے کی وجہ سے ناامید ہو گئے ہوں گے۔“

”تم نے اخبار میں یہ تصویر دیکھی؟“ بوڑھی عورت نے کہا۔

یہ سن کر انٹونیا چونک گئی۔ اس نے سوچا کہ اسے بھی یہ تصویر دیکھنی چاہیے۔ وہ اخبار مانتھنے کے لیے اس کی جانب مڑی تھی مگر دورنگ کے دستاؤں والی لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت کی جانب بڑھنے لگی۔ اس دوران میں پیاؤنواز اپنی دھن ختم کر چکا تھا اور خاموشی ہونے کی وجہ سے وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو واضح طور پر سن سکتے تھے۔

”میں دوبارہ زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔“
 ”کیا میں تم سے بات کر سکتی ہوں؟“

پوسٹار

ہوں، تم یہ کیوں بھول جاتے ہو آرٹلڈ کہ وہ ایک اداکارہ ہے۔ سر لائل اور وہ سال میں دو مرتبہ ہیر ویکٹ آتے ہیں۔ ہمیشہ وہ پہلے آتی ہے۔ بعد میں سر لائل اپنے دونوں ملازموں کے ہمراہ آتا ہے۔ اس کا رویہ میرے ساتھ غیر دوستانہ ہے گوکہ ہمارا تعارف ہے لیکن وہ یہی ظاہر کرتی ہے کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔“

”اس کا اصل نام کیا ہے؟“ انٹونی نے پوچھا۔
”سر لائل سے شادی کرنے سے پہلے وہ میرا اسم مار کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ پہلے اس نے ایک دور طابوئی فلوپس میں معمولی کردار کیے تھے پھر وہ روم آگنی اور اس نے ٹی وی کے تاریخی ڈراموں میں کام شروع کر دیا۔“
”تم اس کے بارے میں اتنا زیادہ کیسے جانتی ہو؟“

ہیجر پائن نے پوچھا۔
”جب اس کی شادی سر لائل سے ہوئی تو مجھے اس بے جوڑ تعلق پر حیرت ہوئی اور میں نے انٹرنیٹ پر اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ دراصل میں اس کی ایک فلم یوٹیوب پر دیکھ رہی تھی۔ جس میں اس نے میڈم ہیری کا رول پہلے کیا تھا۔ فلم کا آخری حصہ بہت دلچسپ تھا۔ جب اس کا سر فلم کر کے مشتعل ہجوم کے سامنے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں زندگی میں کبھی اتنا نہیں ہنسی۔ وہ اب بھی چھوٹے یورپی ملکوں میں مشہور ہے جہاں اطالوی فلمیں پسند کی جاتی ہیں اور رومانویہ میں تو اس کا چہرہ صابن کے اشتہار میں بھی استعمال ہو رہا ہے۔“

”لگتا ہے کہ یہ لڑکی اس کی کوئی پرستار ہے۔ اس نے صرف آٹو گراف ہی نہیں مانگا بلکہ مداحوں کی کسی سوسائٹی کا بھی ذکر کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا لہجہ بھی غیر ملکیوں جیسا تھا۔“ آرٹلڈ نے مونچھوں پر ہاتھ بھیرتے ہوئے کہا۔

انٹونی کو یاد آیا کہ اس لڑکی نے اپنا نام ایریکا بتایا تھا اور لیڈی بیفٹ کے تاثرات سے یوں لگا کہ جیسے اس نے اسے پہچان لیا ہو۔ ڈیور نے اس کی سوچ پڑھ لی اور آگے کی طرف جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بتاؤں کہ کیا سوچ رہی ہوں۔ یہ لڑکی اس کی بیٹی ہے جس سے اس نے پیدائش بعد قطع تعلق کر لیا تھا اور اب وہ اپنا حق لینے آئی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس لہجہ میں بات کر رہی تھی۔ جیسے بلیک میل کر رہی ہو۔“

جائے ختم ہونے کے بعد ہیجر پائن نے شہر میں گھومنے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے اس عمر جوڑے کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا لیکن ڈیور نے یہ کہہ کر معذرت کر لی

”بوڑھی عورت نے انٹونیہا ہوگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔“ ممکن ہے کہ میں اس بارے میں کچھ نہ بتا سکوں لیکن اس عورت کی شناخت ضرور ظاہر کر سکتی ہوں۔ اگر تم اس میں کوئی دلچسپی رکھتے ہو۔“

وہ دونوں ہی اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنی کرنسایاں بوڑھی عورت کی جانب کر لیں۔ اس جوڑے کا نام آرٹلڈ اور ڈیور کا رٹ تھا۔ بوڑھی عورت نے کہنا شروع کیا۔

”وہ اپنے آپ کو لیڈی بیفٹ کہتی ہے لیکن سر لائل بیفٹ سے شادی سے پہلے وہ ایک اداکارہ ہو کر تھی تھی۔ یہ شادی دو سال قبل ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ چھ شادیاں کر چکی تھی لیکن جب چھٹا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ صدمے سے پاگل ہو گئی۔ اس کا نام سویلون تھا اور وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اس صدمے سے باہر نہ آ سکی اور اس کا زرد سر بیک ڈاؤن ہو گیا۔ اس کا علاج ہوا، اور جب وہ اس نفسیاتی بیماری سے صحت یاب ہوئی تو اسے ایک سماجی کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اس نے کرنل لائل پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے۔ وہ عمر میں اس سے بڑا تھا اور اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ میرا شوہر در کرنل لائل پرانے دوست ہیں اس لیے ہمیں بھی اس نادبی میں مدد کیا گیا۔“

”سر لائل اور میرا تعلق لندن کے ایک ہی کلب سے ہے۔“ آرٹلڈ نے وضاحت کی۔ ”ہم ٹکٹ جمع کیا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں تھوڑا بڑا ہے۔ اس کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ جب ہم ملتے ہیں تو وہ کبھی مجھے ڈیولن اور کبھی ڈیورڈ کہتا ہے۔ یہ اس کے ملازموں کے نام ہیں جو مائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں تاکہ اس کی وجہ حاصل کر سکیں۔“

”سر لائل بوڑھا ہو چکا ہے اور بہت امیر ہے۔ اس نے پہلے ہی اپنی وصیت میں سب کچھ اس کے نام کر دیا ہے اس کا مطلب ہے کہ شادی کے وقت وہ حقیقت سے بے خبر میں تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔“

”لگتا ہے کہ وہ اسے بہت چاہتی ہے۔“

”اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو بہت بے وقوف ہو۔“

”میں نے خود اس کی وارنٹنگ دیکھی ہے جب وہ لوں اکٹھے ہوتے ہیں۔“

”میں نے بھی دیکھی ہے لیکن میں اسے اداکاری کہتی

سنائی دی۔ ”تمہاری آنکھیں نہیں ہیں جو تم یہ تصویر نہیں دیکھ سکے؟“

”مجھے افسوس ہے جناب۔ میں نے یہ تصویر نہیں دیکھی۔“ ایک نوجوان کی آواز سنائی دی۔

”تم نے دیکھے بغیر ہی یہ اخبار ہر کمرے میں دے دیا۔ پولو کیا تم نے ایسا نہیں کیا؟“

”جی جناب، ہمیشہ میں ہی کمروں میں اخبار دیتا ہوں۔“

”معلوم ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟ تم نے ہمیں تباہ کر دیا۔“

”یہ میرے فرائض میں شامل ہے کہ ہر کمرے میں شام کا اخبار پہنچاؤں۔“

”تمہیں یہ احساس ہی نہیں کہ کیا کر بیٹھے ہو۔ میرا فون مسلسل بچ رہا ہے اور میں لوگوں سے یہی کہہ رہا ہوں کہ کوئی غلطی ہوئی ہے کہ کوئی میری بات پر یقین نہیں کر رہا۔ تین

جوڑے ہوئے چھوڑ کر چائے ہیں۔ میں انہیں الزام نہیں دوں گا۔ ان کی پریشانی قدرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ا-

بستر میں ٹل ہونا نہیں چاہتے۔ میرے گاہک جارہے ہیں کیا تمہیں اس کا احساس ہے۔ کیوں نہ تمہیں ملازمت نکال دیا جائے؟“

”یہ بہت ناجائز ہو گا۔“ پائٹ نے لفٹ میں سو ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر محتای اخبار نے اس گلا گھونٹنے والے کی تصویر شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس میں تیل بوا-

کا کیا قصور ہے۔ نیچر کی بیچ و بکار سے لگتا ہے کہ اس قاتل کسی نہ کسی طرح اس ہوٹل سے کوئی تعلق ہے۔ وہ یہاں تو اب بھی ہے اور کہیں چھپا ہوا ہے۔“

”کاشا نثار سوچ ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ہمارے کمرے میں نہیں چھپا ہوا ہے۔“ انٹونیا نے ہینڈ بیگ کھول کر اخبار نکالا لیکن اسے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے تھم

کھولا۔

صفحہ تین پر تین تصویریں تھیں۔ پہلی ایک دب چہرہ والے کی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ اسپیکر کو ڈیس

دوسری ایک معصوم صورت لڑکی کی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ رکی فیون۔ دس سال کی عمر میں اور تیسری تصویر؟

کھونٹنے والے فیون کی تھی۔

”اوہ میرے خدا۔“ انٹونیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

پائٹ اس کے برابر میں کھڑا تھا، وہ بولا۔ ”میں نے

کہ اسے ایک ضروری خط لکھنا ہے جبکہ آرٹلڈ سے پہر میں سونے کا عادی تھا۔ انٹونیا اور پائٹ نے خوش دلی سے ان کی

معذرت قبول کی اور گھونٹنے نکل گئے۔ باہر آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پہلے انہوں نے گر جائیں جھانکا پھر نیو پائی

ہال میں چلے گئے جو اندرونی طور پر اٹھارویں صدی کی طرز آرائش سے مزین تھا۔ بد قسمتی سے وہ زیادہ دیر وہاں نہیں

ٹھہر سکے کیونکہ ہال بند ہونے کا وقت قریب ہو رہا تھا۔ وہ تیرہ فروری کی سہ پہر تھی اور ویلنٹائن ڈے کی تیاریاں

عروج پر تھیں۔ دکانوں پر دل کی شکل کے کیک، پھول اور دیگر تحائف خوب صورتی سے سجائے گئے تھے۔ اچانک ہی

بارش شروع ہوئی اور آسمان بادلوں سے سیاہ ہو گیا۔ انہوں نے ہوٹل واپسی کی راہ لی۔ راستے میں وہ ایک اسٹال کے

پاس سے گزرے جہاں ہیر و گیت ایونٹ کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا اور اس کے صفحہ اول پر سرخی تھی۔ ”گلا گھونٹنے والا

فیون کی تصویریں پہلی بار۔“

انٹونیا نے اخبار خریدا۔ وہ تصویریں صفحہ تین پر تھیں۔ ابھی وہ انہیں دیکھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ تیز بارش شروع ہو گئی۔ انٹونیا نے فوراً اخبار اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ پائٹ

نے چھتری کھولی اور وہ تیزی سے ہوٹل کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس کے دماغ میں ایک نئی جستجو ابھری۔ کچھ عرصہ قبل گلبرٹ نام کا ایک جوڑا خودکشی کر کے ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ

جاننا چاہ رہی تھی کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ کہیں وہ لڈی بیٹھ کا چیمپا شو ہر گلبرٹ تو نہیں تھا جس سے وہ بہت زیادہ

محبت کرتی تھی اور جس کے چلے جانے سے وہ ندوس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی۔ گوکہ یہ بات ابھی تک ثابت یا ظاہر نہیں

ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں انٹونیا اس بارے میں اندازہ لگانے پر مجبور ہو گئی۔

استقبالیہ ڈیسک پر پہنچ کر پائٹ نے چھتری بند کی۔ وہاں بھی اخبار کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا اس نے خوش دلی سے

کہا۔ ”بارش زوروں پر ہے۔ لگتا ہے رات بھر ہوتی رہے گی۔“

انٹونیا نے مسکراتے ہوئے استقبالیہ کلرک سے کہا۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں میڈم۔“ وہ بے یقینی سے بولا۔ ”بہت خراب موسم ہے لیکن کل صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اخبار اٹھا یا اور دروازے میں ڈال دیا۔

نیچر کے کمرے سے ایک غصے میں بھری ہوئی آواز

بارے میں سوچ رہی تھی۔

ڈیورا نے کہا۔ ”وہ پولیس والا تقریباً پندرہ منٹ وہاں موجود رہا اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ قاتل کی موجودگی کا سراغ لگانے میں ناکام رہا ہو۔“

”بلکہ وہ ڈپٹی منیجر اور استقبال کلرک سے باتیں کر رہا تھا۔“ آرملڈ نے کہا۔ ”پھر میں نے دیکھا کہ استقبال کلرک نے نیل بوائز کو بلا لیا اور ہر ایک کو چند ہدایات دیں۔“

”ہم نہیں سن سکے کہ وہ ہدایات کس بارے میں تھیں۔“ ڈیورا تاسف سے بولی۔

آرملڈ نے اعلان کیا کہ اسے اندازہ ہے۔ استقبال کلرک نے لڑکوں کو کیا ہدایات دی ہوں گی۔

”اس نے ان سے کہا ہو گا کہ ہر کمرے میں جا کر دیکھیں کہ عورتیں محفوظ ہیں۔“

”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس نے بھاگنے سے پہلے ہی عورت کا گلا گھونٹ دیا ہے؟“

”یہ بات سمجھ میں آئی ہے اگر تم اس پر غور کرو۔۔۔۔۔۔ یہ شور کیا ہے؟“

لالی سے شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ گلاس ہاتھوں میں لیے اٹھے اور لالی کی جانب چل دیے۔

یہ آواز کچھوے جیسی شکل کے ایک بہت ہی بوڑھے شخص کی تھی جو استقبال ڈیسک کے ساتھ ہی جھیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فان کلرک کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو افراد کھڑے تھے جنہوں نے سیاہ رنگ کے کوٹ اور دستاں پہن رکھے تھے۔

”بہت خوب، یہ تو سر لالک ہے۔“ آرملڈ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ پولیس والا بھی ابھی تک یہیں ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا کہ میری بیوی فون کا جواب نہیں دے رہی؟ میں کیسے مان لوں کہ وہ کمرے میں نہیں ہے؟“ سر لالک اونچی آواز میں استقبال سے بات کر رہا تھا۔

”اس نے تو کہا تھا کہ وہ ہوٹل کی لابی میں میرا انتظار کرے گی اور اگر مجھے ٹھیک طرح سے یاد ہے تو یہ لابی ہی ہے۔“

میری بیوی کو پیغام میں ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ لائبریری میں میرا انتظار کرے۔ ممکن ہے کہ میں پرانے وقتوں کا آدمی ہوں لیکن مجھے ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد اپنی بیوی کی جانب سے استقبال کی توقع تھی اور میرا یہ بات اچھی طرح جانتی ہے۔“

”کیا تم نے اسے پیغام نہیں بھیجا تھا، ڈیولین؟“ وہ اپنے ایک خدمت گار کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔

پہلی کہا تھا کہ یہ وہی قاتل ہے۔“

”ہاں، تم نے کہا تھا لیکن یہ محض تمہارا اندازہ تھا۔“

”اس نے سادہ شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا جس سے مجھے شبہ ہوا۔“

یہ تصویر بتا رہی تھی کہ پیانو نواز ہی قاتل فیلون ہے۔ انٹونیا نے بھی سوچا مگر یہ تھا کہ ایسا ممکن ہوگا۔

☆☆☆

”وہ غائب ہو گیا ہے۔ اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ روزانہ مختلف رنگ کی بولگاتا اور اپنے آپ کو اسٹاف کے دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتا تھا۔“ سز کارلٹ نے انکشاف کیا۔ ”منیجر نے اس کے بارے میں تحقیق کیے بغیر اسے ملازمت دے دی لیکن اب وہ غائب ہے، یہ میرے تجربے بتا رہا ہے۔“

”گویا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔“ انٹونیا نے کہا۔ ”یہ پریشانی کی بات ہے۔“

”گلتا یہی ہے کہ وہ غائب ہو گیا۔“ ڈیورا نے کہا۔

اس وقت لوگ بار میں بیٹھے ہوئے تھے جس وقت شام کے اخبار کی کاپیاں ہوٹل میں تقسیم ہو رہی تھیں تو ایک میڈ نے اسے عقبی دروازے سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے تجربے نے یہی بتایا ہے۔“

”اس جوڑے نے کہاں خودکشی کی تھی؟“ انٹونیا نے موضوع بدلتے ہوئے ڈیورا سے پوچھا۔

”تم کس جوڑے کی بات کر رہی ہو؟“

”مسٹر اور مسز گلبرٹ۔ جن کا تذکرہ تم سر پھر میں کر رہی تھیں۔“

”اوہ ہاں۔“ ڈیورا نے جواب دیا۔ ”وہ جگہ ڈسٹرکٹ کلک میں ہے اور سینٹ بیز کہلاتی ہے۔ وہ دراصل ایک چھوٹا سا خوش نما گاؤں ہے۔ انہوں نے پانچ سو فٹ اونچی ایک چٹان سے چھلانگ لگائی تھی۔“

”یہ کیسے معلوم ہوا کہ انہوں نے خودکشی کی تھی؟“

”کہا جاتا ہے کہ اس کی جیب سے ایک خط ملا تھا۔“

دراصل مسز گلبرٹ کو سرطان تھا اور وہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس خط میں کچھ اسی طرح کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔“

”جب ہم بچے آرہے تھے تو ہم نے ایک پولیس اے کو استقبال پر دیکھا تھا۔“ آرملڈ نے کہا۔

”شاید اسے ہمارے تحفظ کے لیے بھیجا گیا ہو۔“

انٹونیا نے ازراہ مذاق کہا۔ وہ اس وقت سینٹ بیز کے

”کیا ہے۔“

”ایک سو بیس..... لیکن یہ تو میری بیوی کے کمرے کا نمبر ہے۔“ لائل نے کہا۔

انٹونیا نے سمجھنے سے قاصر تھی کہ پولیس والے نے اپنے پیچھے آنے والوں کو کیڑھیوں پر روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی شاید اس کی وجہ اس کی نوجوانی اور نا تجربہ کاری تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسے پولیس میں آئے ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔

تیل بوائے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”پہلی منزل۔“ اس دوران استقبالیہ کلرک ای۔پولیس کے لیے فون کر چکا تھا۔ پولیس والا سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے میجر پائن اور انٹونیا تھے اور یہ واردات کمرانمبر ایک سو بائیس میں ہوئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بہت مہیب لگ رہا تھا اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ انٹونیا نے جبکہ کرا لاش کا نفسیاتی سے معائنہ کیا۔ اس کی گردن کے گرد رسی کے بجائے دو عدد بوتانی بندھی ہوئی تھیں۔ جنہیں آپس میں جوڑ کر گھاٹھونٹنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

پائن نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”جانے سے پہلے ایک اور مقتول کا اضافہ کر گیا۔“

انہوں نے پولیس والے کو داکٹا کی پریولٹے ہو۔ سنا۔ ”ایک عورت کی لاش۔ لگتا ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ کمرانمبر ایک سو بائیس۔ غالباً اس کا نام لیڈی بیٹھ ہے۔ اس شوہر نیچے لابی میں شور مچا رہا ہے۔“

”نہیں، لیڈی بیٹھ نہیں۔“ میجر پائن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے افسران کو بتاؤ کہ مرنے والی کا نام ایریکا ہے۔“

انٹونیا کی آنکھیں لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ پولیس انسپکٹر اور اس کے ماہرین کی ٹیم یہاں آگئی تو اسے اور میجر پائن کو ایک سیکنڈ کے لیے بھی جائے وقوعہ پر نہیں برداشت کیا جائے گا۔ اس نے تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ ایریکا کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ چہرے پر قفل میک اپ تھا اور گردن کے گرد گھٹا ہوئی بوتانیوں نے ٹھوڑی کے نیچے گڑھا ڈال دیا تھا۔

تو یہ بات ہے۔ انٹونیا نے سوچا۔ اس کا دل تیزاً سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایریکا کی ٹھوڑی کے نیچے نشان کو چھوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، اس کا خیال درست تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ سمجھنے لیا اور کاشٹل

اس کے بجائے دوسرے خدمت گار نے جواب دیا۔ ”میں نے پیغام بھیج دیا تھا۔ ڈیولین میں ہوں۔ میں نے سو بائیس فون کے ذریعے پیغام بھیجا تھا۔“

”تم نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ سات بجے ہوٹل کی لابی میں میرا انتظار کرے پھر وہ کہاں چلی گئی؟“ سر لائل نے استقبالیہ کلرک کو گھورتے ہوئے کہا۔

”سر ممکن ہے کہ وہ.....“

”کیا ممکن ہے؟ یہ بات اپنے دامخ سے نکال دو کہ وہ میری حکم عدولی کر سکتی ہے۔ تم نے دیکھا کہ وہ بار بار لائبریری میں بھی نہیں ہے۔ وہ ہوٹل کے پول پر تیراکی کرنے یا مساج کروانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جبکہ اسے معلوم ہے کہ میں آ رہا ہوں پھر وہ سو بائیس پر جواب کیوں نہیں دے رہی۔ ایک بار پھر اس کا نمبر ملاؤ ڈیولرس۔ صرف اس طرح کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کوئی خوفناک واقعہ پیش نہ آ گیا ہو۔ لہذا مجھے یہ مت بتانا کہ شاید وہ چھل قدمی کے لیے گئی ہو۔“

”ممکن ہے کہ لیڈی بیٹھ سو رہی ہوں۔ میں کسی کو دیکھنے کے لیے بھیجتا ہوں۔“

”کیا احمقانہ بات ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ پھر اس کی نگاہ کارٹ پر گئی۔ ”آہ میرے دوست! تم بھی نہیں ہو؟“ اس نے خیر مقدمی انداز میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہو رہی ہے اور یہ تمہاری بیوی ہے ڈیولرس۔ تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو مانی ڈیزر، ہم بعد میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے لیکن پہلے مجھے اپنی بیوی کو تلاش کرنا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ نہیں غائب ہو گئی ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت فکر مند ہوں۔“

پھر وہ استقبالیہ کلرک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیڈی بیٹھ کبھی نہیں سو سکتی جبکہ اسے معلوم تھا کہ میں آ رہا ہوں۔“ اس نے اپنی چھڑی کا رخ کلرک کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ ”میری بیوی کہاں ہے؟ تم نے اسے کہاں غائب کر دیا؟“

استقبالیہ کلرک نے بے بسی سے پولیس والے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک تیل بوائے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا اور بدحواسی کے عالم میں بولا۔ ”اوپر ایک لاش موجود ہے کمرانمبر ایک سو بائیس یا ایک سو چوبیس۔ ایک عورت..... مردہ حالت میں..... اس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اس کا گلا گھونٹا

پوسٹار

کرتی۔ دروازہ کھلا اور انسپٹر کو ڈیس اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک باوردی سارجنٹ بھی تھا۔ گوکہ اس نے چشمہ نہیں لگا رکھا تھا لیکن اس کی شکل پیا نواز سے بہت مل رہی تھی جسے ہونٹ سے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ انٹونیا کو اسے دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی البتہ مچ پائے کم از کم ایک منٹ کے لیے حیران رہ گیا پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف یہ فرض کر سکتا ہوں کہ تمہاری تصویر کے نیچے غلط کپشن لگ گیا۔“

انسپٹر نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل ایسا

کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک فون پر باتیں کر رہا تھا اور اس کی پشٹ انٹونیا کی طرف تھی۔ پھر اس نے سوالیہ انداز میں اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”کیا تم اس میں زندگی کی رمت تلاش کر رہی ہو؟“

”نہیں اپنا شبہ دور کر رہی ہوں یقین میں بدل گیا ہے۔“ انٹونیا نے پچی آواز میں کہا۔

”سہ بات میرے دماغ میں بھی آئی تھی لیکن میں نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ گوکہ ساری علامات موجود تھیں۔ مثلاً میک آپ ٹیمپریلک انداز میں کیا گیا تھا۔ لباس بھی عجیب سا تھا جیسے نسوانیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے بہت ہی بھونڈے انداز میں پیا نواز سے فلرٹ کرنے کی کوشش کی۔“

”میں جان گئی ہوں کہ وہ ایک مرد ہے۔“ انٹونیا بولی۔ ”اور مجھے اس کا نام بھی معلوم ہے۔“

☆☆☆

لیڈی بی بیٹ کرے میں داخل ہوئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ”ڈارلنگ! مجھے بہت افسوس ہے۔“

”تم اب تک کہاں غائب تھیں؟“ سر لائل نے پوچھا۔ ”ہم تو سمجھے کہ تم مر گئیں۔ ڈیولین کا خیال تھا کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے اور ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ تادوان کا مطالبہ جلد ہی آنے والا ہے۔ اس کے دماغ میں ایسی ہی سسنی خیر باتیں آتی ہیں۔ شاید مجھے اسے نکال دینا چاہیے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید تمہیں دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔“

”میں باہر گئی تھی۔ تمہارے لیے ویلنٹائن کا تحفہ خریدنے۔“ وہ ایک پیکیٹ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یہاں کیا ہو رہا ہے؟ برابر والے دروازے پر اتنے لوگ کیوں جمع ہیں؟“

”کوئی عورت مردہ پائی گئی ہے۔ اگلی مرتبہ میں تمہارے گلے میں پٹا ڈال کر رکھوں گا۔“ سر لائل نے کہا۔

”مجھے تم پر بھروسہ نہیں رہا۔“

”ڈارلنگ۔“ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”یہ یو کیسی آرہی ہے؟ ہونٹ اب پہلے جیسا نہیں رہا اور میری یوٹائیاں کہاں گئیں؟ ان میں سے دو کم ہیں۔“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ وہ بولی۔ ”شاید ڈیورز رکھنا بھول گیا ہو۔“

☆☆☆

اس سے پہلے کہ انٹونیا اس مردہ شخص کی شناخت

قارئین متوجہ ہوں

پرجا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ڈرامہ بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پر چاہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پر چانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **نمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-63 نیٹ ۱۱۱ کینڈیشن پبلی کیشنز ہاؤسنگ اتھارٹی ٹی وی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہی ہوا تھا۔ انہوں نے انتہائی نااہلی دکھائی گوکہ بعد میں میرے افسران نے ایڈیٹر کو سخت کہا لیکن جو ہونا تھا، وہ ہو گیا صرف ہوٹل کا میجر ہی میری اصل شناخت سے واقف تھا لیکن اس وقت وہ بھی شہر سے باہر گیا ہوا تھا لہذا جیسے ہی اخبار کا تازہ شمارہ آیا، میں تیزی سے وہاں سے نکل گیا تاکہ ہوٹل میں کھلی نہ پھیلے۔

”بد قسمتی سے اس کے باوجود وہاں کھلی مچ گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تم کسی الماری میں یا بستر کے نیچے چھپے ہوئے ہو اس لیے بہت سے لوگ ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے۔“

انسپکٹر نے میجر پائن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔ تمہارے ساتھ یہ عورت کون ہے؟“

”یہ میری بیوی انٹوینا ہے اور میں میجر پائن ہوں۔“
”تم بہت اچھا بیٹا بنو جاتے ہو اور آج تم نے گھبرٹ اور سیولین کی جو دھن سنائی، اس نے اس پراسرار قاتل کے معے کا سراغ دے دیا جو اس کے مل کی جانب جاتا ہے۔“
گوڈیس ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ”حل؟ کیا حل؟“

انٹوینا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ تم نے اس ہوٹل میں بیٹا نوواز کا روپ دھارنے کا فیصلہ اس وقت کیا جب تمہیں کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ فیلون اس ہوٹل میں آ رہا ہے؟“

گوڈیس نے اسے تجسس انداز میں دیکھا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ فیلون گزشتہ تین برس سے سابقہ اداکارہ سمیرا اس پر فریفت ہے جو اب لیڈی بیٹھ کھاتی ہے۔ ہم نے اس کی انٹرنیٹ ہسٹری دیکھی۔ اس نے یوٹیوب پر دستیاں اس کی ساری فلمیں دیکھ رکھی تھیں۔ اسے وہی پیٹیا سے معلوم ہو گیا کہ اس اداکارہ نے سرائل بیٹھ سے شادی کر لی ہے اور

ایک ویب سائٹ سے اس کا موجودہ پتا بھی معلوم ہو گیا۔ فیلون نے انٹرنیٹ کے ذریعے اس کے دوسرے پرستاروں سے پیغام رسانی جاری رکھی جو زیادہ تر امریکا، اٹلی اور مشرقی یورپ میں رہتے ہیں۔ اس نے متعدد بار سمیرا اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اداکارہ نے اس کے کسی پیغام کا جواب نہیں دیا۔ وہ اس کے نام پر ایک سنائی سوسائٹی بنانا چاہ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کی سرپرست بن جائے۔“

”یہ سب اس نے اپنی آیا کا گلا گھونٹنے کے بعد کیا؟“

”ہاں، اسے گرفتار کرنے کے بعد نفیاتی معاہدہ

کر دیا گیا۔ وہ شیزوفرینیا کا مریض تھا۔ اس نے اپنی آیا پر بری عادتوں کی طرف راغب کرنے کا الزام لگایا گوکہ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کیا عادتیں تھیں۔ اس کا خاندان خاصا امیر اور بااثر ہے۔ انہوں نے اسے ایک ایسے کلینک میں داخل کر دیا جو نفسیاتی مجرموں کے لیے مخصوص تھا۔ وہ ہوشیار میں کسی جگہ پر واقع ہے۔ ڈاکٹر اور نرسوں کی نظر میں وہ ایک ماڈل مریض تھا۔ وہ ان کے ساتھ بڑے اخلاق اور متاثر کن انداز میں پیش آتا اور اکثر کہا کرتا کہ اسے اپنے کیے پر افسوس ہے اور اس کے آنسو بہنے لگتے۔ اس کا کہنا تھا کہ فیلون دماغی خلل کی وجہ سے ہوا۔ اس وقت اس کا ذہن بالکل تاریک ہو چکا تھا۔“

”پھر وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔“

”ہاں جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ کلینک کے حفاظتی انتظامات انتہائی ناقص تھے۔“ انسپکٹر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اسے صرف ڈاکٹر کا کوٹ پہننا پڑا اور مصنوعی موچیں لگا لیں پھر وہ بڑے آرام سے بچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ایک کزن نے اسے عارضی پناہ، جعلی شناختی کاغذات اور کچھ رقم دینے کا اعتراف کر لیا۔ پھر مری فیلون نے ویلا کورٹ... فون کر کے اپنے آپ کو سمیرا اس کا بیٹھ

ظاہر کیا اور کہا کہ وہ اس سے فوری طور پر بات کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ اس کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بٹلر نے بتایا کہ سمیرا اس لیک ڈسٹرکٹ کے گاؤں سینٹ بیڑم کی ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے کسی صحت افزا مقام پر چھل قدمی کرنے کا مشورہ دیا تھا اس کے بعد وہ سرائل کے ساتھ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ منانے ہیرو گیت جائے گی۔ سرائل اور لیڈی بیٹھ ہمیشہ اولڈ سوان ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔“

میجر پائن بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہی وہ وقت تھا جب تم نے یہاں آنے اور اس پر نظر رکھنے کا فیصلہ کیا؟“

”ہاں، میں نے سوچا کہ میں بہت اچھا بیٹا بنو جاتا ہوں تو کیوں نا اس کا صحیح استعمال کیا جائے۔ میرے افسران کو اس اسکیم پر شہرہ تھیں لیکن بعد میں وہ اس پر متفق ہو گئے لیکن ہمارا نشانہ خطا ہو گیا۔“

”اس میں تمہاری غلطی نہیں تھی۔“ انٹوینا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم نے اپنی تفتیش میں لیڈی بیٹھ کو شامل کیوں نہیں کیا؟ کیا ایسا کرنا ٹھیک نہ ہوتا؟“

”ہم اسے شامل تفتیش کرنا چاہ رہے تھے لیکن اس کے ڈاکٹر زکا کہنا تھا کہ وہ انتہائی نازک جذباتی کیفیت میں ہے اور لگتا ہے کہ وہ دو سال پہلے اسے جو زروں بریک ڈاؤن ہوا تھا ابھی تک اس کے اثرات باقی ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ



پاکستان
2017ء

جنگاتی جھلماتی تحریریں لیے ستمبر 2017ء کا دہن نمبر

پاکستان
ماہنامہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے خوب صورت سلسلے دار ناول نئی اقساط لیے

سیمہ رضا ردا نے اپنے ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں دکھائے کرداروں کے نئے رنگ

سحرش فاطمہ کے سحرانگیز بیان کا ترجمان مکمل ناول میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں

عالیہ درا کی نفسیاتی تحقیق کا نچوڑ ایک جاندار ناول اشک جگنو اور ستارے

نگہت اعظمی، سعدیہ رئیس اور فرح طاہر کی خصوصی کہانیاں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق اور حج کی باسعادت مناسبت سے اختر شجاعت کا پُر شکوہ مضمون

وہ آنے بزم میں.....

ہماری سینئر رائٹر صبیحہ شاہ

کی صباحت بھری آمد

شانستہ زبین کا سنہرا رو پہلا روپ لیے ایک جامع سروے

اس کی تلاش

دہن نمبر کے لیے شوق و شگ اور کہیں سنجیدہ رنگ لیے فوزیہ احسان رانا، المیس جبار، ہالہ احمد، ام نامہ، ضادیہ احمد، دانیہ آفرین، نگہت غفار، دیگر ہنرمند لکھاریوں کی حسین تحریریں

اس کے ساتھ، ساتھ دلچسپ اور پر تحقیق کارٹرز، سحرانگیز شاعری، خوش ذائقہ پکوان، قابل عمل نسخے اور بہت بہت پر لطف احوال صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر



خوب! تو صاحب زادے کیل کار میں
پھاڑوں کی سیر کو گئے تھے!

وہ ابھی تک دوائی لے رہی ہے۔ اس لیے ہم اسے یہ بتا کر مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ایک قاتل اس کا پیچھا کر رہا ہے جو جوڑوں کو کھا گھوٹ کر ہلاک کر دیتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں بہت ہوشیاری سے کیمل رہا ہوں لیکن سب غلط ہو گیا اور میری اسکیم دھری رہ گئی اور ہم واپس پرانی جگہ پر آئے۔“ انسپکٹر نے سر آدھ بھرتے ہوئے کہا۔ ”خدا ہی جانتا ہے کہ فیلون کہاں ہے اور میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔“

”فیلون یہیں ہے اور وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔“ انٹوینا نے کہا۔ ”یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب اسے کسی علاج کی ضرورت نہیں رہی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ وہ یہاں؟“

اس نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”فیلون مر چکا ہے۔“ ☆☆☆

دودن بعد وہ چاروں یعنی انٹوینا، میجر پائن، مسٹر کارٹ اور ڈیورائی شاپ میں کافی بی رہے تھے۔ ڈیورائی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”تو تم سراغ رسانی پر مبنی کہانیاں لکھتی ہو اور کسی حد تک خود بھی سراغ رساں ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک میں نے تمہاری کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ میں یقیناً تمہاری کتابیں ضرور پڑھوں گی۔“

”تمہیں یقیناً انٹوینا کی کہانیاں پسند آئیں گی۔“ پائن نے کہا۔

”کیا انسپکٹر نہیں جانتا تھا کہ فیلون دہری شخصیت کا مالک ہے؟ کیا یہ ایک جانی پہچانی حقیقت نہیں تھی؟ ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہیں۔“

”نہیں، فیلون نے بھی لڑکی کا روپ نہیں

دھارا۔“ انٹوینا نے کہا۔ ”اس وقت بھی نہیں جب اس نے اپنی آیا کو قتل کیا۔ اس کے کزن نے انسپکٹر کو یہی بتایا کہ فیلون اس کا ذمے دار اپنی آیا کو سمجھتا تھا۔ اسی نے اس میں لڑکیوں والی عادتیں ڈالیں جب وہ ایک چھوٹا لڑکا تھا تو آیا اس کے بال نہیں کاٹی تھی۔ اسے لڑکیوں والے کپڑے پہنائی اور انہی کی طرح اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سکھائی۔“

”فیلون کے والدین اس کے پاس نہیں تھے۔ ویسے بھی انہوں نے ہمیشہ لڑکی ہی کی خواہش کی تھی۔ اس لیے انہوں نے رکی میں ہونے والی تبدیلیوں پر اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ اسے زنانہ کپڑے پہننے دیکھ کر خوش ہوتے اور اس سے رقص کی فرمائش کرتے۔ جو ان ہونے تک رکی فیلون کی شخصیت و دھوڑوں میں بیٹ گئی۔ بظاہر وہ مرد تھا لیکن اس کی

تمام عادات نسوانی تھیں۔ آیا کو قتل کر کے وہ ذہنی طور پر مریض بن گیا۔ اس نے رکی سے جان چھڑائی اور ایریکا بننے کی طرف ہائل ہو گیا۔“

”لیکن جب اس نے پہلی بار لیڈی بیٹھ سے بات کی تو اس وقت مرد تھا۔“ آرٹلڈ نے پوچھا۔

”ہاں وہ مرد کے روپ میں ہی سینٹ بیز گیا تھا۔“ انٹوینا نے کہا۔ ”اس نے اسی ہوٹل میں کمرہ کرایا جہاں لیڈی بیٹھ ٹھہری ہوئی تھی اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔“

وہ اپنے آئی پیڈ کے ذریعے اس کی تصویریں لیتا رہا اور یہ کام اس نے اتنی ہوشیاری سے کیا کہ لیڈی بیٹھ کو پتا بھی نہیں چلا۔ وہ اس کا سا بے بن کر رہ گیا۔ وہ گلبرٹ اور اس کی دوسری بیوی کے قتل کا معنی شاد تھا کیونکہ وہ چھل قدمی کے دوران اس کا پیچھا کیا کرتا۔“

”لیڈی بیٹھ کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا سابق شوہر

دوسری بیوی کے ساتھ سینٹ بیز میں ہی ہے جس کی خاطر

اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔“

”اس طرح کے واقعات کتابوں میں ملتے ہیں لیکن

بعض اوقات حقیقت میں بھی ایسا ہو جاتا ہے۔“ میجر پائن

نے کہا۔ ”لیڈی بیٹھ کو کبھی اس کا علم چھل قدمی کے دوران

ہوا۔ اس نے ان دونوں کو ایک چٹان پر کھڑے دیکھا اور

سمجھی کہ وہ سورج ڈوبنے کا نظارہ کر رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ

تھی کہ وہ خود کشی کرنے والے تھے جیسا کہ بعد میں گلبرٹ کی

جیب سے ملنے والے خط سے ظاہر ہوا۔ گلبرٹ کی دوسری

بیوی کو کینسر تھا اور وہ اس کے بغیر نہیں رہتا چاہتا تھا چنانچہ

انہوں نے خود کشی کا فیصلہ کیا۔ لیڈی بیٹھ کو یہ بات معلوم

نہیں تھی۔ اس نے گلبرٹ کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ اس سے

اب بھی محبت کرتی تھی حالانکہ وہ خود بھی سر لائل سے شادی کر چکی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔
 ”وہ ایک الگ تھلک جگہ بھی اور اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ فیلون ایک درخت کے پیچھے چھپا کھڑا ہے۔ وہ دبے قدموں وہاں تک پہنچی اور دونوں میاں بیوی کو اس چٹان سے دھکا دے دیا جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے پھر وہ سینٹ بیز کی جانب چل دی۔
 اس کا کہنا ہے کہ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔“
 ”کیا وہ ہول ہوئی واپس آئی؟“

”ہاں اس نے فوراً ہی اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔“ انٹوینا نے کہا۔ ”اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ایک اجنبی وجوان شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کا بہت بڑا پرستار ہے اور آٹوگراف کی فرمائش کی لیکن لیڈی نے انکار کر دیا۔ اس وجوان نے کہا وہ چاہتا ہے کہ وہ اس سوسائٹی کی سرپرست بن جائے جو وہ اس کی تعریف کے لیے قائم کر رہا ہے۔ لیڈی نے اسے کمرے سے جانے کے لیے کہا جس پر وہ وجوان بولا کہ وہ اس بارے میں سوچے وہ اس سے رابطے میں رہے گا۔“
 ”اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اسے دہرا قتل کرتے ہوئے دیکھ چکا ہے؟“

”نہیں، اس وقت نہیں۔“ پائٹن نے کہا۔ ”مت بھولو کہ وہ اس پر فریفتہ تھا اور دیکھ سکتا تھا کہ وہ پریشان ہے۔ وہ تعظیماً جھکا اور چلا گیا۔ تاکہ اولڈ سوان ہوٹل میں ایک مختلف روم میں سامنے آئے۔ ہم سب نے انہیں اس ہوٹل میں گھنٹہ کرتے دیکھا۔ لیڈی پیچٹ نے اسے پہچان لیا اور خوف زدہ ہو گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس قتل کے بارے میں جانتا ہے۔“
 ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو مجرم محسوس کر رہی ہو؟“
 ڈیپورائے کہا۔

”ہاں یہ بھی ممکن ہے بعد میں اس شخص نے لیڈی کو لائبریری میں بیٹھا ہوا دیکھا اور اس سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لیے کہا۔ لیڈی نے ایک بار پھر انکار کر دیا جس پر اس شخص نے کہا کہ وہ اس کے جرم سے واقف ہے۔ یہ کی فیلون اپنی نازل آواز میں بول رہا تھا اور اسے بلیک میل کر رہا تھا پھر اس نے لیڈی سے کہا کہ وہ اس کے آئی پیڈ پر تصویریں دیکھ سکتی ہے جن میں سے ایک میں وہ گلبرٹ جوڑے کی طرف جارہی ہے اور دوسری میں وہ خالی چٹان سے واپس آ رہی ہے۔“

میجر پائٹن نے کہا۔ ”اس کے خلاف تقریباً واقعاتی ثبوت ہیں۔ سینٹ بیز ہوٹل کے میجر نے تصدیق کی کہ لیڈی پیچٹ اور فیلون ایک ہی وقت میں اس کے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس نے فیلون کی تصویر بھی پہچان لی۔ اس نے فیلون کو لیڈی کا پیچھا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا تاہم لیڈی نے جوئل کیے، اس کی شہادت کوئی نہیں اور نہ ہی وہ آئی پیڈ مل سکا جس میں تصویریں تھیں۔“

”اب اس کے پاس اعتراف جرم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ جسے وہ قاتل سمجھ رہی تھی، وہ دراصل پولیس انسپکٹر تھا۔“ انٹوینا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کہنا تھا کہ اسے بلیک میل سے جان چھڑانے کا خیال اس وقت آیا جب شام کا اخبار تقسیم کیا جا رہا تھا اور اس نے قاتل کی تصویر دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ ہوٹل کا بیانا نواز ہے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تصویروں پر غلط کیٹچن لگ گئے تھے، اس نے سوچا کہ یہی سمجھا جائے گا کہ اسی قاتل نے ایریکا کو بھی ہلاک کیا ہے۔“

”اس کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ایریکا بھی فیلون تھی؟“ آرٹلڈ نے پوچھا۔

”ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ وہ اس کے کمرے میں تھی اور کہا کہ وہ اس کی بات ماننے پر تیار ہے۔ وہ اسے آٹوگراف بھی دے گی اور اس کی سوسائٹی کی سرپرست بھی بن جائے گی جب وہ اپنی آٹوگراف بک اٹھانے کے لیے مزا تو اس نے بوٹائی کی مدد سے اس کا گلا گھونٹ دیا جو سر لائل کی تھیں اور اس کے سامان میں پہلے ہی ہوٹل کی پیکیج تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ فوری طور پر یہی سمجھا جائے گا کہ یہ بوٹائیاں بیانا نواز کی تھیں۔“

”پھر اس نے فیلون کے آئی پیڈ سے ساری تصویریں ضائع کر دیں اور اسے اپنے بیگ میں ڈال کر شوہر کے لیے ویلھائن کا تحفہ لینے چلی گئی۔ راستے میں اس نے وہ آئی پیڈ ایک ٹالے میں چھپکھپکھایا۔“

آرٹلڈ بولا۔ ”سر لائل کا کہنا ہے کہ اس شوہر اے کی اہمیت چائے کی پیالی میں اٹھنے والے طوفان سے زیادہ نہیں۔ وہ بہترین دیلوں کی خدمات حاصل کرے گا۔“

”میں نے اب تک جتنی کہانیاں سنی ہیں، ان میں یہ بہترین ہے۔“ ڈیپورائیولی۔ ”یہ بہت بڑا جرم ہو گا انٹوینا۔ اگر تم نے اسے نہ لکھا۔“



کھوٹ

تنویر واسطی

نیت اچھی ہو تو بڑے سے بڑے نقصان کے باوجود انسان فائدے میں رہتا ہے... اگر نیت میں کھوٹ ہو تو وہ کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی بددینی... اس نے احسان فراموشی کو بالائے طاق رکھ دیا تھا...

فراڈ سے باز نہ آنے والوں کا المیہ.....

اسمٹہ بھی بیو کی طرح چھ فٹ دواغ لمبا لیکن قدرے بھاری جسامت والا تھا۔ اس کے بال سرخی مائل بھورے اور آنکھیں سبز تھیں۔ ڈھانچے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”میں تو سمجھا تھا کہ ہم نے تمام لاشیں تلاش کر لی ہیں۔“ اسمٹہ نے چیخے ہتے ہوئے کہا اور بیو سامنے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس گھر میں کوئی دروازہ یا ٹوٹی ہوئی کھڑکی باقی نہیں بچی تھی۔

”کیوں نہ ہم ایک اور ڈوبی ہوئی عورت کی لاش لے کر میڈیکل آفیسر کے پاس چلیں۔“ اسمٹہ نے ایک چھوٹے سے تولیے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

”تم نے اس کی ٹھو پڑی کی پشت پر سوراخ دیکھا؟“ بیو نے کہا۔

”ہاں، یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یعنی اسے قتل کیا گیا ہے۔“

آپریشن کلین سوپ میں ایف بی آئی کے ساتھ مقامی سراغ رساں اور پولیس آفیسر بھی حصہ لے رہے تھے۔ اس کا مقصد ایک تو طوفان کی تباہ کاریوں کا جائزہ لینا تھا اور...

اس کے ساتھ ہی وہ ان منشیات فروشوں کو بھی پکڑ رہے تھے جو ویران گھروں میں چھپ کر کاروبار کرتے تھے۔ یہ لوگ طوفان آنے کے بعد ہوسٹوں اور اٹلانٹا چلے گئے تھے لیکن ایک سال بعد وہ نو تعمیر شدہ شہر میں دوبارہ اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب تک انہیں خاصی کامیابی ہوئی

بلیک جرمن شیفر ڈ کوئی شکاری کتا نہیں تھا لیکن اس نے اس بے رنگ و روغن لکڑی کے مکان کی سڑھیوں کے نیچے بنی ہوئی الماری میں وہ ڈھانچا تلاش کر لیا۔ وہ غراتا اور بھونکتا ہوا واپس پلٹا۔ سچی سراغ رساں بیو نے اپنی تاریخ کی روشنی میں وہ ڈھانچا دیکھا جو ہڈیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جان ریون بیو، نیو اور لینز پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہوئی سائڈ کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اور ان دنوں بیو اکیلا ہی اپنے فرائض انجام دے رہا تھا کیونکہ دوسرے آفیسر آپریشن کلین سوپ میں مصروف تھے، وہ چار ستمبر دو ہزار چھ کا ایک روشن گرم دن تھا۔ اس مکان میں بچی نہیں تھی اور اس کے بیرونی حصے پر مٹی کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی جو کہ زیریں تانکھہ وارڈ کے تمام مکانوں پر جمع ہو گئی تھی۔ یہ ایک سال پہلے آنے والے خوفناک طوفان قطرینا کی وجہ سے ہوا تھا۔

بیو نے گھنٹوں کے بل جھک کر دیکھا۔ اس کے ماتھے سے پسینا بہہ رہا تھا۔ اس کے ڈارک براؤن بال بڑھے ہوئے تھے اور اس نے دودن سے شیو بھی نہیں بنایا تھا۔ اس نے ٹھوڑی کمزید نیچے کیا اور سچی اس کی نظر کھوپڑی کے عقب میں ایک سوراخ پر مٹی۔ الماری میلے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی جو بیگروں پر لٹکے ہوئے تھے جبکہ ایک کونے میں رنگ آلود وہیل چیئر بھی رکھی ہوئی تھی۔

بیو واپس آیا اور اس نے ایف بی آئی کے اسٹیشنل ایجنٹ مائیک اسمٹہ سے کہا کہ وہ کرائم لیب ٹیسٹیشن کو بلا لے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اسمتھ نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں نے پہلے بھی قتل کے کیس پر کام نہیں کیا۔ میں زیادہ تر وائٹ کالر گرام ویکٹا ہوں پھر ہم کس طرح اس ڈھانچے پر کام کریں گے اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟“

”اس سے پہلے میں بتا لگتا ہوگا کہ مقتول کون ہے؟ ہم کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے کیونکہ اس علاقے میں کوئی نہیں رہتا۔“

یہ اور اسمتھ نے لاش کے پٹائے جانے کے بعد پینتالیس منٹ تک مکان کی تلاشی لی تھی اور انہیں وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے مقتول کے بارے میں کچھ پتا چلتا۔ ”ہمیں جائداد کے ریکارڈ سے ابتدا کرنا ہوگی۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس مکان کا مالک کون ہے؟“ یہ نے کہا۔

رات کے کھانے پر ان کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس بار انہوں نے ایک دوسرے ریسٹوران کا انتخاب کیا۔ اس وقت تک وہ یہ معلوم کر چکے تھے کہ یہ مکان آخری بار 1922 میں سیوئیل ڈی سلور اسٹین اور آئرناروک سلور اسٹین نے خریدا تھا۔ گویا سلور اسٹین اور ان کے وارث ہی

تھی اور تلاشی کے نتیجے میں انہیں اتنا اسلحہ بارود ملا جو افغانستان یا عراق کی جنگ میں دونوں کے لیے کافی ہوتا۔ انہوں نے ویران مکانوں کے ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹریلرز کی بھی تلاشی لی۔ جس دن یہ ڈھانچا دریافت ہوا۔ اسی روز مختلف مکانوں سے بائیس افراد کو گرفتار کیا گیا جن کے پاس سے ستر گرام کوکین اور چھ پاؤنڈ چرس برآمد ہوئی۔

یہ باہر نکل کر ایف بی آئی کی اسٹیشن وین تک گیا۔ کولر میں سے پانی کی دو بوتلیں نکالیں۔ ایک اسمتھ کو دی اور دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کرائم لیب والوں کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی سفید اسٹیشن وین آگئی۔ وہ دونوں انہیں وہ ڈھانچا دکھانے لے گئے جو ڈیسلونڈ اسٹریٹ کے مکان نمبر 312 کی ایک الماری میں پڑا ہوا تھا۔ یہ مکان انڈسٹریل کنال سے دو بلاک اور دریائے سسی ہسی سے تین بلاک کے فاصلے پر تھا۔

ان دونوں نے سچ ایسی اوپن سٹریٹ میں کیا۔ یہ چھوٹا سا ریسٹوران گاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگ ہسپانوی زبان بول رہے تھے کیونکہ شہر کی تعمیر نو میں حصہ لینے کے لیے جنوبی اور وسطی امریکا سے یہاں آ گئے تھے۔



اس کے قانونی مالک تھے۔ اس مکان کا جائداد ٹیکس کبھی ادا نہیں کیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لوزیا نامی شخص پچھتر ہزار ڈالر سے کم مالیت کے مکانات ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ بجلی یا ٹیکس کمپنی کا ریکارڈ بھی دستیاب نہیں تھا کیونکہ سارا ریکارڈ طوفان کی نذر ہو گیا تھا اور اب دونوں کمپنیاں کمپیوٹر فائلوں سے ریکارڈ تلاش کر رہی تھیں۔ اسی طرح دوڑ لسٹ میں بھی اس مکان کے کسی مکین کے نام کا اندراج نہیں تھا۔

”پھر اس مکان میں کون رہتا تھا؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

”گلتا یہی ہے کہ اس پر کسی نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔“ بیو نے کہا۔ ”شاید سلوراسین کا کوئی وارنٹ نہیں تھا اور اس کے مرنے کے بعد کسی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ تاکتھ وارڈ میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو قرض حاصل نہیں کر سکتے، ان کے پاس اپنی کوئی جائداد نہیں ہوتی۔“

”ایف بی آئی یہ چیک کر سکتی ہے کہ کسی نے اس مکان کو خریدنے کے لیے قرض کی درخواست تو نہیں دی؟“

پوسٹ مارٹم کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ یہ ایک مکمل انسانی ڈھانچہ نہیں تھا۔ دائیں ران کی ہڈی کے علاوہ سیدھے ہاتھ کی بڑی ہڈی، ریڑھ کی ہڈی کے دو مہرے، سیدھے ہاتھ کی چھ ہڈیاں اور بائیں بازو کی چار ہڈیاں غائب تھیں۔ البتہ گولی اپنی اصلی شکل میں موجود تھی۔

”یہ کسی جانور کے چبانے کے نشانات ہیں۔“ پیٹھالوجسٹ نے بائیں ران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔ ”شاید کتے ہڈیاں لے گئے۔“

کرائم لیف اینیٹشن نے گولی دکھائی اور بولا۔ ”گلتا ہے کہ اعضاء یہ اڑتیس کے رپو اور سے چلائی گئی ہے۔ تم سر پہر میں فون کرنا۔ اس وقت تک اس کی تصدیق ہو جائے گی۔“

بیو نے اسمتھ کے دفتر میں قدم رکھا تو ایف بی آئی آفیسر نے اسے بتایا۔ ”اس مکان کے لیے دو مختلف لوگوں نے قرض کی درخواست دی ہے۔ ان میں سے ایک ایڈا اسمتھ ہے جو اس وقت اٹلانٹا میں پناہ گزین ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا مکان دو منزلہ تھا جو طوفان میں بہہ گیا لیکن اس کے پاس ملکیت کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے اس کی

درخواست ستر دکر دی گئی۔ دوسرا پناہ گزین الفریڈ بی جوز ہے جس نے ہوٹن سے درخواست دی تھی۔ ہمارے فراڈ یونٹ نے ایڈا اسمتھ کا تو پتا لگا لیا لیکن جوز کو ہوٹن پولیس نے گولی مار دی۔“

”اب ہم کیا کریں گے؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

”گڈول۔“ بیو نے پرامید لہجے میں کہا۔

”ادھہ۔“ اسمتھ نے برا سامنہ بنایا جیسے وہ اس خیال سے متفق نہیں تھا۔

”یہ ایک غیر منافع بخش ادارہ ہے جو ضرورت مندوں کو خوراک، کپڑے، فرنیچر یہاں تک کہ نقد رقم بھی فراہم کرتا ہے۔“ بیو نے کہا۔ ”جیک کی مدد سے ہم مطلوب شخص کا پتا لگا سکتے ہیں۔“

پیتا لیس منٹ بعد وہ گڈول ہیڈ کوارٹر میں تھے جہاں انہیں ایک تیز و طرار عورت کلیری اسمتھ نے بتایا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم اس شخص کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔ یہ ہم سے تین مرتبہ ہزار ہزار ڈالر لے چکا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک فولڈر کھولا اور اس میں رکھا ہوا کاغذ پڑھنے لگی۔

”ایڈلن گرین نے تینوں درخواستوں پر یہی نام لکھا لیکن دستخط اور سوشل سیکیورٹی نمبر مختلف تھے۔ اس نے 312 ڈیسٹنڈ اسٹریٹ کے نقصان کا دعویٰ ہمارے امدادی مرکز پر کیا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور بولی۔ ”اس پر بھی وہی دستخط ہیں۔“

”کیا اس نے موجودہ پتا دیا تھا؟“ اسمتھ نے اپنا قلم اور نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

”اس نے ڈیسٹنڈ کو ہی اپنا مستقل پتا بتایا البتہ عارضی پتے کے طور پر تین پناہ گاہوں کے نام لکھے۔“

”کیا ہمیں ان درخواستوں کی نقول مل سکتی ہیں۔“

”میں تمہارے لیے نئی کاپیاں نکلاؤں گی۔“ مسز اسمتھ نے سر دھجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد بیو، اور لینز پولیس ڈپارٹمنٹ کی دو منزلہ عمارت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ حصہ سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا تھا۔ اسمتھ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”ایڈلن گرین، سان انٹو میں ہے۔ میں نے اس کے پیچھے دو ایجنٹ لگا دیے ہیں۔“

بیو نے کہا۔ ”وہ جیوش جیل میں ہے۔ چلو اس سے بات کرتے ہیں۔“

”کیا؟“ اسمتھ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

بیو نے اپنا کوٹ اٹھایا اور بولا۔ ”مجھے پہلا سبق یہ پڑھایا گیا تھا کہ پولیس کمپیوٹر ضرور چیک کرو۔ ایملڈن گرین ایک مبینے سے جیل میں ہے۔ اس پر تین ڈکیتیوں کے علاوہ غیر قانونی طور پر پانچ سو گرام کوکین رکھنے کا الزام ہے۔“

ایملڈن گرین کا قد چھ فٹ پانچ انچ اور وزن اسمتھ سے پچاس پاؤنڈ زیادہ تھا۔ اس کا سر گنجا اور چہرے کے دونوں جانب زخموں کے نشانات تھے۔ ان کی ملاقات اور لینز پیرش جیل کی پہلی منزل پر واقع ایک چھوٹے انٹرویو روم میں ہوئی جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ شریف کے ایک ڈپٹی نے گرین کے بائیں ہاتھ میں بندھی پھٹکڑی کو آہنی میز سے باندھ دیا جو بولٹ کے ذریعے فریش سے جڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پیروں میں زنجیر تھی اور اس نے قیدیوں والا اورنج سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسمتھ نے اسے ان درخواستوں کی نقول دکھائیں جو انہیں گڈول سے ملی تھیں۔

”تم اسی لیے یہاں آئے ہو؟“ گرین نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”کیا تم کبھی 312 ڈیسلوئڈ میں رہے ہو؟“

”کئی سال۔“

”تمہارے علاوہ وہاں اور کون رہتا تھا؟“

”کئی لوگ، وہ ایسی جگہ تھی جہاں لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔“

بیو نے فور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ جب اسمتھ نے اس سے پوچھا کہ اس گھر میں وہیل چیئر کون استعمال کرتا تھا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا اور اس سے سگریٹ مانگی۔

”ہم سگریٹ نہیں پیتے۔“ اسمتھ نے کہا۔

”اچھا، تمہارے پاس چاکلیٹ تو ہوگی یا خالی ہاتھ چلے آئے ہو؟“

ایملڈن گرین سے انہیں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی البتہ بیو نے یہ اندازہ ضرور لگایا کہ اگرچہ وہ قاتل نہیں ہے لیکن جانتا ہے کہ یہ قاتل کس نے کیا۔ وہاں سے واپسی پر راستے میں اسمتھ نے پوچھا۔ ”اب کیا پروگرام ہے؟“

”جیرن پیرش کرائم لیب چلو۔“ اس نے اپنی نوٹ بک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں گرین کا ریکارڈ دیکھنا ہے۔ وہ اکتوبر 2005ء میں طوفان کے فوراً بعد گرفتار ہوا تھا۔“

اسمتھ نے دو صفحات پر مشتمل فہرست دیکھی اور بولا۔ ”اس کے پاس سے آتشیں اسلحہ برآمد ہوا تھا۔“

”شیرف کے دفتر نے اس سے ایک گن لی تھی۔ شاید اب بھی ان کے پاس ہوگی۔“

”یہ بھی ایک جرم ہے۔“ اسمتھ نے نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔

کرائم لیب کی چیف ایگزیکٹو لوئیس بیکر ایک دراز قد عورت تھی۔ اس نے خلیے رنگ کا لیب کوٹ پہن رکھا تھا۔

”تم جس ہتھیار کی بات کر رہے ہو، اب وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ایک گن کی مہربانی سے وہ گن ایملڈن گرین کو واپس کر دی گئی تھی۔ حالانکہ وہ گن سمیت پکڑا گیا تھا لیکن ڈسٹرکٹ انٹاری کی طرف سے الزام واپس لینے کے بعد جج نے ایک مجرم کو وہ گن واپس کر دی۔“

”کیا تم سنجیدہ ہو؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

بیکر نے اس پر گہری نظر ڈالی اور بولی۔ ”تم تو لیانا میں کب سے ہو؟“

پھر وہ بیو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”ہم ہر ہتھیار کو ٹیسٹ کرتے ہیں۔ کیا میں تمہیں یہ بتایا کہ گرین کا رولور اعشاریہ اڑیس کا تھا اور اس سے تاملتھ وارڈ میں گولی چلائی گئی تھی۔“

”کیا واقعی؟“

بیکر نے بیو پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنا نام بیو بتایا تھا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”میں نے تمہارے بارے میں سن رکھا ہے۔“ پھر اس نے اسے کئی کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے ریکارڈ کے لیے ہیں۔ جب تم وارنٹ گرفتاری لینے جاؤ گے تو یہ تمہارے کام آئیں گے۔“

اسمتھ نے بیو کے کندھے پر ہاتھ بارتے ہوئے کہا۔

”اب ہم اسے پکڑ سکتے ہیں۔“

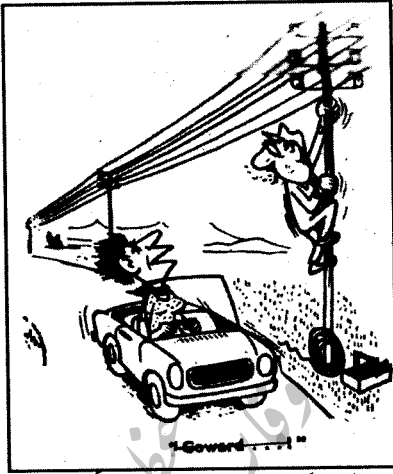
”تم یہاں کی عدالتوں کے بارے میں نہیں جانتے۔ جب تک ہمارے پاس گن یا اعتراف جرم نہ ہو، اس وقت تک یہ بیکار ہے۔“

”تم سنجیدہ ہو؟“ اسمتھ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

بیو نے لوئیس بیکر کا شکر یہ ادا کیا اور دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں بیٹھے ہی اسمتھ نے کہا۔

”ہم نے یہ کیس حل کر لیا ہے۔“

بیو نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”یہ کافی



بس ڈر گیا میری گاڑی سے..... بزدل کہیں کا

بائی واٹر اور ٹائیگر وارڈ کے اجازت مکانوں میں رہنے لگا لیکن ڈیسلونڈ اسٹریٹ بھی نہیں گیا۔

”یہ بولی کر اس ہائی اسکول کے قریب ہے۔“
”میں جانتا ہوں لیکن وہاں کسی مکان میں نہیں رہا۔“
”تم نے بھی گرین کے پاس کوئی گن دیکھی؟“
”نہیں۔“

وہ گرین کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتا سکا اور نہ ہی اسے وہیل چیئر کا کچھ پتا تھا۔ البتہ اس نے اتنا ضرور کہا۔ ”میں اس کی سابق بیوی کو جانتا ہوں۔ وہ میری کزن میری ریڈ ہے۔“
”ہم میری کس طرح تلاش کر سکتے ہیں؟“ بیو نے پوچھا۔

”وہ عرصہ ہوا یہاں سے جا چکی ہے۔ قطر بنلے بعد وہ نیش دل چلی گئی تھی۔“
”اس کا کوئی دوست یا رشتے دار نیواورلینز میں ہے۔“

ریک مین نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مزید کوئی مفید معلومات فراہم نہ کر سکا۔ بیو نے اسے اس سے کہا کہ کیا وہ کوئی سوال کرنا چاہتا ہے۔
”اگر میری ریڈ تمہاری کزن ہے تو کیا تمہارا کوئی اور رشتے دار اس شہر میں ہے؟“

نہیں ہے۔ ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ قتل کے وقت یہ گن گرین کے ہاتھ میں تھی اور اس کے لیے اعتراف جرم ضروری ہے۔“

”ہم اس کی گرفتاری کا وارنٹ لے سکتے ہیں۔“
اسمٹھ نے کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پاس اس کی گرفتاری کی ممکنہ وجہ ہے۔ اگر پولیس آفیسر کے پاس ایسے حقائق ہیں جن کی روشنی میں وہ کسی شخص کو مشتبہ سمجھتا ہے تو اس کے وارنٹ جاری ہو سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟“ اسمٹھ نے کہا۔

بیو اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہم اس کے دوستوں سے ملیں گے۔ کوئی ایسا شخص جو ایلڈن گرین کو جانتا ہو۔ اس کی گن کے بارے میں اسے پتا ہو۔ شاید وہ بتا سکے کہ ہم کس کی ہڈیاں لے کر آئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ قتل کس نے کیا ہے لیکن ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کا قتل ہوا ہے۔“

اسمٹھ نے اپنا سر پیچھے کیا اور بولا۔ ”قلوں میں جس طرح قتل کا معما حل کیا جاتا ہے، یہ اس سے مختلف ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم ٹکڑے جوڑ کر کوئی تصویر مکمل کر رہے ہیں۔“

بیو نے اس کی بات سنی اور بولا۔ ”سب سے مشکل کام ان ٹکڑوں کو تلاش کرنا ہے۔“

”ایلڈن گرین کا واحد ساتھی ان دنوں جیمز سن پیرش کے بحالی مرکز میں مقیم تھا۔ لہذا اگلی صبح نو بجے ایک ڈپٹی جی ریک مین کو جیل کے انٹرویو روم میں لے کر آگیا۔ جی نے اورنج کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ہلکے سانسو لے رنگ کا افریقی امریکن تھا اور دودھ چوری کے الزام میں پکڑا جا چکا تھا۔ اس کے نامہ اعمال میں تین ڈیٹیاں، شدید نوعیت کے حملے، مار پیٹ، چوری، لوٹ مار اور چرس رکھنے کے الزامات تھے۔ اسمٹھ نے اپنا تعارف کروایا تو ایف بی آئی کا نام سن کر ریک مین کی بھوین تن گئیں۔ بیو نے کہا۔

”ہم تمہارے بارے میں کوئی بات کرنے نہیں آئے بلکہ تمہارے دوست ایلڈن کے بارے میں کچھ جانتا چاہتے ہیں۔“

ریک مین نے کہا کہ وہ طوفان کے بعد پناہ کی تلاش میں چلا گیا تھا لیکن جلد ہی واپس آگیا اور پانی بجلی کے بغیر

وہ گھاس سے بڑھی ہوئی جڑوں کے درمیان نالی کھود رہا تھا۔
جیسے ہی اس کی نظر سراغ رساںوں پر پڑی وہ گھر کے دروازے
کی طرف دوڑتے ہوئے چلایا۔ ”ماما، پولی، پولی.....“

میری ریڈ طویل قامت دہلی پتلی عورت تھی۔ اس کا
قد چھ فٹ کے لگ بھگ ہو گا۔ اس کے بال سرخی مائل
بھورے جبکہ جلد کا رنگ چیری کی لکڑی جیسا تھا۔ اس کی
گردن کی دائیں جانب ایک ٹیو بنا ہوا تھا۔ جب اس نے
جالی والے دروازے کے باہر سراغ رساںوں کو دیکھا تو اس
کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری۔ اس نے فی شرٹ اور
جینز پہن رکھی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو لڑکا دوڑتا ہوا اندر
گیا۔ اسمتھ نے اپنا کارڈ نکالا اور بولا۔

”ایف بی آئی، اینٹیل ایجنٹ اسمتھ اور میرے ساتھ
شیرف آفس کے سراغ رساں پیٹرن اور نیو اور لینز پولیس
کے سراغ رساں بھی ہیں۔“

اس عورت کی براؤن آنکھیں بڑے جرم لگیں اور وہ
بولی۔ ”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟“
”کس بارے میں؟“

”گرمین کے بارے میں جسے لوگ کوچازر کے نام
سے بھی جانتے ہیں۔“

ریڈ نے ایک بار پھر بڑے سیٹے پر گلے ہوئے بیچ
کو دیکھا اور انہیں اندر آنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ تینوں
لیونگ روم میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ میری
ریڈ نے ایزی چیئر سنبھال لی۔ اس کا بیٹا بھی سامنے ہی
بیٹھ گیا۔

بڑے نے اسمتھ کو موقع دیا کہ وہ میری ریڈ کے پس منظر
کے بارے میں سوالات کرے۔ دونوں نے نوٹ بک
نکال لی۔ میری ریڈ نے بتایا کہ وہ نیو اور لینز کے ایک فلاحی
اسپتال میں پیدا ہوئی اور نانکھ وارڈ میں پلٹی بڑھی۔ قطرینا
سے پہلے وہ دس سال سے لوئر نانکھ میں رہ رہی تھی۔ چنے
کے لحاظ سے وہ نرس تھی لیکن اس علاقے میں اسپتال نہ
ہونے کے سبب اسے کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ اس نے بتایا

کہ طوفان آئیچی کے بعد وہ لیک چارلس آئی۔ اسے چند
اچھے لوگوں کی مہربانی سے یہ مکان کرائے پر مل گیا۔ وہ ایک
ڈاکٹر ہے اور اس کی بیوی ڈانس اسٹوڈیو چلاتی ہے۔ جب
اس نے اپنی کہانی ختم کی تو بڑے نے پوچھا۔

”تم کو چازر کوکب سے جانتی ہو؟“
اس نے ایک گہری سانس لینے ہوئے کہا۔ ”تقریباً

”میں نے یہ کب کہا کہ وہ میری کزن ہے۔ میرا مطلب تھا
کہ وہ کزن جیسی ہے۔ ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔“
اس سہ پہر دفتر واپس پہنچ کر بڑے نے اسمتھ کو فون کیا اور
بولا۔ ”میری ریڈ نیش ول میں نہیں ہے۔“
”پھر وہ کہاں ہے؟“

”وہ لیک چارلس میں فوڈ اسٹیپ پر گزارہ کر رہی
ہے۔“ یہ کہہ کر بڑے نے ریسپور ہاتھ میں پکڑا اور لیک چارلس
میں سراغ رساں مائیک پیٹرن کا نمبر ملانے لگا۔ اس کے
ساتھ ہی اس نے اسمتھ سے بھی رابطہ منقطع نہیں کیا تا کہ وہ یہ
گفتگو سن سکے۔ مائیک کی آواز سن کر اس نے کہا۔ ”میں
نیو اور لینز پولیس ڈپارٹمنٹ سے سراغ رساں جان ریون بڑے
بول رہا ہوں، تم سناؤ کیا کر رہے ہو؟“

”کھانا مار رہا ہوں۔“ پیٹرن نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”میں اپنے دفتر میں ایف بی آئی کے اینٹیل ایجنٹ
مائیک اسمتھ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی
ضرورت ہے۔“

”اف میرے خدا، ایف بی آئی والوں کے ہوتے
ہوئے تمہیں میری مدد کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ خیر کہو، کیا
کام ہے؟“

”لیک چارلس میں ہمارا ایک امکانی گواہ ہے۔ تمہیں
اس کا نام اور پتا کھوا رہا ہوں۔ کیا تم میری خاطر اسے تلاش
کر سکتے ہو؟“
”ٹھیک ہے۔ تم نام بتاناؤ۔“

بڑے نے اسے میری ریڈ کے بارے میں معلومات اور
لیک چارلس میں اس کے آخری پتے کے بارے میں بتایا تو
وہ بولا۔

”یہ علاقہ شہر کی حدود میں ہی ہے لیکن میں تمہاری
خاطر پتا لگاؤں گا تا کہ تمہیں سٹی پولیس کو فون نہ کرنا
پڑے۔“

”گڈ، میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔“ یہ کہہ کر اس نے
فون بند کر دیا اور اسمتھ سے کہا۔ ”بذریعہ سڑک سفر کرنے
کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

وہ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں لیک چارلس پہنچ
گئے۔ سراغ رساں مائیک پیٹرن چھوٹے قد کا باؤنی شخص
تھا۔ وہ انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک متوسط آبادی میں
لے گیا جہاں اینٹوں کے بنے ہوئے سنگل اسٹوری مکان
بنے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا میگو لیا کے درخت کے
نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا بیچل تھا جس سے

آسکتا۔ میں اس پر قتل کا الزام عائد کرنے والا ہوں۔“
 ”اس نے اور بھی جرم کیے ہیں۔“ اسمتھ نے کہا۔
 ”جن میں غیر قانونی طور پر آتشیں اسلحہ رکھنا اور گڈول سے
 تین مرتبہ فراڈ کرنا شامل ہے۔“
 ریڈ کی نظریں بیو پر جم گئیں۔ وہ اس کے بولنے کا
 انتظار کرتا رہا پھر اس نے پتلی آواز کر کے سرگوشی میں کہا۔
 ”تم مجھے مزید کیا بتا سکتی ہو؟“

”میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔“ وہ اپنے بیٹے کا
 شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ”پچھلے کرمس پر ایلڈن یہاں
 آیا تھا اور میرے پاس ہی ٹھہرا۔ وہ کار میں کوئی چیز بھول گیا
 جو میں نے اپنے بیڈروم میں رکھ لی۔“
 اسمتھ سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ بولا۔ ”تمہارے
 بیڈروم میں کیا ہے؟“

”وہ اپنی کن میری کار میں بھول گیا تھا۔ اس نے
 مجھے چند روز بعد فون کیا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ اس
 نے وہ کن میرے پاس نہیں چھوڑی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ
 وہ واپس آئے۔“

میری ریڈ نے وہ کن اپنے بستر کے گدے کے نیچے
 چھپا کر رکھی تھی۔ وہ اٹھارہ اڑیس کا اسمتھ اینڈ وین ماڈل
 15 تھا اور اس کا سیریل نمبر وہی تھا جو لوئیس بیکر کی رپورٹ
 میں لکھا گیا تھا۔

بیو نے گھر واپس آتے ہوئے گاڑی کی رفتار آہستہ
 رکھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس اسے تیز رفتاری کی وجہ سے
 روکے اور اس کے پندرہ منٹ ضائع ہو جائیں۔ وہ مسلسل
 اس بوڑھی عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو معذوری کی
 وجہ سے وہیل چیئر کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی تھی اور اپنے آپ
 کو طوفان کی تباہ کاریوں سے بچانے کی جہد و جہد کرتی رہی
 کہ ایک ذلیل شخص نے اس کے سر میں گولی مار دی تاکہ
 گڈول سے پیسے وصول کر سکے۔

اسمتھ نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا اور اسے بند
 کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم کس طرح ثابت کریں گے کہ وہ
 ڈھانچا دو دو بدو کا تھا۔“

”ناہیجہ وارڈ میں کئی بدور رہتے ہیں۔ اگر انہیں میں
 ڈھانچے کے بارے میں بتایا جائے تو ان میں سے کوئی اس
 مکان کی وراثت کا دعویٰ کر سکتا ہے اس کے لیے ان کا ڈی
 این اے کروانا ہوگا۔“

وارنٹ گرفتاری حاصل کرنے میں ڈیڑھ دن لگ
 گیا، بیو نے جج کے سامنے تمام ثبوت رکھے اور قتل کے الزام

نو برس سے۔“
 ”کیا تم ڈیسلونڈ اسٹریٹ میں بھی رہی ہو؟“
 ”نہیں، ایلڈن وہاں رہتا تھا۔“
 ”آخری بار ایلڈن سے تمہارا رابطہ کب ہوا تھا؟“
 ”میں نے ایک سال سے اس سے ملنا چھوڑ دیا ہے
 اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔ وہ ضرور دوبارہ کسی
 مشکل میں پھنس گیا ہوگا۔“
 ”وہ پیرش جیل میں ہے۔“ بیو نے بتایا۔ اسی دوران
 وہ لڑکا اچھل کر میری کی ران پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔
 ”ایلڈن فشیات کا دھندا کرتا ہے۔ اس کی ساری عمر
 اسی میں گزر گئی۔ اسی لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔“
 لڑکے نے اس کے گلے میں انہیں ڈال کر آنکھیں
 بند کر لیں۔ وہ بولی۔ ”اگر تم سوچ رہے ہو کہ یہ لڑکا ایلڈن
 سے ہے تو یہ غلط ہے۔“

”اس کے علاوہ اس گھر میں اور کون رہتا تھا؟“
 ”میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتی۔ سوائے اس بوڑھی
 عورت کے جو مکان کی مالک تھی۔“
 ”اس کا نام کیا تھا؟“

”دو بدو۔ اس طرح کا نام کیسے بھول سکتی ہوں۔
 اس سے صرف دو مرتبہ ملی تھی۔ وہ محض ایک بوڑھی عورت
 ہے جو وہاں رہ رہی تھی اور اس نے ایلڈن کو وہاں ٹھہرنے کی
 اجازت دے رکھی تھی۔“

”کیا ان کی آپس میں رشتے داری ہے؟“
 ”وہ اسے آئی کہا کرتا تھا لیکن وہ اس کی آئی نہیں
 تھی۔ وہ معذور عورت وہیل چیئر کی محتاج ہو چکی تھی۔“
 بیو نے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں کوئی ایسی وجہ ہو
 سکتی ہے کہ وہ اس کے سر میں گولی مار دے؟“

ریڈ کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور اس کے نچلے ہونٹ میں
 لرزش شروع ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مشکل
 تمام اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور اپنے آنسو پونچھ کر
 دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔

اسمتھ مضطرب نظر آ رہا تھا جبکہ پیڑن بھی اپنی جگہ سے
 کھڑا ہو گیا۔ بیو نے اسے اپنی جگہ پر دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا
 اور ریڈ کو غور سے دیکھنے لگا۔ ابھی اس کے سوالات ختم نہیں
 ہوئے تھے لیکن اسے صبر سے کام لینا تھا۔ بالآخر ریڈ نے
 ایک گہری سانس لی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”تم نے
 اسے جیل میں رکھا ہوا ہے۔“

”وہ پہلے سے ہی جیل میں ہے لیکن اب باہر نہیں

میں ایلڈن گرین کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل کیا جبکہ اسمتھ نے اس پر غیر قانونی اسلحہ رکھنے اور فراڈ جیسے الزامات عائد کیے۔ پہلے ان کی منظوری اٹارنی کے دفتر سے لی گئی پھر اسے ایک فیڈرل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔

انہوں نے اور لینز جیش جیل میں داخل ہونے سے پہلے اپنے ہتھیار بیو کی گاڑی کی ڈکی میں رکھے اور ایک ڈیجیٹل ریکارڈر لے کر انٹرویو روم میں بیٹھ گئے۔ گرین کی ناگوں میں ڈیجیٹر بندھی ہوئی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پڑی ہوئی ہتھکڑی کا دوسرا سرا میز سے منسلک تھا۔ اس کے ہمراہ آنے والے ڈپٹی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور خود باہر نکل گیا۔

بیو نے اپنا ریکارڈر، اسٹی فارم اور دو کیٹری باری نکالیں اور گرین کے سامنے بیٹھ گیا جبکہ اس مرتبہ اسمتھ کو کھڑا ہونا پڑا۔ گرین نے کیٹری کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے وہ صدیوں کا بھوکا ہو لیکن بیو نے انہیں پیچھے کر لیا پھر اس نے ریکارڈر آن کیا۔ اس میں تاریخ اور وقت کے ساتھ وہاں موجود لوگوں کے نام ریکارڈ کیے اور گرین کو اس کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا۔ جسے سننے کے بعد گرین نے فارم پر دستخط کر دیے جس کا مطلب تھا کہ وہ بیو سے بات کرنے کے لیے تیار ہے۔

”تم یہ گفتگو کیوں ریکارڈ کر رہے ہو؟“ گرین نے کہا۔ ”تم مجھ پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے۔“ بیو اس کا مطلب سمجھ گیا۔ گرین کی دلچسپی صرف باتوں کی حد تک تھی۔ اس کی بات سن کر بیو دل ہی دل میں محظوظ ہونے لگا کہ مجرم یہ کیوں سوچتے ہیں کہ وہ سراغ رسانوں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں۔

”میرا اندازہ تھا کہ تم دوبارہ آؤ گے۔“ گرین نے کہا۔ ”تم نے ایسا کیوں سوچا؟“ ”بس یہ محض میرا اندازہ تھا۔“ گرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بیو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے سوچنے سمجھنے کی مہلت دے چنانچہ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سوال داغ دیا۔ ”312 ڈیسلوئڈکس کی ملکیت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارا نہیں ہے۔“

گرین جیسے کی جانب جھکا اور طنز یہ انداز میں بولا۔ ”تم مجھے گندول سے فراڈ کے الزام میں گرفتار کر رہے ہو جبکہ اس میں کوئی جان نہیں ہے۔“

بیو نے اس کی بات کو طنز انداز کرتے ہوئے اپنا

سوال دہرایا۔ ”اس مکان کا مالک کون ہے؟“ ”میں نہیں جانتا۔“ گرین نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”میں وہاں سے ایک ویل چیرٹی ہے، وہ کس کی تھی؟“ ”ویل چیرٹی۔۔۔!“ گرین نے اس طرح کہا جیسے اس نے کوئی انہونی بات سنی ہو۔

”تمہارے پاس اسمتھ اینڈ ویسن کا اعشاریہ اثاثہ کیا ریوالور ہے؟“

گرین کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اسمتھ کی طرف دیکھا پھر دوبارہ بیو پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس کوئی گن نہیں ہے۔“

”طوفان کے فوراً بعد اکتوبر میں تمہارے پاس ایسی ایک گن تھی؟“

”میرے پاس؟“ گرین نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔“ بیو بولا۔ ”جسٹین جیش شریف آفس نے تم سے وہ گن لی اور بعد میں واپس کر دی۔“

گرین نے کیٹری باری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک بار دے دو۔“

”یہ تمہیں بعد میں ملے گی۔ پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔“

گرین نے اپنا سرا دھر اُدھر گھمایا اور اسمتھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا تعلق ایف بی آئی سے ہے، تم یہاں صرف کھڑے ہونے کے لیے آئے ہو۔“

”میرا ساقی ہم دونوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔“ اسمتھ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرے پاس گن تھی۔ وہ چوری کا مال نہیں تھا۔ جب عدالت کی تسلی ہو گئی تو جج نے وہ گن مجھے واپس کر دی۔“

یہ کہتے ہوئے گرین کی آواز بھرا گئی اور وہ پریشان نظر آنے لگا۔ ”اب وہ گن میرے پاس نہیں ہے۔“ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”اگر کسی نے اسے استعمال کیا ہے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ جب دوسری بار طوفان آیا تو وہ گن کہیں گم ہو گئی تھی۔“

”وہ گن تم سے کہاں گم ہوئی؟“ بیو نے پوچھا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ جانے والی چیز تھی سو چلی گئی۔“

بیو نے اس کی طرف کیٹری باری بڑھادی اور انتظار کرنے لگا کہ وہ کب اسے کھول کر دکھائے گا۔

کھوت

نے وہ چاقو نکالا تو گرین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
 بیو نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی اور تیزی سے اٹھ کر
 میز کی دوسری جانب سے اس کے بال پکڑ لیے پھر اس کے سر
 کو زور سے جھکا یا اور چاقو کا دس انچ والا پھل اس کی
 آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

”یہ جنگ میں استعمال ہونے والا چاقو ہے اور بڑی
 صفائی سے آدی کی کھال اتارتا ہے۔“

گرین نے خوف زدہ انداز میں بیو اور اساتھ کو باری
 باری دیکھا پھر اس کی نظریں دوبارہ بیو پر جم گئیں۔

”میری طرف دیکھو کو جائز۔“ بیو نے غراتے ہوئے
 کہا۔ ”میں لاٹوا ہوں اور میرا تعلق اوگلا لاقیلے سے ہے۔
 اگر تم اس الزام سے بری ہو گئے، اگر کوئی ہوشیار وکیل تمہیں
 بچانے میں کامیاب ہو گیا، اگر تم میری ریڈ یا اس کے بیٹے
 کے پیچھے گئے تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور اس چاقو سے
 تمہارے جسم کا ایک ایک عضو الگ کر دوں گا اور تم مرنے
 سے پہلے اپنا خون بہتے ہوئے دیکھو گے۔ تم میری بات سمجھ
 رہے ہو نا۔“

یہ کہہ کر اس نے چاقو اس کی ناک سے لگا دیا۔ گرین
 نے آہستہ سے سر ہلایا تو اس نے چاقو واپس اپنی جیب میں
 رکھ لیا۔ ایملن نے ایک گہری سانس لی۔ اب اس کی
 آنکھوں سے ناراضی جھلک رہی تھی۔ بیو نے اساتھ کو مخاطب
 کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا کام ختم ہو گیا۔“

باہر نکلے ہوئے اساتھ نے ایک طویل سانس لی اور
 بولا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اس کے سر کی کھال اتار دو گے۔“

”ایف بی آئی ایجنٹ کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا۔“

ان دونوں نے کار کی ڈکی سے اپنے ہتھیار نکالے اور

اپنے ہولسر میں رکھ لیے۔ بیو نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک

پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”بعض اوقات انسان کتنا ظالم

اور بے حس ہو جاتا ہے۔ جس بوڑھی عورت نے اسے پناہ

دی، اس کو ہی قتل کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عورت کا کوئی

وارث نہیں ہے اور اس کے مرنے کے بعد وہ مکان متروکہ

املاک میں شمار ہوگا۔ اس کی مرمت کے لیے اس نے گڈول

سے قرض حاصل کرنا چاہا مگر وہاں بھی وہ فراڈ سے باز نہیں آیا

اور تین مختلف درخواستیں دے کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی

کوشش کی۔ واقعی اگر آدی کی نیت میں کھوت ہو تو وہ کہیں نہ

کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔“

اساتھ نے اس کی بات غور سے سنی اور سر ہلا کر رہ گیا۔

”جب جنیورن کے سپاہیوں نے تمہیں گرفتار کر کے
 وہ گرن تم سے لی تو اس سے پہلے وہ تمہارے پاس کتنے عرصے
 سے تھی۔“

”مجھے معلوم نہیں۔ شاید دو سال۔“

”قط بنائے پہلے؟“ بیو نے اساتھ کی طرف دیکھا

اور بولا۔ ”میں قطریتلے پہلے اور بعد میں ہونے والے

تمام واقعات کا جائزہ لینا ہے۔“

”ہاں، وہ میرے پاس کچھ عرصہ رہی۔“ گرین نے

بار بار تکیہ حصہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”دونوں مرتبہ طوفان آنے کے موقع پر وہ تمہارے

پاس تھی۔“ بیو نے پوچھا۔

”ہاں۔“

بیو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”دو دو دو۔“

گرین نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی

کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے اساتھ کی طرف

دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔

”تم دو دو دو کو ب سے جانتے تھے؟“

گرین نے دوبارہ کندھے اچکائے اور بولا۔ ”وہ

اس کا مکان تھا۔“

”کیا تم اسے آئی نہیں کہتے تھے؟“

گرین نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور بولا۔

”اب میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہوں گا۔“

بیو نے ریکارڈر بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور بولا۔

”ہمارے پاس تمہاری گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ میرا

دوست تمہیں غیر قانونی اسلحہ رکھنے اور فراڈ کے الزام میں

گرفتار کرنا چاہتا ہے جبکہ میرے پاس قتل کے الزام میں

گرفتاری کا وارنٹ ہے۔“

”کیا؟“ گرین نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

”تم نے وہیل چیز میں بیٹھی ایک عورت کو گولی

ماری۔ جب ہم عدالت میں جائیں گے تو تم کیا سمجھتے ہو کہ

جیوری کس کی بات کا یقین کرے گی۔“

بیو نے اساتھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اچھی طرح دیکھو

کہ دروازہ بند ہے۔“

اساتھ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور دروازہ چیک کر

کے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خوش قسمتی سے میٹل ڈیٹیکٹر اس چاقو کا پتا نہیں لگا سکا

جو بیو نے اپنے کوٹ کی جیب میں چھپا رکھا تھا۔ جب اس



وہ ایک لمحہ

ارشاد بیگ

نازک لمحہ کسی کی بھی زندگی کو تہ و بالا کر دینے کی طاقت رکھتے ہیں... ایسے ہی ایک کمزور لمحہ کی گرفت... جب ایک جانور نے اسے انسانیہ کا سبق سکھا دیا...

درندہ صفت سفاک شخص کا ایک یادگار میل.....

تھیں۔ سردوے نرم آنکھیں۔
وہ جب کسی کو گھور کر دیکھتا تو سامنے والے کی جان نکل جاتی تھی۔ وہ صرف ایک بات کہا کرتا۔ ”بس کر بابا زندگی بچڑ.....“
اس جملے کے بے شمار مطلب نکل سکتے تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ تو نے غلطی کی ہے۔ اس کی سزا ملے گی۔ دوسرا مطلب یہ تھا کہ اب تجھے ہمیشہ کی زندگی کی طرف سفر کر جانا چاہیے۔ اس جملے کو جاننے والے اور وہ جو اس کی فطرت سے واقف ہوتے تھے، وہ یہ سن کر کانپ کر رہ جاتے تھے۔
عام طور پر اس جملے کے بعد اس کا دوسرا جملہ یہی ہوتا۔ ”بابا“ اب اس بے چارے کو چلا جانا چاہیے۔“ یعنی اب اس

تیمور کی مٹی نے پانچ بچے دیے تھے۔ جس طرح اس کی مٹی ریشماں خوبصورت مٹی اسی طرح اس کے بچے بھی خوبصورت تھے۔

گول منول سے۔ ریشمی بالوں سے بھرے ہوئے۔
اس کی مٹی ایرانی نسل کی تھی جو اس کے ایک دوست نے جتنے میں لا کر دی تھی۔ پہلے تو تیمور کا دل چاہا کہ وہ اس مٹی کو واپس کر دے یا کسی اور کے حوالے کر دے لیکن اس کا دل نہیں مانتا۔ مٹی کی خوبصورتی نے اس کا دل موہ لیا تھا۔

ویسے وہ ایک بے رحم انسان تھا..... بہت ہی بے رحم۔
وہ زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بولتی

کا کام ٹھکانے لگا دینا ہوگا۔

اس کے بندے پھر اس بد نصیب کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ جس کے لیے یہ جملہ کہا گیا تھا۔

اس کا نام تیمور تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا اصل نام کیا ہے۔ لیکن وہ خود کو تیمور لنگ کہلوا یا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں اس کی ایک ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ زخم تو ٹھیک ہو گیا تھا لیکن چال میں ہلکی سی لنگ آگئی تھی۔

اس کے مزاج میں بے رحمی کی وجہ سے اس کے بے تکلف دوست بھی اس سے ٹالاں رہتے تھے۔ ”پار جب تیرا کام تیرے رعب سے چل... جاتا ہے تو پھر اتنی بے رحمی کس لیے۔“ وہ ہنس دیا کرتا۔ ”یہ بے رحمی دشمنوں کے لیے نہیں۔ دوستوں کے لیے ہے۔“ وہ کہا کرتا۔

کیا مطلب؟

”دیکھ پیارے۔ دشمن سامنے ہوتا ہے۔ اس سے مقابلہ آسان ہوتا ہے۔ دوست چھپے ہوتے ہیں۔ پتا نہیں چلتا کہ کب وار کر جائیں۔ تو ان کو خوف زدہ کرنے کے لیے ایسی بے رحمی بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہماری لائن ایسی ہے کہ اس میں نرمی نہیں چلتی۔ ذرا نرمی کی اور کوئی گردن پر سوار ہو گیا۔ سمجھے۔“

لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے سگے سامنے لے کوئی بات پر بڑی بے رحمی سے مار دیا تھا۔ وہ کسی کو معاف کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ جب بھی اس کے سامنے کسی کو لایا جاتا، وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا۔ اپنا سر کھاتا اور دھیرے سے بولتا۔ ”میں کر بابا۔ زندگی پکڑ۔“ اور جس کو سامنے لایا جاتا، اس پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ زندگی پکڑ کا مطلب ہے کہ زندگی کی خیر مانگ۔ اب تیرا وقت ختم ہو گیا۔

اس کے بے شمار کاموں میں ایک کام انوار برائے نادان بھی تھا۔ اس کے کارندے پورے شہر میں شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے۔ اور کسی کی بھی ریکی کرنے کے بعد تیمور کو اس کی مکمل رپورٹ دی جاتی۔

”یہ نام ہے۔ یہ عمر ہے۔ یہ کاروبار ہے۔ اس کی روٹین کیا ہے۔ کس وقت گھر سے نکلتا ہے۔ اکیلا ہوتا یا ڈرائیور بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کارڈز تو نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو ان کے پاس کون سا اسلحہ ہوتا ہے۔ اس کی کمزوری کیا ہے۔ اس کے گھروالے کون کون ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

وہ کہا کرتا۔ ”انوار برائے نادان کوئی عام جرم نہیں ہے۔ یہ بہت ٹیکنیکل کام ہے۔ اس میں بہت ہوشیاری کرنی پڑتی ہے۔ ہاتھ ایسوں پر ڈالنا چاہیے جو زیادہ شور نہ کریں اور جن کے گھر

والے آسانی سے خوف زدہ ہو کر نادان کی رقم ادا کر دیں۔

ابھی تک تیمور کے گینگ کو اس جرم میں پکڑا نہیں جاسکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت ہوشیاری اور احتیاط سے کام کیا جاتا تھا۔ وہ خود یہی کہا کرتا کہ اس کے طریقے سے سائنٹفک ہوتے ہیں۔ لیکن اس بار معاملہ کچھ اور ہو گیا تھا۔ اس کے بندے ایک نوجوان کو اٹھالائے تھے۔

تیمور انسانوں کی مختلف نفسیات سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ ہر طرح کے لوگ شکار ہو کر اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ نوے فی صد ایسے ہوتے تھے جو خوف سے کانپ رہے ہوتے۔ اپنی زندگی کی بھیک مانگا کرتے۔ عام طور پر زیادہ عمر کے دولت مندوں کی حالت غیر ہوا کرتی تھی۔ ان کے برعکس نوجوان خاموش رہا کرتے۔ شاید نوجوانی کے زعم میں یا اسی قسم کی کوئی اور بات ہوتی۔

دوسرے نوجوان بھی خوف زدہ رہتے تھے۔ لیکن یہ بہت بری طرح سہا ہوا تھا۔ تیمور اس کو گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس نوجوان کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ تھی۔ اچھا خاصا خوش شکل بھی تھا لیکن خوف نے اس کے نقش بگاڑ دیے تھے۔

تیمور کے سامنے آتے ہی وہ بری طرح رونے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے۔ میری می پریشان ہوں گی۔ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھائیں۔ ان کو نیند نہیں آتی۔“

تیمور مسکرا دیا۔ ”اوئے ہمت کر جوان۔ کیوں عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے۔ چھوڑ دیں گے تجھے۔ پہلے تیرا جنر فیلد... تو معلوم کر لیں۔ کیا کام کرتا ہے تیرا باپ؟“

”میرے ڈیڈ کا انتقال ہو چکا ہے۔“ اس نوجوان نے بتایا۔ ”ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔“

”کیا؟ تیمور کو یہ سن کر ایک شاگ سا لگا تھا۔ اس کو بتایا گیا تھا کہ یہ نوجوان ایک ارب پتی تاجر کا بیٹا ہے۔ اب یہ بتا رہا تھا کہ وہ ایک غریب نوجوان ہے۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔

تیمور نے اس بندے کو آواز دی جو اس کو اٹھا کر لایا تھا۔ وہ تیمور کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ”اوئے تو یہ کس کو اٹھا کر لے آیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔“ اس بندے نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”یہاں آکر ہم کو احساس ہوا کہ یہ کوئی اور ہے۔“ ”بھول کے بیچے۔“ تیمور نے اس کے چہرے پر کھوسنا رسید کر دیا۔ ”جانتا ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے۔ ہم اس کا کیا کریں۔ یہ تو کسی مفلس کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔“ تیمور کے آدمی کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ چہلی بار ایسا ہوا تھا

تیور نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ ”دیکھ بھائی، میں نے بتایا تھا کہ جو یہاں آجائے، وہ واپس نہیں جاتا۔ تجھے کیسے جانے دیں۔ اب تو ہمیں رہے گا۔ ہمارا کام کیا کرے گا۔ سمجھے؟“

”خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔“ نوجوان نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”ایسا ظلم نہ کریں۔“

ملی نے اپنے بدن کو زور زور سے تیور کی ایک ٹانگ سے رگڑنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میاؤں میاؤں بھی کرتی جا رہی تھی۔

”اؤے۔“ تیور نے اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہوا ہے اس کو؟ کیوں بے چین ہو رہی ہے۔“

”باس۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کے ایک بچے کو دلدار نے اٹھالیا ہے۔ اسی لیے بے چین ہو رہی ہے۔“

دلدار اسی اڈے کا ایک چیتا نوجوان تھا۔ تیور کے پاس وہ اس وقت آیا تھا جو وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ اس کے بعد اس کی واپسی نہیں ہو سکی تھی۔ تیور اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس وقت دلدار وہاں نہیں تھا۔

”بلا کر لاؤ اس کو۔“ تیور نے ایک آدمی کو حکم دیا۔

دلدار کچھ دیر بعد اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کہاں ہے اس کا بچہ؟“ تیور نے ملی کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے پاس ہے باس۔“ دلدار نے بہم کر جواب دیا۔

”جاؤ اب اس کو اور ہاں۔“ اس نے اپنے خاص آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے علاقے سے باہر چھوڑ آؤ۔“

”باس ایسا تو پہلے بھی نہیں ہوا۔“ اس آدمی نے کہا۔

”ہاں۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہوا ہو؟“

کہ کسی جانور نے انسان کو کوئی سبق سکھا دیا ہو۔ جاؤ۔ لے جاؤ۔ اس کو۔ اس کی ماں بھی بے چین ہو رہی ہوگی۔“

نوجوان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

تیور نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر سر کھانے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ ”جاؤ۔ زندگی بکڑ۔“ لیکن اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ نوجوان رو رہا تھا۔

”چل بھائی۔“ تیور کے آدمی نے اس سے کہا۔ ”چل تجھے پہنچا دیتے ہیں۔“

تیور کے آدمی کے ساتھ چلنے سے پہلے تیور نے اس ملی کے پاس جا کر اسے اپنی گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اس کے بچوں کے پاس چھوڑ دیا۔

کہ ان سے ایک ایسی غلطی ہو گئی تھی جو تیور کے نزدیک قابل معافی نہیں تھی۔ تیور نے اپنی عادت کے مطابق اپنا سر کھچا یا ہی تھا کہ وہ آدمی اس کے پیروں پر گر پڑا۔ ”باس، اب ایسا بھی نہیں ہوگا“ وہ خوف سے بلک رہا تھا۔ ”معاف کر دو مجھے۔“

تیور نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بے رحم آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ آدمی لرز کر فرش پر لیت گیا۔ اس کے بدن پر کچلی طاری تھی۔ وہ اب فریاد بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز جیسے بند ہو گئی تھی۔

تیور کی مسکراہٹ گہری ہوئی جا رہی تھی۔ جس نوجوان کو انوا کر کے لایا گیا تھا۔ اس پر سکے کا عالم طاری تھا۔

تیور نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اب تو بتا تیرا کیا کیا جائے؟ اس نے اپنے پیروں کے پاس گرے ہوئے آدمی کو زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ ”جا کھڑا ہو جا حرام خور۔ یہ تیرا ہمیلی اور آخری غلطی تھی۔ اس کے بعد۔۔۔ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

وہ آدمی اپنی جان بچ جانے پر تیور کا شکر یہ ادا کرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ تیور پھر اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوا۔

”اب بتا۔ تیرا کیا کیا جائے، ہم تیرا چار تو ڈال نہیں سکتے۔“

نوجوان سکے کی کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے بولنا

شروع کر دیا۔ ”خدا کے لیے جانے دیں مجھے۔ میری کمی رو رہی ہوں گی۔ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتیں۔ جب تک میں گھر نہ لوٹوں ان کو چین نہیں ملتا ہے۔ وہ پریشان رہتی ہیں۔ دعائیں کرتی رہتی ہیں۔ خدا کے لیے میرے حال پر رحم کریں۔“

اس کا گڑ گڑانا اور اس کی فریادیں کر اس پاس کھڑے تیور کے سامنے زور زور سے ہنسنے لگے۔

”بات سن۔“ تیور زور سے گرجا۔ ”یہ ہمارا اصول نہیں ہے۔ جو ایک بار یہاں آجائے ہم اسے جانے نہیں دیتے۔ کیوں چھوڑ دوں تجھے۔ تاکہ تو واپس جا کر ہمارے خلاف پُلپس میں چلا جائے۔ جیل والوں کے پاس چلا جائے تاکہ وہ ڈھنڈورا پیٹنے لگیں کہ اس شہر میں کیسا ظلم ہو رہا ہے۔ دن دھاڑے لوگوں کو اٹھالیا جاتا ہے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ حکومت کیا کر رہی ہے؟ کیوں یہی سب ہو گا؟“

”نہیں۔“ نوجوان بلبلانے لگا۔ ”میں کسی کو نہیں جانتا۔ مجھے کسی کے پاس نہیں جانا ہے۔ اپنی ہی کے پاس جانا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ پاگل ہو گئی ہوں گی۔“

اسی دوران تیور نے اپنی ملی کی آواز سنی۔ وہ چاروں طرف بلبلاتی پھر رہی تھی۔

ملی تیور کے پاس آ کر اس کے پیروں کے پاس لیت گئی۔

سویرا

سرور اکرام

وہ بادشاہوں سے ملے... شاعروں... مصوروں سے... موسیقی کے ستروں سے کھیلنے والوں سے اور عام انسانوں سے بھی... جہاں بھی جھوٹ کے قدم گئے لوگ زیادہ مطمئن اور پرسکون نظر آنے لگے... جب سچ کے قدم پہنچتے تو لوگوں کے چہرے بجھ جاتے... تلخ سچ کے باوجود پُر امید اور مایوسیوں کو شکست دینے والے پُر عزم فاتحین کا کارنامہ... صعوبتوں... اور مصیبتوں کو جھیلنے کے باوجود وہ وطن کی محبت سے سرشار تھے... ان کے افکار ان کے نغمے زندہ اور تصورات آباد تھے...

دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی اثر انگیز داستان.....

اس ہوٹل کا ملک منیر بھائی خود بھی شاعری کا شوق رکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اکثر اشعار مہمل ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ کسی نہ کسی سے اصلاح لیتا رہتا تھا۔ خاص طور پر امجد بریلوی سے۔ جو اس ہوٹل کے مستقل گاہک تھے۔ خود استاد ذکاقت بھی اس ہوٹل میں آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہ ایک کلاسیکل منکر تھے لیکن موجودہ دور کے بے تکی موسیقی نے کلاسیکل گانے والوں کو فراموش کر دیا تھا۔ استاد ایک مٹی انسان تھے۔ ان کی معلومات کلاسیکی میں

ابھی دن کے گیارہ بجے تھے۔ استاد ذکاقت ہوٹل کی طرف جاتے جاتے رک گئے۔ اس ہوٹل سے اور اس بابا سے ان کی پرانی شناسائی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے اس بابا کو دیکھتے آرہے تھے۔ یہ ہوٹل اس شہر میں شاعروں اور ادیبوں کی بہت بڑی پناہ گاہ تھی۔ شہر بھر کے شاعر اور ادیب اس ہوٹل میں جمع ہو کر مختلف ادبی اور علمی گفتگو کیا کرتے۔ اسی لیے یہ ہوٹل نقصان میں چل رہا تھا کیونکہ اکثر شاعر اور ادیب مفلوک الحال تھے۔

بہت زیادہ تھی لیکن وہ ہمیشہ شکوہ ہی کرتے رہتے تھے۔ بہت کم لوگ ان کے فن کے قدردان رہ گئے تھے۔ استاد ایک خاص مزاج کے انسان تھے۔ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔

استاد اس فقیر کو اسی فن ہاتھ پر ایک عرصے سے دیکھ رہے تھے۔ وہ فقیر بھی کوئی فقیر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک بے نیازی ہی ظاہر ہوا کرتی۔ کبھی کبھی وہ استاد نزاکت کو اشعار بھی سنایا کرتا تھا جس سے یہ اعزازہ ہو جاتا کہ اس نے بھی اچھے دن دیکھے ہوں گے۔ جب موع میں ہوتا تو انتہائی گہری باتیں کیا کرتا جس سے پتا چلتا کہ اس کا مطالعہ بھی بہت اچھا ہے۔ ہوئی کی طرف جاتے ہوئے استاد اس کی خیریت معلوم کرنے اس کے پاس رک جایا کرتے تھے۔ اس دن بھی استاد اس کے پاس آکر رک گئے۔ ”کیسے ہو بھائی؟“ ”استاد نے خوش دلی سے پوچھا۔

فقیر نے گردن اٹھا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ”زندہ ہوں بھائی، اب اور کیا چاہیے؟“ ”استاد نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”بھائی میاں خدا تم کو سلامت رکھے۔ اب اس دور میں تم جیسے ملتے کہاں ہیں؟ میں نے تم کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے برسوں سے تم کو دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں استاد۔“ ”فقیر نے ایک گہری سانس لی۔ ”گردش وقت بھی آگے مجھے لے جانے لگی۔ تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک۔“

”بھائی میاں! تمہاری ان ہی باتوں نے تو اپنا گردیدہ کر لیا ہے۔“ ”استاد نے کہا۔ ”ویسے ایک بات ہے کہ ہم ناقدری کے دور میں پیدا ہو گئے ہیں۔ مجھ ہی کو دیکھ لو۔ اتنا بڑا کلاسیکل گائیک اور کوئی جانتا ہی نہیں، واہ۔“

جس وقت ان دونوں کی باتیں ہو رہی تھیں، اس وقت ہوٹل کا مالک منیر ایک رجسٹر لیے بیٹھا تھا۔ اس ہوٹل کا اکلوتا وائٹر اور چائے بنانے والا اس کے پاس ہی کھڑا بیٹھا تھا۔ جس کا نام شہنشاہ تھا۔ اس ہوٹل کی ظاہری حالت بہت خستہ تھی۔ دو چار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ سچا سچ بڑا چھوٹا مکان تھا۔ دیکھو دیکھو تھے۔ ایک طرف ایک میز پر جواد بیٹھا تھا۔ وہ بھی ایک دانشور قسم کا انسان تھا۔

منیر نے گردن اٹھا کر شہنشاہ کو دیکھا۔ ”کل جواد صاحب نے کتنی چائے پی گئی؟“ اس نے پوچھا۔

”تین کپ۔“ ”شہنشاہ نے بتایا۔ ”اس کے علاوہ

بکڑے بھی تھے۔“

”یہ بکڑے کہاں سے آگئے؟“

”سانے والی دکان سے اُدھار لے کر آیا تھا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ یہ اُدھار کا سلسلہ بند ہی کر دیں۔ میں جب پرانے ہوئی میں تھا تو اتنی بخشش مل جاتی تھی کہ پوری تنخواہ ایک طرف اور بخشش ایک طرف۔ اور ایک یہاں کے کسٹمر ہیں کہ اُدھار کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ بہت سوں کو تو سگریٹ بھی اپنی جیب سے لا کر دیتا ہوں۔“

”پھر تو تم ایسا کرو کہ پرانے ہی ہوئی..... چلے جاؤ، وہاں بیٹش کرو گے۔“

”اب تو کوئی بھی نہیں رکھے گا صاحب۔“ ”شہنشاہ نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”کیا بتاؤں صاحب! ہمارے اس ہوٹل کی ساکھ بہت خراب ہو گئی ہے۔ مارکیٹ میں مشہور ہے کہ جس نے یہاں کام کر لیا وہ کسی کام کا نہیں رہا۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ لکھ کر لگا دیں کہ اس ہوٹل میں شاعروں اور ادیبوں کا داخلہ منع ہے۔“

منیر کچھ دیر تک شہنشاہ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بے وقوف! تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے یہ ہوٹل پیسے کمانے کے لیے کھولا ہے؟“

”تو پھر کیوں کھولا ہے صاحب؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ ”منیر نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال لیا۔ ”سنو، میں نے ایک تازہ غزل لکھی ہے۔ گرچہ یہ زمین بہت مشکل تھی لیکن میں نے بھی کمال کر دیا ہے۔ عرض کیا ہے۔“

شہنشاہ نے جلدی سے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”خدا کے لیے مجھے تو معاف کر دیں صاحب۔ شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”تو پھر سمجھ میں آ گیا نا کہ میں نے یہ ہوٹل کیوں کھولا ہے؟ یہاں کے گاہکوں کو ہر حال میں میری شاعری سننی پڑتی ہے۔ یہ بھولت اور کہاں ملے گی؟ اچھا جاؤ دیکھو جواد صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ بے چارے بہت دیر سے اکیلے بیٹھے ہیں۔“

شہنشاہ، منیر سے جان چمڑا کر جواد کی طرف آ گیا۔ ”صاحب چائے لے آؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، دو کپ لے آؤ۔ ایک میرے لیے ایک نقیس صاحب کے لیے۔ وہ پان لینے رک گئے تھے نہ جانے کہاں رہ گئے۔“

اس دوران نقیس اور نزاکت ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

نزاکت کے اس مکان کا بیرونی دروازہ ہر وقت کھلا ہی رہتا تھا۔ خیم کو احساس ہو گیا تھا کہ نزاکت گھر آ کر باورچی خانے میں چلا گیا ہے۔ وہ سخت پر آ کر بیٹھ گیا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے بجنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید نزاکت کھانا بنانے میں لگ گیا تھا۔ یہ اس کی ڈیوٹی تھی۔ اچانک دروازے پر ہونے والی دسک نے خیم کو چونکا دیا۔ اس نے دروازے پر جا کر دیکھا۔ محلے کا ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ خیم نے پوچھا۔

”انکل کہاں ہے؟“

”کون انکل؟“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کہہ دوں گا۔ تم دفع ہو جاؤ۔“
 لڑکا چلا گیا تو نعیم بڑبڑاتا ہوا اندر آ گیا۔ ”حد ہو مہی، ابا،
 بھی کسی کسی حرتیں کرنے لگے ہیں۔“
 خراکت نے ایک ٹرے میں کھانا لا کر تخت پر رکھ دیا۔
 ”ابا! یہ کیا حرت ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔
 ”ابے اب کیا ہو گیا۔ کیوں تاؤ کھا رہا ہے؟“
 ”ایک بچہ آیا تھا اپنی چنگ واہیں لینے۔“ نعیم نے

”ابا تم نے تو مجھے میں منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں
 پھوڑا۔ بچوں کے ساتھ چنگین اڑاتے ہو۔“
 ”لبے یہ بہت ثواب کا کام ہے۔“
 ”بچوں کے ساتھ چنگین اڑانا۔“

”نہیں، بچوں کا دل بہلاتا۔۔۔۔۔ تجھے کیا معلوم، وہ ایک وکرانی کا بیٹا ہے۔ محلے کا کوئی بچہ اس کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتا۔ اس بہانے اگر وہ کچھ دیر کو خوش ہو جاتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ مولانا کو میری یہ ادا۔۔۔ پسند آجائے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ محل کسانا کھا۔ میں اس بچے کو دوسری پتنگ دلوادوں گا۔“

غیب نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ ”ارے یہ کیا پھر رہی

جواد نے نزاکت کی طرف دیکھا۔ ”یار چھوڑو۔ کن باتوں میں لگ گئے۔ اس دن تمہاری شہری جو تو مزہ آگیا۔“
 ”آپ لوگوں کی شاعری کی طرح موسیقی بھی بہت باریک کام ہے جواد صاحب۔“

”ہاں، یہ بے چارہ اپنے فن کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ کبھی اس کے دن بھی بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ یاد میں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں نزاکت گھر میں داخل ہوتے ہی سدرہ پاور جی خانے

کی طرف چلا گیا۔ شہر کے ایک غربت زدہ علاقے میں بنا ہوا یہ مکان ٹین کی چھت کا تھا۔ ایک بڑا سا آگن اور دو کمرے۔ اس کمرہ میں اس کے ساتھ اس کا بیٹا بیٹھ رہا کرتا تھا جو ابھی بے روزگار تھا لیکن اس کی مفتی محلے کی ایک لڑکی رضیہ سے ہو گئی تھی۔ مفتی کو دو سال ہو چکے تھے مگر ابھی تک شادی کی کوئی امید لکائی نہیں دے رہی تھی۔

دبی روٹی؟“

”اے دبی سے گرمی مرنی ہے۔“ نزاکت نے کہا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جب دبی بازار سے آتا

ہے۔ روٹیاں تندو سے آتی ہیں تو پھر تم یہ باور دینی خانے میں کیا کھڑے بڑھکتے رہتے ہو؟“

”اے یہی تو پورے ملک میں ہو رہا ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے پورے ملک میں؟“

”یہی کہ ہر سال بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں کہ

اس سال ملک میں یہ ہو جائے گا۔ وہ ہو جائے گا۔ دولت کی

بارش ہوگی اور جب سال ختم ہوتا ہے تو ورلڈ بینک سے جاکر

فرصے لے آتے ہیں۔ سالن بنانے کی کوشش کرتا ہوں اور

جب نہیں جاتا تو جاکر بازار سے دبی لے آتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے

امان کا انتقال ہوا تھا۔“ فہیم چپ کر بولا۔

نزاکت نے ایک گہری سانس لی۔ ”بیٹا! مرحومہ کا

انتقال تو اپنی یادداشت کی خرابی سے ہوا تھا۔ تو تو جانتا ہے کہ

تیری ماں کو بھولنے کی بیماری تھی۔ ایک بار سانس لیتا بھول

گئیں، پورے دو گھنٹوں تک سانس نہیں لی۔ بس اسی میں

انتقال ہو گیا۔“

”نہیں تم نے ان کے منہ پر تکیہ تو نہیں رکھ دیا تھا؟“

”اے کیوں باپ پر الزام لگا رہا ہے۔ اس وقت تو میں

محبت پر راگ ملہا رہا تھا۔ تو نے ہاتھ کیوں روک لیا کھاتا

رو۔“

”نہیں ابا، میں کھا چکا۔ اپنے ایک دوست کے پاس

جا رہا ہوں۔ وہیں کھالوں گا۔“

”موقع ملے تو میرے لیے بھی کچھ لیتے آنا۔“

فہیم نے کچھ کہنا چاہا پھر جھٹکا کر بولا۔ ”ابا میری بات

مانو۔ تم کوئی کام پکڑلو، جیسا بھی ہو۔“

”اے یہی کیسی اولاد ہے۔ باپ سے کہہ رہی ہے کہ کوئی کام

پکڑلو۔ خود نہیں کر رہا۔“

”ابا تم کو جانتے ہو کہ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔ کتنی کوشش

کر رہا ہوں۔ تم کام کرنے لگو۔ تو گھر کا خرچ چلے گا۔ تم اپنے

آپ کو کلاسیکل سنگر کہتے ہو لیکن میں نے کبھی تمہارا گانا نہیں

سنا۔“

”اے کلاسیکل سنگر گانا سنانے نہیں ہیں۔ ٹھونسنے ہیں۔

ویسے میری شان معلوم کرنی ہو تو جا کر مہاراجا پٹیلہ سے معلوم

کر۔ میں روزانہ اپنے راگ سے ان کے گل میں روشنی کیا کرتا

تھا۔“

”ابا! اب ایسی بات ہر ایک سے مت کہنا۔ ورنہ والے پکڑ کر لے جائیں گے کہ چلو روشنی کرو۔“

”بیٹا! اگر اپنی محنتوں کو اتنا ہی خیال ہوتا تو اب

کتنے ڈیم بن چکے ہوتے۔ کتنے پروجیکٹ شروع ہو جاتے۔

اچھا اب تو جانچتے بھی ہوئے جاتا ہے۔ وہاں سب میرا اذ

کر رہے ہوں گے۔ کچھ دیر کا بول کر آیا تھا۔“

”ابا تمہارے سارے جاننے والے بھی فالتو بیٹھے۔

ہیں۔“

”فالتو نہیں بیٹھے، ملک کے مسائل پر غور کرتے رہے۔“

اس وقت اس ہوٹل میں شہرام بھی آکر بیٹھ چکا تھا۔

ایک مصور تھا۔ اس کی بنائی تصویروں کی دو تین نمائش بھی ہو

گئیں۔ اس بار وہ پھر کی نمائش کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

”شہرام صاحب، میں نے سنا ہے کہ آپ پھر کی نمائش

کی تیاری کر رہے ہیں؟“ نفیس نے پوچھا۔

”جی بھائی، کچھ تصویریں اکٹھی ہو گئیں، سوچ رہا ہوں

کہ ایک نمائش کریں ڈالوں۔“

”اور اس بار کا موضوع کیا ہوگا؟“ جو اد نے پوچھا۔

”یہاں کا سبکیٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہی غربت، گلیا

میں کھیلنے ہوئے تنگ دھڑنگ بچے، چلی ہوئی عورتیں۔ یو

اٹھاتے ہوئے مزدور۔ کچے کمروں کی گرتی ہوئی دیواریں، ا

کے علاوہ یہاں اور کیا ہو سکتا ہے؟“

شہرام کی باتیں سننے نے نفیس کی تھیں۔ وہ کاؤنٹر چھوڑا

ان کی میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ”شہرام صاحب! ہمارے

ملک کا صرف یہی چہرہ تو نہیں ہے نا اور بھی بہت کچھ ہے۔ آپ

جن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟ ان کے چہروں کو ذرا بار بار

سے پینٹ کریں۔ غربت کے باوجود ان کے چہروں پر اُمیدور

کے اجالے بھی دکھائی دیں گے۔ وہ بھوکے سو تو جاتے ہیں لیکن

دوسری صبح ان کے خزم پھر سے تازہ ہوتے ہیں جس گاؤں میں

غربت پاؤں پیارے رہتی ہے، اسی گاؤں کے کھیتوں میں

فصلوں کی شادابی بھی ہوتی ہے۔ ذرا اس کو بھی تو پینٹ کریں۔“

”منیر ٹھیک کہہ رہے ہیں شہرام صاحب! آپ کی

تصویریں دیکھ کر زندگی سے پاپوسی ہونے لگتی ہے۔“

منیر اپنی بات کہہ کر چلا تھا۔

”آپ لوگوں کو معلوم ہے؟“ شہرام نے کہا۔ ”مجھے

این او کی طرف سے آخری ہے کہ میں وہاں جا کر اپنی تصویروں

کی نمائش کروں۔“

”یہی تو پالیسی ہے۔“ نفیس نے کہا۔ ”آپ اپنے ملک

جتلا کر بولا۔

نزاکت کی آواز گونج رہی تھی۔ ”ایسا مت کہہ بیٹا، اگر تو نے کلاسیکل کو چھوڑ دیا تو تاریخ تجھے معاف نہیں کرے گی۔“

”اور اگر میں پیسے لے کر نہیں گیا تو میری بیوی مجھے معاف نہیں کرے گی۔ عمر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔“

”مبارک ہو بیٹا! تو اب جا کر فنکاروں کی برادری میں شامل ہوا ہے۔ معاشرہ یہ سمجھتا ہے کہ فنکار اسی وقت بنتا ہے جب اسے بھوکا رکھا جائے۔ اسی لیے فنکاروں کو پیسے دیئے نہیں

دیئے جاتے۔ بس پیٹ پر پتھر باندھ کر گاتے رہو۔ شاعری کرتے رہو۔ تصویریں بناتے رہو اور طلبہ بجاتے رہو۔ ویسے

مجھے ہمارے ملک کے فنکاروں کو صرف شہرت چاہیے۔“

”لیکن میں نے بہت سے فنکاروں کو دیکھا ہے، ان کے پاس تو بہت پیسے ہوتے ہیں۔“

”اے یہ چاروں والے فنکار ہیں۔ سچا فنکار ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ تو فیصلہ کر دو سو سال کے بعد تاریخ میں تیرا نام سنہری

حروف میں لکھا جائے گا کہ اس ملک میں ایک ایسا فنکار بھی تھا کہ جب وہ طلبہ بجاتا تو سترے روشن ہو جاتے تھے۔“

”مجھے ایسا انتظار نہیں کرنا ہے استاد۔ میرے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔“

نزاکت نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھ بیٹا! کلاسیکل میوزک کا فیئیشنل ہونے والا ہے۔ مجھے اس میں بلایا

ہے۔ طلبہ پر تو ہی سنگت کرے گا۔ اس میں بہت پیسے ملیں گے۔“

”فیئیشنل تو پچھلے سال بھی ہوا تھا۔ وہاں تمہاری آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔“

”اے مجھے کسی نے سیندر رکھلا دیا تھا۔“ نزاکت نے بتایا۔

”کس نے کھلایا تھا سیندر؟“

”ایک عورت تھی۔ میں نے تو سیندر اس کی ماگ میں ڈالنے کے لیے خریدا تھا لیکن اس نے مجھے پانی میں گھول کر پلا

دیا۔ بس میری آواز ہی ختم ہو گئی۔“

سلطان پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں سے کچھ نہیں ملے والا۔ اسی دوران باہر سے کسی لڑکی کی

آواز آئی۔ وہ فہیم کو لارہی تھی۔ ”فہیم! فہیم! اگلے، اگلے!“

”واہ! کیسی سرلی آواز ہے استاد۔“ سلطان نے کہا۔

”اے یہ میرے بیٹے کا سنگیت ہے۔ تو اس کے چکر میں مت پڑ جانا۔“ نزاکت نے آواز دی۔ ”بیٹا آؤ، اندر آ جاؤ۔“

ایک اسمارٹ سی لڑکی اندر آ گئی۔ اس نے اندر آ کر

اجٹا بیٹا تک اور غربت زدہ چہرہ بنا لیا، باہر اتنا ہی سراہا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آسکر اور ٹیل بھی مل جائے۔“

”لیکن سچائی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نفیس صاحب۔“

”ہرام نے کہا۔“

”شہرام صاحب! سچائی کا ایک ہی رخ نہیں ہوتا۔ اس لہو پہلو ہوتے ہیں۔ مایوسی کے ساتھ امید بھی ہوا کرتی ہے۔

میرے کے ساتھ اجالا بھی ہوتا ہے۔“ جواد نے کہا۔ اس نے اس گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا تھا۔

”میر اپنی جگہ سے اٹھ کر پھر اس میز کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے جواد کی بات سن کر تالیاں بجا لیں۔ ”واہ جواد صاحب!

ناخوش کر دیا۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو اس ملک سے کوئی اپنی نہیں ہے کیونکہ آپ یہی بولتے رہتے تھے۔ یہ داغ داغ بالا، یہ شب نریدہ بحر۔“

”بے وقوف آدمی، یہ میں طنز یا مذاق کے لیے نہیں بنا۔ دکھ سے بولتا ہوں۔ رنج کا پہلو ہے اس میں۔ فیض

اجب نے بہت کرب کے عالم میں کہا ہے۔ اس میں ایک اہش چھپی ہوئی ہے۔ ایک ترنا ہے کہ کاش یہ اجالے داغ دار

ہی ہوتے۔“

”چنانچہ بھائی، مجھے تو سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں میری پیشین رکی ہوئی ہے۔ میں دھکے کھاتا پھر رہا ہوں۔“

ام نے کہا۔

”شہرام صاحب، آپ کی ناراضی بجا ہے۔“ نفیس نے

”لیکن کسی ایک شخص یا ادارے سے ناراض ہونے کا یہ

مطلب نہیں کہ پورے ملک سے بدگمان ہو جائیں۔“

”بھائی نفیس، یہ تمہارے کلاسیکل سنگر کہاں رہ گئے؟

ہدیر کا بول کر گئے تھے؟“ جواد نے پوچھا۔

”کسی کام میں انک گئے ہوں گے۔“ نفیس نے کہا۔

”ایسے ہی آدمی ہیں۔ من موہی قسم کے۔“

اس وقت نزاکت ایک نوجوان کو گھیرے بیٹھا تھا۔ وہ فان اس سے کلاسیکل کی تربیت لینے آیا تھا۔ اس کو رخصت

نے کے بعد وہ ہوٹل کی طرف جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ

اکا طبعی سلطان داخل ہوا۔ نزاکت نے تنخواہ پر اس کو کھرا ہوا

لیکن کئی مہینوں سے اسے پیسے نہیں دیے گئے تھے۔

”اسلام علیکم استاد۔“ اس نے اندر آتے ہی نزاکت کو

مکھیا۔

”اے دوس دفعہ کہا ہے کہ کلاسیکل سے پیار کرنے والوں

اقت کا پابند ہونا چاہیے۔“

”اب مجھے کلاسیکل سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔“ سلطان

نزاکت کو سلام کیا۔ نزاکت نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ”رضیہ تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟“
 ”جی انکل، بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے سلطان کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون ہیں؟“
 ”بیٹا یہ آنے والے دور کا بہت بڑا فنکار ہے۔ ابھی تو اس کے حالات خراب چل رہے ہیں لیکن چار پانچ مہینوں میں اس کے حالات بدلنے والے ہیں۔“
 ”وہ کسے انکل؟“ رضیہ نے پوچھا۔
 ”یہ اگلے الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے اور ہمارے یہاں جو الیکشن میں کھڑا ہو جائے اس کو بیٹھنے کے بھی پیسے مل جاتے ہیں۔“

سلطان نے جلیلا کر پوچھا۔ ”استاد! تم نے میرے بارے میں تو بتا دیا۔ اب یہ بتاؤ یہ کون ہیں؟“
 ”اے بیٹا یا نا کہ یہ میرے بیٹے کی منگیتر ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ منگیتر ہی رہے گی۔ شادی وادی کی نوبت نہیں آنے والی۔“
 ”ایسا نہ کہیں انکل۔ مجھے امید ہے کہ فیہم کو جاب مل جائے گی۔“

”اے اسی آسرے پر تو زندگی گزار دی۔ حکومت نے میری کلاسیکل خدمات پر مجھے تین لاکھ کا چیک دیا تھا۔ تین بار باؤنس ہو چکا ہے۔“ نزاکت نے بتایا۔

”آپ نے شکایت نہیں کی؟“
 ”کی مٹی شکایت۔ کہنے لگے جب تک زندہ ہو چیک باؤنس ہوتا رہے گا۔ اس کو کیش کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ انتقال کر جاؤ۔ دوسرے ہی دن کوئی دزد پر اخبار والوں اور پی وی والوں کی بھیڑ لے کر پہنچ جائے گا اور تصویر کھینچواتے ہوئے چیک دے جائے گا۔ تم بتاؤ، تم کس کام سے آئی ہو؟“
 رضیہ نے سلطان کی طرف دیکھا۔

”فکر مت کرو۔“ نزاکت نے کہا۔ ”اس کے سامنے بول دو۔ اس کا کام صرف سننا ہے۔“

”انکل، اماں نے کہا ہے کہ اگر فیہم کو نوکری نہیں ملی تو وہ میری معافی کسی اور سے کر دیں گی۔“
 ”فرض کرو تمہاری نہیں معافی ہو گئی۔ اس طرف فیہم کو بھی نوکری مل گئی، پھر کیا ہوگا؟“ نزاکت نے پوچھا۔
 ”پھر اماں دونوں کی تنخواہیں دیں گی۔ جس کی تنخواہ زیادہ ہوگی، شادی اسی سے ہنی کر دیں گی۔“ رضیہ نے کہا۔
 ”واہ، لگتا ہے تمہاری اماں نے وہ وادی پارٹی جوائن کر لی ہے جس کا نعرہ ہے حال نہ دیکھو، مال کو دیکھو۔“

”استاد تمہاری باتوں میں اتنی تلخی کیوں ہوتی ہے؟“ سلطان نے پوچھا۔
 ”اے جب زندگی میں تکلیاں ہیں تو باتوں میں مضامین کہاں سے آئے۔“
 ”اچھا استاد، میں تو جا رہا ہوں، مجھے اجازت دو۔“
 ”تو کہاں جائے گا؟“
 ”ایک جگہ ٹکڑے بنانے کا کام مل رہا ہے، سوچ رہا ہوں وہی کر لوں۔“
 ”بہت اچھا ہے اور ہاں دیکھ اگر وہاں گلاب جامن بنانے کا بھی کام ہو تو مجھے بتا دینا۔“
 سلطان بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد نزاکت نے رضیہ سے کہا۔ ”بیٹا! تم بیٹھو، میں باورچی خانے سے آلو لے کر آتا ہوں، چھیلنا ہے۔“
 ”انکل، آلو مجھے دے دیجئے گا، میں چھیل دوں گی۔“
 ”نہیں بیٹا تم نہیں چھیل سکتی۔ میں ایک خاص تکنیک سے چھیلتا ہوں۔ مغلوں کے شاہی باورچیوں کا فن تھا۔ سینہ بہ سینہ ہمارے خاندان میں چلا آ رہا ہے۔“

”انکل ایک بات تو بتائیں۔ کیا ہمارے بادشاہ اسی قسم کے ہنر میں وقت برباد کرتے تھے؟“
 ”بیٹا، ان پر بس ایک دھن سوار ہو گئی تھی کہ جس طرح بھی ہو ملک کو برباد کر دو۔ اس بات پر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے تھے کہ خدا نے ایک ملک دے دیا ہے۔ اس کی حفاظت کریں۔“

”انکل، آپ بھی تو بہت بڑا بھلا بولتے رہتے ہیں۔“
 ”نہیں بیٹا، میں صرف کچھ خاص لوگوں اور خاص اداروں کو بڑا کہتا ہوں۔ وطن اور مٹی کو بھی بڑا نہیں کہا۔“
 ”تو ہمارے بادشاہوں نے اس طرح ملک برباد کیا۔“
 ”یاد رکھو بیٹا، بادشاہ یا شہزادہ کسی ایک خاص کردار کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک مزاج کا نام ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ ایک ذہنیت، ایک mentality آج بھی ایسے لوگ ملیں گے۔ تم نے کسی دن پریامیٹر کو روڈ پر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کیا قافلہ ہوتا ہے۔ کتنی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ کتنی پولیس ساتھ ہوتی ہے۔ صرف ایک آدی کے لیے۔ عوام چاہے جھک مارتی رہے۔ میں اس کے خلاف ہوں۔ ورنہ یہ ملک تو اللہ کا تحفہ ہے۔“

رضیہ اس وقت بہت عقیدت سے اس آدی کو دیکھ رہی تھی جو بظاہر بڑھا کھٹا نہیں تھا لیکن جس کی باتوں میں کتنی

☆☆☆

ہوٹل کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا فقیر نہ جانے کن خیالات میں تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے دانشور اور شاعر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ شہشاہ کی آواز نے فقیر کو چونکا دیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے کھڑا تھا۔ ”یہ لو بابا، چائے۔“

فقیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شفقت بھری مسکراہٹ آگئی۔ اس نے پیالی لے لی۔ ”خدا تجھ کو خوش رکھے۔ تو میرا کتنا خیال رکھتا ہے۔“ شہشاہ اس کی کرسی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ”تمہیں کچھ کرا پتا بابا یاد آتا ہے بابا۔“

”اب کہاں ہے تیرا بابا؟“

”وہ مر گیا ہے بابا۔“ شہشاہ نے بتایا پھر تلی سے سا۔ ”بے چارے نے میرا نام شہشاہ رکھا تھا۔ اسے کیا علوم تھا کہ اس کا شہشاہ ایک ہوٹل میں بیرابن جائے گا۔“

”تو کیا ہوا، تیرا دل تو بادشاہوں والا ہے نا۔ سب کچھ ہے تیرے پاس۔ اچھا یہ بتا، یہ جو تیرے ہوٹل میں تیس ہوتی رہتی ہیں، کیا کیا باتیں ہوتی ہیں؟“

”بابا، ان کی باتیں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ موٹی دلی باتیں سمجھ سے باہر ہیں۔ ہاں، یہ جو اپنا مالک منیر ہے، اس کو بہت مزے آتے ہیں۔ وہ ان کی باتیں سننا رہتا ہے۔ وہ خود بھی تو شاعری کرتا ہے بابا۔“

”اچھا، اب تو میرا ایک کام کر۔“ فقیر نے ایک پرزہ ہال کر شہشاہ کو دے دیا۔ سنو، یہ ان لوگوں میں سے کسی کو دے دیتا۔“

”اب تو وہ لوگ کل ہی آئیں گے۔“ شہشاہ نے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں، کل دے دیتا۔“

”میں کچھ دیر بعد آکر پیالی لے جاؤں گا۔“ شہشاہ نے کہا۔

شہشاہ کچھ دیر بعد واپس آیا تو فقیر نظیر اکبر آبادی کی یک لقم زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

”دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مقلد و مقلد ہے سو ہے وہ بھی آدمی زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی کھلے جو مکتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی۔“

”واہ بابا! یہ تو بہت اچھی شاعری تھی۔“ شہشاہ نے

کہا۔ ”لیکن تم ابھی تک نہیں ہو؟“

”ہاں بیٹا۔“ فقیر نے ایک گہری سانس لی۔ ”پتا نہیں کیوں آج جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ لیکن تم ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے؟“

”بابا، ہوٹل کا تھوڑا کام تھا وہ نشتا کر جا رہا ہوں۔ بابا، تم سوئے کہاں ہو؟“

”اب کیا سونا۔“ فقیر نے ایک گہری سانس لی۔

رات کیا سوئے کہ اک عمر کی نیند اڑ گئی

خواب کیا دیکھا کر دھوکا لگا کتھیر کا۔

”ایک بات کہوں، تم مجھے کوئی معمولی آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ شہشاہ نے کہا۔ ”تم دیکھنے میں ایسے ہو۔ جس طرح میں نام کا شہشاہ ہوں اسی طرح تم بھی کچھ اور ہو۔“

”ارے نہیں بیٹا، میں ایک عام سا انسان ہوں۔“

”تم سوئے کہاں ہو؟“

”صابر کو تو جانتے ہونا، وہ گیراج والا۔ وہ اللہ کا بندہ مجھے اپنے گیراج میں سونے کی اجازت دے دیتا ہے۔“

”تمہارا پتا کوئی نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں ہے۔“ فقیر ناراض ہونے لگا۔ ”میں کروڑ کا خاندان ہے میرا۔ یہ پوری قوم میرا خاندان ہی تو ہے۔ ورنہ کوئی غیروں کے لیے اتنی قربانی کہاں دیتا ہے۔ جتنی قربانی ہم نے دی ہے۔ ہم ہندوستان سے کئی لوگ چلے تھے۔ میرا بابا، میری ماں، دادا، دادی، میرے دو بڑے بھائی۔ لیکن صرف میرا بابا اور میری ماں یہاں تک پہنچ سکے۔ باقی سب راستے میں مار دیے گئے۔ ایسی قربانی کوئی غیروں کے لیے تو نہیں دیتا ہے نا، انہوں کے لیے دیتا ہے۔ اسی لیے یہ بیس کروڑ لوگ میرے اپنے ہیں، میرے اپنے۔“

شہشاہ اس فقیر کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ کتنی بڑی بات کہہ گیا تھا وہ فقیر۔

”اور ہاں۔“ فقیر کو کوئی بات یاد آگئی تھی۔ ”ایک

بات اور..... برسوں چودہ اگست ہے۔ میرا خاندان بارہ اگست کو ہندوستان سے چلا تھا اور جب چودہ کی صبح کو یہاں پہنچا تو صرف دو آدمی تھے۔ میرا بابا اور میری ماں۔ اسی لیے میں ہر سال چودہ اگست کی صبح ضرور مناتا ہوں۔ اپنے خاص انداز سے۔ اس بات تم میرے پاس آ جانا۔“

☆☆☆

اس وقت بھی ہوٹل میں کم ہی لوگ تھے۔ ایک میز کے گرد بیٹھ، جوا، شہرام بیٹھے تھے۔ ہوٹل کا

کو یا آگ سی بھڑک گئی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے جہ
 کوچ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخیں نکل
 تھیں۔ اس کے جسم پر سرخ دھاریوں اور خراشوں کا جال
 بن گیا تھا جس سے خون رس رہا تھا مگر وہ خود کو روک نہیں
 تھا۔ دو قدم آگے بڑھ کر اس کی ہمت جواب دے
 زمین پر گرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ مسلسل حرکت
 تھے۔ اس کی رگ رگ میں شعلہ دک رہے تھے۔ وہ گم
 پر تڑپ رہا تھا جو اس کے خون سے سرخ ہو رہی تھی پھر
 کے حلق سے تکلیف میں ڈوبی ایک آخری چیخ برآمد ہوئی
 اس کے ساتھ ہی وہ ساکت ہو گیا۔

☆☆☆

وہ نہایت بردباری سے چلتا ہوا اسٹیج کی جانب
 رہا تھا۔ دونوں طرف کرسیوں پر بیٹھے بے شمار افراد زور
 سے تالیاں بجا رہے تھے۔ سامنے اسٹیج پر کئی نامور چہرے
 اس کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں سنہ
 قلم کی شکل میں بناوہ ایوارڈ تھا جسے حاصل کرنا ہر صحابہ
 خواب ہوتا ہے۔ ابھی اس نے اسٹیج پر چڑھنے کے لیے
 سیدھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک جیڑگزراہٹ نے سب
 تھیں تھیں کر کے رکھ دیا۔ تالیوں کا گونج مدھم پڑ گئی۔ د
 ہی دیکھتے اسٹیج، ایوارڈ، روشنیاں سب گدھے کے سر
 سینک کے مانند منظر سے غائب ہو گئیں۔ اگلے ہی لم
 اچھل کر اٹھ بیٹھا تھا۔ بیڈ سائز پر رکھا فون مسلسل چنگھا
 تھا۔ اتنے اچھے خواب سے اس طرح بیدار کرنے پر اس
 خون آشام نگاہوں سے فون کو گھورا۔ کال کرنے والا ابھی
 کی نیند کی مغبوطی اور کچے پن سے اچھی طرح واقف
 آرہا تھا اسی لیے استقامت سے گھنٹیوں پر گھنٹیاں بجا
 جارہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے فون اٹھایا۔ اسکرین پر چمکنے
 نام اس کے کلاس فیلو احمد کا تھا۔ اس کی نظر نام اور وقت
 ایک ساتھ پڑی تھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔

”ہیلو..... کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟“ وہ رے
 میں غرایا۔
 ”توبہ، نہ سلام نہ دعا..... کیا بہت گہری نیند
 تھی؟“ احمد نے مصحومیت سے پوچھا۔
 ”احمد اس وقت صبح کے سات بجے ہیں، میں راز
 دو بجے کے بعد سوتا ہوں۔“

”اچھا، اچھا..... اصل میں، میں اگلے ہفتے
 تمہارے شہر آ رہا ہوں، سنا ہے کوئی زبردست چیخ ہونے
 ہے۔ اس کی کوریج کے لیے آ رہا ہوں۔ کچھ انٹرویوز بھی

مطلب مسلسل پریکٹس تھا۔
 اس کے دو ہی شوق تھے ایک فنٹ ہال اور
 دوسرا اسپورٹس میگزین پڑھنا..... فنٹ ہال میں آگے جانے
 کے لیے اسے جس توانائی کی ضرورت تھی اس کا شارٹ کٹ
 بھی اس نے ڈھونڈ نکالا تھا اور اب وہی اس کا سب سے بڑا
 شوق بن چکا تھا جس سے وہ پندرہ منٹ پہلے ہی لطف اندوز
 ہو چکا تھا۔ اس کی ابتدا پر فارمنس میں جادوئی تیزی کے لالچ
 میں ہوئی تھی مگر اب وہ اس کا اس قدر عادی بن گیا کہ اس
 کے بغیر رہنا دشوار ہو گیا، یہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہو پایا
 تھا۔

اس کی عمر ابھی صرف 19 سال تھی۔ وہ صوبے کی فنٹ
 ہال ٹیم کا سب سے کم عمر کپتان تھا اور بین الاقوامی سطح پر اسے
 بہترین فنٹ بالرز میں شمار کیا جانے لگا تھا۔
 ’ایک دن اس میگزین کے سردار پریش ہوں گا۔‘
 اس نے صغیر پلٹتے ہوئے سوچا اور غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ
 داہنے ہاتھ سے بائیں کبھی کو کھینچا۔ ’ایسا ضرور ہو گا۔‘ وہ
 خواب کی کیفیت میں خود کو ٹائٹل پر دیکھ رہا تھا مگر اسے فوراً
 اس کیفیت سے باہر آنا پڑا۔ بازوؤں میں ہونے والی مسلسل
 خارش نے اسے آگے سوچنے نہیں دیا۔ اسے ایک عجیب سی
 چچن محسوس ہو رہی تھی اور وہ بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں
 اور کندھوں کو کھج رہا تھا۔

”یہ..... یہ مجھے ہو کیا رہا ہے؟“ وہ پریشان ہو کر کھڑا
 ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں پر مونی مونی سرخ دھاریاں پڑتی
 جارہی تھیں۔ مسلسل کھینچنے سے جلد پر خراشیں بھی ابھر آئی
 تھیں مگر عجیبی اتنی شدید تھی کہ وہ خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔
 اب یہ چچن اس کے ہاتھوں اور کندھوں سے ہوتی ہوئی سینے
 اور پیٹھ تک آ گئی تھی۔ اس نے بے اختیار جرسی اتار چنگی اور
 سامنے لگے درخت کے تنے سے پیٹھ کو رگڑنا شروع کر دیا
 مگر اس سے بھی اس کی تکلیف میں صرف اضافہ ہی ہوا تھا۔
 وہ دوڑتا ہوا اندر کی جانب لپکا۔ مگر پر اس وقت کوئی نہیں
 تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے کمرے میں الارمی سے بچانے
 والا ایک مرمہ موجود ہے۔ الماری سے مرمہ نکال کر اس نے
 بیشکل ٹیوب کو کھولا اور اسے اپنے ہاتھوں اور سینے پر دیوانہ
 وار ملنا شروع کر دیا مگر نتیجہ اب بھی صفر ہی رہا تھا۔ اس نے
 ٹیوب کو زمین پر پھینکا اور ایک بار پھر باہر نکل آیا۔ اب اسے
 مدد کی تلاش تھی۔ کوئی ڈاکٹر شاید اسے اس عذاب سے بچا
 سکے۔ اس نے سوچا اور اسی حالت میں گیٹ کی طرف
 بڑھا۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اس کے پورے جسم میں

لبو کا کھیل

اس نے نیچے پر سر رکھ کر آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ فون دوبارہ گنگنا اٹھا۔

”فون کیا مصیبت ہے، بند ہی کر دیتا ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھا مگر اسکرین پر اخبار کے ایڈیٹر جمال صاحب کا نام دکھ کر وہ خشک گیا۔ اُنیسجی ان کے فون کا مطلب کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ہی ہو سکتی تھی۔

”جی جمال صاحب.....“

”خضر تم سو رہے ہو مگر سونے کا وقت نہیں ہے یہ فوراً کھڑے ہو جاؤ اور دفتر پہنچو۔“ وہ اپنے مخصوص تیز تیز لہجے میں بولتے جا رہے تھے۔

”مگر جمال صاحب ہوا کیا ہے؟ بتائیے تو مجھے.....“

”بھئی تم آؤ تو..... بتانے اور پوچھنے کے لیے ہی عیوبلا رہے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ کل رات شہر میں دو قتل ہو گئے ہیں۔“

”دو قتل.....“

”ہاں، ہاں..... اور اب یہ نہ کہنا کہ قتل تو ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی تو بے حسی چھائی ہے ہم پر..... ارے میاں ہر قتل ایک کہانی ہوتی ہے مگر یہ جو دو قتل ہوئے ہیں یہ ہماری بیگ فٹ بال ٹیم کے ستاروں کے ہوئے ہیں، بس اب تم نکل آؤ میاں..... پھر بات ہوتی ہے۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ خضر کی نیند اب مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے میں وہ دفتر کے اندر تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ روشن تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ آمنہ اس سے قبل ہی دفتر پہنچ چکی تھی۔

آمنہ ”اخبار“ کے مالک کی بھتیجی تھی۔ وہ امریکا سے فوٹو گرافی پڑھ کر آئی تھی اور اب ”اخبار“ کی فوٹو گرافی خضر اگر روزنامہ اخبار کو چھوڑنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا تو اس کی ایک وجہ بھی تھی۔

”تو تم پہنچ گئیں.....“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”اور کیا، جمال صاحب کا تو تمہیں پتا ہے، فون بھی تار کی طرح کیا تھا..... ویسے یہ ہو کیا رہا ہے؟“ وہ بولی۔

”یہ تو تم بتاؤ.....“ خضر اپنی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی نیا سیریل کلرکس آیا ہے۔“ وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ”ورنہ کسی کو ان دو بچوں

ہیں۔ تمہیں یہی بتانے کو فون کیا تھا پھر دن بھر میں کام میں اچھ جاؤں گا تو بھول نہ جاؤں اس لیے سوچا ابھی کر لیتا ہوں۔ ویسے صحت کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے صبح اٹھنا۔“

”اوکے..... ضرور تشریف لاؤ۔ اب اگر تمہارا صحت نامہ ختم ہو گیا ہو تو میں سولوں تھوڑی دیر؟“ اس نے پوچھا۔

”کس قدر چڑچڑے ہوتے جا رہے ہو تم، لگتا ہے کہ بڑھا پا جیڑی سے آ رہا ہے اسی لیے کہتا ہوں کہ کوئی اچھا بڑا اخبار یا جینٹل جوائن کر لو، پیسے ویسے کم آؤ..... کب تک اس چھوٹے شہر کے چھوٹے سے اخبار سے چپے رہو گے۔“

احمد نے ہمدردی سے کہا۔

”احمد، تم سے میری ملاقات ہوگی، اپنا پروگرام مجھے ای میل یا وائس اپ کر دینا..... اور ہاں اپنے مشورے کے مطابق کسی بڑے شہر کے بڑے اخبار سے میرا اپائنٹمنٹ لیٹر ساتھ لیٹے آنا۔“ وہ دانت پر دانت جما کر بولا اور فون کاٹ دیا۔

احمد اس کا کلاس فیلو اور اچھا دوست تھا۔ یونیورسٹی کے بعد خضر نے اپنے شہر کے روزنامے ”اخبار“ کو جوائن کر لیا تھا جبکہ احمد ایک بڑے انگریزی روزنامے سے منسلک ہو گیا تھا جو اب ایک جینٹل کا بھی مالک تھا۔ خضر، احمد کی ترقی سے خوش تھا مگر احمد پر ملاقات یا گفتگو میں اسے یہ یاد دلانا نہیں بھولتا تھا کہ یونیورسٹی میں ہر سبیکٹ میں ٹاپ کرنے والا خضر ترقی کی دوڑ میں اس سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ خضر نے گہری سانس لی۔

وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کر سکتا ہے مگر مقابلے اور لائٹنگ کے اس دور میں آگے بڑھنے کے لیے کام کے علاوہ جو کچھ کرنا پڑتا تھا، وہ اس کے بس کا وگ نہیں تھا پھر وہ روزنامہ اخبار کی اپنی ملازمت سے مطمئن نا۔ اس وقت وہ اپنے دفتر کا سینئر پورٹریٹسٹ ویسے بھی اس کے کوئی لمبی چوڑی ڈے دار یوں کا بوجھ تو تھا نہیں۔ اس کے والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کی والدہ نے اسے اور اس کی بڑی بہن خدیجہ کو پالا پوسا۔ خدیجہ کی ادوی کے چند ماہ بعد ہی وہ بھی دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

ریجے کے شوہر کی ملازمت امریکا میں تھی۔ کاغذات مکمل تھے ہی وہ بھی امریکا جاسکی تھی اور ایک بار خضر اس سے ملنے امریکا گیا تھا۔ خضر نے آبائی مکان بچ کر شہر کے ایک قریع علاقے میں ایک آرام دہ پارٹمنٹ لے لیا تھا۔ صحافت کا شوق بھی تھا اور پیشہ بھی۔ یوں زندگی اچھی کٹ رہی تھی۔

ل۔

کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ضرور یہ کوئی اور چکر ہے۔“
”ارے آمنہ ضروری نہیں کہ یہ کسی سیریل کٹر کا کام ہو۔“

”تم مت مانو..... مگر مجھے لگ رہا ہے کہ یہ کوئی بڑا چکر ہے۔ میں نے تو باہمی کا چھوٹا پتل اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“ وہ اپنے خوب صورت بالوں کو جھٹکاتے کر بولی۔
”باپ رے۔“ خضر نے نروس سی ہنسی کے ساتھ اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کیا مطلب.....“ آمنہ نے گھور کر پوچھا۔
”کس بات کا مطلب؟“

”اس ہنسی اور اس باپ رہے باپ کا؟“ وہ اسے گھور رہی تھی۔

”ڈر گیا ہوں ناپتول کی موجودگی اور اس کے نتائج کے بارے میں سوچ کر..... خود ہی سوچو اگر کوئی مجرم ہمارے سامنے آئے..... کیا اور تم نے گولی چلا بھی دی تب بھی جتنا میں تمہارے نشانے کے بارے میں جانتا ہوں اس سے خطرہ مجھے بھی لاحق ہے۔ یاد نہیں جب ہم کوریج پر گئے تھے اور تم نے بال کو باسکٹ میں ڈالنے کے لیے پھینکا تھا اور وہ اس ناچیز کے سر پر لینڈ کر گئی تھی جبکہ..... باسکٹ بال تو گولی سے خاصی بڑی ہوتی ہے..... ہوتی ہے نا؟“ وہ خود کو آمنہ کے پھینکے ہوئے شے سے بچاتے ہوئے بولا۔

”تم حالات کو سمجھ نہیں رہے ہو شاید۔“ وہ بولی۔
”سمجھ رہا ہوں مگر میں تمہیں خوف زدہ نہیں دیکھنا چاہتا۔“ خضر اس بار سنجیدگی سے بولا۔ ”چلو اب جمال صاحب کی طرف چلتے ہیں۔“

ایڈیٹر کے کمرے کی جانب جاتے ہوئے خضر کے ذہن میں کئی سوالیہ نشان رقصاں تھے۔

کیا واقعی شہر میں کوئی سیریل کٹر آگیا تھا؟ اور اگر تھا بھی تو اس نے ان دونوں لڑکوں کو کیوں قتل کیا؟ انہوں نے ایسا کیا کیا تھا؟ یا وہ ایسی کسی چیز میں شامل ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں ان کے حصے میں موت آئی تھی؟

”کہاں کھوئے ہوئے ہو میاں؟“ جمال صاحب کی کرخت آواز نے خضر کو چوڑکا دیا۔ وہ اپنی کرسی پر براجمان تھے۔ پڑھنے کی عینک حسب معمول ان کی ناک کی پھٹنگ پر دھری تھی اور وہ اس کے اوپر سے اسے گھور رہے تھے۔

”میں ان دونوں لڑکوں کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”خبر کیا ہے سر؟“

”یعنی خبر بھی اب میں تمہیں بتاؤں گا؟“ وہ ملاحتی

انداز میں بولے۔ ”میاں خبریں جاننے کے لیے جو اخباروں میں رپورٹرز رکھے جاتے ہیں۔ خیر تم فوراً تھانے جاؤ..... دیکھو وہاں سے کیا خبر ملتی ہے، جو بھی تقبیلے پکڑ لو، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے اور آمنہ تمہیں خضر کے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے کچھ اچھی تصاویر چاہئیں، سمجھ نہیں نا.....“ فون کی ٹھنکی بجی تو وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ خضر اور آمنہ کو انہوں نے رکے کا اشارہ کیا۔

”کیا آپ کو یقین ہے؟“ چند لمبے خاموشی سے سننے کے بعد انہوں نے پوچھا پھر بولے۔ ”جی، شک ہے، آپ کا شکریہ۔“ انہوں نے ریسور کرڈیل پر رکھ کر نروس انداز میں اپنی عینک اتار کر میز پر رکھی پھر اگلے ہی لمحے دوبارہ پہن لی اور خضر اور آمنہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

”ٹیم کے ایک اور لڑکے کا قتل ہو گیا ہے۔“

☆☆☆

خضر اور آمنہ تھانے پہنچ کر قدرے حیران ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں اس چھوٹے سے شہر میں جہاں اس طرح کی وارداتیں کم ہوتی ہیں ایک رات میں تین لڑکوں کے پراسرار قتل کی وجہ سے جو افراتفری یا بھاگ دوڑ نظر آتی چاہیے تھی وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ سپاہی ادکھ رہے تھے۔ ایس ایچ او اور انسپکٹر تھانے میں موجود نہیں تھے۔ جب وہ ڈی ایس پی کے دفتر میں پہنچے تو وہ میز پر ناخنیں پھارے دانتوں میں غلال کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا مگر غلال والی ایکنی وین اسی طرح جاری تھی۔

”خبریت سے رپورٹر صاحب..... مج مع تھانے میں؟“ وہ خضر کو دیکھ کر مسکرایا۔

”ڈی ایس پی صاحب کیا آپ نہیں جاننے کہ ہم کیوں آئے ہیں؟“ خضر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جوابی سوال کیا۔ ”میرے حساب سے تو اور بھی لوگوں کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔“

”اچھا، اچھا..... میں سمجھا شاید فٹ بالروں والے معاملے کی خبر لینے آئے ہیں۔“ بھیجی اس کے لیے تو فٹسر صاحب نے خود خبر بھجوائی ہے۔“

”اچھا..... تو آپ کو پتا ہی نہیں ہے حالانکہ علانے کے تو سب سے بڑے اخبار کے ڈے رپورٹر ہو آپ جی..... بھائی بات یہ ہے کوئی قتل شے نہیں ہوا ہے۔“ وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔

لوہو کا کھیل

رپورٹ لے آئیں گے۔ تم بعد میں یہیں آکر ان سے بات کر سکتے ہو۔“

صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خضر اور آمنہ اس معاملے میں کسی سے بھی بات کریں۔

”اوکے ڈی ایس پی صاحب معلومات کا شکریہ، ہم چلتے ہیں۔“ خضر کچھ سوچتے ہوئے گھڑا ہوا گیا۔ ”امید ہے کہ آپ رپورٹ کے آتے ہی مطلع کریں گے۔“

”بالکل، کیوں نہیں، آپ کو خبر مل جائے گی۔“

”خضر ہمیں فوراً شرنیل احمد کے گھر جانا چاہیے۔“ آمنہ باہر نکلتے ہی بولی۔ ”یہ موٹا کچھ گڑ بڑ کر رہا ہے شاید وہاں سے ہی کچھ معلوم ہو سکے۔“

”ہو سکتا ہے مگر مجھے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا، ایسا کر دو آمنہ اب گاڑی تم چلاؤ، میں اس دوران کچھ فون کالز کرتا ہوں۔“ خضر حایاں آمنہ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

شرنیل احمد کا گھر وہاں سے تین منٹ کی مسافت پر تھا۔ خضر اس دوران فون پر مصروف رہا تھا جبکہ آمنہ خاموشی سے گاڑی چلاتی رہی تھی۔ خضر نے بات ختم کر کے فون جیب میں رکھا اور آمنہ کی جانب دیکھ کر انہیں نہجیں۔

”کیا معلوم ہوا..... ٹیم کے فیجر سے بھی بات کی تا تم نے؟“ آمنہ نے پوچھا۔

”ہاں یار..... کچھ عجیب سلسلہ ہے، سرکاری اہلکاروں حتیٰ کہ ٹیم کے لوگ تک اس حوالے سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ کوئی گہرا اور بڑا معاملہ لگتا ہے۔ مرنے والے تین لڑکوں میں سے دو کا تعلق دیگر علاقوں سے ہے۔ ان کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور فارنک کے بعد ان کے آبائی علاقوں میں روانہ کر دی جائیں گی۔“ خضر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ارے تم رک کیوں گئیں؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”کیونکہ شرنیل احمد کا گھر آ گیا ہے۔“ آمنہ نے گاڑی سائیڈ پر لگاتے ہوئے کہا۔

یہ توسط طبقے کی ایک اچھی آبادی تھی۔ شرنیل کے گھر کے باہر غالباً تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے ٹنٹ لگا یا گیا تھا۔ ٹنٹ کی دوسری جانب ایک پولیس موبائل بھی موجود تھی۔ خضر اور آمنہ مکان میں داخل ہوئے۔ اندر موجود ملازم انہیں ڈرائنگ روم تک لے آیا۔ سادگی سے سجے ڈرائنگ روم میں شرنیل کے والد، والدہ، چھوٹے بھائی کے علاوہ چند عزیز، ایس ایچ او اور انسپکٹر بھی موجود تھے۔ شرنیل کی والدہ مکمل رو رہی تھیں جبکہ اس کے والد کا چہرہ ہر

”آپ کا مطلب ہے کہ یہ افواہ ہے اور وہ تینوں لڑکے زندہ ہیں؟“ خضر نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کی آدمی بات بالکل درست ہے کہ قتل کی افواہ اڑی تھی مگر لڑکے زندہ نہیں ہیں۔“

”مطلب کیا ہے آپ کا؟“ آمنہ نے چمک کر پوچھا۔

”مطلب یہ ہے کہ تینوں لڑکوں نے خودکشی کی ہے۔“

”خودکشی؟“ آمنہ اور خضر نے ایک ساتھ پوچھا۔

”ہاں جی.....“ ڈی ایس پی نے حتمی انداز میں کہا۔

”ایک ہی ٹیم کے تین لڑکوں نے ایک ہی رات الگ الگ جگہوں پر خودکشی کر لی..... کیا یہ بات ماننے والی لگتی ہے؟“ خضر نے اسے گھورا۔

”جی لگے یا نہ لگے ہوا تو ایسا ہی ہے۔“

”میڈیکل رپورٹ آگئی ہے؟“

”اتنی جلدی کیسے آجائے گی؟“ وہ گویا خضر کی حماقت پر اسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”شام یا کل تک آجائے گی۔“

”پھر آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ خودکشی ہے؟“ اس بار آمنہ نے پوچھا۔

”بی بی ہمارا بھی کوئی تجربہ ہے آخر..... دراصل شواہد یہی بتا رہے ہیں کہ لڑکے ڈرگ استعمال کرتے تھے۔ اس کا اور ڈرگ موت کی وجہ بن گیا ہے۔ ہمیں تینوں کے پاس سے میوٹھ کی باقیات ملی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میوٹھ ڈرگ ہے۔“ وہ رازداری سے بولا۔

”لیکن.....“ خضر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ ڈرگ استعمال کرتے تھے تو نہیں اس کی مقدار کا علم ہوگا پھر وہ اس قدر کیوں استعمال کریں گے۔ لے یہ اتفاق ہے تو بھی اسے کسی ایک کے ساتھ ہونا چاہیے..... پھر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہاں پر یہ ڈرگ بعد میں آ لی جی ہو۔“

”دیکھیے خضر صاحب! ہم ان بچوں کے والدین کو رید دیکھیں اور بدنام نہیں کرتا چاہتے۔ یہی منشر صاحب نے لی کہا ہے پھر اس طرح ٹیم کا نام بھی بدنام ہوتا ہے اسی لیے سے خودکشی ہی کیا جا رہا ہے۔“

”ہم.....“ خضر چند لمحوں سوچتا رہا۔ ”رپورٹ شام ۷ بجے نہیں آئے گی؟“

”نہیں، ایس ایچ او اور انسپکٹر گئے ہیں۔ شرنیل احمد مکان پر کچھ شواہد..... کو رجسٹر کرتا تھا جس کے بعد وہ

احساس سے عاری نظر آ رہا تھا۔ ایسے ہی نظر جو نبی
خضر پر پڑی وہ تیر کی طرح ان کی طرف آیا تھا۔
”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں خضر صاحب؟“ وہ
وجہی مگر سخت آواز میں بولا۔

”وہی..... عبدالصاحب۔“ خضر اس کے سینے پر لگی
نیم پلٹ کر پڑھ کر بولا۔ ”جو آپ کر رہے ہیں یعنی اپنی
ڈیوٹی۔“

”میں یہاں بیان ریکارڈ کر رہا ہوں اور آپ کو ان
لوگوں سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“

”مگر کیوں؟ آپ ہمیں اس بات سے کیسے روک
سکتے ہیں؟“ آمنہ بولی۔ ”ہمیں بھی ان سے بات کرنے کا
انتہائی حق ہے جتنا آپ کو ہے۔“

”غلط، میں یہاں اس وقت انچارج ہوں اور موقع
واردات پر کون آئے گا اور کیا کرے گا اس کا فیصلہ مجھے ہی
کرنا ہے۔“

”واردات.....“ خضر نے دہرایا۔ ”مگر ابھی کچھ دیر
پہلے تو آپ کے ڈی ایس بی نے ہمیں اس بات کا یقین دلایا
ہے کہ یہ کوئی واردات یا ٹک نہیں ہے۔“

”وہ درست کہہ رہے ہیں مگر پھر بھی ہم شواہد.....
وغیرہ اکٹھے کر رہے ہیں۔ میڈیا کے لیے خبر جاری کر دی
جائے گی۔“

”یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔“ آمنہ بولی۔
”خضر صاحب میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں
اور مجھے یقین ہے کہ آپ ایک دیکھی خاندان کے لیے مزید
مسائل کھڑے نہیں کریں گے، آئیے میں آپ کو باہر تک
چھوڑ دوں۔“

خضر نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا پھر کچھ سوچتے
ہوئے خاموشی سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ آمنہ ایک لمحہ اپنی
جگہ کھڑی رہی پھر بدلتی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ ایسے
انچ اوپر ہرنگ ان کے ساتھ آیا تھا جب تک ان کی کار اگے
نہ بڑھی وہ وہیں کھڑا تھا۔

”یہ لوگ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ آمنہ
نے گاڑی میں بیٹھتے ہی بہ آواز بلند کہا۔ وہ خضر کے خاموشی
سے باہر آ جانے کے فیصلے سے خوش نہیں تھی۔

”ہاں مگر کیا..... یہ جاننا آسان نہیں لگتا۔“ خضر نے
دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اور ایک میلر میٹر پر داؤ بڑھا دیا۔

☆☆☆

دفتر میں داخل ہوتے ہی استاد نے خضر کو موسم گرم

ہے کی نوید سنائی تھی۔ استاد اخبار کا سب سے پرانا ملازم
ہر مرض کی دوا تھا۔ چائے بنانے سے لے کر اندر باہر۔
سارے کام اس کے سپرد تھے۔

”خیریت.....“ خضر نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ”مگر
گھوما ہوا ہے صاحب کا..... دوبار تم لوگوں کا پوچھ چکے؟
اور کہا ہے کہ جیسے ہی آئیں..... اندر کمرے میں بیٹج دوں
”چلو چلتے ہیں۔“ آمنہ مسکرائی۔ مالک کی
ہونے کے ناتے صرف وہی ایسی تھی جس کے سامنے جہا
صاحب کا جلال دم توڑ جاتا تھا اور وہ یہ بات اچھی طر
جاتی تھی۔

”آئیے میاں..... آپ بھی آئیے بی بی..... تشریف
لائیے، بیٹھے۔“ جمال صاحب ان کے کمرے میں داخل
ہوتے ہی بولے۔ آپ جناب سے لبریز گفتگو اس بات
اشارہ تھی کہ وہ واقعی غصے یا شدید تناؤ کا شکار تھے۔ خضر
آمنہ خاموشی سے میز کے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
”آخر تم دونوں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“ وہ دو کھوا
کی خاموشی کے بعد بولے۔

”وہی جو ہمارا کام ہے اور جس کے لیے آپ۔
ہمیں بھیجا تھا۔“ خضر سادگی سے بولا۔ ”ڈی ایس بی بلکہ
پورے ڈیپارٹمنٹ کا رویہ ہی سمجھ میں آنے والا نہیں ہے، و
اس سارے معاملے کو لپیٹ دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں کچھ
انہوں نے بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم دفتر میں بیٹھ کر
ان کی سبھی باتوں کی خبر کا انتظار کریں۔“
”پھر آپ نے کیا کیا؟“ حقیق کا دائرہ بڑھا دیا اور
شرجیل احمد کے گھر جا پہنچے۔“

”اوہ تو ساری خبریں تو ہیں آپ کے پاس پھر ہم سے
پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟“ خضر سر جھٹک کر بولا۔ ”ہمیں
اپنی اسٹوری بنانے کے لیے معلومات درکار ہیں اور اب
تک جو سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ پولیس اس معاملے کو
خود کشی اور اورڈوز کا رنگ دینا چاہتی ہے اور اس معاملے
میں فٹنر اسماعیل کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ کچھ ہے سر جو بہت
غلط ہے اور یقیناً ہمارے قارئین اس معاملے کی حقیقت جانا
چاہیں گے۔“

”مگر ڈی ایس بی اور فٹنر اسماعیل دونوں کا یہ کہنا ہے
کہ کوئی کچھ جانتا نہیں جانتا اور اس کوشش سے ٹیم کا نام بدنام
ہو جائے گا اور تو اور خود میرے پاس یعنی پبلشر صاحب کا بھی
ایک چیخا چمکاڑا فون آچکا ہے۔“ جمال صاحب پھٹ

لہو کا کھیل

پڑے۔
 ”پھر ہم اپنا کام کس طرح کریں؟“
 ”کسی بھی طرح کرو مگر مجھے پیشہ ریا کسی کا بھی فون
 نہیں آنا چاہیے، مجھ کے تم لوگ۔“ وہ اپنے ہاتھ کو پستول کی
 طرح لہراتے ہوئے بولے۔
 آمنہ نے اسے کریدا۔

”بہت بری، سارا جسم زخموں اور خراشوں سے بھرا پڑا تھا۔ رگیں پھٹ گئی تھیں، ستا ہے کہ لاشوں کو پوسٹ مارٹم اور ضروری کارروائی کے بعد خصوصی پاکس میں بند کر کے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس شخص کو تو ان کے گھر میں ہی دفن کر دیا گیا۔“

”سمجھ گئے نا، اب تم دونوں جاؤ میرا وقت ضائع نہ کرو۔“ انہوں نے محفل پر خاست کا اعلان کرتے ہوئے عینک لگا لی تھی۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ دونوں فٹ بال ٹیم کے کوچ کے دفتر میں کھڑے تھے۔ اس بار آمنہ نے اپنی اسپورٹس کار نکالی تھی۔ دفتر میں کوئی نہیں تھا۔

”اب کیا کریں.....؟“ آمنہ نے پوچھا۔ ”میں اس خالی دفتر کی علامتی تصویر بنالیتی ہوں۔“

”کیا میں کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“ اس سے پہلے کہ خضر کوئی جواب دیتا ایک آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ خضر نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ شہزاد ادا خان تھا، دو جویرہ کو چڑھیں سے ایک..... شہزاد ادا خان ٹریک سوٹ میں بلبوس تھا۔

”کیا حال ہے شہزاد؟“ خضر نے پوچھا۔
 ”بس ٹھیک، میں تو ابھی تک اس صدمے سے باہر
 نہیں آسکا ہوں۔“ یحییٰ نے کہا۔ ”آج کل تو میں
 اور وہ بھی اس بُری طرح.....“ وہ جھجھکی سی لڑکھائی
 ”واقعی..... یہ ایک بڑا دلچسپ ہے مگر شہزاد، اس بُری
 طرح سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”ارے کیا تمہیں پتا نہیں..... کیسے رپورٹ ہو یا، یہ بات تو تقریباً سب کو ہی معلوم ہو چکی ہے۔ جن لوگوں نے فرانسک جانے سے پہلے ان کی لاشیں دیکھی ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ان کی بُری حالت تھی۔ ان کا پورا جسم بُری طرح نچا ہوا تھا اور وہ اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے تھے۔“ شہزاد نے رازداری سے بتایا۔

”کیا.....؟ کیا ان کی موت کسی دوا کے اوور ڈوز سے نہیں ہوئی تھی؟“

”مجھے نہیں پتا مگر اکثر لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ شمال کے جنگل سے کوئی وحشی درندہ شہر میں آ گیا ہے اور یہ اس

”بہت بری، سارا جسم زخموں اور خراشوں سے بھرا پڑا تھا۔ رگیں پھٹ گئی تھیں، سنا ہے کہ لاشوں کو پوسٹ مارٹم اور ضروری کارروائی کے بعد خصوصی باکس میں بند کر کے دیا جائے گا۔ ایک تو ان کی حالت کی وجہ سے اور پھر اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس سے ہر طرف خوف پھیلنے کا خطرہ جو ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اودہ، یہ تو ہماری سوچ سے زیادہ پریشان کن صورت حال ہے۔“ آمنہ بولی۔ ”آپ بھی محتاط رہیے گا شہزاد صاحب۔“

”جی..... جی بالکل۔“ شہزاد خان کے چہرے پر خوف کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

”کوچ نعمان صاحب کیسے ہیں؟“ خضر نے پوچھا۔
 ”وہ ٹھیک ہیں مگر ظاہر ہے کہ ان حالات نے انہیں
 بہت زیادہ متاثر کیا ہے، ہماری ٹیم ایک خاندان کی طرح
 ہے۔“

’وہ اس وقت موجود ہیں؟‘

”ہاں وہ گراؤنڈ میں اپنی مخصوص بیچ پر مل جائیں گے، آؤ میں تم لوگوں کو وہاں پہنچا دیتا ہوں۔“

گراؤنڈ میں داخل ہوتے ہی انہیں کوچ نعمان نظر آ گئے تھے۔ وہ سیدھے ہاتھ پر بنی ایک بیچ پر سہ سہ سے بیٹھے تھے۔ وہ خود فٹ بال کے بہترین کھلاڑی رہ چکے تھے۔ کسرتی جسم اور شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ہرے پرانوس، فکر اور تباؤ کے تاثرات جیسے ہوئے تھے۔

خضر کے لیے اس لمحے تک تین لڑکوں کی اس طرح
دو ایک سنسنی خیز خبر سے زیادہ نہیں مگی مگر اب کوچ کوچ کیجھ
راور ان سے اس حالت میں سوال و جواب کرتے ہوئے
شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی مگر اسے بہر حال اپنا کام تو
رہنا ہی تھا۔

”شربل بہت جلد بہترین فٹ بالرز میں شامل ہو
تا۔ ان لڑکوں کے سامنے پوری زندگی پڑی تھی۔ مجھے اب
یقین نہیں آتا کہ ان کی خاطر وہ ایسے کیسے برابر کر سکتے
ہیں؟“ وہ حضرا اور امہ کو بیٹھنے کی جگہ دیتے ہوئے بولے۔
”یہ واقعی عجیب لگتا ہے، لگتا ہے نا؟“ حضرا نے

پوچھا۔

”تو تم اپنی خبر کے لیے میرے تاثرات لینے آئے ہو؟“

”اگر آپ بہتر محسوس نہ کر رہے ہوں تو ہم دوبارہ آجائیں گے۔“ آمنہ نے کہا۔

”نہیں، نہیں، سب وقت ایک جیسے ہی ہیں آمنہ۔“

”شکریہ نعمان، میرے لیے بھی یہ سوال ایک معما بنا ہوا ہے کہ آخر اتنے ہونہار کلاڑیوں کو کیا چیز اس نشے کی طرف لے گئی؟“ خضر بولا۔

”دنیا میں کامیاب، ہونہار اور بہترین مستقبل رکھنے والے انہی شخصیات بھی آج کل ڈرگز استعمال کر رہے ہوتے

ہیں۔ یہ شارٹ کٹ کا دور ہے ہر ایک کو فوری کامیابی چاہیے خواہ اس کی قیمت کچھ ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے، خصوصاً

جو نیر اور ملکی سطح پر لوگ یہ سوچ کر اسے استعمال کرتے ہیں کہ فی الحال انہیں چیک نہیں کیا جائے گا۔ وہ اس گمان میں

ہوتے ہیں کہ بین الاقوامی مقابلوں تک پہنچ کر وہ اسے چھوڑ دیں گے مگر ایسا کرنا اکثر اوقات ممکن نہیں رہتا۔“

”کیا آپ جانتے تھے.....؟“

”مجھے شک تھا مگر اس شہر میں کسی کو اس بات کی پروا نہیں تھی حتیٰ کہ ان کے والدین تک کو نہیں..... سب کو

کامیابی سے زیادہ دہشتی ہے۔“

”تو کیا آپ نے اس حوالے سے شرجیل کے والد سے بات کی تھی؟“

”ہاں، ایک بار میں نے اس کے والد اور پھر ہماری ٹیم کے سرپرست اعلیٰ وزیر اسماعیل صاحب سے بھی اس کا

اظہار کیا تھا۔ شرجیل کے والد نے اس بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا۔ والدین اگر وقت پر بچوں پر نظر رکھ لیں اور ان کی

معصرویات کو جانتے رہیں تو بعد میں رونے کی نوبت کم آتی ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولے۔

”فسخ صاحب نے ان سے زیادہ سخت زنجیل دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس طرح وہ زیادہ بہتر کارکردگی دے سکتا ہے تو مجھے خاموش

رہنا چاہیے۔ مجھے اس بات پر بہت افسوس ہوا تھا۔“

”کیا واقعی میتھ انہی شخصیات کی جسمانی طاقت بڑھا دیتی ہے؟“

”ہاں..... اس سے طاقت و توانائی دونوں دگنی ہو جاتی ہیں۔ اسٹینا بڑھ جاتا ہے مگر یہ سب مختصر مدت کے لیے ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے اثرات جسم کو خصوصاً ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔“

”مگر تب بھی کیا یہ بہت غیر معمولی سائنس لگتا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر تین افراد جو اس کو کافی مہینوں سے استعمال کر رہے تھے اور ڈوز لے کر مر جائیں؟“ خضر نے پوچھا۔

”کیا کہا جاسکتا ہے؟“ کوچ نے کندھے اچکائے۔

”یا پھر تم دونوں بھی اس خون آشام درندے والی کہانی پر یقین کرتے ہو؟“

”آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں میں نے تم سے ابھی جو بھی باتیں کی ہیں، کیا میں تم دونوں پر یقین کر سکتا ہوں کہ یہ

آف دی ریکارڈ رہیں گی؟“

”اوہ۔“ خضر نے گہری سانس لے کر ٹیپ ریکارڈر بند کیا۔ ”اوکے، میں وعدہ کرتا ہوں، اگر حالات مزید

پراسرار ہوئے اور ان میں سے کسی بات کو سامنے لانا پڑا تو میں آپ سے پوچھ کر تمام ذرائع سے یہ خبر دوں گا، منھوڑ؟“

”ٹھیک ہے مگر صرف اس صورت میں اگر اس سے کسی قاتل کو پکڑا جاسکے کیونکہ میں موت کے بعد ان بچوں یا

ان کے والدین کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ تم میرے حوالے سے رکی بیان تیار کر لیتا۔“ وہ دونوں کا ریشہ بیٹھنے تک بالکل خاموش رہے تھے۔

”خون آشام درندہ، نجی ہوئی لاشیں..... مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی درندہ ایک ہی

دن میں تین مختلف جگہوں پر تین افراد کو قتل کر سکے؟“

”ہاں نہیں..... مگر اس سب کو جاننے کا ایک طریقہ ہے۔“ آمنہ بولی۔

”اوہ شاید تم پوسٹ مارٹم رپورٹ کی بات کر رہی ہو، میں نہیں سمجھتا کہ ڈپارٹمنٹ صحیح رپورٹ منظر عام پر آنے دے گا۔“

آمنہ جواباً مسکرائی۔ اس نے ایک سیلر ڈباؤ بڑھایا اور بولی۔ ”شاید تم بھول گئے ہو، پوسٹ مارٹم کرنے والا چیف میڈیکل آفیسر میرے ماموں کا بیٹا ہے۔“

☆☆☆

جمال صاحب اپنے کمرے میں تھپتھپتے۔ وہ ساتھ کے بیٹے میں تھے۔ درمیانی قد و قامت، سفید بالوں اور اپنی گہری پُرسوج آنکھوں کی وجہ سے وہ ایک روایتی ایڈیٹر

ی نظر آتے تھے۔ اس وقت وہ گہری سوچ میں تھے۔ تین پراسرار اصوات اور ان کے نتیجے میں سامنے آنے والا ڈباؤ انہیں ذہنی تناؤ میں مبتلا کرنے کے لیے کالی

نسیم مجازی کے شاہکار تاریخی ناول

جہانگیر بکس



450/- انسان اور یوتا

یہ نئی سامراج کے علم و ہرستی کے ماحول پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہوں میں اختیار کرنے پر مجبور کیا

300/- پاکستان سے دیوار تک

تاریخی مہم، مہم میں کھیلنے والا ایک دلچسپ سفر نامہ قزاق

450/- آخری چٹان

سیرت خرم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاریخوں کے سب روایں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

225/- سوسال بعد

گاندھی جی کی اہمیت، اہمیتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مفاصلہ کی منہ بولتی تصویر

325/- سفید جزیرہ

بحرالکاف کے کسی مظلوم جزیرے کی داستان

475/- شاہین

انڈیا میں مسلمانوں کے شہب فرادی کی کہانی

475/-

معظم علی

لارکا کا ایک اسلام دشمن، میر جعفر کی تندی، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک شاہکار عظیم کی داستان شجاعت

550/- خاک اور خون

سکھ، تریچ، انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکان

450/- کیسا اور آگ

فروری جی کی عیاشی، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی گھٹ کی داستان

599/- قافلہ قزاق

راہوں کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

425/- محمد بن قاسم

عالم اسلام کے 17 سالہ بیرونی تاریخی داستان، جس کے سبب سے لوہے کی تلواروں نے مسلمانوں کی فلاح دیں

300/- پورس کے ہاتھی

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں نوجوان اور بھروسہ کے سامراجی مفاصلہ کی داستان، جہیں ہرماز پر منہ کی تلوار پڑی

550/- اوتوکاروٹ گئی

شیر پور (نہرو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے فوجیں قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

500/- گمشدہ قافلے

انگریز کی اسلام دشمنی، ہندو کی عداوت اور سکھوں کی مصیبتوں اور عظیم موروثی کوٹھن میں شہلے کی لڑنے و خیرگی داستان

300/- داستان مجاہد

فتح دہلی کے بعد راجہ دارنے راجا جوں کی مدد سے دوسو چھوٹوں کے وسط 50 ہزار سوار اور سپاہیوں کی فوج بنائی، قاتل سندھ کی حرکت کارا داستان

450/- پردیسی درخت

اسلام دشمنی، ہندو سکھوں کے گٹھ جوڑی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تمام انسانی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

500/- یوسف بن تاشیفین

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آگاہ و صاحب کی تاریک راتوں میں امیر کی قدسیں بلترکے والے گماں پس کی داستان

550/- آخری معرکہ

جب مسلمانوں کے پورے دست کوڑنے کی ہادی آئی تو ہندو راجے اور چھادی سلطان کے قدوس میں گڑبڑے اور کھانم اس کے ذہن کے روبرو پہنچے پہلے تیار ہیں۔ سلطان کا چھوٹے سے تختہ اٹھا ہوا اس نے جواب دینے میں فوجیں لیں، ہر سٹیم کھانا چاہا ہوا، نیم چابی کی ایک کھلا جھیر خور

اندھیری رات کے مسافر

انڈیا میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تاجی کے کھڑکھڑاتے مہر و مہلوں، ہندو فوجوں کی ذلت اور مالی کی نام تاک داستان

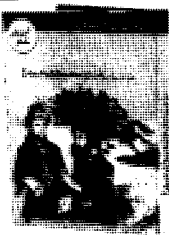
475/- ثقافت کی تلاش

اہم اہم ثقافت کا پرکار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی عقلی اور روحانی قدوس کو اہلیں کی قہر پھٹکوں کی چمچ بھین کے ساتھ پامال کیا

625/- قیصر و کسریٰ

لہور اسلام سے قبل عرب و غم کے تاریخی، سیاسی، علاقائی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزند نامہ کے ابتدائی نقش کی داستان

سبق آموز کتب سلسلہ



165/- اقوال حضرت علی المرتضیٰ

165/- اقوال آخر کرام

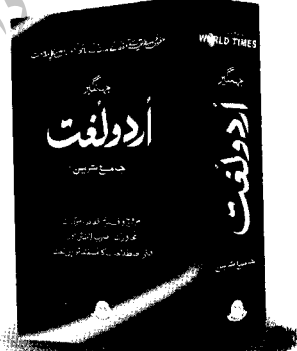
195/- حکایات گلستان سعدی

140/- اقوال شیخ سعدی

180/- حکایات رومی

170/- دلچسپ و عجیب حقائق

199/- حکایات بوستان سعدی



ادولفت

(جامع ترین)

ادولفت (جامع ترین) سے نقطہ کا انداز کے ساتھ اور ذرا بڑے کا پلاؤت

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

جہانگیر بک ڈپو

تھا۔ ذہنی دباؤ سے بچنے کے لیے تو آٹھ سال پہلے وہ ایک بڑے اخبار کی ملازمت چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ ٹینشن، ہائپر ٹینشن، بلڈ پریشر میں اضافہ اور پھر ہارٹ ایک، وہ ان سب سے گزر چکے تھے۔

وہ شروع سے جانتے تھے کہ یہاں کوئی گڑبڑ تھی۔ ملازمت کے پہلے ہی ماہ ایک پراسرار فون کال نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اگر انہیں اس جگہ اور اس اخبار کا ایڈیٹر رہنا ہے تو انہیں کچھ چیزوں اور کچھ لوگوں کے بارے میں اپنی آنکھیں، کان اور زبان بند رکھنی ہوگی۔ دوسری صورت میں انہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ جمال صاحب نے پہلے راستے کا انتخاب کیا تھا جس کے بعد انعام یا بوس کی صورت میں انہیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ کے علاوہ نوٹوں کا ایک لفافہ گھر کے دروازے پر لٹکے گا تھا جس نے ان کے بہت سارے مسائل حل کر دیے تھے۔ ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان سالوں میں انہوں نے دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیجا۔ تعلیم مکمل کر کے انہوں نے وہیں ملازمت شروع کر دی تھی۔ اس لفافے کی مدد سے ہی جمال صاحب اپنا چھوٹا سا گھر خریدنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اتنے سالوں میں وہ اچھی طرح جان گئے تھے کہ پابشر کا مفاد اور مرضی بھی اسی بات میں مٹی یوں سب ٹھیک چل رہا تھا مگر اب ان اموات نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ کیا اس کا تعلق بھی اس پراسرار طاقتور شخص سے تھا؟ اگر ایسا ہوا اور اس کا راز کھل گیا تو وہ اسے کیسے سامنے لائیں گے؟ اور اس سب کا نتیجہ کیا ہوگا؟

فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا۔

”جمال.....“ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر وہ سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ ”تم فٹ باروں والی کہانی کے لیے کیا کر رہے ہو؟“

”میں ہمیشہ کی طرح پوری احتیاط کروں گا۔“ انہوں نے جوابا کہا۔

”شاباش! مجھے معلوم تھا مگر میں نے یہ اس لیے پوچھا ہے کہ تمہارے دور پورٹرز اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ وہ نیو پارک ٹائمز یا بی بی سی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ انہیں جہاں نہیں ہونا چاہیے وہ وہاں بھی نظر آ رہے ہیں۔ تمہیں ان پر نظر رکھنا ہوگی، سمجھ گئے نا.....؟“

”جی بالکل..... میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔“ ”گڈ۔“ اور اس کے ساتھ ہی کال کٹ گئی۔ جمال

نے گہری سانس لے کر پشت کرسی پر ٹکا دی۔ یہ اتنا آسان نہیں لگ رہا تھا مگر انہیں یہ کسی نہ کسی طرح کرنا ہی تھا مگر وہ اسے اس طرح کرنا چاہ رہے تھے کہ ان کی اصول پسندی پر بھی بات نہ آئے اور کسی کو ان پر شک بھی نہ ہو۔

☆☆☆

ڈیش بورڈ پر رکھا خضر کا فون اچانک رقص کرنے لگا تھا۔

”ہیلو باس.....“

”تم کہاں ہو؟“ جمال صاحب کی آواز ابھری۔ ”سرا! ہم کوچ نعمان کے تاثرات لینے گئے تھے۔“ ”اوکے، میں چاہتا ہوں کہ تم جتنی جلد ممکن ہو سکے دفتر پہنچو، مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“

”کیا آپ کو کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟“ ”ہاں اور وہ یہ کہ تم غیر ضروری طور پر دوسروں کے معاملات میں دخل دے رہے ہو۔“

”باس، میں اپنا کام کر رہا ہوں۔“ خضر بولا۔ ”تمہارا کام وہ لکھتا ہے جس کی میں نہیں ڈتے

داری دوں، اب تم دفتر پہنچو تاکہ ہم بیٹھ کر بات کر سکیں۔“ ”کال بند ہو گئی تھی۔ خضر چند لمحوں کو دیکھتا رہا۔

”جمال صاحب کا رتاؤ بہت عجیب و غریب ہے۔“ وہ بالآخر بولا۔

”تو وہ کب عجیب نہیں ہوتا۔“ آمنہ سکرانی۔ ”نہیں، وہ کچھ مختلف انداز میں عجیب لگ رہے

ہیں۔ میں کہنا نہیں چاہتا مگر وہ بالکل ڈی ایس کی طرح نظر آ رہے ہیں جو اس سارے معاملے کو دباننا چاہتا ہے۔“

”تم شاید کچھ زیادہ ہی سوچ رہے ہو۔“ آمنہ نے اسے ٹوکا۔

”ہو سکتا ہے، انہوں نے ہمیں جتنی جلد ممکن ہو سکے دفتر پہنچنے کا حکم دیا ہے۔“

”جتنی جلد ہو سکے کا ترجمہ میرے لیے یہ ہے کہ فرانک سے واپسی پر..... ٹھیک ہے نا۔“ آمنہ ہنسی۔

”تم جانتی ہو تم ایک مکمل صحافی ہو، نڈر اور بے باک۔“ خضر ڈرامائی انداز میں بولا۔ آمنہ اس کی بات سن کر

آداب بجالائی تھی۔ وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ دفتر سے نکلنے کے بعد سے ہی ایک شہر ورٹرک خاموشی سے ان کا پیچھا کر رہا

تھا۔ اب بھی وہ ایک مختل فاصلے سے ان کے تعاقب میں تھا۔

لہو کا کھیل

یہ کیسے ہوا تھا۔ کون سی چیز کسی انسان کو اس طرح اپنی جان لینے پر مجبور کر سکتی ہے؟ یہ سوال اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ اس نے کاؤنٹر سے فرسٹ فائنڈنگ فارم لیا اور اسے بھر کر اپنے کلپ بورڈ پر لگا دیا۔ وہ فوری طور پر چند ٹیسٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

”ہیلو..... ڈاکٹر سعید احمد۔“ وہ فون کان سے لگا کر عادت کے مطابق بولا۔

”تم نے کیا معلوم کیا ہے؟“ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے سوال کیا۔

”آپ کون بول رہے ہیں؟“

”تم اچھی طرح جانتے ہو ڈاکٹر کہ میں کون بول رہا ہوں۔ میرے سوال کا جواب دو، ان لڑکوں کی موت کس طرح ہوئی ہے؟“

ڈاکٹر ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر اس نے کسی غیر مرئی چیز کو گویا نگاہوں پر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ خون کا بہہ جانا موت کی وجہ بنتا ہے۔“

”نہیں..... ڈرگ کا ضرورت سے زیادہ استعمال ان کی موت کی وجہ ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں سر مگر ان کی ٹاکس اسکریننگ ہمارے پاس موجود ہے ان میں سے کسی نے بھی کبھی ڈرگ کو ضرورت سے زیادہ استعمال نہیں کیا ہے۔“

”میرے خیال، میں شاید تم ٹھیک طرح سے سن نہیں پائے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ ان کی موت ڈرگ کے ضرورت سے زیادہ استعمال کی وجہ سے ہوئی ہے اور تمہیں ٹاکس اسکریننگ کو بھی ضائع کرنا ہوگا۔ بات سمجھ میں آگئی ہے نا۔“

”اوکے سر، میں سمجھ گیا ہوں۔“ ڈاکٹر نے دہمی آواز میں کہا جس کے ساتھ ہی فون کٹ گیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اسے یہ حکم ماننا ہی تھا۔ نہ ماننے کی صورت میں اس کی ملازمت کا بحال رہنا ناممکن تھا۔

ملازمت کے ابتدائی دنوں میں اس سے ایک بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی اور اس کے دستاویزی ثبوت اس ”آواز“ کے پاس تھے۔ اس نے آج تک اس شخص کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ اس کی ہر بات ماننے کا پابند تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ہر بار اپنی فرمانبرداری کی قیمت بھی مل جایا کرتی تھی۔

اس نے فون میز پر رکھا اور دوسرا فارم نکال کر حکم کے مطابق رپورٹ تیار کرنے لگا۔ اپنی پرانی رپورٹ اس نے الگ رکھ لی تھی۔ وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے جعلی رپورٹ

ڈرامیور نے رپورٹ دینے کے لیے موبائل پر ایک کا ہندسہ دیا یا اور بولا۔ ”یوں لگ رہا ہے جیسے وہ دونوں دفتر واپس جا رہے ہیں۔“

”گلد۔“ دوسری طرف موجود شخص اس خبر سے خوش ہوا تھا۔ ”اگر وہ کہیں اور رکیں تو مجھے خبر دینا مت بھولنا۔ میں اس سب کو کسی بڑی خبر کی شکل میں نہیں دیکھنا چاہتا۔“

☆☆☆

سعید احمد نے اپنا کلپ بورڈ میز پر رکھا اور ہمت کر کے سعد خان کے بے جان جسم پر نظر ڈالی۔ یہ ایک لمبا کرا تھا جہاں اسٹریچرز پر تین لاشیں موجود تھیں۔ دیوار پر ایک طرف ایک بڑی کمپیوٹر اسکرین تھی۔ ساتھ بنے کاؤنٹرز پر مختلف آلات لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک میز اور چند کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا، وہ دس سال سے فرانک ڈپارٹمنٹ کا سربراہ تھا۔ اس سے قبل ڈاکٹر کی تعلیم اور پھر خصوصی تربیت میں وہ بہت سی لاشوں کا پوسٹ مارٹم اور رپورٹنگ کر چکا تھا۔ اس سے قبل بھی وہ قتل اور حادثوں سے متاثرہ متعدد مرنج لاشیں دیکھ چکا تھا مگر آج جو کچھ اس کے سامنے تھا اس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

تینوں لاشوں کے جسم پر کوئی بھی جگہ خونی خراشوں سے خالی نہیں تھی۔ ابتدائی جائزے میں ہی اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ کسی خون آشام درندے کا کام نہیں ہے۔ مگر بے

زخموں کے مانند پڑی یہ خراشیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ ابتدائی معائنے کے بعد تین اس وقت جب اسے یہ یقین

ہوئے لگا تھا کہ درندہ نہ سہی مگر یہ کسی ایسی مخلوق کا حملہ ہے جس نے اپنے شکار کو خود کو بچانے کی مہلت تک نہیں دی۔

اس کی نظر سعد کے ناخون پر پڑی۔ وہ اچھل سا پڑا تھا پھر اس نے تینوں لاشوں کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔

جو کچھ سمجھ آ رہا تھا وہ قابل یقین نہیں تھا۔ یہ معاملہ اس سے زیادہ پراسرار اور حیران کن نظر آ رہا تھا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے محذب عد سے ان تینوں کے ناخون کا دوبارہ جائزہ لیا۔ ان کے ہر ناخن کے ساتھ نچی ہوئی کھال کے ریشے لٹک رہے تھے۔

اسے حتیٰ نتیجے تک پہنچنے کے لیے چند مزید ٹیسٹ کرنے تھے مگر جو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ لڑکوں نے کسی بھی

وجہ سے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کو اس بری طرح اور اس قدر تیزی سے نوچا تھا کہ جسم کی چھوٹی بڑی رگیں کٹ گئی تھیں۔ خون کا تیزی سے بہہ جانا ان کی موت کی وجہ بنتا تھا۔

اسے حتیٰ نتیجے تک پہنچنے کے لیے چند مزید ٹیسٹ کرنے تھے مگر جو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ لڑکوں نے کسی بھی

وجہ سے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کو اس بری طرح اور اس قدر تیزی سے نوچا تھا کہ جسم کی چھوٹی بڑی رگیں کٹ گئی تھیں۔ خون کا تیزی سے بہہ جانا ان کی موت کی وجہ بنتا تھا۔

اسے حتیٰ نتیجے تک پہنچنے کے لیے چند مزید ٹیسٹ کرنے تھے مگر جو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ لڑکوں نے کسی بھی

موجود نہیں تھا۔ خضر کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اگر انہیں رپورٹ میں گڑبڑ کرنا ہوگی تو دفتر میں زیادہ لوگ موجود نہیں ہوں گے۔ وہ تیزی سے اندر کے بلاک کی طرف بڑھا۔ اسے ڈاکٹر اور آمنہ کی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ”پلیز احمد بھائی، میں تصویر نہیں بناؤں گی، مجھے صرف ایک لمحے کے لیے ان لاشوں کو دیکھنا ہے۔“ آمنہ بولی۔

”نہیں آمنہ، یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی رپورٹ ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دوں گا، تمہیں وہاں سے کاپی مل جائے گی۔“ ڈاکٹر نے نرم گھر جی لہجے میں جواب دیا۔

”آخر مسئلہ کیا ہے ڈاکٹر سعید احمد۔“ آمنہ کا صبر جواب دے گیا تھا۔ ”آپ آخر کیا چاہا رہے ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں مگر تم بھول رہی ہو کہ ہمیں نہ تو یہاں آنا چاہیے تھا اور نہ یہ ضد کرنا چاہیے، یہ لاشیں تقیتش کا حصہ ہیں تم جانتی ہو۔“

”مطلب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ قتل ہیں؟“

”میں نے یہ نہیں کہا ہے اور آمنہ اب تم مجھے کام کرنے دو، مجھے گھر واپس جانے سے پہلے پوری رپورٹ تیار کرنا ہے۔“ ڈاکٹر نے دروازہ کھول کر آمنہ کے لیے راستہ بنایا تھا۔ کمرے سے وہ پہلے باہر آئی تھی۔ باہر آتے ہی اس کی نظر ایگزیشن روم کے منتقل دروازے کے باہر کھڑے خضر پر پڑی۔ وہ فوراً مڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

”ٹھیک ہے میں جاتی ہوں مگر مجھے صرف 5 منٹ دیں، مجھے آپ سے اپنے ایک مسئلے پر بات کرنا ہے احمد بھائی۔“ اس نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا تھا۔

خضر بند دروازے کو دیکھ کر مسکرایا اور ہاتھ میں پکڑی پن لے کر لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

شور و زحمت میں بیٹھے شخص نے دوسری سگریٹ سلگائی اور ایک لمبی جمائی پی پھر اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

”آخر یہ دونوں کیا کر رہے ہیں اندر۔“ اس نے بیزار سی سوچا، اتنے میں اس کا فون بجا۔

”کیا وہ یہاں سے نکل گئے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”نہیں باس، وہ ابھی تک اندر ہیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟“

تیار کرنے کے باوجود خود اپنے تجسس کے لیے اس کیس پر کام کرنا چاہ رہا تھا۔

فارم مکمل کر کے اس نے لیب کو ٹاکس اسکریننگ ضائع کرنے کا حکم دیا۔ ابھی وہ اس سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اسے آمنہ کی آواز سنائی دی۔

”احمد بھائی کہاں ہیں آپ.....؟“ وہ غالباً اندر آ چکی تھی۔

ڈاکٹر تیزی سے کھڑا ہوا۔ اس نے لیب کر دو لاشوں پر شیٹ ڈالی، تیسری لاش تھوڑے فاصلے پر تھی اور آمنہ کے قدموں کی چاپ قریب آتی جا رہی تھی اس لیے اس نے پہلی ترجیح اپنے گلاب بورڈ کو چھپانے کو دی اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے دونوں جانب ان دونوں نے ایک ساتھ تاب گھمائے تھے۔ تاب ہلتا دیکھ کر آمنہ نے اپنا ہاتھ ہٹالیا تھا جس کے فوراً بعد دروازہ مکمل گیا تھا۔

”ارے تم آمنہ۔“ ڈاکٹر نے باہر نکل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اسے متقل کر دیا۔ ”آؤ کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر دیا، آپ اپنا کام کرتے رہیے نا، مجھے تو ڈومنس کا کام ہے۔“ وہ اندر جانا چاہ رہی تھی۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے میں ویسے بھی اپنا کام کر چکا ہوں، تم آؤ۔“ وہ اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

آمنہ نے مڑ کر متقل دروازے کو گھورا۔ اسے ہر قیمت پر اس کمرے میں جانا ہے، اس نے سوچا اور ڈاکٹر کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

خضر باہر گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ آمنہ اکیلی اندر جائے گی اور اپنے ماموں زاد بھائی کو اس بات پر آمادہ کرے گی کہ وہ انہیں لاشوں کو دیکھنے کا موقع دے۔

خضر اس کی بات مان گیا تھا مگر اب اس کے لیے انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ان لاشوں کے بارے میں اتنا سن چکا تھا کہ اب انہیں خود دیکھنا چاہ رہا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر آمنہ ڈاکٹر کو رضامند نہ کر پاتی تو ان کی ساری محنت خاک ہو جائے گی۔

اس نے آمنہ کے اندر جانے کے بعد دو منٹ تک انتظار کیا تھا پھر عمارت میں داخل ہو گیا تھا۔ استقبال پر کوئی

لہو کا کھیل

جانب دیکھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ پوچھتی خضر بولی پڑا۔
 ”اودہ یہ کیا ہے؟“ اس کا اشارہ وٹن شیلڈ کی طرف تھا۔ اس کے متوجہ کرنے پر آمنہ نے سامنے دیکھا تو ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے والے دایرے کے نیچے ایک کاغذ لگا ہوا تھا جس پر ان دونوں کا نام لکھا تھا۔ وہ خضر کو جواب دے بغیر تیزی سے نیچے اتری اور کاغذ کو نکال کر کھولا۔ اس پر بڑے بڑے حرفوں میں صرف ایک جملہ لکھا تھا۔
 ”خود کو روک لو..... ورنہ تمہارا انجام بھی ان لڑکوں جیسا ہو سکتا ہے۔“

”آمنہ کیا یہ ہے؟“ خضر نے پوچھا۔
 ”دھمکی..... وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
 ”ہم..... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم صحیح جا رہے ہیں اور اس سب کے پیچھے بہت کچھ چھپا ہے۔“ خضر نے پرچے کو پڑھ کر حیرت میں ڈال لیا تھا۔
 ”لگتا ہے کہ تمہیں اندر کچھ ایسا نظر آیا ہے جس نے سب داغ کر دیا ہے۔ بتاؤ اندر کیا دیکھا تم نے؟“
 ”مجھے خود مجھ نہیں آ رہا کہ میں نے کیا دیکھا ہے اور یہ کہ کسی دوا کا کوئی بھی ڈوز کسی کو اس حالت میں پہنچا سکتا ہے۔“ خضر سر ہلا کر بولا مگر میں نے اس سب کی تصاویر اور ویڈیو بھی بنائی ہے اور تمہارے آنے سے پہلے اسے اپنی ای میل پر بھی محفوظ کر لیا ہے۔“

”واؤ..... زبردست خضر، یہ پہلا ثبوت ہی ہماری کہانی کو صحیح ثابت کر دے گا، مجھے دکھاؤ۔“
 ”میرا خیال ہے کہ راستے میں یہ دیکھنا مناسب نہیں پھر بھی اگر تم دیکھنا ہی چاہتی ہو تو ڈرائیونگ مجھے دے دو۔“
 ”نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔“ آمنہ نے جواب دیا۔ خضر نے اس کے جواب پر ایک تصویر کھول کر فون اس کے سامنے کر دیا۔

تصویر پر نظر پڑتے ہی آمنہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی اور گاڑی لہر اکر رک گئی تھی۔

☆☆☆

”آف یہ سب ناقابل برداشت ہے خضر.....“ آمنہ بالآخر بولی۔ وہ اب دفتر کی جانب جا رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار اسٹیرنگ وھیل خضر کے ہاتھ میں تھا اور اس کا فون آمنہ کے ہاتھ میں۔ ”خضر..... چھ مہینے کالیں.....“ وہ اچانک بولی۔

”یوں لگتا ہے کہ جھوٹا باندی کی اس جوڑی کو خوف زدہ کرنا ہی پڑے گا۔ پھلی ڈگری کافی ہوگی، تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔“
 فون بند کر کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ سے ایک کاغذ نکالا۔ وہ صرف فرسٹ ڈگری والے حکم سے بھی خوش نہیں ہوتا تھا مگر کرنا تو اسے وہی تھا جو کہا گیا تھا۔ وہ بال پین نکال کر کاغذ پر جھک گیا۔

☆☆☆

خضر کو تالا کھولنے میں چند لمحوں لگ گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے مگر اسے بھی اس سے قبل اس طرح لاک کھولنے کا ایک یا دو بار ہی اتفاق ہوا تھا اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنے فلیٹ کی چابیاں دفتر میں بھول آیا تھا۔ بالآخر کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ لاک کھلا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ اندر داخل ہوتے ہی مختلف کیمیکلز کی چیز ہونے اس کا استقبال کیا تھا۔ خضر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بشکل خود کو کھانسنے سے روکا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ کمرے میں تین اسٹریچر موجود تھے، ان میں سے دو پر شیش پڑی ہوئی تھیں۔ خضر نے پہلے اسٹریچر پر سے چادر اٹھائی اور ایک لمبے کے لیے ساکت سا ہو گیا۔ وہ سعد خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کئی بار اس سے مختلف حوالوں سے بات کر چکا تھا مگر اس وقت اس کو پہچاننا تقریباً ناممکن تھا۔ تکلیف اور دہشت نے اس کے نوجوان چہرے کے نقوش کو بگاڑ دیا تھا جبکہ جسم پر زخموں اور خراشوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

”کسی دوا کی زیادتی انسان کا یہ حال کر سکتی ہے؟“
 وہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے دوسری چادر ہٹائی، وہ ان تینوں میں سب سے کم عمر راہیل تھا۔ تیسرے اسٹریچر پر شرنیل احمد کی لاش تھی۔ وہ چند لمحوں تک ان تینوں کو دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر جیب سے اپنا آئی فون نکالا اور تینوں کی تصاویر بنانا شروع کر دیں۔ ہر اینگل سے تصویریں بنانے کے بعد اس نے ان کی ایک ویڈیو بھی بنائی۔ جو کچھ اس کے سامنے تھا اسے بغیر ثبوت سے کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ تصاویر اور ویڈیو بناتے ہوئے اس نے اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ ان میں فرانک کا ایزام روم اور اس کے تمام لوازمات

نظر آئیں۔
 کام ختم ہوتے ہی اس نے پہلے دو اسٹریچر پر پہلی چادریں ڈالیں، کمرے سے نکلا، دروازے کو لاک کیا دے قدموں عمارت سے باہر نکل گیا۔ آمنہ جب باہر آئی وہ کار میں موجود تھا۔ آمنہ نے کار میں بیٹھتے ہی اس کی

لوگ کہاں جا رہے ہیں اور دن ابھی ختم نہیں ہوا۔ شام کو یقیناً اسے اپنا کام مکمل کرنے کا بہتر موقع مل جائے گا۔ اس نے سگریٹ جلائی اور گانے کی آواز بلند کر دی۔

☆☆☆

خضر کو اندازہ تھا کہ جمال صاحب بھرے بیٹھے ہوں گے اور ان کے دفتر پہنچنے ہی شروع ہو جائیں گے۔ وہ دونوں ذہنی طور پر ان کے سوالات کی بمباری کے لیے بھی تیار تھے مگر جو وہ کہہ رہے تھے اس کا خیال بھی ان دونوں کو نہیں آیا تھا۔

”خضر تم نے تاثرات پر مبنی مضمون تیار کر لیا؟“ انہوں نے سادگی سے پوچھا۔

”تاثرات پر مبنی؟“ خضر نے بھونچکا ہو کر انہیں دیکھا۔ صحافتی دنیا میں لوگوں کے تاثرات کو من و عن لکھ دینا آسان کام سمجھا جاتا ہے۔

”ہاں..... اور مجھے اس ایڈیشن کے لیے صرف اسی آرٹیکل کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے متانت سے کہا۔ ”تم کل صبح تک بھی مضمون دے سکتے ہو۔“ ان کی اس وضاحت نے خضر کو یک دم مایوس اور اداس سا کر دیا تھا۔ اس کا جوش و جذبہ لمحہ بھر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس کا زبردست تحقیقاتی رپورٹ بنانے کا خواب ذمیں بوس ہو گیا تھا۔

”جمال صاحب کیا واقعی آپ صرف ایک تاثراتی مضمون چاہتے ہیں۔ صبح تو ہم نے کچھ اور طے کیا تھا۔ ہم نے سارا دن اس اسٹوری پر کام کیا ہے اور آپ یقیناً جانیں کہ یہ تین نوجوانوں کی حادثاتی موت سے بہت آگے کی چیز لگ رہی ہے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ سنسنی خیزی ہماری پالیسی نہیں ہے اور یہاں ان چیزوں کو کوئی پسند بھی نہیں کرتا۔ دوسری اور آخری بات یہ ہے کہ میں اس حوالے سے کسی اور اسٹوری میں دلچسپی نہیں رکھتا۔“

”مگر باس.....!“

”خضر تم نے میری بات سن لی نا.....؟ اب یہ بات یہیں ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اس لیے میری بات کو بھلو..... اب مجھے پرسوں والی تعلیمی کانفرنس کی خبر کی کننگ بیج دو۔“ انہوں نے میٹنگ پر خاست کر دی گئی۔ خضر ایک لمحے وہاں کھڑا رہا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر خاموشی سے اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا بقیہ دن معمول کے کاموں میں گزر گیا تھا۔ اسے جمال صاحب کے رویے پر حیرت بھی مگر وہ جو کچھ دیکھ چکا تھا اس کے بعد

”کس کی.....؟ جمال صاحب کی تو نہیں؟“ خضر نے پوچھا۔

”ان کی ہی ہیں اور لوہے پھر آگئی کال.....“

”جمال صاحب بھی کسی خطرناک بیوی کی طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“ خضر چڑ کر بولا۔ ”تم کیا کہتی ہو، کیا ہمیں ان کو کچھ بتانا چاہیے؟“

”بالکل، میرے خیال سے تو ہمیں انہیں سب بتا دینا چاہیے۔“

”ایک بار پھر سوچ لو، وہ جس قسم کے موڈ میں صبح سے ہیں، کیا انہیں یہ سب بتانا اور دکھانا مناسب ہوگا؟“

”مگر یہ بھی تو سوچو کہ جھوٹ بولنے کے باوجود انہیں بہر حال معلوم تو ہو ہی جائے گا، جمال صاحب سے کچھ چھپانا ممکن نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔“

”دیکھو..... انہیں تصویروں کے بارے میں ابھی کچھ مت بتانا بلکہ کسی کو بھی نہ بتانا۔ یہ خود تمہارے لیے بہت اچھا ہے، یوں سمجھ لو کہ وہ تصویریں تمہاری انشورنس ہیں۔ اس دھمکی کے بعد یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ یہ لبا پکڑ ہے۔“

”ٹھیک ہے، لاؤ فون دو۔“ وہ بولا۔

اتنی دیر میں فون بند ہو چکا تھا لہذا خضر نے خود جمال صاحب کا نمبر ملایا۔

”تم کہاں غائب ہو مياں؟“ وہ سخت غصے میں تھے۔ ”میں نے تمہیں فوراً پہنچنے کو کہا تھا اور اس بات کو بھی ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا۔“

”سوری باس! ہم دراصل فرانک کی طرف چلے گئے تھے۔“

”کیا لینے گئے تھے تم لوگ وہاں؟ تم لوگ خود کو سمجھ کیا رہے ہو، جیمز بانڈ اور اگا تھا کرٹی۔ مياں تفتیش کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں جمال صاحب مگر آج ہمیں کہیں سے بھی کوئی درست جواب نہیں مل رہا ہے۔“

”اس کی وجہ تمہارا رویہ ہے، تم صحافی سے زیادہ پولیس والے بن گئے ہو..... اب فوراً آؤ دفتر۔“

خضر نے سر ہلاتے ہوئے فون بند کیا اور آٹھ نوکد کچھ کر مسکرایا۔

ان سے کافی پیچھے شد زور ٹرک موجود تھا۔ ڈرائیور کو کسی بہتر موقع کی تلاش تھی مگر سڑک پر ٹریفک کافی تھا۔

اس نے اپنی رفتار اور کم کر لی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ

لبو کا کھیل

دن کا اُجالا رات کے اندھیرے سے بے انگلیز ہو رہا تھا۔ خضر گاڑی چلاتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا۔ دن بھر کے واقعات کسی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر چل رہے تھے اور ان سے جنم لینے والے سوالات اسے الجھا رہے تھے۔ سب سے زیادہ حیران کن رویہ جمال صاحب کا تھا اور آمنہ..... آمنہ کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ اسے شروع سے ہی بہت اچھی لگتی تھی۔ درمیانی قد و قامت، سنہری چہرہ، دھکی آنکھیں، مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں پڑنے والا ڈھیل، جھکتے ہوئے مجبورے بال۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی کشش تھی اور آج وہ اس کے ساتھ ڈنر کرنے جانے والا تھا۔ گویا اس کا اچھا وقت شروع ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔

اب وہ اپنے اپارٹمنٹ سے دو تین میل کی دوری پر ہی تھا۔ اسے سڑک کا یہ حصہ بہت پسند تھا۔ دونوں طرف دور دور تک درخت ہی درخت تھے۔ درخت جو انسانوں کے لیے زندگی کی لویہ ہیں۔ کاش لوگ درختوں کی اہمیت سمجھ لیں تو موسموں کا تغیر زندگی کو لگنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس نے سوچا۔

وہ سڑک پر مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار جھٹکے نے گاڑی کو تیزی سے آگے کی جانب دھکیل دیا۔ خضر نے ہشمل اپنے سر کو ونڈ شیٹل سے ٹکرانے سے بچایا۔ وہ سیٹ بیلٹ لگانا بھول گیا تھا۔ افتاد پڑنے پر اس نے میکا کی انداز میں بیلٹ لگائی۔

”یہ..... یہ کیا مصیبت ہے.....؟“ اس نے پیچھے دیکھا۔ تھوڑی دور کسی ٹرک کی ہیڈ لائٹس اسے اپنے پیچھے آتے محسوس ہوئیں۔ خطرے کے احساس پر اس نے ایکسپریٹر پر اپنا ہیکر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے ٹرک اور کار کے درمیان فاصلہ بڑھا مگر اگلے ہی لمحے ٹرک نے دوبارہ کار کو ٹکرایا۔ اس بار مگر پہلے سے بہت زیادہ زوردار تھی۔ کار اچھل کر دوبارہ سڑک پر آئی۔ اسٹیئرنگ ڈھیل، بریکس کچھ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

تیسری لگنے لگنے گویا کار کو اچھاال ہی دیا تھا۔ وہ سڑک سے اتر کر درختوں، پتھروں، جھاڑیوں سے ٹکراتی تیزی سے اچھلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ خضر اسٹیئرنگ ڈھیل اور بریکس پر اپنی پوری طاقت صرف کر رہا تھا مگر سب کچھ اس کے قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ کار کسی رولر کو سڑک کے مانند آگے بڑھ رہی تھی۔

پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی

پیچھے ہٹا نہیں چاہتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آمنہ اس فیصلے میں اس کا ساتھ دے گی یا نہیں مگر وہ اس اسٹوری کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مکمل رپورٹ دیکھ کر جمال صاحب کا فیصلہ بدل جائے گا۔

چھٹی کے وقت وہ اور آمنہ ایک ساتھ دفتر سے نکلے تھے۔ ان دونوں کی گاڑیاں پارکنگ میں تھیں۔

”خضر! کیا جمال صاحب نے تم سے اس حوالے سے مزید کوئی بات کی.....؟“ گاڑی کے قریب پہنچ کر آمنہ نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ اب صرف ایک تاثراتی مضمون چاہتے ہیں۔“ خضر مایوسی سے بولا۔

”میں آج دوپہر کے بعد چائے بنانے کے لیے اٹھی تھی تو پچھلا دروازہ کھلا نظر آیا، میں اسے بند کرنے کی کوشش مگر جمال صاحب وہاں باہر کھڑے بڑی دھیمی آواز میں کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔“

”وہ کیا کہہ رہے تھے؟“

”میں پوری بات تو نہیں سن پائی مگر میں نے ایک جملہ پورا سنا تھا، وہ کسی سے کہہ رہے تھے کہ ”میں نے ان دونوں کو کنٹرول کر لیا ہے۔“

”تمہارے خیال میں، وہ ہمارے بارے میں بات کر رہے تھے؟“

”اور کس کے بارے میں کریں گے؟ جس طرح وہ ہلکی آواز میں چپ کر بات کر رہے تھے وہ ان کا انداز نہیں ہے۔ یہ سب بہت عجیب ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ خوف سا آ رہا ہے نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے؟“

”تم خوف زدہ ہو.....؟“ خضر نے حیرت سے پوچھا۔

”تھوڑی بہت..... کیا تم شام کو فری ہو، ہم آٹھ بجے کہیں کھانا ساتھ کھا سکتے ہیں اور اس سب پر بات بھی کریں گے۔“

خضر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ دفتر میں مغرور مشہور آمنہ سے خود کھانے کی دعوت دے رہی ہے۔

”کیوں نہیں ہم آٹھ بجے قابلٹی پر ملتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”ٹھیک ہے۔“ آمنہ نے جواب دیا اور پھر ان دونوں کی گاڑیاں مخالف سمتوں میں روانہ ہوئیں۔

شد زور ٹرک اب خضر کے پیچھے تھا۔

☆☆☆

کہیں اور نہ جاسکے۔ تمہاری حماقت کی وجہ سے اب ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔“ وہ غرایا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

آمنہ کافی دیر سے خضر کا انتظار کر رہی تھی۔ اس دوران وہ ایک کپ کافی اور فریج فرائز لے چکی تھی مگر خضر کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اس نے فون اٹھایا پھر کچھ سوچ کر واپس رکھ دیا۔ وہ پہلے ہی اسے تین کالز کر چکی تھی جن میں سے ایک بھی ریسپونڈ نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نہیں مصروف ہو گیا ہو مگر ایسی صورت میں بھی وہ اس کا فون ضرور اٹینڈ کرتا بلکہ ایسی صورت میں تو خود اسے فون کرنا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا۔ ”پھر کیا ہوا ہو گا، کہیں کوئی کسی بھی طرح اسے روکنا چاہتا ہو تو.....“ دھمکی والے اس خط کے الفاظ اسے یاد آگئے تھے۔ ”کہیں خضر کے ساتھ کچھ غلط تو نہیں ہو گیا؟“ اب اس کے لیے ریسٹورنٹ میں بیٹھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ پیسے میز پر رکھ کر باہر نکل آئی۔

خوف بری طرح اس کے اعصاب پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ اس نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی مشکوک فرد اسے اپنی طرف متوجہ نظر نہیں آیا۔ وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی اور اگلے ہی لمحے اس کی اسپورٹس کار خضر کے گھر کی جانب جانے والے راستے پر تھی۔ ”اس نے مجھے کال کیوں نہیں کی؟“ یہ سوال اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ اب خضر کے گھر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ درختوں سے بھری سڑک کی طرف مڑتے ہی اسے پولیس کی گاڑی اور گاڑی اٹھانے والا ٹرک نظر آیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کہیں خضر کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟ کسی نے اسے مار تو نہیں دیا؟ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ پولیس کار میں انیس ایچ او عبدال حبیب موجود تھا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

”اوہ آپ.....“ وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ شاید آپ ہماری کچھ مدد کر سکیں۔“

”آپ کا کیا مطلب ہے؟“ آمنہ نے اسے گھورا۔

”مجھے یہاں سے میرے ایک سب انسپکٹر نے اطلاع دی کہ ایک کار جگل میں درختوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی ہے۔ میں اسے ہی دیکھنے یہاں آیا ہوں، وہ کار خضر کی ہے۔“ آمنہ نے سانس روک لی۔ وہ اپنی پریشانی کا اظہار

کار بھی رک گئی۔ درختوں نے ایک بار پھر انسان کو بچا لیا تھا۔ گاڑی دو بڑے درختوں کے درمیان پھنس گئی تھی۔ ونڈ شیڈ سے باہر تھوڑے فاصلے پر چھوٹی سی جھیل نشتر آ رہی تھی۔ خضر کا سر اسٹیرنگ پر پڑا تھا، اس کے ماتھے سے خون کی ایک لکیر سی نکل کر اس کے گالوں تک آ پہنچی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ اب بھی گیز پر تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا جسم بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اسما عیمل شیر محمد اپنی طویل و عریض قیمتی اسٹڈی میں بیٹھا ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اسٹڈی میں تمام فرنیچر شیشم کی خاص لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ ہال نما کمرے کی تمام دیواریں کتابوں کے شیلف سے سجی تھیں جن میں دنیا کی نادر کتابوں کے ڈھیر موجود تھے۔ یوں تو اس کا پورا محل ہی دیکھنے کے قابل تھا۔ اسے نادر اور لائٹنک چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا مگر کتابوں سے اسے عشق تھا۔ اس کے پاس ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں جن میں سے اکثر اس نے پڑھ رکھی تھیں۔ مگر اس وقت اس کا دھیان سامنے موجود کتاب پر نہیں تھا۔ وہ اپنے علاقے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ اس کا شہر تھا۔ یہاں سب کچھ اس کی مشکا کے مطابق ہی ہوتا تھا۔ وہ برسوں سے یہاں کا نظام چلا رہا تھا اور اب جو کچھ بھی غلط ہوا تھا اسے ہی اس کو ٹھیک بھی کرنا تھا مگر..... اس نے دانت پیچھے کر سوچا۔ ”وہ احقر رپورٹر اور اس کی ساتھی اس کا وقت ضائع کر رہے تھے اور اسے وقت ضائع کرنے والے لوگ پسند نہیں تھے۔ وہ کسی کو اپنے کاموں میں دخل دینے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی غلط مثال قائم ہوا اسے اس راستے کو ہی بند کر دینا تھا۔“

اس نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور فون اٹھایا۔ عین اسی لمحے فون بج اٹھا۔ دوسری طرف موجود شخص کی گھبراہٹ ہوئی آواز اس کے لیے ایک اور بری خبر لائی تھی۔ ”سر..... خضر غائب ہو گیا ہے۔“

”غائب ہو گیا، کہاں غائب ہو گیا؟ اور وہ لڑکی.....“

سر اس کی کار سڑک سے اتر کر جھیل کے پاس درختوں میں جا کر پھنس گئی تھی۔ میں وہاں پہنچا تو وہ کار میں نہیں تھا۔ میں نے ارد گرد دیکھا مگر اس کا سراغ نہیں ملا، وہ لڑکی اب بھی قابلی پر اس کا انتظار کر رہی ہے۔ کیا مجھے اس کے پیچھے جانا ہے؟“

”نہیں، خضر کے بغیر وہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ تم اسے ڈھونڈو اور جب وہ مل جائے تو اس بات کو یقینی بناد کہ وہ

لو کا کھیل

کار کو نگر بار کر سڑک سے اتار دیا تھا۔ اس کی کار درختوں میں پھنس گئی تھی۔ وہ کار سے اتر بھی گیا تھا۔ اسے وہاں ایک شخص نظر آیا تھا، اس شخص نے قریب آ کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھا تھا۔ حضور کو اپنی گردن میں خیر چمین کا احساس ہوا تھا، اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ یقیناً اسے بے ہوشی کا انجکشن دیا گیا تھا اور نہ جانے وہ کب سے یہاں اس طرح پڑا تھا۔

”آمنہ نے نہ جانے اس کا کتنا انتظار کیا ہوگا اور پتا نہیں اسے یا پانی کو لوگوں میں سے کسی کو اس کی گمشدگی کی خبر ملی بھی ہوگی یا نہیں۔“ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہار فلوں والی چرر کی آواز کے ساتھ کوئی دروازہ کھلا اور ایک شخص اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے چہرے پر ماسک پہن رکھا تھا۔

”تم حضور احمد ہوتا؟“ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔
”یہ سب کیا ہے، مجھے یہاں اس طرح کیوں لایا گیا ہے؟“

”تم سے جو پوچھا جا رہا ہے، پلیز صرف اس کا جواب دو۔“

”ہاں میں ہی حضور احمد ہوں، اب تم بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”حضور سکون سے میرے سوال کا جواب دو، اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔“

”کیا تم نہیں جانتے کہ انخوا ایک جرم ہے اور تم اس کے لیے جیل جاسکتے ہو۔“ حضور نے پوچھا۔

”حضور میرے پاس فالتو کی گیدڑ بھیکیاں سننے کا وقت نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ تم کچھ نہیں کر پاؤ گے۔ لہذا سکون سے میری بات سنو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔“

اس بار وہ تھوڑے سخت لہجے میں گویا ہوا۔ حضور چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”او کے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”یہ کہ تم کچھ نہ کرو۔ اگر تم ان لڑکوں کی موت کے بارے میں تحقیقات کرتے رہے تو اس سے بہت سے لوگ ناراض ہو سکتے ہیں۔ اس سے خود تمہاری سلامتی کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”اور اگر میں انکار کر دوں.....؟“ حضور نے پوچھا۔

”تم اتنے احمق نہیں ہو سکتے اور ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ تم اپنی محنت کو بھول جاؤ، تم چند ماہ بعد اس کہانی کو چھاپ سکتے ہو۔“

اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”کیا آپ نے وہاں تک جا کر دیکھا ہے؟“
”ہاں۔“

”تو پھر.....؟“
”آپ کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں؟“

”یہی کہ حضور کہاں ہے؟ کیا وہ زخمی ہوا ہے؟“
”میں جب وہاں پہنچا تو یہاں صرف کار تھی۔“

”اس بات کا کیا مطلب ہے کہ وہاں صرف کار تھی؟“ آمنہ جھنجھلا کر بولی۔ ”حضور کہاں غائب ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ ایس ایچ اے اے نے کندھے اچکا کر کہا۔ ”البتہ طے ہے کہ اس حادثے میں کوئی دوسری کار موجود نہیں تھی۔ نہ جانے کس طرح اس کی کار بے قابو ہوئی اور سڑک سے اتر گئی۔“

”آپ کے خیال میں وہ زندہ ہوگا؟“ آمنہ نے لرزے دل کے ساتھ سوال کیا۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کار کی حالت دیکھ کر یہ کہنا کہ وہ اتر کر ٹھٹھا ہوا کہیں چلا گیا ہو، مشکل ہے مگر ہم دیکھ رہے ہیں۔“

”او کے، آپ کو جیسے ہی کوئی خبر ملے پلیز مجھے بھی بتائیے گا۔“ آمنہ اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولی۔

”ضرور۔“ آمنہ اس کا جواب سننے سے قبل ہی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ حضور ایک محتاط ڈرائیور رہا ہے اور اسے یقین تھا کہ یہ صرف ایک کار کا حادثہ نہیں تھا یقیناً اس سے زیادہ کچھ ہوا تھا۔

مگر اس وقت وہ اس کے بارے میں بھی سوچ نہیں پا رہی تھی اس کے ذہن کی سوئی ایک ہی سوال پر انگی ہوئی تھی۔ ”حضور آخر کہاں تھا؟“

☆☆☆

حضور کو ہوش آیا تو پہلا احساس سر میں شدید درد کا تھا مگر اگلے ہی لمحے درد کو بھول گیا تھا۔

وہ اس وقت ایک کرسی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ کمرے میں موجود واحد بلب اس کے چہرے سے تھوڑے سے فاصلے پر جگہ کار تھا۔ اس کی روشنی اسے اندھا کیے دے ہی تھی۔ کمرے میں عجیب سی بو سی ہوئی تھی۔

”میں کہاں ہوں؟“ وہ بڑبڑایا۔

لمحے بھر میں اسے وہ ٹرک یاد آ گیا تھا جس نے اس کی

”تم نے یہ ساری محنت مجھے صرف یہ سمجھانے کے لیے کی ہے۔“ خضر نے حیرت سے پوچھا۔
 ”تم میری محنت کو بھول جاؤ۔ تمہارا کام میری بات کو ماننا ہے، سمجھ گئے تم.....؟“
 ”ہاں۔“

”بہترین، مجھے خوشی ہے کہ تم نے سمجھ داری کہ ثبوت دیا ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی نقاب پوش شخص نے خضر کی گردن پر ہاتھ پھیرا، اس کے ہاتھ میں موجود سوئی نے خضر کو لمبے بھر میں ہوش و حواس سے یکجا نہ کر دیا۔

☆☆☆

الارم کی تیز آواز بالآخر خضر کو جگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ حواس بحال ہوتے ہی اسے ماسک والا شخص یاد آیا اور وہ ایک جھکے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے گھروار اپنے بستر پر تھا۔

”تو کیا رات کے واقعات ایک بُرا خواب تھے۔“ اس نے گڑبڑا کر سوچا۔ کار کے حادثے میں اسے سر پر چوٹ لگی تھی۔ اس نے بالوں کے درمیان ہاتھ پھیرا وہ چوٹ وہاں موجود تھی۔ وہ اٹھ کر تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا۔ نیچے اس کی کار بھی موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سب خواب نہیں تھا، اسے اٹھا کر لے جانے والے اسے بحفاظت اس کے گھر پہنچا گئے تھے۔

وہ اس گورکھ دھندے کے بارے میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا پھر اسے آمنہ کا خیال آیا اور اس نے اس کا نمبر ملایا۔
 ”خضر..... کیا یہ تم ہو.....؟“ آمنہ نے پہلی کھٹی پر فون ریسیو کر لیا تھا۔

”ہاں آمنہ، مجھے کل کے لیے افسوس ہے۔“
 ”کل کے لیے افسوس..... میں تو خدا کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ تم زندہ ہو۔ جب کل مجھے پتا چلا کہ تمہاری کار تباہ ہو گئی، میں تب سے صرف یہی دعا کر رہی تھی۔“
 ”آمنہ، کیا آج مجھے دفتر تک لفٹ مل جائے گی؟“
 وہ بولا۔

”بالکل، میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“ آمنہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

فون رکھ کر وہ تیزی سے تیار ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آمنہ وقت کی بہت پابند ہے اور اگر اس نے پندرہ منٹ کہے ہیں تو پندرہ حویں منٹ پر وہ اس کے سامنے ہوگی۔ فون اور چابیاں لے کر وہ کمرے سے نکلے ہی والا تھا تب اس کی

نظر ڈائٹنگ ٹیبل پر رکھے لفافے پر پڑی، اس پر اس کا نام لکھا تھا۔

اس نے لفافہ اٹھایا عین اسی وقت دروازے کی کھٹی بجی۔ اس نے لفافہ اپنی جیب میں رکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آمنہ دروازے پر موجود تھی۔

”مطلب یہ کہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی اندازہ نہیں ہو سکا۔“ آمنہ اس کی داستان سننے کے بعد بولی۔

خضر جواب میں ایک لمحہ خاموش رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے آمنہ کو اس خط کے بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں پھر اس کے دل نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اس پر ہی اعتماد کر سکتا ہے۔

”ابھی مجھے اپنے ڈریسر پر سے یہ خط ملا ہے۔“ اس نے جیب سے لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً اسے ان ہی لوگوں نے رکھا ہوگا۔“

”تو پھر اسے کھول کر پڑھو.....“ آمنہ بولی۔
 خضر نے خط کھولا اور بے آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔
 ”خضر صاحب!

ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ اس سارے معاملے میں آپ کو کچھ تکلیف تو ضرور پہنچی ہے اور آپ کے ذہن میں بہت سے سوالات ہوں گے مگر اس وقت آپ کو ان کے جواب نہیں دیے جاسکتے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہماری کل کی ملاقات کے بارے میں کسی سے گفتگو نہ کریں۔ اس حوالے سے کوئی کہانی تیار کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اس وقت آپ کے لیے بہتر یہ ہے کہ آپ چپ چاپ اپنا کام کریں جب وقت آئے گا ہم آپ کو خود تمام معلومات فراہم کر دیں گے اور اس دن آپ پر اسے کہیں بھی چھاپنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اگر آپ نے ہماری اس درخواست کے خلاف کام کیا تو ہمارے پاس اپنی بات منوانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں جو یقیناً آپ کو پسند نہیں آئیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس خط یا رات کے واقعات کے بارے میں جمل، آمنہ یا کسی سے بھی ذکر نہیں کریں گے..... یہی سب کے لیے بہتر ہوگا۔“

”انہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“ آمنہ نے پوچھا۔
 ”معلوم نہیں مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ میں دو کام کر چکا ہوں یعنی تمہیں ساری تفصیل بھی بتا دی اور خط بھی پڑھوا دیا۔“ وہ بڑبڑایا۔
 ”فکر مت کرو، میں کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گی.....“

اس کے قریب آ کر بولا۔ ”خضر صاحب آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔“

☆☆☆

خضر کے لیے مشکل کا آغاز پیر سے زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔ ابھی صبح کے دس ہی بجے تھے اور وہ گرفتار ہو کر تھانے کے لاک آپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس پر نشے کی حالت میں گاڑی چلانے اور حادثے کا الزام تھا اور اب وہ لاک آپ میں تنہا بیٹھا جمال صاحب اور آمنہ کی مدد کا منتظر تھا۔ ذرا سی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔ وہ سختی سی قامت والا عجیب و غریب شخص اس سے کچھ فاصلے پر گندی زمین پر بیٹھا خود بھی گندی کا حصہ لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ دانت پیلے تھے اور چہرہ شاید مہینوں سے نہیں دھلا تھا۔ وہ شاید کافی دیر سے خضر کو دیکھ رہا تھا پھر وہ پیٹھے پیٹھے اس کی جانب کھسک آیا۔

”میں رانا ہوں۔“ وہ اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ خضر نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھما مگر وہ کچھ بولا نہیں تھا۔

”تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں پاگل ہوں، ہے نا؟ میں پاگل نظر بھی آتا ہوں، شاید ہوں بھی مگر میں یہ جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں ہو۔“

”اچھا ذرا بتاؤ مجھے بھی، میں یہاں کیوں ہوں؟“ خضر کو وہ پاگل ہی لگا تھا۔

”کیونکہ تم اصولوں کے مطابق نہیں چل رہے تھے۔“

”ظاہری بات ہے اگر میں اصولوں کے مطابق چلتا تو لاک آپ میں کیوں ہوتا، اس میں کیا خاص بات ہے؟“ خضر بولا۔

”نہیں، تم میری بات سمجھے نہیں۔“ وہ بولا۔

”کیسی بات۔۔۔؟“

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے اصولوں کے مطابق نہیں چل رہے ہو، خضر صاحب یہاں بہت طاقتور لوگوں کا راج ہے، جب تک تم ان کے راز نہیں جان جاتے وہ بہت اچھے لگتے ہیں مگر جب انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تم انہیں جان گئے ہو تو پھر وہ تمہیں برا دیکر دیتے ہیں۔“

”پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟“

رانانے اس کا سوال نظر انداز کر دیا تھا۔ ”یہی سب میرے ساتھ ہو چکا ہے۔“ وہ اپنی رو میں کہے جا رہا تھا۔

”یہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے؟“ خضر اس کا

اللہ نہ کرے اگر کچھ برا نہ ہوا تب تک۔“

”ارے آمنہ مجھے کیا ہونا ہے۔۔۔۔۔“

کیا تم پاگل ہو، کل تم قتل ہو سکتے تھے۔ نہ جانے یہ کوئی سیکرٹ ایجنسی کے لوگ ہیں یا کوئی اور، اور پھر جب تمہاری کاردرختوں سے ٹکرا کر تباہ ہوئی تب بھی۔۔۔۔۔ اللہ نے تمہاری جان بچائی ہے۔“

”ایک منٹ۔۔۔۔۔ تمہیں یہ کس نے کہا کہ میری کار تباہ ہو چکی ہے۔“

”ایس ایچ او عبدل حبیب نے۔۔۔۔۔“

”مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری کار کو نقصان تو ضرور پہنچا تھا مگر وہ ٹھیک ٹھاک حالت میں مگر اس نے تم سے جھوٹ کیوں بولا؟“ خضر بولا۔

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔“ آمنہ نے جواب دیا۔ ”اس وقت کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا۔“

”آمنہ مجھے تو یہ لگ رہا ہے کہ ہم ابھی ان اموات کے حوالے سے وہیں کے وہیں ہیں مگر جب اتنے لوگ اتنی شدت سے ہمارے پیچھے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے ہم انجانے میں ان کے کسی راز تک پہنچ گئے ہیں اور میں اب پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا۔ شاید یہ اسٹوری مجھے صحافت میں وہاں لے جائے جو میری منزل ہے۔ میں تمہیں اس خطرناک راستے پر ساتھ چلنے کو کہیں کہہ سکتا۔۔۔۔۔“

”بس۔“ آمنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میری گاڑی کے بغیر تم فی الحال کسی منزل تک نہیں پہنچ سکتے مسٹر۔ میں تمہارے ساتھ ہوں مگر ہمیں سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں اب جمال صاحب کے حکم کے مطابق تاثراتی مضمون لکھوں گا، اس کو رے نیچے میں اپنا کام بھی کروں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر اب دفتر چلیں۔“

”بالکل میڈم۔۔۔۔۔“ خضر بولا۔

وہ اخبار کے دفتر پہنچے تو پارکنگ کے باہر پولیس موبائل موجود تھی۔ ایس ایچ او اور دو انسپکٹر اس کے پاس کھڑے تھے۔ آمنہ کی کار کو اتادیکھ کر انہوں نے ریڈیو پر کسی سے گفتگو شروع کر دی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ آمنہ نے کار پارکنگ کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں مگر کچھ گڑبڑ ہے۔“ خضر بولا۔

خضر ابھی گاڑی سے اترا ابھی نہیں تھا کہ ایس ایچ او

جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”ہاں، میں ایک اچھا برنس میں تھا مگر جیسے ہی مجھے ان کا راز معلوم ہوا میری زندگی ہی بدل گئی۔“
”واقعی؟ اور وہ راز کیا ہے؟“

”کیا تم میری بات سمجھ نہیں رہے۔ جب تم کسی راز کو جان جاؤ گے، تو پھر اسے اپنے ذہن سے نہیں نکال سکو گے۔ انہیں اگر اس بات کا علم ہو گیا تو وہ تمہیں میرے جیسا بنا دیں گے یا اگر تم خوش قسمت ہوئے تو تمہیں مار ڈالیں گے۔“
خضر خاموشی سے رانا کا چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی باتیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔

”رانا کیا باتیں بنا رہے ہو تم؟“ ایس ایچ او کی آواز پر وہ بدک کر اپنی جگہ جا بیٹھا تھا۔ ”پہلے خضر صاحب آپ کے پاس نے آپ کی ضمانت کرا دی ہے۔“ اس بار وہ خضر سے مخاطب تھا۔

خضر نے لاک آپ سے باہر آکر رانا کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

”وہ تمہاری نگرانی کر رہے ہیں، محتاط رہو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ خضر ایک لمحے بے بسی سے اسے دیکھتا رہا پھر باہر نکل آیا۔ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ رانا ایچ بول رہا تھا یا یہ بھی اس کے لیے کوئی حتمی تھی۔ جو بھی تھا وہ اسے بہت بے سکون کر گیا تھا۔

☆☆☆

”آخر تم سکون سے بیٹھ کیوں نہیں سکتے، نئے میں گاڑی چلانا اور خود کو حادثوں کا شکار کرنا..... یہ سب تم کیا کر رہے ہو؟“ جمال صاحب گاڑی میں بیٹھتے ہی پھٹ پڑے تھے۔

”آپ جانتے ہیں میں شراب نہیں پیتا اور کل جو ہوا تھا وہ مجھے خاموش کرانے کی کوشش تھی۔“ خضر بولا۔

”اب مجھے یہ کہاں ان مت سناؤ، بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں تمہیں کل سے معطل کر رہا ہوں، میرے اگلے حکم تک تم صرف دفتر کے اندر کام کرو گے۔ رپورٹنگ یا فیلڈ کا کوئی کام نہیں کرو گے، سمجھے؟“

خضر کو یوں لگ رہا تھا جیسے جمال صاحب غصے کی اداکاری کر رہے ہوں۔ وہ ایسا کیوں کر رہے تھے یہ ایک اور معما تھا۔

دفتر میں داخل ہو کر نیوز روم کے سامنے انہوں نے ایک بار بے آواز بلند خضر کی معطلی کا اعلان کیا اور اسے کمرے میں آنے کا کہہ کر اندر چلے گئے۔

خضر کے کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد جمال صاحب نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر میز پر جھک گئے اور خضر کو بھی قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سرکشی نما آواز میں بول رہے تھے۔

”خضر خدا کے لیے تم اس اسٹوری سے الگ ہو جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے آسان نہیں ہے، کسی رپورٹر کے لیے نہیں ہوتا مگر اس وقت یہ تمہاری سلامتی کے لیے ضروری ہے۔“

”میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں، کیا یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ میں خبر کی صورت میں آپ کو لاکر دوں؟“ خضر بھی اسی انداز میں بولا۔

”نہیں، مجھے اس وقت اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس معاملے میں لوگوں سے ملنا، سوالات کرنا سب چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے مگر آپ نہیں جانتے کہ میں نے ان لاشوں کو کس حال میں دیکھا ہے۔“

”مجھے مت بتاؤ خضر، میں اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔“ جمال صاحب بولے۔

”کیوں آپ ایک ماٹھے ہوئے ایڈیٹر ہیں، کیا آپ کے لیے سچ کی کوئی قیمت نہیں۔“

”بعض اوقات سچ بہت مہنگا پڑتا ہے، تم آج کے بعد سے اس پکڑے باہر نکل رہے ہو..... بولو میاں.....؟“

”ٹھیک ہے جمال صاحب.....“

”بس تو اب جا کر وہ مضمون مکمل کرو اور دفتر میں بھی اس حوالے سے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا۔“ وہ بولے۔

خضر ان کی بات سمجھ گیا تھا۔ گفتگو کے اختتام پر وہ مایوس اور غصے کی اداکاری کرتا ہوا ان کے کمرے سے باہر آیا تھا اور اپنی نشست پر جا بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا؟ کیا تم نے جمال صاحب کو رات کے واقعے کے بارے میں بتایا، وہ خط دکھایا انہیں؟“ چند لمحوں بعد آمنہ اس کے سامنے تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ آمنہ اس وقت یہ باتیں نہ کرے مگر وہ اپنی رو میں کہے جاری تھی۔ ”انہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا اصل میں انہیں حقیقت کا علم نہیں ہے۔ یہ بہترین موقع ہے تم انہیں وہ خط دکھاؤ تاکہ انہیں تمہاری بات پر یقین آجائے اور لاشوں کی وہ تصویریں بھی جو ہمارا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔“

”آمنہ ہم اس پر پلچ پر بات کریں گے۔“ بالآخر خضر

یوم آزادی کی مناسبت سے خصوصی تحریریں لیے اگست 2017ء کا جشن آزادی نمبر

پاکینہ



شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ماہرانہ قلم کی جولانیاں..... قسط وار ناول کی صورت

سحر ساجد نے من جاں بازم کا کیا انشیں اختتام

سیما رضا ردا اپنے مٹی ناول..... ہم کو مٹ بدنام کیا..... کو ایک دلکش انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے

14 اگست کی مناسبت سے ناہید سلطانہ اختر، دردانہ نوشین خان،

منشا محسن علی اور نرمین سرہیو کی خصوصی تحریریں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے روح پرور مضامین

نامور مزاح نگاروں کے شہ پاروں سے انتخاب..... فکاہیہ کالم کی صورت

وہ آنے بزم میں.....

نرہت اصغر سے مصنفہ عذرا آفتاب

کی بڑ لطف باتیں

اس کے علاوہ

طیبہ عنصر مغل، فرح بھٹو، غزالہ عزیز، ہاجرہ ریحان،

افشین جہاں آرا کی خوب صورت کہانیاں

دیباغہ میں بسنے والے اپنا یوم آزادی کیسے مناتے ہیں۔ یہ پڑھیے شائستہ زریں کے خصوصی سروے میں.....

اس کے ساتھ ساتھ جو کن شاعری خوش ڈاکٹر پکوان قابل غور ترانے اور دلچسپ بیانیہ مستقل سلسلے صرف آپ کے ذوق کے لیے

مصیبت بن سکتی ہیں۔“ خضر بولا۔ ”مگر تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہو آمنہ.....“
”مجھے ایک خیال پریشان کر رہا ہے خضر۔“ وہ بمشکل بولی۔

”کیسا خیال.....؟“ خضر نے سینڈ وچ کا آخری لقمہ کھاتے ہوئے پوچھا۔

”جو لوگ اتنے خطرناک ہیں کہ ایک اخبار کے پورے دفتر کو ڈب کر سکتے ہیں تو پھر کیا انہوں نے یہاں تمہارے گھر پر تمہیں چھوڑتے ہوئے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا ہو گا؟ اگر میرا شک درست ہے تو ہم واقعی بہت بڑی مصیبت میں پڑ چکے ہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

خضر اس کی بات سن کر ایک لمحے کو سن سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جلوں پر جتنا غور کرتا جا رہا تھا اسے اس بات میں حقیقت نظر آرہی تھی۔ یہ سو فیصد ممکن تھا۔

وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بیرونی سٹ کھلنے والی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس سے بیٹے ہی والا تھا کہ اسے سڑک پر ایک سیاہ دین رکئی نظر آئی۔ دین کی اگلی شستوں پر نظر پڑتے ہی اس کی ریزہ کی ہڈی میں سرسراہٹ شروع ہو گئی تھی۔ وہاں بیٹھے دونوں افراد کے چہروں پر وہی ماسک موجود تھا جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

☆☆☆

”آمنہ اٹھو۔“ وہ بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور بولا۔
وہ دونوں پچھلے دروازے سے دوڑتے ہوئے باہر نکلے اور ایبارمنٹ کی دوسری جانب پہنچے جہاں گیارہوں کی طرف مڑ گئے۔ خضر نے ایک گیارہ کا تالا کھول کر کوٹنے میں کھڑی موٹر سائیکل کو باہر نکالا۔

”یہ..... یہ کیا ہے؟“ آمنہ نے پوچھا۔
”یہ میرا پرانا شوق اور اس وقت ہماری جان بچانے کا واحد کلٹ ہے، جلدی تھو.....“

آمنہ کے بیٹے ہی موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔ خضر کا اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک شخص عقیبی طرف سے داخل ہوگا۔ اسی لیے اس نے عمارت کے گرد گھوم کر دوسری جانب سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس علاقے سے بخوبی واقف تھا اور اگر وہ یہاں سے نکل جاتے تو پھر وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں چھپ کر ان حملہ آوروں سے جان بچا سکتے تھے۔ دس منٹ بعد وہ محل سڑک پر تھے۔

کو اس کی بات کا کافی ہی بڑی تھی۔ جمال صاحب کی گفتگو کا انداز اور ان کا خوف خضر کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ آمنہ کو بھی اس حوالے سے خبردار کر دے گا۔ وہ اسے کسی پریشانی میں پڑتا نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ اس راہ میں صرف خطرات ہی خطرات تھے۔

صبح کا باقی وقت تاثراتی مضمون کی تیاری میں گزر گیا تھا اب چونکہ وہ ”گراؤنڈ“ ہو چکا تھا۔ اس نے تمام تیاری ٹیلی فون پر ہی کی تھی۔ مرنے والے لڑکوں کے والدین، دوستوں، اسکول ٹیچرز، کوچر اور ساتھیوں سے انٹرویو اور ان کی رائے لی گئی تھی۔ ان سب کو ملا کر ایک ایڈیشن تیار ہو گیا تھا۔

وہ لچ کے لیے چند لمحوں کی تاخیر سے باہر نکلا تھا۔ آمنہ پہلے سے ہی گاڑی میں اس کی منتظر تھی۔
”لچ کہاں کرنا ہے؟“

”میں آج تمہیں اپنا خصوصی چکن سلاد کھلانے والا ہوں۔“ خضر خوش دلی سے بولا۔
”یعنی خضر چکن جانا ہے۔“ وہ بھی ہنسی۔

”بالکل یوں تو ہم کہیں بھی لچ کر سکتے ہیں مگر وہاں ہم موجودہ صورت حال پر بات نہیں کر پائیں گے اس لیے آج خضر چکن ہی سہی۔“
”میں سمجھتی ہوں۔“ آمنہ نے جواب دیا۔

خضر کے اپارٹمنٹ پہنچ کر پہلے انہوں نے مل کر سینڈ وچز اور سلاد بنائے۔ کھانے کے دوران خضر نے آمنہ کو جمال صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔
”تو تمہارا مطلب ہے کہ دفتر میں کوئی بات کرنا محفوظ نہیں ہے؟“ آمنہ نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے یہی اندازہ ہوا ہے۔“
”اور ان لوگوں نے اس خط میں تمہیں واضح طور پر کہا تھا کہ تم کوئی بھی بات مجھے یا جمال صاحب کو بھی نہیں بتاؤ گے، دوسری صورت میں وہ تمہیں سخت سزا دیں گے؟“

”ہاں، مگر تم یہ باتیں کیوں دہرا رہی ہو؟“
”اور میں نے اپنی حماقت میں تصویروں کا ذکر بھی کر دیا۔“ آمنہ کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ ترقی ہوتا جا رہا تھا۔

”ہاں میں تمہیں اس سے روک ہی رہا تھا۔ ہم نے مردہ خانے میں ان لاشوں کی تصاویر یا ڈوبنا ہی تو جمال صاحب بھی نہیں جانتے اور اس کی خبر کسی کو ملنی بھی نہیں چاہیے۔ موجودہ حالات میں وہ ہمارے لیے اٹھو لٹس نہیں

لبو کا کھیل

دونوں کی جان خطرے میں ہے۔ اسے یقین تھا کہ احمد جیسے ہی یہ میسج دیکھے گا حرکت میں آجائے گا مگر فی الحال اس کا فون بند جا رہا تھا۔

خطرہ صرف یہ تھا کہ اگر وہ جلد اس پیغام کو نہ دیکھ پایا تو شاید اس کے بعد ان دونوں کو اس کی مدد کا فائدہ نہ ہو سکے۔ وہ بدترین حالات کا شکار تو تھے ہی مگر خطر کو اس جگہ پر عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کسی غلط جگہ آ گیا ہو۔ بالآخر وہ کھڑا ہو گیا۔

”مگر ہم جاگیں گے کہاں؟“ آمنہ نے پوچھا۔
”آمنہ یہاں سے تھوڑا پیچھے ”صحت مند“ ہے۔“ وہ

بولی۔

”ہاں، ہاں منسٹر صاحب کی فیکٹری، آدھا شہر وہیں تو ملازمت کرتا ہے۔“ آمنہ نے کہا۔

”میں نے اس پر کئی بار بیچہ بنایا ہے، اس کے ارد گرد جنگل نما درخت ہیں جو ادارے نے خود اگائے ہیں اور پھر نہایت خوب صورت لینڈ اسکیپنگ بھی کی گئی ہے۔ ہم مدد آنے تک وہاں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بالکل کھلی جگہ ہے۔ یہاں ہمیں نشانہ بنانا اور پھر ٹھکانے لگانا دونوں ہی بہت آسان ہے یوں بھی اس شہر کے لوگ تو ایک رات میں تین تین نوجوانوں کی پراسرار موت پر بھی نہیں چوکتے تو ہم جیسے بے چارے صحابیوں کو کون گھاس ڈالے گا۔“ وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ وہ فیکٹری کے اطراف میں پہنچے تو ہر طرف سناٹا سا تھا۔ انہوں نے درختوں کے درمیان جھانپوں میں موٹر سائیکل کو چھپایا اور فیکٹری کی طرف بڑھے۔ خطرے کے پلان کے مطابق انہیں داہنی طرف لینڈ اسکیپنگ سے ملحق علاقے میں چھپنے کی جگہ مل سکتی تھی اور وہ اسی پلان پر کام کر رہے تھے مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ تدبیر کند بندہ کھنڈر پر کند خندہ تو عین اس وقت جب وہ داہنے پلاٹ کے باہر پہنچ گئے تھے فیکٹری میں جیسے ایمر جنسی لاگو ہو گئی۔ کئی سٹاک کارڈز باہر نکل آئے اور ایک دم تلاشی مہم شروع ہو گئی تھی۔

”..... کیا ہو رہا ہے؟“ آمنہ نے سرگوشی کی۔
”دشش، معلوم نہیں لیکن اب ہمیں پلان تبدیل کرنا پڑے گا۔“ خطرہ آواز دبا کر بولا۔ ”ان کی نظر میں آئے بغیر اب اس طرف نہیں جایا جاسکتا۔“
”پھر؟“

”ہمیں اب کوریڈر میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہاں ہمیں کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے گی۔“

”اب کیا کرتا ہے؟“ آمنہ نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مجھے ایک ایسی جگہ کا علم ہے جہاں یہ ہمیں نہیں آموڈ سکیں گے۔“ خضر بولا۔

”کہاں؟“

”سمورا۔“

”سمورا؟ وہ جہاں لوگ موٹر سائیکل ریس کرتے ہیں؟“

”ہاں مگر اس وقت وہاں شاید کوئی نہیں ہوگا۔“ خضر بولا۔

چند لمحوں میں وہ سمورا پہنچ گئے تھے وہاں غار نما جگہیں بنا کر روڈ سائڈ ڈھابے بنائے گئے تھے جو شام ڈھلے چلتے تھے۔ خضر نے ایک ڈھابے کی آڑ میں موٹر سائیکل روک کر آمنہ کو اترنے میں مدد دی۔ اس کے لیے موٹر سائیکل کی اس طرف کی سواری کا پھیلا موقع تھا۔ وہ بایک سے اترنے کے بعد بھی دو منٹ تک کا پتہ ہی نہیں دیتی تھی۔
”اب..... اب ہم کیا کریں گے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ہم تھوڑی دیر بیٹھیں رہیں گے اور اس کے بعد شہر واپس جاگیں گے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم جمال صاحب کو کال کر لیں۔“

”یہ تم کرنا، وہ تمہیں فوراً نوکری سے نکال دیں گے..... کیونکہ وہ یہی سمجھیں گے کہ تم وہی کچھ کر رہے ہو جس کے لیے انہوں نے تمہیں روکا تھا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، کچھ اور سوچتے ہیں۔“ خضر زمین پر بیٹھے ہوئے بولا۔ دس منٹ کی ذہنی مشق کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تھے۔ ان حالات میں عموماً پولیس جائے پناہ ہوتی ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ ایسے میں جمال صاحب یا کوئی بھی ان کی سلامتی کا ضامن نہیں ہو سکتا تھا۔

”تم نے کل کہا تھا کہ تمہارا کوئی دوست یہاں آنے والا ہے اور وہ ایک بڑے چمپل پر کام کرتا ہے، کیا وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا؟“ آمنہ نے پوچھا۔

عام حالات میں خضر، احمد سے مدد لینا شاید پسند نہیں کرتا مگر اس وقت اس کے پاس انتخاب کے زیادہ مواقع نہیں تھے اس لیے اس نے مختصر الفاظ میں اپنے حالات لکھ کر احمد کو ایس ایم کر دیا تھا۔ خضر نے اسے کسی حکومتی ایجنسی سے رابطہ کرنے کو کہا تھا اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان

”یہ خطرناک ہوگا.....“ آمنہ کے جواب پر خضر اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس سوچنے سمجھنے اور مشورہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ خضر نے آنکھیں بند کر کے اللہ سے مدد مانگی۔ آمنہ کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے کوریڈور کے اندر دوڑ لگا دی۔ چھوٹے سے کوریڈور کے ساتھ ہی ایک وسیع و عریض ویرہاؤںس ملحق تھا۔ اندر لمبی سی روشنی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف سامان کے بڑے چھوٹے ڈبوں کا ڈھیر تھا۔ باہر سے لوگوں کے بولنے کی تیز آوازیں وہ صاف سن پارہے تھے جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ کسی بھی وقت اندر آ سکتے تھے۔ خضر نے چاروں جانب دیکھا۔ ڈبوں کے ڈھیر کے پیچھے وہ چھپ سکتے تھے مگر وہاں سے انہیں ڈھونڈنا بہت آسان تھا۔ جس طرح کی تلاش وہاں ہو رہی تھی اس میں یہ ایک خطرناک انتخاب ثابت ہو سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر دیوار میں بنی الماری پر پڑی جس پر سیاہ حروفوں میں Janitor's closet لکھا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے دروازہ لاک نہیں تھا۔ خضر نے ناب گمما کر دروازہ کھول لیا۔ ”اوہ یہ صفائی کے سامان وغیرہ کی جگہ ہے۔“ آمنہ بولی۔

”جو بھی ہے آمنہ، اس وقت یہی ہماری جائے پناہ ہو سکتی ہے۔“ یہ الماری کسی چھوٹے سے اسٹور کے مانند تھی۔ اس سامان کے باوجود وہاں آرام سے اتنی جگہ بھی جہاں وہ دونوں بیٹھ بھی سکتے تھے اور کھڑے بھی رہ سکتے تھے۔ اندر فینائل اور دیگر کیمیکل کی دھج سے اس کی چھلکی سمت میں ہوا کی ٹکاسی کے لیے سوراخ بھی بنائے گئے تھے جو اس وقت ان دونوں کے کام آ سکتے تھے۔ خضر نے دروازے کو بند کر کے اندر سے خود کار لاک لگا لیا۔ اب وہ اندر سے تو دروازہ کھول سکتے تھے مگر باہر سے اسے چابی کے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

”تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، وہ انسان ہے کوئی چھلواوا نہیں ہے۔ تم دونوں ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود اسے پکڑ نہیں سکے۔“ اسماعیل شیر محمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”سر آپ بہت جلد اچھی خبریں گے۔“

”مگر اچھی خبر میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟“ وہ غرایا۔

”سروہ بہت چالاک ہے، اس کے پاس موٹر سائیکل

تھی اور وہ دونوں اس پر نکل گئے۔ ہم نے تلاش لی ہے مگر وہاں کچھ نہیں ملا۔ ہم تھوڑی تاخیر سے سورا پکچھ گئے تھے مگر وہ اس وقت تک وہاں سے بھی نکل چکے تھے۔ اب ہم فیکٹری پر ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں آئے ہوں کیونکہ یہ جگہ سمورا سے قریب ہے۔“ دوسری جانب سے بولنے والا ہے ہوئے لمحے میں کہہ رہا تھا۔

”یعنی وہ خود اپنی موت تک آپہنچا۔“ اسماعیل شیر محمد پہلی بار مسکرایا۔ ”فیکٹری میں ریڈ الارٹ کا اعلان کر دو۔ سارے گارڈز کو ان کی تلاش پر لگا دو اور سنو انہیں بتا دینا کہ میری طرف سے انہیں دیکھتے ہی شوٹ کر دینے کے احکامات ہیں۔ بعد میں جو کرنا ہوگا میں بتا دوں گا۔“ وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔

اسے ناکامی پسند نہیں تھی اور خضر نامی یہ رپورٹر اسے مات پر مات دیتا جا رہا تھا جس وقت سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے پاس لاشوں کی تصویریں موجود ہیں اس نے اسی وقت ان کی موت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ وہ بچ نہیں پائے گا۔ زندگی کی تلاش میں وہ موت کے منہ میں چلا آ رہا تھا۔ ”صحت مند“ اس کی ملکیت تھی اور اس کا وہ راز بھی جسے چھپانے کے لیے وہ کبھی بھی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

شعیب خان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ وہ ”صحت مند“ کے سیکورٹی ڈپارٹمنٹ کا سربراہ تھا۔ اسے ابھی ابھی فون پر بتایا گیا تھا کہ فیکٹری میں ایک عورت اور ایک مرد صحت مند آئے ہیں جو کہ ان کے ادارے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسے حکم دیا گیا کہ انہیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ اس حکم کے ملنے ہی فیکٹری میں موجود تمام گارڈز کو الارٹ کر دیا گیا تھا۔

شعیب یہاں کے کام کی حساسیت کو سمجھ رہا تھا۔ فیکٹری کے محلے سے اس کا مفاد وابستہ تھا۔ یوں بھی اس کی سرشت اور پھر مسلسل مشق نے سوالات کی عادت ختم کر دی تھی۔ اسے حکم سننا اور اس پر عمل کرنا اس کی جبلت ثانی بن چکی تھی۔ پھر یہ اپنی نوعیت کا پھلواوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ مسکرایا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

الماری میں انہیں باہر کی تمام آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ گارڈز کی دوڑ بھاگ اور اس دوران حالات پر تبصرے نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے

”آج تو ہم مسلسل ہی موت زندگی کھیل رہے ہیں۔“

نفسر بولا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ خضر کی گھڑی میں 6 بج رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ جمال صاحب انہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اس نے موبائل کی روشنی کم کر کے اسے کھولا۔ تین مس کالز اور ایک میسج اس کا منتظر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جمال صاحب کو پیغام لکھنا سخت نا پسند تھا۔ اس لیے اس نے پہلے میسج کھولا۔ وہ احمد کی جانب سے تھا۔ وہ ان سے فیکٹری کی لوکیشن مانگ رہا تھا۔ خضر کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے فوری طور پر احمد کو لوکیشن کی تفصیلات بھیجیں۔ احمد کے جوابی میسج نے اسے بہت مطمئن کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے پوری تیاری کی ضرورت ہے مگر وہ اہم لوگوں کو اس کی اہمیت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ خضر نے ثبوت کے طور پر اسے لاشوں کی ویڈیو بھی بھیج دی تھی۔

”تمہیں یقین ہے کہ احمد کچھ کر پائے گا؟“ آمنہ نے پوچھا۔

”امید تو ہے اگر وہ یہ ہمارے لیے نہ بھی کرے تب بھی ایک بڑی خبر کا لالچ اسے ضرور کچھ کرنے پر مجبور کر دے گا۔ میں نے اسی لیے وہ ویڈیو اسے بھیجی ہے۔ ہمارے لیے تو اس وقت یہ بھلا کا مسئلہ ہے۔“ خضر سکرایا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“

تھوڑی دیر میں پھر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔

”تم سب کو محتاط رہنا ہے، مال وقت پر ہر جگہ پہنچ جائے۔ سارے ٹرک، الگ الگ مقامات پر جائیں گے۔“ ایک آواز نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔

”مال۔۔۔۔۔“ خضر نے سوچا، اس کی معلومات کے مطابق ”صحت مند“ دکانوں اور گھر میں صفائی ستھرائی کا سامان تیار کرتی تھی۔

”جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو، ٹرکوں کی رفتار بالکل رکھنا ہے، کسی کو اپنی جانب متوجہ نہیں ہونے دینا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو فوراً رابطہ کرتا ہے۔ اس سارے مال کو دو دن کے اندر چھانچوں میں لوڈ ہو جاتا ہے اور ہاں اس دوران وہ دونوں نہیں نظر آئیں تو انہیں گولی مار دینا۔ ہمارے پاس ان کے انتقام کا تمام بندوبست موجود ہے۔“ تھوڑی دیر میں وہاں دوبارہ خاموشی چھا گئی تھی۔ آمنہ اور خضر اس کے باوجود سانس روک کر بیٹھے رہے تھے۔

اگر کوئی اس وقت خضر سے پوچھتا تو شاید وہ اس

تھے۔

وہ دونوں سے جن سوالات کے جواب کی تلاش میں تھے ان میں سے کچھ کے جواب الماری میں بند ہونے کے بعد مل گئے تھے۔

”سب لوگ ادھر آئیں۔“ ایک تیز جھمکانہ آواز نے خضر اور آمنہ کو الارٹ کر دیا تھا۔ ”جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہوا کہ دو جاسوس یہاں گھس آئے ہیں۔“ جاسوس کے لفظ پر خضر اور آمنہ نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ”ان سے ہمارے ادارے اور ہمیں شدید خطرہ ہے۔ باس نے انہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دیا ہے، آپ لوگوں نے سن لیا ہے ان کے لیے شوٹ ٹوکل کا آرڈر ہے۔“

خضر ساکت سا کھڑا رہ گیا تھا۔ الماری کے نیم اندھیرے میں بھی وہ آمنہ کی آنکھوں میں تیرتے خوف کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ دونوں اپنی سانسیں روکے کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر میں قدموں کی چاپ اور گفتگو کی آوازیں کم ہوتی چلی گئیں۔ آمنہ اور خضر نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دی۔ باہر کوئی تھا جو اس الماری کی طرف آ رہا تھا۔ مین اسی وقت خضر کا فون سرسرایا، اس نے احتیاطاً فون کی بیل بند کر دی تھی۔ ڈائجبریشن محسوس کرتے ہی اس نے غیر محسوس طور پر فون کو جیب میں دبایا تھا۔ وہ اور آمنہ سانس روکے کھڑے تھے۔ قدموں کی چاپ الماری کے دروازے کے مین سامنے آ کر ٹھم گئی۔ خضر کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے گاڑ دروازے پر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے پھر دروازے کا ٹاب کھولا۔ وہ غالباً دروازہ کھول کر الماری چیک کرنا چاہ رہا تھا۔ خضر نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دروازہ اندر سے بند کیا جاسکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اب ان کا پچھنا ناممکن ہے۔ اس نے آمنہ کا بازو پکڑا اور بدترین انجام کے لیے تیار ہو گیا۔

”یہ لاک ہے۔“ گاڑ زور سے چلا یا۔ ”یہاں کوئی آواز حتیٰ کہ دل کے دھڑکنے کی آواز بھی نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے ہمیں آفس جا کر چابی لانے کی ضرورت ہے۔“ ویئر ہاؤس کے اس حصے کو صاف ڈیکھ کر دیتے ہیں۔

”ٹھیک ہے ہم دوسری طرف چلتے ہیں۔“ دوسری طرف سے جواب آیا۔

چند لمحوں میں قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔

”آف۔۔۔۔۔ میں تو سمجھی تھی کہ آج ہمارا کام تمام ہو گیا۔“ آمنہ نے گہری سانس لے کر سر کوٹھی کی۔

حوالے سے مزید کام کرنے سے تو یہ کر لیتا مگر اب معاملہ اس کے ہاتھ سے باہر نکل چکا تھا۔ جو لوگ اس سبب میں ملوث تھے انہوں نے ان دونوں کو اپنے لیے سکیورٹی رسک سمجھ لیا تھا اور انہیں ہر صورت اپنے راستے سے ہٹانے کی تیاری کر لی تھی۔

☆☆☆

جمال صاحب بہت پریشان تھے۔ دوپہر سے خضر اور آمنہ کا کوئی پتا نہیں تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ انہوں نے خضر کے ساتھ بہت سختی کی ہے مگر وہ خود بھی اس کے لیے مجبور تھے۔

پانچ بجے انہوں نے ایک سب ایڈیٹر کو خضر کے گھر معلومات لانے کے لیے بھیجا تھا اور جو خبریں وہ لایا تھا اس سے وہ اور دہل گئے تھے۔ اس کے مطابق خضر کے اپارٹمنٹ کے نیچے آمنہ کی کار موجود تھی جس کے دو شیشے توڑ دیے گئے تھے۔ اوپر خضر کے گھر کے دروازے پر گولیوں کے نشان تھے جبکہ پچھلا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ گھر کے اندر ہر چیز بکیر دی گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنے والوں کو کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔

وہ خضر کو تین کا لڑکے تھے مگر ان کا فون ایک بار بھی ریسیو نہیں کیا گیا تھا۔ وہ خوف زدہ تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ ان کے دو مایہ ناز رپورٹرز کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ ”مجھے کال کرو خضر..... کال کرو۔“ وہ فون کو دیکھتے ہوئے بڑبڑاتے اور میز پر اپنا سر دکھ دیا۔

☆☆☆

اخبار کا مالک اور پبلشر اعجاز احمد بھی کچھ کم تناؤ کا شکار نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت فون تھا۔

”جی، امین صاحب..... کوئی حکم.....“

”کیا واقعی تم میرے حکم کی تعمیل کرتے ہو اعجاز؟“ دوسری جانب سے طنزیہ انداز میں پوچھا گیا۔ ”مگر ایسا ہوتا تو اب تک تمہارے وہ دو رپورٹرز میرے لیے عذاب نہ بنے ہوتے۔“

”وہ اب میرے رپورٹرز نہیں رہے ہیں سر، جیسے ہی وہ مجھے ملتے ہیں، میں انہیں ملازمت سے برخاست کر دوں گا۔“ ملتانیہ انداز میں بولا۔

”اپنی جیٹی کو بھی.....“

”ہاں، اسے تو پہلے کروں گا کیونکہ اسے خاندانی اقدار کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“

”بہترین.....“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر یک دم

زور سے چلایا۔ ”یہ کافی نہیں ہے، انہیں ڈھونڈو۔ ورنہ سنا، بھگتے کو تیار ہو جاؤ۔“ اور لائن کٹ گئی تھی۔ اعجاز احمد اس غصے سے ہم گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امین شیر محمد کی چیز۔ اور وہ کیا کر سکتا تھا۔ اب اسے فوری طور پر ان دونوں ڈھونڈنا تھا اور پھر انہیں اپنے اخبار، اپنے دفتر اور اپنی زندگی سے باہر نکال بھیجنے کا تہ تیہ ہی وہ سکون کا سانس لے سکا تھا۔

☆☆☆

انہیں الماری میں بند ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے اس وقت باہر سامان لایا اور لے جایا جا رہا تھا۔ ہر تھوڑے دیر بعد بہت سے قدموں کی چاپ اور سامان رکھنے اور اٹھانے کی آواز انہیں لرزا رہی تھی۔ بالآخر کام ختم ہوتا نظر آیا۔ اس باطویل خاموشی ہو گئی تھی۔ غالباً ان کا ”مال“ آگے جا چکا تھا..... اگلے روز کے لیے نیا مال ویتز ہاؤس میں ڈمپ کیا جا چکا تھا۔

تمام تر خوف کے باوجود خضر اس ”مال“ کے بارے میں جانتا چاہتا تھا۔ مکمل خاموشی کے بعد بھی اس نے کچھ دیر انتظار کیا تھا پھر کچھ کے بغیر تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ باہر ہر طرف خاموشی اور تاریکی تھی۔

”تم یہ کیا کر رہے ہو؟“ آمنہ کی آواز کانپی۔

”میں ان کا ”مال“ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سرگوشی کی اور جیب سے موبائل نکال لیا۔ موبائل کی مدد سے روشنی میں اسے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر رکھے باکس نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ آمنہ اسے روک پائی وہ کسی سائے کے مانند الماری سے نکلا۔ اس نے باکس کو تیزی سے کھولا اس میں سے ایک بوتل نکالی اور اسی شیک رفقاری سے دوبارہ الماری میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

”اگر انہیں معلوم ہو گیا تو بہت بُرا ہو گا۔“ آمنہ بولی۔

”اب صبح تک یہاں کچھ نہیں ہو گا، گھبراؤ مت۔“ خضر نے اسے تسلی دی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا اپنا دل سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اس نے اندھیرے میں بوتل کو بولی۔ بوتل میں پکن صاف کرنے والے محلول کے بجائے سفید چمک دار ذرات بھرے ہوئے تھے۔

”یہ..... یہ میوہ ہے، نشہ آور دوا.....“ آمنہ دھیرے سے بولی۔

”اوہ یعنی یہ چکر ہے۔ صحت، سند دراصل ملک اور دنیا کی صحت چھین لینے کے کام میں مصروف ہے۔“ بڑبڑایا۔

اہمیت

”یا تو اپنی ساری رقم میرے حوالے کر دو یا مر۔ نے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ ایک ڈاکو نے ایک کنجوس پر پستول تان کر کہا۔

کنجوس پستول پر نظریں گاڑ کر بالکل گم مسم سا کھڑا رہ گیا۔ ڈاکو نے کچھ دیر تک جواب کا انتظار کیا۔ پھر آنکھیں نکال کر بولا۔ ”جلدی جواب دو۔ رقم یا زندگی، ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب تمہیں کرنا ہے۔“

”خاموش رہو۔“ کنجوس نے کہا۔ ”میں بھی اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں کہ دونوں میں سے کس کو زیادہ اہمیت دوں۔“

☆☆☆

ایک سیدھا سادہ آدمی گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے زین لگا رہا تھا۔

”معاف کرنا۔“ ادھر سے گزرنے والے ایک راہ گیر نے کہا۔ ”تم نے گھوڑے پر اپنی زین رکھی ہے۔“

دیا: ”کیونکہ تمہیں یہی نہیں معلوم کہ میرا کس سمت جانے کا ارادہ ہے۔“

طرف دیکھا۔ ”کہیں تم دونوں ہی کو تو گولی مارنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے؟ مجھے گاؤں کے بتایا تھا کہ یہاں کچھ لوگ کھس آتے ہیں۔“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر ہم وہی دونوں ہیں۔“ خضر بولا۔ ”کیا تم ہمیں یہاں سے نکلنے میں مدد دے سکتے ہو؟“

”میں..... مگر تم مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ وہ تمہارے پیچھے کیوں ہیں؟“

”میں تمہیں سب بتا دوں گا مگر اس وقت یہاں اتنی بات کرنا مناسب نہیں ہے کیا تم ہمیں یہاں سے نکال سکتے ہو؟“

”میں کوشش کر سکتا ہوں۔ میرے پاس صفائی کا کارٹ ہے، میں اس میں تمہیں چھپا کر لے جا سکتا ہوں مگر اس کے عوض مجھے کیا ملے گا؟“

”جو تم کہو۔“ آمنہ نے کہا۔

”خفیک ہے تم لوگ تیار ہو، میں اپنی پک آپ لے کر آتا ہوں۔“

”اور جی وہ راز ہے جسے سب سے چھپانے کے لیے زندگی کو موت نکال اس پہنانے میں وہ ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔“

خضر نے پوچھ اور اس سے برآمد ہونے والے مواد کی اپنے موبائل کے ذریعے تصاویر بنائیں اور پھر ان تصویروں کو بھی احمد کو بھیج دیا۔ اس کے انداز سے کے مطابق چند لمحوں میں اس کا جواب آ گیا تھا۔

”کیس بہت مضبوط ہو گیا ہے، تمہیں یقین ہے کہ وہاں ثبوت موجود ہیں؟“

خضر کے اثبات میں جواب کے بعد اس نے فوراً کارروائی کی یقین دہانی کرا دی تھی۔

اس کے بعد وہ دونوں پھر اسی طرح اندھیرے میں بیٹھ گئے تھے۔ اب انہیں احمد اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد یکنخت خاموشی کسی کے ہماری قدموں کی چاپ سے گونج اٹھی۔ وہ قدم الماری کی طرف ہی آرہے تھے۔ جس آواز سے وہ دونوں دہل گئے تھے، وہ کسی کی چین کی چابیوں کی آواز تھی۔

آمنہ اور خضر کو لگ رہا تھا جیسے ان کا دل ان کے کانوں میں دھڑک رہا ہو۔

پھر کسی نے دروازے میں چابی لگائی۔ لاک کی ٹکک کے بعد دروازے کی ٹاپ کھولی۔ آمنہ نے خضر کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ دروازہ یک دم کھلا اور کسی نے الماری میں لگے بلب کے بٹن کو دبایا۔

”خضر..... آمنہ، تم دونوں کیا کر رہے ہو؟“ ایک جانی پہچانی آواز ان کے کانوں میں آئی۔

اندھیرے سے اچانک روشنی نے ان کی آنکھوں کو چند سیادیا تھا مگر جو بھی وہ دیکھنے کے قابل ہوئے، فٹ بال ٹیم کے جونیئر کوچ شہزاد خان کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بھی اسی کی طرح ساکت ہو گئے تھے۔

”تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ خضر نے پوچھا۔

پھر خود ہی وہ اپنے سوال پر شرمندہ ہو گیا۔ شہزاد نے پتلی کا جپ سوٹ پہن رکھا تھا۔

”اصل میں مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں شام کی شفٹ میں یہاں صفائی کا کام کرتا ہوں، پلیز تم کسی سے ذکر مت کرنا.....“ وہ بولا۔

”تم فکر مت کرو..... یہ بتاؤ کہ کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو؟“

”کیسی مدد؟ ہاں تم دونوں اس الماری میں کرکیر ہے ہو؟“ اس نے دوبارہ پوچھا پھر ایک لمحے کو سہم کر ان کی

میں سوار تھے۔ ان پر بڑی چادریں وغیرہ پڑی تھیں۔ شہزاد کے گارڈز کے ساتھ اچھے تعلقات نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے صرف اس سے زبانی گفتگو کی تھی، پک آپ کو چپک نہیں کیا گیا تھا۔ چند لمحوں میں وہ موت کی وادی سے باہر آ چکے تھے۔ خضر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اتنا آسان تھا۔ وہ فی الحال اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت تو وہ صرف اپنے اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

پھر اس نے اپنا آئی فون نکالا اور جمال صاحب کو ایک ایس ایم ایس کیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت صرف ان پر اعتبار کر سکتا تھا۔ اس نے انہیں کوچ شہزاد کے گھر پر ایک کھنٹے میں آنے کی درخواست کی تھی۔

دوسرا میسج اس نے احمد کو کیا تھا جس میں اس نے کوچ شہزاد کا ذکر کر دیا تھا۔

☆☆☆

جمال صاحب خضر کا پیغام پڑھ کر خوش زیادہ ہوئے تھے یا پریشان یہ جاننا مشکل تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ کیا کریں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کے اس قدم کو پسند نہیں کیا جائے گا۔ پبلشر اجازت احمد ویسے ہی انہیں خضر اور آئمنہ کو درخواست کرنے کا حکم دے چکا تھا۔

دوسری طرف انہیں خضر سے لگاؤ تھا۔ اس میں انہیں اپنی جوانی نظر آتی تھی۔ پھر یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں اور انہیں ان کی کتنی ضرورت ہو۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

خضر کے اندازے کے مطابق شہزاد کے گھر کو دس منٹ کی مسافت پر ہونا چاہیے تھا مگر سفر اس سے طویل ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا خضر کے دل میں دوسے پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ شہزاد صحت مند میں ملازمت کرتا ہے، اسے پیسوں کی ضرورت ہے پھر بھی وہ اتنی آسانی سے ان کی مدد کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ چیز اسے اچانک کھٹکتی تھی۔

اچانک پک آپ رک گئی۔ وہ دونوں چادروں کے شٹے کا انتظار کر رہے تھے۔ یک دم ان پر مکمل غماصی چیز آ کر گری۔ خضر کو آئمنہ کے چہرے کی آواز آئی، وہ تیزی سے اس کی طرف مڑا تھا مگر اسی لمحے اس کے بازو میں کوئی چیز اتر گئی تھی جس کے بعد وہ پک آپ سے زمین پر آ گرہا تھا۔

خضر کی دوبارہ آنکھ کھلی تو وہ ایک تاریک کمرے میں ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس بار ہاتھ پیروں کے ساتھ

ساتھ اس کے منہ پر بھی ٹیپ لگا دی گئی تھی۔ اس نے آئمنہ کو آواز دینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اس کمرے میں مٹی یا نہیں، اس اندر میرے میں یہ جانتا بھی ممکن نہیں تھا مگر اسے یقین تھا کہ وہ اسی کمرے میں ہوگی، وہ اس کی جھک محسوس کر سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک کھٹی کھٹی سی آواز نے اس کے یقین کو پختہ کر دیا تھا۔ وہ دونوں ہر ممکن آواز نکال کر ایک دوسرے کو اپنی موجودگی سے مطلع کر رہے تھے۔

اچانک انہیں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں بے اختیار چیخنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ دہلی دہلی آوازیں بہت دم کی تھیں مگر وہ دونوں ایک دوسرے کو بخوبی سن سکتے تھے۔ دروازے سے اندر آنے والا اب نیچے کی طرف آ رہا تھا۔

خضر کا دل ڈھول کی طرح بج رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ آنے والا دوست ہوگا یا دشمن۔ شہزاد جس طرح انہیں یہاں باندھ کر گیا تھا اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی کو لینے گیا ہے۔ اگر یہ وہی تھا تو ان کا انجام شاید قریب آچکا تھا۔ خضر نے مایوسی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

”کیا تم نے واقعی ان دونوں کو پکڑ لیا ہے؟“ اسماعیل شیر محمد نے سختی سے پوچھا۔

”جی سر بالکل! وہ میرے قبضے میں ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو ان کی ضرورت ہے۔“ شہزاد نے فون پر کہا۔

”ہمم..... پھر تم مجھے سے کیا چاہتے ہو؟“

”رقم..... مجھے پیسے کی شد ضرورت ہے اور آپ کو ان لوگوں کی۔ اگر آپ مجھے 5 کروڑ روپے دے سکیں تو میں ان دونوں کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”شاید تم جانتے نہیں کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟“

”میں جانتا ہوں سر اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ بہت فراخ دل ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم جگہ بتاؤ، میرے بندے تمہیں رقم پہنچا دیں گے۔“

تصویلات طے کر کے اسماعیل شیر محمد نے فون رکھا تو اس کی آنکھیں جھک رہی تھیں بالآخر اس نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ وہ مسکرایا۔

☆☆☆

”یعنی تم یہ جانتے ہو کہ کام پورا نہ کرنے والوں کو
برخواست کر دیا جاتا ہے.....؟“ اسماعیل نے پوچھا۔

”ہاں.....“

”تو پھر میں تمہیں برخواست کر رہا ہوں۔ اپنے
زمینین آرڈر وصول کر لو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا
تھا۔ دو منٹ بعد آنے والی کال نے کام ختم ہونے کی اطلاع
دے دی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح شہر میں شہرینوں کے ساتھ جھگڑائی تھی۔
ایف آئی اے اور دودھیاں نے صحت مند پر چھاپا
مار کر بہت بڑی مقدار میں نشہ آور چیزیں برآمد کر لی تھیں۔
اسماعیل شیر محمد گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کسی نے رات گئے اخبار
کے پبلشر اعجاز احمد کو کولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور سب سے
بڑی خبر ان تینوں کھلاڑیوں کے بارے میں چھپنے والی
رپورٹ تھی۔

فٹ بال کے کھلاڑیوں کو جو نیئر کوچ طاقت و انرجی
میں اضافے کا لالچ دے کر نشے سے متعارف کراتے تھے
اور پھر ان پر نت نئے تجربات کیے جاتے تھے جن سے
زیادہ مہمیتی اور اثر پذیر نشے بنائے جاتے۔ وہ تین کھلاڑی
میں سے ایک ہی ایک تجربے کی نذر ہو گئے تھے جس میں نشے کی
غلط مقدار نے ان کے جگر کے افعال کو بگاڑ دیا تھا جس کے
بعد خارش اور الرجی سمجھنے کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی
تھی۔ ان سب خبروں کی بازگشت پورے ملک میں کئی دن
تک سنائی دی جاتی رہی تھی۔

اس قدر بھاگ دوڑ کے بعد آج خضر نے پورا دن
سوئے کا فیصلہ کیا تھا مگر صبح ہی صبح فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے
اسے جگا دیا۔ اسکرین پر احمد کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے
دانت پیس کر فون ریسویو کیا۔

”میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے
کہ تمہارے لیے بڑے شہر کے ایک بڑے اخبار کا
اپائنٹمنٹ لیٹر تیار ہو گیا ہے۔“

”بہت شکریہ احمد۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”مگر کیا تم یقین کرو
گے کہ میں نے اپنے چھوٹے سے اخبار میں زندگی کی خوشی
پائی ہے۔ میں یہاں بہت خوش ہوں اور تمہاری ترقی کے
لیے دعا گو ہوں اور ہاں خبردار! مجھے صبح سات بجے فون مت
کرنا۔“ دوسری طرف احمد کے طویل قہقہے کی آواز گونجی اور
فون بند ہو گیا۔

کلک کی آواز اور کمرے میں روشنی پھیل جانے پر
خضر نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ دروازے کے پاس گھڑی
شخصیت کو دیکھ کر اس کا دل خدائے عزوجل کے سامنے
سجدے میں گر پڑا تھا۔ آج دوپہر کے کھانے سے پہلے تک
وہ جسے اپنا دشمن سمجھ رہا تھا اس وقت انہی مجال صاحب کو
یہاں دیکھتا اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔
تھوڑی دیر میں وہ دونوں آزاد ہو کر مجال صاحب

کی کار میں ان کے ہمراہ واپس جا رہے تھے۔ فرق صرف یہ
تھا کہ اب انہیں اپنی منزل کا علم تھا۔ احمد کا چلایا ہوا چکر
کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ تینوں ایف آئی اے کے دفتر
جا رہے تھے جہاں ”صحت مند“ اور اسماعیل شیر محمد کے
خلاف چھاپا اور کارروائی کی تیاری ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اسماعیل شیر محمد غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے
بندے خضر اور آمنہ کو لینے شہزاد کے قلم پر گئے تھے مگر
وہاں انہیں کوئی نہیں ملا تھا جس کے بعد وہ شہزاد خان کو بھی
ساتھ لے آئے تھے۔

”وہ کہاں ہیں؟“ اسماعیل غرایا۔

”مم..... میں نہیں جانتا، بس یہ معلوم ہوا ہے کہ اخبار
کے ایڈیٹر۔ مجال صاحب اس طرف آئے تھے۔ انہیں
میرے قلم اور ان لوگوں کی موجودگی کا علم کیسے ہوا یقین
کریں میں نہیں جانتا۔“ وہ گھگھکیا۔

”مجال.....“ اسماعیل سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔
پھر اپنے آدمیوں کی طرف مڑا۔ ”اسے یہاں سے کم کرو۔
مجھے ابھی ایک ضروری کام کرنا ہے۔“

ان سب کے جانے کے بعد اس نے ایک فون ملا کر
کچھ ہدایات دی تھیں اس کے بعد وہ گھڑی کو دیکھتا رہا جب
اس کے حساب سے مقررہ وقت آ گیا تو اس نے ایک نمبر
ملا یا۔

”جی اسماعیل صاحب.....“ دوسری طرف سے اعجاز
احمد کی آواز ابھری۔

”تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ غرایا۔

”مم..... میں نے ان دونوں کو نکال باہر کیا ہے۔“
وہ گھگھکیا۔

”اور وہ مجال..... تمہارا ایڈیٹر..... کیا تمہیں علم ہے
کہ وہ ان دونوں سے مل گیا ہے۔“

”نہیں..... اگر ایسا ہے تو میں اسے بھی نکال دوں

گا۔“

خود کردہ را

سید شکیل کاظمی

ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کو بہت ساری سہولیات دی ہیں وہیں اس نے ہماری ذاتی زندگی کو بے اثر نہیں رہنے دیا۔ ہمارے متعلق کوئی بھی، کبھی بھی، کچھ بھی جان سکتا ہے اور اس کا سامان ہم خود ہی کرتے ہیں۔ کچھ قریبی دوستوں کی روداد جو ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے مگر ایک آن دیکھے تعلق اور جال میں مقید تھے۔ جس کی ہر کڑی ایک دوسرے سے منسلک تھی۔ کچھ مفاد پرست... اور ہوس گزیدہ ننگ انسانیت لوگ انہی کڑیوں کو ملا کر ان کی زندگی میں زہر گھولنے کے لیے کمر بستہ تھے اور ان کی بے خبری ہی ان کے لیے سب سے بڑی سزا بننے والی تھی۔

چند ایسے کرداروں کی کہانی جو ہماری حقیقی زندگی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ اس ماہ کے سرورق پر حیرت انگیز کہانی

اس پوزیشن پر رکھا ہوا تھا مگر اس کا حسن ہی اس کے لیے وبال جان ثابت ہوا تھا۔ یہ بات بلال غوری اور زبیر احمد کے علاوہ صرف نادبہ کو پتا تھی یا پھر اس بندے کو جس کے لیے داور سے آج میٹنگ رکھی گئی تھی۔ بلال غوری کا خاص آدمی زبیر، داور کو کام کے متعلق برسرِ تلک دے رہا تھا۔ داور خاموشی سے ساری تفصیلات سن رہا تھا اور اسے ذہن میں محفوظ بھی کرتا جا رہا تھا۔ کیونکہ ان معلومات کے ذریعے ہی وہ اپنا کام بخوبی انجام دے سکتا تھا۔ داور کو جو کام دیا گیا تھا، یہ اس کے لیے کھن میں سے بال نکالنے سے بھی زیادہ آسان تھا مگر اس میں صرف ایک الجھن تھی کہ جس بندے کو اسے ٹارگٹ کرنا تھا، اس کے متعلق اسے علم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے یا کہاں ملے گا۔ ابتدائی معلومات میں صرف تصویر اور نام ہی دستیاب تھا یا وہ موبائل نمبر جو وہ استعمال کرتا تھا مگر اب وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سوائے چند لوگوں کی سماجی رائلے کی ویب سائٹس سے لی گئی معلومات اور ان میں موجود چند تصاویر کے سوا کوئی واضح معلومات نہیں تھی۔ یہ داور کی پیشہ ورانہ زندگی میں انوکھی طرز کا کیس تھا۔ پہلے اس بندے کو زندہ حالت میں پکڑنا تھا تا کہ اس سے بلال کچھ معلومات لے سکے پھر

وفاقی دارالحکومت میں زندگی رواں دواں تھی اور اس کا درجہ حرارت بہت معتدل اور خوشگوار تھا۔ لوگوں کی چہل پھل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ملک کی سیاسی بساط پر ہمیشہ کی طرح اکھاڑ پچھاڑ جاری تھی۔ جہاں سب لوگ اپنے کاموں اور زندگی کی مصروفیات میں الجھے ہوئے تھے وہیں اسلام آباد کے ایک مشہور فائبر اسٹار ہوٹل میں ایک خفیہ میٹنگ منعقد کی گئی تھی۔ یہ نہایت ہی مختصر ملاقات تھی جس میں صرف کام کی چند باتوں، ایک بھاری رقم اور کچھ کاغذات کے سوا کسی چیز کا تبادلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں کل تین افراد شریک تھے۔ ان میں سے ایک کا نام داور تھا جو کہ جرائم کی دنیا میں خطرناک قاتل کے طور پر جانا تھا اور ایک بہت وسیع اور منظم نیٹ ورک چلا رہا تھا۔ ایک بہت بڑی سماجی و سیاسی شخصیت بلال احمد غوری جو کہ حالیہ الیکشن میں قومی سطح پر سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور اس کا ایک خاص آدمی زبیر احمد، یہ تینوں اس وقت دوسری منزل کے ایک گھڑی سوئٹ میں موجود تھے۔ زبیر احمد کسی خاص مقصد کے تحت یہاں موجود تھا اور آج کل وہ بلال غوری کے ذاتی اسسٹنٹ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا ورنہ اس سے پہلے بلال نے ایک خوبصورت اور طرح دار حینہ نازیہ کو



اسے منظر سے غائب کر دیا جا۔۔۔
مزید معلومات اور مدد کے لیے زبیر
اُمید ہمہ وقت اس کے لیے فون پر
موجود تھا کیونکہ وہ انٹرنیٹ اور اس
پر موجود سماجی رابطے کی ویب
سائٹس کے متعلق کافی علم رکھتا تھا اور
اس میں ماہر بھی تھا۔ اسی خاص کام
اور اہلیت کی وجہ سے بلال نے زبیر
احمد کا انتخاب کیا تھا مگر وہ بندہ ابھی
تک ان کی پہنچ سے دور تھا۔ داور
کوئی سراغ رساں یا جاسوس ٹائپ
کی چیز نہیں تھا کہ مطلوبہ بندے کی
کھوج میں اکیلا نکل جاتا اور
کامیاب و کامران لوٹ آتا۔ اس
لیے اس کے پاس پہلی امید زبیر تھی
تھا جو اس کی ٹھیک رہنمائی کر سکتا تھا
کہ یہ دی گئی معلومات کس طرح کار
آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ اپنے
طور پر دی گئی معلومات پر ایک نظر
ڈالنے کے لیے بیٹھ گیا اور آخر فائل
بند کرتے کرتے اسے سمجھ آ چکی تھی
کہ اسے کم از کم اپنے چار پانچ اور

بندوں کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اس نے معمول سے
دو گنی رقم طلب کی تو بلال غوری کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔
”تم اپنی اوقات سے باہر ہو رہے ہو داور۔ یہ میرا
ذاتی کام ہے اس لیے ایسا کر رہے ہو ورنہ پارٹی کا کام ہوتا
تو آدھے پیسوں میں ہو جاتا“ بلال نے انتہائی غصے میں کہا
لیکن اس میں بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔
داور ہنسنے لگ گیا ”بلال صاحب بات ایسی ہے کہ اگر
ایک بندے کا کام ہوتا تو اتنے ہی لیتا، مگر پتا نہیں ان چھ
بندوں میں سے کون جانتا ہو آپ کا مطلوبہ بندہ کہاں ہے۔
وسکتا ہے مجھے چھ کے چھ بندوں کا بندوبست کرنا پڑے اس
کے لیے مجھے پانچ چھ اور لڑکوں کو بھی کام پھیلانا پڑے گا۔
باقی خرچے کا کام ہے۔ اب آپ بتاؤ سودا منظور ہے یا بھر
نئے اجازت ہے۔“ وہ بلال کی بے بسی سے لطف اندوز ہو
ہوا تھا۔ بلال اور داور کے درمیان ایک پرانی بد مزگی کے
زات بھی تھے کیونکہ بلال نے ایک دفعہ اس کی ضمانت
پنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ اتنے بدنام زمانہ

بندوں سے اپنے تعلق کا مکمل کے اعتبار نہیں کر سکتا۔ یہ بات
اس کے سیاسی کیریئر کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے کہ وہ ایک
اجرتی قاتل کی ضمانت لے رہا ہے۔ بلال غوری کو بھی علم تھا
کہ داور پرانی بات کو دل میں دبائے بیٹھا ہے اس لیے اب
کام پڑنے پر اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے
داور یہ کام بھی نہ کرتا مگر سیاسی پارٹی کے ایک اور اعلیٰ
عہدیدار کی سفارش پر داور کو ہائی پھر نی پڑی۔ آخر بلال
نے ہتھیار ڈال دیے اور ساری رقم کیش کی صورت میں
میں داور کے حوالے کر دی۔

☆☆☆

آج اسائنمنٹ نہ بنانی ہوتی تو عائشہ بھی باقی گھر
والوں کے ساتھ اپنے چچا کے ہاں دعوت پر چلی جاتی مگر
اسے کل ہر حال میں یہ اسائنمنٹ جمع کروانی تھی اس لیے وہ
گھر میں رک گئی۔ ویسے بھی گھر والوں نے دو سے تین
گھنٹوں میں واپس آ جانا تھا اور تب تک اسے پوری امید تھی
وہ اپنا کام ختم کر لیتی مگر کام کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اسامات

فون پر سوشل میڈیا پر بھی معروف تھی اور کلاس فیلوز کے ساتھ بلی پبلیکٹی گپ شب لگا رہی تھی۔ عاتشہ بہت محتاط اور ریزرو قسم کی لڑکی تھی اس لیے وہ ہر کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی نہ ہی اس نے کبھی اپنی تصویر کو سوشل میڈیا پر لگایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کل لڑکیوں کو کس طرح جموٹی تصویروں کے ذریعے بلیک میل کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ محتاط رہتی تھی۔ اس دوران اچانک ہی موسم کا مزاج تبدیل ہو گیا، دیکھتے دیکھتے ہی بادل چھا گئے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگ گئی۔ یہ موسم عاتشہ کا پسندیدہ موسم تھا اس لیے وہ فوراً گیلری میں آگئی اور اپنے چہرے پر پڑنے والی بوندوں سے موسم کا لطف اٹھانے لگی۔ اچانک اس نے سوچا کیوں نا پروفائل پر بارش کی تصویر لگا کر اپ ڈیٹ کروں کہ لاہور میں بارش ہو رہی ہے۔ اس نے گیلری میں کھڑے ہو کر ہلکی ہلکی بارش کا منظر اپنے اسارٹ فون میں عکس بند کیا اور دو قدرے بہتر تصویروں کو پروفائل پر لگا دیا اور ساتھ ہی لکھ دیا اتنا رو مینٹک موسم اور نیچے اکیلے گھر میں یونیورسٹی کی اسائنمنٹ سے سرکھپانا پڑ رہا ہے۔ اس کے کلاس فیلوز نے بھی معمول کی طرح اس سے سوال و جواب شروع کر دیے۔ وہ اسائنمنٹ کو بھول کر کلاس فیلوز لڑکیوں کے ساتھ گپ شب کرنے لگ گئی۔ ایک گھنٹا تک گزر گیا اسے پتا ہی نہیں چلا..... اچانک اسے ڈور بیل نی آواز آئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ گھر والے اتنی جلدی آگئے۔ اس نے گیلری سے جھانک کر نیچے دیکھا تو وہاں ایک خوب لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے کسی سیل گرل کی طرح کے تھے جو گھر گھر جا کر اپنی مصنوعات کی تشبیہ کرتی یا بیچتی ہیں۔ اس نے ایک عدد لی کیپ بھی پہن رکھی تھی۔ اس نے اوپر سے ہی کہا گھر میں کوئی نہیں اس لیے وہ کوئی چیز نہیں خرید سکتی۔ گیٹ پر موجود لڑکی نے اپنی لی کیپ اتار کر اوپر دیکھا اور کہا۔ ”میں کچھ بیچنے نہیں آئی۔ آپ کا ایک پارسل ہے جو ڈیلیور کرنا ہے۔“ پھر عاتشہ کو سمجھ آیا کہ وہ کسی گورنر مینٹی سے ہے۔ اس کے لیے یہ مقام حیرت تھا کہ لڑکیاں اب گورنر کی جاب بھی کرنے لگی ہیں ورنہ اس نے ہمیشہ لڑکوں کو ہی دیکھا تھا یہ کام کرتے ہوئے۔ پارسل کا سن کر وہ تھوڑی الجھن میں مبتلا ہوئی مگر پھر سوچا ہوسکتا ہے ابو یا بھائی کے لیے آیا ہو ضروری تو نہیں میرا ہی ہو۔ اس کا کمر اٹھائی منزل پر تھا۔ وہ اپنے کمرے سے اتر کر گیٹ پر آئی۔ جلد بازی میں اس نے گھر میں عام استعمال کا ایک سوٹی دوپٹا سر پر اوڑھ لیا۔ یہ مشرقی اطوار اس کے خون میں شامل تھے حالانکہ گیٹ پر ایک لڑکی

تھی کوئی مرد نہیں، لیکن وہ دوپٹے کو اپنے لباس کا جزو قرار دے لیتی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے لڑکی سے پارسل لیا اور واپس پلٹنے لگی تو لڑکی نے کہا ”پلیز اس پیپر پر وصولی کے دستخط تو کر دیں۔“

”اوہ سوری، میں بھول گئی۔“ عاتشہ نے خجالت آمیز لہجہ میں کہا۔

وہ پیپر اور پائل لینے کے لیے آگے بڑھی تو اس لڑکی نے برق رفتاری سے عاتشہ کے چہرے پر اسپرے کر دیا۔ عاتشہ نے دہشت سے چیخ مارنے کی کوشش کی مگر اس لڑکی نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر باڈی چنڈی لمحوں میں عاتشہ اپنے حواس سے ہگانہ ہو چکی تھی۔ لڑکی نے گیٹ سے سر باہر نکال کر تھوڑی دور گھڑی ایک گاڑی کو اشارہ کیا جس پر ایک گورنر مینٹی کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی گھر کے گیٹ کے پاس آ کر رکتی گئی۔

☆☆☆

راولپنڈی صدر کی ایک معروف ترین شاہراہ پر جہاں گارمنٹس اور لائف اسٹائل دکانوں کی بہتات تھی وہیں زین کا دفتر زین ٹیکنالوجی ہاؤس کے نام سے تھا اور ساتھ ہی دکان بھی جس میں وہ کمپیوٹرز سے لے کے لیپ ٹاپ اور ٹیبلٹ کمپیوٹریں رکھتا اور خریدتا تھا۔ زین بذات خود ایک کمپیوٹر انجینئر تھا اور اس کے ساتھ ہی بلا کا ذہین بھی۔ جدید رہنما کی وجہ سے اس کا کاروبار بہت اچھا تو نہیں لیکن صحیح چل رہا تھا اور اس کی گزراوقات ٹھیک ہو رہی تھی مگر اب وہ تھوڑا آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک اچھی گاڑی اور راولپنڈی میں اپنا گھر بے شک وہ کوئی عام سادس ضرب دس کا کوئی فلیٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے اس نے ایک منصوبے پر کام شروع کیا تھا لیکن سب کچھ الٹا ہو گیا اور زین کو اچانک ہی منظر سے غائب ہونا پڑا۔ کیونکہ وہ کچھ ایسا جان گیا تھا جو اس کی زندگی کے لیے خطرہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے کچھ عرصے کے لیے اپنا دفتر اور کرائے کا فلیٹ چھوڑ دیا تھا اور کسی دوسری جگہ آکر سستا سا کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ اصل میں بات وہاں سے شروع ہوئی تھی جب اس کی نادہ نامی ایک لڑکی سے انٹرنیٹ پر دوستی ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کافی بے تکلف ہوتے گئے اور پھر ان میں ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ایک ساتھ گھومنا پھرنا اور کھانا پینا اکثر چمٹی والے دن کا معمول بن گیا تھا۔ ایک دن نادہ نے باتوں ہی باتوں میں زین کو بتایا کہ وہ بلال احمد غوری کی پرسنل اسسٹنٹ ہے۔ زین کے لیے یہ اطلاع

خود کردہ را

ایک تم کو دے دیتا ہوں، لیکن اگر تم جھوٹ نہیں لینا چاہتیں تو قسطوں میں پیسے دے دیتا، مجھے اعتراض نہیں۔“ زین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

نادیہ کو تھوڑی سی شرمندگی ہوئی کہ وہ ایسے ہی غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی۔ واجبی سے انکار کے بعد نادیہ نے وہ جھوٹ قبول کر لیا۔ وہ خود کو زین کا قرض دار محسوس کرنے لگی تھی۔ زین کے خلوص اور دوستی کے بدلے وہ اسے ابھی تک اندھیرے میں رکھے ہوئے تھی۔ مگر شاید اب صحیح وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے متعلق سب کچھ بتا دیتی، لیکن اسے موقع ہی نہیں ملا۔ زین چونکہ کمپیوٹر انجینئر تھا اس نے لیپ ٹاپ میں خفیہ سافٹ ویئر ز اور نوٹ لیب کر دیے تھے جو عام صارف کی نظر میں نہیں آ سکتے تھے۔ اس طرح اس لیپ ٹاپ پر ہونے والی ہر سرگرمی کی رپورٹ زین کسی بھی وقت حاصل کر سکتا تھا۔ نادیہ چونکہ پرنٹل اسٹنٹ کے ساتھ ساتھ بلال غوری کی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ بھی تھی اس لیے وہ آنے جانے والی رقوم اور دفتر کے اخراجات وغیرہ سب کی تفصیل رکھتی تھی۔ اس کام کے لیے دفتر میں اس کے پاس ایک بہترین ڈیک ٹاپ کمپیوٹر موجود تھا، مگر اپنا لیپ ٹاپ آنے کے بعد اس نے اپنی سہولت اور تہذیبی کی خاطر سارا کام اس پر شفٹ کر لیا۔ وہ خود کو آپ گریڈ محسوس کر رہی تھی، کام زیادہ ہونے کی صورت میں وہ کام اپنے ساتھ گھر لے جاتی اور لیپ ٹاپ پر آرام سے کام ختم کر لیتی۔ دوسرا فائدہ لیپ ٹاپ کا نادیہ کو یہ تھا کہ وہ اپنے موبائل اور کمرے کی ساری تصاویر اور ویڈیوز اس میں رکھ لیتی تھی ورنہ جب تک دفتر کا کمپیوٹر استعمال کرتی تھی وہ اپنی تصاویر اور ذاتی نوعیت کی چیزیں اس میں رکھنے سے احتراز کرتی تھی، کیونکہ دفتر کا کمپیوٹر وہاں ہر کسی کی پہنچ میں ہوتا ہے اور وہاں چیزیں محفوظ بھی نہیں رہتی تھیں۔

نادیہ اس شام سے بڑی آپ سیٹ تھی کیونکہ ان دونوں کا اس دیک اینڈ پر ملنے کا پروگرام تھا مگر اچانک زین نے بتایا کہ اس کے کسی دوست کی شادی ہے آزاد کشمیر میں۔ وہ کچھ اور دوستوں کو لے کر وہاں جائے گا اور وہ سکتا ہے اسے تین چار دن لگ جائیں۔ اس لیے دیک اینڈ کا پروگرام اگلے ہفتے کا رکھ لینے ہیں۔ نادیہ کو معلوم تھا کہ اب زین سے ملاقات اگلے ہفتے ہی ہوگی۔ اس لیے اس نے وہ برانڈ ڈکھڑی سنہال کے رکھ دی جو زین کو تحفے میں دینے کا ارادہ تھا۔

☆☆☆

بہت معنی رکھتی تھی۔ کیونکہ بلال احمد غوری کوئی عام سا بزنس مین نہیں تھا۔ وہ ایک بہت بڑے گروپ کا مالک تھا جس کے زیر اثر بہت ساری کمپنیاں چل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک بااثر سیاسی پارٹی کا رکن اور اسمبلی کا ممبر بھی تھا۔ زین کے دماغ میں کچھ دیر پہلی شروع ہو گئی کیونکہ وہ بلال کی پرنٹل اسٹنٹ اور اکاؤنٹنٹ تھی۔ بے شک وہ سیاسی نہیں بلکہ کاروبار کی حد تک ہی بلال کی پرنٹل اسٹنٹ اور اکاؤنٹنٹ تھی مگر پھر بھی اس کی پہنچ اور تعلق سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زین کئی دن سوچتا رہا کہ وہ اس سے کون سا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ بھی وہ آسان شرائط کے ساتھ قرض لینے کی سوچتا اور کبھی بینک سے اس کی گارنٹی پر گاڑی نکھوانے کا..... لیکن اس کا ذہن کہیں ایک جگہ ٹھہر نہیں رہا تھا..... اور وہ براہ راست نادیہ سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح یا تو وہ اسے منع کر دیتی یا پھر کسی بہانے سے ٹال دیتی، اس لیے اس نے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے کا سوچا۔ آخر کافی دن کی سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک انوکھا اور خطرناک خیال آیا جس میں اس کی جان کو کئی خطرات لاحق ہو سکتے تھے مگر آگے بڑھنے کے لیے اس نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اب وہ اپنا لائف اسٹائل تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نادیہ کو ایک لیپ ٹاپ گفٹ کیا، حالانکہ ملاات اور اس کی جیب اس چیز کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے تھے، نہ ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی مہلک قسم کے عشق میں مبتلا تھے۔ وہ بس برائے ضرورت یا وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے ورنہ دونوں کو ہی معلوم تھا کہ ان کی دوستی کا کوئی مستقبل نہیں۔ ادیہ اور زین ابھی تک ایک دوسرے سے اس لیے رابطے میں تھے کہ دونوں کی طبیعت میں صرف ایک چیز مشترک تھی۔ وہ بھی ایک دوسرے سے سوال و جواب نہیں کرتے تھے کہ کس سے بات کر رہے تھے کہاں رہتے تھے یا یہ کس کا نمبر ہے وغیرہ وغیرہ۔ دونوں کے اندر باہمی سمجھوتے کی فضا قائم تھی۔ جب زین نے نادیہ کو ایک معروف کمپنی کا مہنگا لیپ ٹاپ بطور تحفہ دیا تو اسے بہت حیرت ہوئی اور ساتھ ہی اسے شک بھی ہوا کہ آخر زین بھی نہیں اسی ڈگر کی طرف تو نہیں چل بڑا کہ تحفے دے، احسان جتانے اور پھر اپنی مرضی کرے۔ اس لیے وہ لمبے بھر کو ہچکچاہٹ تو زین نے فوراً بھانپ لیا۔ ”مجھے اس کمپنی کی طرف سے ایک ماہ میں سب سے زیادہ لیپ ٹاپس بیچنے پر دو عدد لیپ ٹاپس بطور بونس دیے گئے ہیں، کیونکہ میں ان کا لائسنس یافتہ ڈیلر بھی ہوں، اس لیے سوچا

تقریباً پچھلے تین ماہ سے وہ پانچوں ملنے کا پروگرام بنا رہے تھے مگر ہمیشہ کوئی نہ کوئی ان میں سے مصروف ہو جاتا یا اسے کوئی کام پڑ جاتا اس لیے ان کی ملاقات موخر ہوتے ہوتے مارچ آگیا۔ یہ سب انٹرنیٹ پر دوست بنے تھے اور ان سب دوستوں میں پابھی دچکی کے امور صرف اور صرف دوہی تھے۔ ایک ان کا پسندیدہ صحافی اور کالم نگار اعجاز باہر اور دوسرا ادب سے دچکی۔ اس لیے ان سب دوستوں نے مل کر ایک گروپ بنا لیا تھا جس میں وہ اپنے شوق اور خیالات کی ترویج کرتے اور ساتھ ہی دوسرے کالم نگاروں اور روزمرہ کے امور پر گفتگو کرتے۔ پھر اس گروپ میں اور لوگ بھی شامل ہوتے گئے جن میں کئی عدد لڑکے، لڑکیاں اور کالم نگار بھی شامل تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہوتا گیا اور وہ انٹرنیٹ کی دنیا سے آگے نکل کر حقیقی دوستی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ان میں سے دو رحیم یار خان سے تھے ایک کا نام اظہر علی اور دوسرا خاور حمید تھا۔ ملک ارسلان آزاد کشمیر سے تھا جبکہ محمد جمیل کا تعلق مری کے ایک نواحی علاقے سے تھا۔ ان کا پانچواں دوست زین العابدین راولپنڈی سے تھا۔ اظہر علی، محمد جمیل اور زین ایک دفعہ پہلے بھی مل چکے تھے راولپنڈی میں، جبکہ خاور اور ملک ارسلان کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ اسے لیے ان کا اشتیاق باقی تینوں سے زیادہ تھا۔

آخر کار ان کا پروگرام فاسل ہوا کہ اظہر اور خاور رحیم یار خان سے راولپنڈی زین کے پاس آئیں گے، جہاں وہ ایک رات رکنے کے بعد صبح مری میں جمیل کے پاس جائیں گے۔ مری میں دوپہر کا کھانا کھا کر اور تھوڑی بہت سیر کرنے کے بعد وہ چاروں ملک ارسلان کی طرف نکل جائیں گے آزاد کشمیر۔ جہاں آج کل ملک ارسلان کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں..... اور ان سب کا پروگرام بھی اسی لیے بنا تھا کہ کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آئی ہی رہتی تھی۔ اظہر اور خاور شادی سے قریباً ایک ہفتہ پہلے نکل پڑے تھے کیونکہ تین دن تو بچے شادی میں نکل جاتے باقی ایک دن آنے جانے میں اور کچھ وقت وہ پہاڑی علاقے کی سیر کرتے۔ سیر سائے کا پروگرام اصل میں اظہر، خاور اور زین کا تھا کیونکہ جمیل اور ملک ارسلان تو اسی علاقے کے رہائشی تھے اور وہ ہر روز ہی ان سیرگاہوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتے رہتے تھے..... لیکن کہتے ہیں انسان جیسا سوچتا ہے ہمیشہ وہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اظہر اور خاور جب راولپنڈی پہنچنے والے تھے تو انہوں نے زین سے رابطہ کیا

کہ وہ کہاں ہے، ہم جلد پہنچنے والے ہیں۔ زین کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کے موبائل فون پر کال بھی کی مگر اس کا نمبر بند ملا۔ وہ پریشان ہو گئے کہ پروگرام کے مطابق ان کو آج زین کی طرف قیام کرنا تھا۔ ویسے بھی زین اکیلا ہی رہتا تھا ایک فلیٹ میں اور اس کے فیملی والے اس کے آبائی گاؤں میں رہتے تھے، مگر اس کا نمبر ملتا تو کوئی بات بنتی۔ وہ پریشان ہوئے مگر زیادہ نہیں کیونکہ راولپنڈی کوئی قصبہ نہیں تھا کہ ان کو ایک رات رہنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ ملتی۔ اور زین کے نمبر پر بھی وہ پیغامات چھوڑ چکے تھے۔ اس کا جب بھی نمبر آن ہوتا اسے ان کے پیغامات مل جاتے اور وہ ان سے رابطہ کر لیتا۔

راولپنڈی بس اسٹینڈ پر اترتے ہی وہ ایک قدرے مناسب سے رستہ واران کی طرف چلے گئے اور ایک رات کے لیے دو بیڈروں پر مشتمل کمرہ کرائے پر لے لیا۔ سفر کی تکان کی وجہ سے انہوں نے کھانا کمرے میں ہی کھایا اور پھر لیٹ گئے۔ نیندا بھی ان کی آنکھوں سے دور تھی جب خاور کے موبائل پر ایک اجنبی نمبر پر پیغام آیا۔ وہ زین کی طرف سے تھا جس میں معذرت کی گئی تھی کہ وہ کسی انتہائی ذاتی نوعیت کے مسئلے میں پھنس گیا ہے۔ اس نے کہا تھا وہ دونوں اپنے پروگرام کے مطابق صبح مری نکل جائیں، میں کوشش کروں گا مری نہیں تو آزاد کشمیر میں آکر ان سے مل جاؤں گا اور میرا موبائل اور پرس ہمیں کم ہو گیا ہے اس لیے میں کسی اور کے نمبر سے رابطہ کر رہا ہوں۔ آپ لوگوں کے نمبر میرے پاس محفوظ ہیں۔ جلد ہی نیا موبائل فون لے کر آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا اور ساتھ ہی تھوڑا دکھ بھی ہوا کہ زین کی پریشانی سے دوچار ہے۔

اگلے دن وہ پروگرام کے مطابق مری پہنچے تو جمیل نے ان کو خوش آمدید کہا۔ وہ بھی زین کے متعلق سن کر پریشان ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق مری گھومنے گئے اور ڈیجیٹل کمرے اور موبائل فون سے دھوا دھڑتوئیں برپا بنانے لگے۔ آخر تھک بار کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو تینوں نے چن چن کر اچھی اچھی تصویریں اپنی اپنی پروفائل اور مشترکہ گروپ میں لگا دیں اور ساتھ ہی ہل کیل پروگرام بھی بتا دیا کہ کل ہم انشاء اللہ آزاد کشمیر وادی غلیم کی سیر کریں گے ملک ارسلان کے ساتھ۔ ملک ارسلان نے ان کو جواب میں خوش آمدید کہا اور بھی کہ وہ ان کا بے مبری سے انتظار کرے گا۔ مگر اس نے بھی ایک سوال کیا کہ زین نظر نہیں آ رہا آپ کے ساتھ تو خاور نے

میں تھا۔

”ہاں، میرا ہی نام سوا ہے۔ کیوں؟“

”وہ..... آپ کے بھائیوں کی لڑائی ہوئی ہے پارکنگ میں کسی کے ساتھ..... آپ کی چھوٹی بہن نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا جلدی سے آپ کو بلا کے لے آؤں۔“

سوا کے ایک دم ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پارکنگ کی طرف گئی۔ وہ ٹرکاس کے آگے آگے تھا۔ ”اوجھر آئیے اس طرف۔“ وہ ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

پارکنگ میں پہنچتے ہی سوا نے دیکھا وہاں پر تو خاموشی کا راج ہے اس لیے سوا کو تھوڑی گڑبڑ محسوس ہوئی۔ اس کے دماغ نے خطرے کی گھنٹی بجائی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ کلوروفارم میں بھیگے ہوئے رومال نے سوا کی ناک اور منہ ڈھک لیا۔ اسی وقت بغل میں آ کر ایک ہائی روف رکی اور اس کا دروازہ کھلا۔ پھر اس لڑکے نے دھکیل کر لکھڑائی ہوئی سوا کو ہائی روف میں بٹھا دیا جس کے شیشے ٹھنڈے تھے۔ اس کے بعد ایک جھٹکے سے ہائی روف پارکنگ سے نکل کر مین روڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

داور پچھلے چھ سات سال سے جرائم کا بہت بڑا نیٹ ورک چلا رہا تھا۔ صوبے کے ہر کونے میں اس کے جاننے والے اور آدمی موجود تھے۔ وہ ایک خود ساختہ ڈان بنا ہوا تھا۔ اپنے کام میں اسے الٹی سرکاری افسران کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ مگر وہ سیاسی پارٹیوں اور صنعت کاروں کی آہٹ کی دشمنی میں نہیں آتا تھا۔ وہ ہمیشہ متوسط یا غریب طبقے کو نشانہ بنانے کا کام لیتا تھا تا کہ بھی اسے دوسری طرف سے مخالفت یا مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ ہمیشہ انتقامی کارروائی سے محفوظ رہے۔ بلا ل غوری سے یہ کیس لینے سے پہلے بھی اس نے یہ احتیاط ملحوظ خاطر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ داور بہت کینہ پرور اور تند مزاج بھی تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اپنی بے عزتی کا بدلہ چکانے کے لیے انتقام اٹھانا پڑے گا۔ وہ بلا ل غوری سے انتقام لینا چاہتا تھا اور اسے ایک ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے۔ بلا ل جتنا پریشان اور گھبراہٹ میں تھا، اس سے ظاہر تھا کہ اس لڑکے کے پاس کوئی بہت ہی خاص معلومات یا چیز تھی جس کی وجہ سے وہ پہلے اسے زندہ پکڑنے کے لیے کہہ رہا تھا ورنہ وہ اسے سیدھا سیدھا مروا بھی سکتا تھا۔ اس لیے داور کا پروگرام تھا کہ جیسے ہی وہ لڑکا ہاتھ آتا ہے، پہلے وہ اپنے طور پر اس سے پوچھ گچھ کرے گا اور کام

اسے بتایا کہ زین بھی کل وہیں پہنچ رہا ہے۔ اگلی صبح وہ تینوں ملک ارسلان کی طرف پہنچ گئے، جہاں ان کی خوب خاطر مدارت ہوئی۔ ملک ارسلان شادی کی تیاریوں کی وجہ سے کافی مصروف نظر آ رہا تھا، مگر اسے اپنے مہمانوں سے کیے وعدے کا بھی خیال تھا۔ آخر وہ وادی نیلم جانے کی تیاری کرنے لگے تو اظہر نے اپنے فون سے ایک اور پوسٹ لگا دی کہ وہ وادی نیلم کی طرف رواں دواں ہیں۔ زین ابھی تک نہیں پہنچا تھا نہ اس نے رابطہ کیا تھا۔

☆☆☆

گھر میں سوا نے دو دن سے شور مچایا ہوا تھا کہ اس دفعہ اپنی پسندیدہ فلم سنیما اسکرین پر ہی دیکھتی ہے اس لیے اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہن کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے حق میں دو ٹوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ اتوار کا پروگرام بن گیا اور سب بہن بھائیوں نے سنیما ہال کی ٹکٹس ایڈوانس میں بک کروا لیں۔ اتوار کو سوا اپنے بہن بھائیوں سمیت پوری تیاری کے ساتھ سنیما ہال فلم دیکھنے پہنچ گئی۔ انڈین فلموں کی پاکستان میں نمائش اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔ وہ بھی ایک انڈین فلم دیکھنے ہی آئے تھے اور اس سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فلم کے دوران سوا نے اپنے موبائل سے سوشل میڈیا پر یہ خبر لگا دی کہ وہ اپنے بہن بھائیوں سمیت ایک انڈین فلم دیکھ رہی ہے اور ساتھ فلم کا نام لکھ دیا مگر احتیاط کے طور پر سنیما کا نام نہیں لکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر سوال و جواب کی بوچھاڑ ہوئی کہ کیسی فلم ہے اور کیا ہو رہا ہے اور اکیلے اکیلے پروگرام بتایا ہمیں بتایا ہی نہیں۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں اس کی پروفاٹل کا حصہ بنتی جا رہی تھیں۔ اس نے کچھ کا جواب دیا اور پھر انٹرول تک موبائل آف رکھا۔ انٹرول پر اس نے دوبارہ نئی پوسٹ لگا دی کہ بہت مزے کی فلم ہے مگر انٹرول کے بعد ہی پتا لگے گا کہ یہ اچھی رہی یا بری۔ وہ ریفریویشن کے لیے کینٹین میں جمع ہو گئے اور اپنا اپنا آرڈر دینے لگے۔ سوا فریش ہونے کے لیے واش روم کی طرف جانے لگی تو چھوٹے بھائی نے پوچھا۔ ”اپنی کہاں جا رہی ہیں؟“

”میں آتی ہوں دو منٹ میں۔“ یہ کہہ کر وہ لیڈیز ریست روم کی تلاش میں پہلی منزل کی طرف چل پڑی۔ انٹرول کی وجہ سے کافی ریش تھا وہاں پر۔ ابھی وہ بیڑھیوں کے پاس ہی پہنچی تھی کہ سنیما ہال کی انتظامیہ و نیقارم میں ملبوس ایک لڑکا ہاتھ بٹھا ہوا اس کے پاس آیا۔ ”مس آپ کا نام سوا ہاتھ ہے؟“ وہ بہت جلدی

کی بات معلوم کرنے کے بعد بلال کے حوالے کرے گا۔ وہ پہلی دفعہ کسی سیاست داں یا اعلیٰ طبقے کے بندے کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کا سوچ رہا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اسے ریاض کی کال آگئی۔ اس نے ریاض اور سارہ کو لاہور کی طرف بھیجا تھا کہ وہاں سے مطلوبہ لڑکیوں کو کسی بھی طرح یہاں آزاد کشمیر کے نواح میں موجود ایک گیسٹ ہاؤس پہنچانا ہے۔ اس نے کال ریسیور کو ریاض نے بتایا کہ وہ اور سارہ دونوں کو لے کر لاہور سے نکل پڑے ہیں اور شام تک وہ گیسٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے۔ وادے کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی سوچ بھٹکنے لگی تھی حالانکہ بلال غوری کی واضح ہدایت تھی کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچانا صرف معلومات لینی ہیں وادے کا کر۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زبیر احمد نے اسے اطلاع دی۔ اس کے مطلوبہ لوگوں میں سے چاروں لڑکے اس وقت وادی نیلم کی طرف نکلے ہیں اور اگلے دو تین گھنٹوں تک وہیں موجود ہوں گے۔ وادے اس وقت اسی ریسٹ ہاؤس میں تھا اور یہاں سے وادی نیلم ایک گھنٹے سے بھی کم کی ڈرائیو پر تھی۔ اس نے اپنے ساتھ دو اور بندوں کو لیا اور ایک جیب میں وادی نیلم کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

زین کو اتنا تو علم تھا کہ نادیر دفتر میں لیپ ٹاپ استعمال ضرور کرے گی مگر اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہو شاید، کیونکہ وہاں ایک پورا انفارمیشن ٹیکنالوجی کا شعبہ تھا جو ایک لائسنس یافتہ اینٹی وائرس اور مضبوط ترین فائروال کے ساتھ ایک محفوظ کنکشن کو یقینی بناتا تھا کہ کوئی غیر ضروری معلومات یا صارف اس پرائیویٹ نیٹ ورک میں مداخلت نہ کر سکے۔۔۔۔۔ فائروال اور کنکشن پورٹی توڑنے کے لیے کسی ماہر ہیکر یا پروگرامر کی ضرورت تھی مگر زین نہ تو پروگرامر تھا اور نہ ہی ہیکر وہ صرف ایک کمپیوٹر انجینئر تھا۔۔۔۔۔ اس لیے اس نے دوسرا لیکن طویل المیاد منصوبہ بنایا تھا کیونکہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کر سکتا تھا۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ڈیپارٹمنٹ نے نادیر کو لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ کی سہولت نہیں دی تھی۔ وہ انٹرنیٹ سے متعلقہ تمام کام اب بھی ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر پر ہی کرتی تھی۔ لیکن کچھ فائروال کام وغیرہ وہ اپنی ایکسٹرنل ڈرائیو میں لے جاتی تھی جب اسے گھر کام کرنا ہوتا تھا۔ گھر میں اس نے اپنا ذاتی انٹرنیٹ کا کنکشن لیا ہوا تھا جس پر وہ ہلکے پھلکے دفتری کام کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا، موزیڈ اور آن لائن شاپنگ

وغیرہ کرتی تھی۔ رات کے وقت اس کی اکثر زین کے ساتھ لمبی بات ہوتی تھی۔

ادھر زین کے پاس بھی اس کے لیپ ٹاپ ا معلومات تب ہی جاتی تھی جب وہ گھر موجود ہوتی تھی شروع شروع میں تو زین کھاتے اور بلز دیکھ دیکھ کر بور ہو گیا۔ اس کو کوئی کام کی چیز نہیں مل رہی تھی۔ زین اس بات سے جلد ہی اکتا گیا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ نادیر کے لیپ ٹاپ سے یہ خفیہ سافٹ ویئر نکال دے۔ وہ اسے بتائے بغیر یہاں سے سارے امور سرانجام دے سکتا تھا یہاں تک کہ اس کی ایک ایک فائل دیکھ سکتا تھا اور اس کے لیپ ٹاپ کا کیسرا بھی آن کر سکتا تھا۔ جسے اصطلاح میں ویب کیس بھی کہا جاتا ہے۔ زین نے نادیر کے لیپ ٹاپ کا لنک کھولا اور آخری دفعہ ایک نظر مارنے بیٹھ گیا پھر وہ سب ختم کر دیتا لیکن ایک فولڈر کی طرف اس کی توجہ جلی گئی جو کہ نادیر نے آج صبح ہی کہیں اس میں بنایا تھا۔ اس فولڈر کا نام رکھا تھا سیکریٹ پر ڈیجٹل۔ زین کا اشتیاق بڑھ گیا۔ اس نے فوراً وہ فولڈر کھولا جس میں کافی تعداد میں تصاویر اور کچھ چھوٹی چھوٹی ویڈیوز بنی ہوئی تھیں۔ زین کے لیے وہ کچھ ایٹم بم سے کم نہیں تھیں۔ یہ بلال غوری اور نادیر کی تنہائی کی تصاویر تھیں اور ویڈیوز بھی۔۔۔۔۔ جو کہ یقینی طور پر نادیر کے موبائل سے لی گئی تھیں اور بلال غوری اس بات سے بے خبر تھا۔ نادیر کے ساتھ اس کا کوئی بہت جذباتی رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی اس کی کپٹیاں سلنے لگیں اور وقتی طور پر اسے نادیر پر بہت غصہ آیا کہ وہ اس کے سامنے خود کو کتنی پاک صاف ظاہر کرتی تھی اسی لیے زین بھی کبھی حد سے زیادہ نہیں بڑھا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اس نے فوراً نادیر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا، مگر وہ نمبر ڈائل کرتے کرتے اچانک رک گیا۔ اس کے ذہن میں یہی بات آئی کہ نادیر نے یہ تصاویر کیوں بنائیں؟ کیا وہ بلال غوری کو بلک میل کرنا چاہتی ہے یا کوئی اور مقصد تھا اس کا۔ زین نے تو یہ سارکھٹ راگ اس لیے پھیلایا تھا کہ وہ بلال غوری کی ٹیکس چوری پکڑتا اور پھر میڈیا میں لے جانے کی دھمکی دیتا۔ اس کے بدلے وہ بلال غوری سے کچھ نہ کچھ فائدہ تو لے سکتا تھا اور اسے اپنی ماہر اندر رائے بھی دیتا کہ کس طرح اپنے نیٹ ورک اور کاؤنٹس کو محفوظ کیا جائے تاکہ دوبارہ کوئی یہ معلومات نہ لے سکے۔ مگر یہ سب دیکھ کر زین کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا، پھر بھی وہ سوچ رہا تھا جو کام نادیر کرنا چاہ رہی ہے وہ کیوں نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے وہ

خود کدھرا

ہمیں اور عنایات دیکھ کر اس کی مزاحمت بالکل دم توڑ گئی تھی۔ وہ بلال کی ہر پیش قدمی کو روکنے کے بجائے ہوا دینے لگی اور بلال غوری بھی اس حسن کا اسیر ہوتا گیا۔ لیکن اب بلال بری طرح سچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک اعتماد کے بندے کو لیا اور نادبہ کے قلیٹ پر پہنچ گیا۔ نادبہ ایک کثیر المرحلہ عمارت کے دوسرے فلور پر اکیلے رہتی تھی۔ عشا کی اذان ہو چکی جب بلال اپنے آدمی کے ساتھ نادبہ کے قلیٹ پر دستک دے رہا تھا۔ دستک سن کر نادبہ نے دروازہ کھولا تو بلال کو سامنے دیکھ کر اس کے حواسوں پر بجلی گری۔ اسے امید نہ تھی کہ بلال بھی یہاں آئے گا مگر اس کا انداز بتا رہا تھا، وہ بہت غصے میں ہے۔ بلال، نادبہ کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آیا اور اسے بیڈ پر دھکا دیا۔ اس کے ساتھ آئے آدمی نے قلیٹ کا دروازہ بند کیا اور سامنے بت بن کے کھڑا ہو گیا۔ نادبہ اس وقت زین کے ساتھ چپٹ میں مصروف تھی۔ زین کو انتظار کا کہہ کر ہی دروازہ کھولنے آئی تھی۔ مگر آگے یہ افتادہ لگتی تھی۔ بلال غصے میں اس پر گرج رہا تھا۔

”تمہاری اتنی جرأت کہ مجھے بلیک میل کرو۔ تمہاری جیسی لڑکیوں کو ابھی طرح سے جانتا ہوں میں۔ بتا کہاں ہیں وہ سب تصویریں جو تو نے بنائی ہیں؟“ اس نے نادبہ کے بالوں کو زور کا جھکا دیا۔ نادبہ کی کراہ نکلی۔ اس کو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ بلال تک یہ بات کیسے پہنچ گئی۔ کیونکہ ابھی تو اس نے بلیک میلنگ شروع بھی نہیں کی تھی۔ وہ مسلسل انکار کرتی رہی کہ اسے کسی تصویروں کا علم نہیں۔ مگر بلال آہستہ آہستہ وحشی ہوتا گیا۔ وہ نادبہ کے منہ میں پکڑا ٹھونس کر اس پر تشدد کرنے لگا۔ ادھر زین نے اکتا کر نادبہ کے لیپ ٹاپ کا کیمرا آن کر دیا کہ دیکھے تو کسی وہ کہاں مصروف ہو گئی ہے۔ مگر سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کو ہکا بکا کر دیا۔ نادبہ کے چہرے پر خون لگا ہوا تھا اور وہ سک رہی تھی۔ جبکہ بلال نے ابھی تک اسے بالوں سے پکڑا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ کہا۔

”آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں، بتاؤ وہ تصویریں کہاں ہیں؟“ زین کو فوراً خیال آیا کہ اس کے جرم کی سزا نادبہ جھگڑ رہی ہے۔ اگر وہ بلال کو تصویر نہ بھیجتا تو نادبہ کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ اس نے اسکرین پر ریکارڈنگ آن کر دی تھی۔ نادبہ کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ اسے اپنی جان بچانے کے لیے بتانا پڑا کہ تمام تصاویر اس کے لیپ ٹاپ میں موجود ہیں۔ بلال غوری نے اس کا لیپ ٹاپ چیک کیا اور فولڈر تک پہنچتے ہی اس نے بے تابی سے کھولا تو اندر اتنی

تصاویر اور ویڈیوز اپنے پاس محفوظ کر لیں اور وہ سافٹ ویئر زویے ہی رہنے دیے تاکہ مزید کوئی معلومات حاصل ہوں سکیں۔

اسے بلال غوری کے ذاتی ای میل ایڈریس کا پتا تھا کیونکہ بہت دفعہ اس نے نادبہ کا میل باکس چیک کیا تھا۔ اس نے ایک بہت واضح تصویر جس میں دونوں کے چہرے اور کتوت صاف نظر آرہے تھے، بلال غوری کو بھیج دی اور ساتھ لکھ دیا میرے پاس ایسی بہت ساری موجود ہیں۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ اگر اتنی بات تمہاری سمجھ میں آگئی تو اگلی بات کریں گے۔ زین نے احتیاط کے پیش نظر وہ ای میل ایک انٹرنیٹ کیبنے سے آئی ڈی بنا کے بھیجی۔ حالانکہ اس کو اس بات کی امید نہیں تھی کہ بلال غوری اتنی تفصیل میں جائے گا لیکن وہ ہر امکان پر نظر رکھ رہا تھا۔ اس نے احتیاطاً اپنا نمبر بھی بند کر دیا تھا اور ایک نمبر نیلے لیا تھا۔ تاکہ نادبہ بھی اس سے رابطہ نہ کر سکے۔ مگر اسے اچانک یاد آیا کہ اس کے دوست کی شادی بھی آزاد کشمیر میں جہاں شمولیت کے لیے رحیم یار خان سے دو دوست آرہے تھے اظہر اور خاور اور ان کے ساتھ اس نے مری سے جیل کو لیتے ہوئے ملک اور سلمان کی شادی میں شامل ہونا تھا۔ اور وہ آج شام کو کسی وقت پہنچنے والے ہوں گے یا پہنچ گئے ہوں۔ اور وہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں مگر اس کا نمبر تو بند تھا۔ اس لیے اس نے نئے نمبر سے خاور کو ایک پیغام بھیج دیا اور یہ لکھا کہ یہ کسی اور کا نمبر ہے اس کا پرس اور موبائل فون چوری ہو گیا ہے۔ وہ کسی ذاتی مسئلے میں الجھ گیا ہے وہ اپنے پروگرام کے مطابق چلیں، وہ ان سے جلد آئے گا۔ خاور کا نمبر اس کی یادداشت میں محفوظ تھا، باقی ابھی تک اس نے صرف ضروری نمبر ہی اپنی فون بک میں محفوظ کیے تھے۔

☆☆☆

بلال غوری کے لیے وہ ای میل ایک دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا شک نادبہ پر ہی گیا تھا کیونکہ نادبہ کے سوا دفتر کے پرائیویٹ کیبن میں کسی کی رسائی نہیں تھی۔ بس بھی بھار آفس ہوائے اور کلینر صفائی کی غرض سے آتے تھے مگر وہ اتنی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی وہ اتنے قابل تھے۔ نادبہ کو اکثر اوقات وہ رات دیر تک کام کے بہانے روک لیتا تھا۔ نادبہ شروع شروع میں بہت خوف زدہ تھی مگر پھر تحائف،

زیادہ تصاویر اور ویڈیوز دیکھ کر وہ مزید غضبناک ہو گیا، اس نے نادیر کے چہرے پر زور کا پتھر مارا۔ زین مسلسل اسکرین پر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا جو ساتھ ساتھ اس کے کمپیوٹر میں محفوظ بھی ہو رہا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے بیٹھے خوف محسوس ہونے لگا۔ پھر بلال غوری نے نادیر سے پوچھا۔

”تم نے مجھے جو تصویر بھیجی تھی وہ کس کے ذریعے بھجوائی تھی؟ اور وہ تصویر بھی ڈیلیٹ کر دہی ای میل سے؟“ نادیر تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔

”میں نے کوئی تصویر نہیں بھیجی، ابھی تو صرف بنائی تھی۔“ سمجھتی تو دو ہفتوں بعد بھی جب میں کسی اور شہر چلی جاتی خاموشی سے..... تم کو تصویر بھیج کر یہاں اس طرح سکون سے بیٹھی ہوئی؟“ یہ نہ کرو ابھن میں پڑ گیا۔ نادیر کی بات بالکل ٹھیک تھی وہ اسی شہر اور اسی فلیٹ میں رہ کر کم از کم اتنی بڑی بے وقوفی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اگر یہ بات سچ تھی تو یہ اس سے بھی بڑی پریشانی تھی کہ یہ تصویریں کسی اور کے پاس بھی موجود ہیں۔ مزید تشدد کرنے پر نادیر صرف یہ بتا سکی کہ اس نے ابھی تک کسی اور کو وہ تصویریں دکھائی ہیں نہ کسی کو پتا ہے۔ یہ صرف لیپ ٹاپ میں محفوظ تھیں۔ اسے نہیں معلوم کہ کیسے کسی اور کے پاس چلی گئیں۔

”کیا تمہارا لیپ ٹاپ کوئی اور بھی استعمال کرتا ہے؟“ اس نے استفسار کیا تو جان بہ لب نادیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ نادیر اس رخ پر لیپ ٹاپ رکھ کر استعمال کر رہی تھی کے پورے کمرے کا منظر واضح نظر آ رہا تھا اس لیے اس کمرے میں ہونے والی ایک حرکت زین اپنے فلیٹ پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ بلال نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بندے کو اشارہ کیا، وہ لیپ ٹاپ لے کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ زین کو اس کا چہرہ بالکل اسکرین کے سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ کے ساتھ پھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور کچھ دیر بعد اس نے گویا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

”سریہ لیپ ٹاپ بگڑ ہے، یعنی اس لیپ ٹاپ پر ہونے والی ہر سرگرمی اور فائل کسی دوسرے بندے کے پاس جا رہی ہے۔“

وہ آدمی دراصل اس کی کمپنی میں آئی ٹی کا ماہر زبیر احمد تھا اور ساتھ ہی اس کا خاص آدمی بھی۔ اسی نے نادیر کو دفتر میں لیپ ٹاپ انٹرنیٹ کی سہولت دینے سے انکار کیا تھا۔ یہ بات پتا لگنے کے بعد نادیر ایک دفعہ پھر بلال غوری کے قہر کا نشانہ بنی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی سانس نے اس کا زیادہ دیر ساتھ نہیں دیا اور وہ یہ بتاتے بتاتے چپ ہو گئی کہ اسے زین

نے یہ لیپ ٹاپ دیا تھا اس کے علاوہ اسے کچھ پتا نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ زین کو اب وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی کیونکہ زبیر نے لیپ ٹاپ اپنے رخ پر رکھا ہوا تھا۔ پھر اچانک بلال کی آواز ابھری۔

”زبیر یہ لیپ ٹاپ پکڑو اور نگو یہاں سے، مجھے لگا ہے یہ میری ہے۔“ زبیر نے جب تک بیک اینڈ پر چلے والے تمام سوفٹ ویئر اور نوٹس ختم کر دیے تھے۔ بلال کے کہنے پر زبیر نے فلیٹ کے اندر گیس کا چو لھا کھلا چھوڑ دیا اور دوسرے کمرے میں ایک موم بتی جلا کر رکھ دی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ فلیٹ ایک خطرناک آگ کا شکار ہونے والا تھا۔ انہوں نے وہاں اپنی موجودگی کے تمام اثرات مٹائے اور خاموشی سے فلیٹ سے نکل آئے۔ ادھر زین نے بھی ان دونوں کی آخری بات یہی سنی تھی کہ نادیر میری ہے۔ اور اس کی آنکھوں کے آگے اندر اچھانا شروع ہو گیا۔ اس کی ایک چھوٹی سی غلطی نے نادیر کی جان لے لی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور ان میں آنسو بھی تھے۔ نادیر چاہے کسی بھی لڑکی کی عمر وہ اس کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی لیکن وہ زیادہ دیر اس کیفیت میں نہیں رہ سکا۔ اسے علم تھا کہ اگر اس نے جلد ہی اپنے تنک پہنچنے والے تمام رستوں کو بند نہ کیا تو وہ جلد ہی اس تنک بھی پہنچ جائے گا۔

اس نے سب سے پہلے اپنی پر دو فائل کو ڈی ایکٹیویٹ کیا جس پر وہ نادیر سے بات کیا کرتا تھا۔ اور پھر اگلے دن صبح صبح ہی اپنا فلیٹ چھوڑ کر ایک سستے علاقے میں بیٹھ کر اپنے پرلے لی۔ اپنے دفتر پر بھی اس نے برائے فروخت کا پور ڈنگا کر ایک فرضی نمبر لکھ دیا تھا۔ اب کسی حد تک وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ اپنے طور پر اس کی احتیاط کا کافی قہر وہ ایک آن دیکھے جال میں مقید تھا جس کی صرف ایک کڑی اس نے ابھل کی تھی باقی ساری کڑیاں کلی تھیں اور انہی کڑیوں کو جوڑ کر بلال غوری اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

☆☆☆

زبیر احمد نے نادیر کے لیپ ٹاپ سے تمام کام کی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ نادیر نے جس لڑکے زین کی بات کی تھی، اس کی اپنی پر دو فائل تو سوشل میڈیا سے غائب ہو چکی تھی یعنی اس نے اس کو ختم کر دیا تھا۔ مگر ایک گروپ سے اس کے متعلق اور اس کے کچھ دوستوں کے متعلق اسے کافی اہم چیزیں ملیں تھیں۔ نادیر بھی اسی گروپ کا حصہ تھی اس لیے زبیر کو بہت زیادہ تنگ و دو نہیں کرنی پڑی معلومات نکالنے کے لیے۔ گروپ میں اس نے چھ بندوں کو

سے نوازے گا۔

زیر نے ان چھ لوگوں کی ایک فائل تیار کی تھی جس میں ان ساری معلومات کا احاطہ کیا تھا اور ساتھ ہی تصاویر بھی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک الگ فائل تیار کی تھی جو صرف زین کے متعلق تھی جس میں اس کے بارے میں کافی محدود معلومات تھیں جیسے اس کا موبائل نمبر اور اس کی کچھ تصاویر جو اسی گروپ میں دوسرے کسی نمبر نے لگائی تھیں جب اس کی اور زین کی کہیں ملاقات ہوئی تھی۔ نادیہ ان میں سے کسی کے ساتھ ایڈریس بھی مگر اب زیر نے نادیہ کی آئی ڈی سے ان سب کو ایڈ کر لیا تھا۔ زیر اتنی سہولت سے اس لیے نادیہ کی پرسل آئی ڈی استعمال کر رہا تھا کہ نادیہ کا پاس ورڈ خود کار طریقے سے محفوظ تھا ویب براؤزر میں، یعنی ایک دفعہ پاس ورڈ ڈالنے کے بعد وہ اس میں محفوظ ہو جاتا تھا اور بار بار پاس ورڈ ڈالنے کا جھنجھٹ ختم ہو جاتا۔ لیکن اسی ایک چھوٹی سی سہولت نے نادیہ کی آئی ڈی کو بنا ہیک کیے کسی دوسرے کی دسترس میں دے دیا تھا۔ اب زیر کو ان سب کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا بھی تاکہ وہ ان سب کو ٹریک کر کے دائرہ کو بخبری کر سکے۔

آج کا دن انتہائی تھکا دینے والا تھا کیونکہ وہ صبح سے اپنے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا۔ آج ہی اتفاق سے اس نے بہت کام کی خبریں دی تھیں۔ سوہان نامی لڑکی نے اپنی پرد فائل پر جب یہ خبر لگائی تھی کہ وہ ایک انڈین فلم دیکھنے لاہور کے ایک سنیما میں گئی ہے اپنی فیملی کے ساتھ تو زیر نے فوراً پتا کر دیا تھا تو ان پر بھی اور انٹرنیٹ سے بھی کہ یہ فلم لاہور کے کتنے سنیما گھروں میں نمائش کے لیے پیش کی گئی ہے۔ لاہور میں کل تین سنیما گھر ایسے تھے جو اس فلم کے قانونی حقوق رکھتے تھے۔ اس لیے اس نے ان تینوں سنیما گھروں کے نام دائرہ کو بتا دیے اور ساتھ ہی کہا کہ وہ اس کے بھائیوں کی وجہ سے اس کو پہچان سکے ہیں اس لیے تینوں سنیما گھروں میں اپنے بندے بھیج دے اس کے بھائیوں کی تصویریں دے کر۔ دائرہ فوراً حرکت میں آیا تھا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سوہانے دوبارہ لکھا کہ انٹرول ہے اور وہ ریلیف شیڈول کر رہے ہیں تو زیر نے دوبارہ یہ اطلاع دائرہ کو دے دی تھی۔ اور آخر کار اس کے بندوں نے فورٹریس اسٹیڈیم سے سوہان نامی لڑکی کو کامیابی سے اٹھایا تھا۔ اسی دوران عائشہ نامی لڑکی نے بھی اپنے گھر کی گیلری سے دوبارہ کچھ تصاویر لگائی تھیں۔ اس دفعہ تصویریں اس کے اپنے گھر کا گیٹ اور گیلری کا جنگلا بھی بہت نمایاں تھا۔ ایڈریس تو

چتا تھا جن میں سے کوئی نہ کوئی ضرور زین سے متعلق کچھ کام کی معلومات مہیا کر سکتا تھا۔ اس نے دو لڑکیوں کو بھی اس ٹک کے دائرے میں رکھا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں جو بات بندہ لڑکوں سے شیئر نہیں کرتا وہ کسی نہ کسی لڑکی سے ضرور کر دیتا ہے جیسے اپنی اور اپنی فیملی کی ذاتی معلومات وغیرہ جبکہ وہ ایک دوسرے پر کافی اعتماد بھی کرتے ہوں۔ زیر نے ان دونوں لڑکیوں اور باقی چار لڑکیوں کی پرد فائل، معلومات اور تصاویر محفوظ کر لی تھیں، دونوں لڑکیاں کافی محتاط تھیں نہ ان کی کوئی تصویر موجود تھی اور نہ ہی کوئی اور سراخ کہ وہ لاہور کے کس ایریا میں رہتی ہیں۔ انہوں نے صرف اپنے شہر کا نام لکھا ہوا تھا اور کچھ خاص نہیں۔ زیر نے کھنٹوں پیچھے کر ان دونوں لڑکیوں کے متعلق کچھ شواہد اکٹھے کیے تھے ان کی پرد فائل سے۔ سوہا انٹرنیٹ لڑکی نے اپنے بھائی کی شادی کی تصاویر لگائی تھیں جس میں اس کے کزن اور بھائی بھی تھے۔ اس نے وہ تصاویر محفوظ کر لیں۔ کیونکہ اگر بھائیوں تک وہ پہنچ جاتے تو بہن کو بھی آسانی سے ٹریک کیا جاسکتا تھا۔ جبکہ دوسری لڑکی نے اپنے گھر کے سامنے ایک میوہل پارک کی تصاویر شیئر کی ہوئی تھیں جو اس نے اپنے گھر کی گیلری سے بنائی تھیں۔ تصویر کو اطلاع کر کے دیکھنے سے اسے پارک میں لگے ٹیوب ویل اور اس کے میٹر کا نمبر ملا جو کہ انتہائی وحشتناک تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس کو مزید واضح کر کے نمبر حاصل کر لیا تھا۔ پھر اس نے لاہور میں اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے اس میٹر کی بالکل اصل لویشن معلوم کر لی تھی کہ وہ ماڈل ٹاؤن کے کس پارک میں لگا ہوا ہے۔ لڑکوں نے البتہ کوئی خاص احتیاط نہیں کی تھی۔ ان سب کی تصاویر اور باقی سرگرمیوں کی تفصیل آسانی سے مل گئی تھی۔ اس نے ایک اور بندے کی مگر اس نے بھی مارک کیا تھا جو کہ پشاور میں کسی فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس نے دفتر کی ریسپشن پر بیٹھ کر اپنی تصویر بنوائی تھی جس کی وجہ سے اس کے پیچھے کا سارا منسٹریش کے دورازے سے نظر آ رہا تھا۔ اس کے بالکل عقب میں ایک مشہور چائیز ریسٹورنٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ پورے پشاور شہر میں اس نام کے صرف دو ہی ریسٹورنٹ تھے۔ اس لیے وہ بندہ بہت آسانی سے ٹریک ہو سکتا تھا مگر اس نے اس کو خود ہی لسٹ سے نکال دیا۔ کیونکہ گروپ کی گفتگو سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ زین کے متعلق کوئی خاص معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔ یہ سارا کام زیر نے بہت جانتاشانی سے کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ بلال اسے ضرور کسی بڑے انعام

تقریباً اس کو معلوم تھا ہی مگر اب بہت واضح ہو گیا تھا اور سونے بے سہاگہ یہ کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے ایک لمبے کی تاخیر کے بعد داور کو بتایا۔ داور بھی کچھ دیر کے لیے یوٹھلا گیا تھا کیونکہ اسے ایک وقت میں بہت سارے لوگوں کو پینڈل کرنا تھا۔ انوا کاروں کو بھی اور انوا کنندگان کو بھی۔ اس کے پاس آدیوں کی کمی نہیں تھی مگر بلاں کی ہدایت کے مطابق مطلوبہ بندے کے علاوہ کسی کو جانی یا کوئی اور نقصان نہیں پہنچانا تھا اور کام بھی نہایت صفائی سے کرنے کو کہا تھا۔ اس لیے داور اپنے محدود ہونے سے زچ ہو رہا تھا۔ بہر حال اس نے ریاض اور سارہ کو فوراً بھیج دیا تھا۔ ریاض ایک کوریئر کمپنی کا ڈرائیور تھا اور ساتھ ہی داور کے لیے بھی تبکار غیر قانونی کام بھی کرتا تھا۔ کام کی نوعیت منشیات یا غیر قانونی اسلحہ ایک شہر سے دوسرے شہر لے کر جانا تھا کوریئر کمپنی کی گاڑی کا استعمال کرتے ہوئے۔ اسی لیے اس دفعہ بھی ریاض نے سارہ کے ساتھ مل کر بھی گاڑی استعمال کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور پھر اپنا مشن ... کامیاب ہونے کی خبر دی تھی۔ داور نے اسے مزید ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مسیر سے رابطہ کرے کیونکہ اس کے پاس دوسری لڑکی ایک محفوظ لوکیشن پر بے ہوش پڑی تھی۔ اسے بھی اسی گاڑی میں ڈال کر سارہ کے ساتھ آزاد کشمیر آ جائے۔ اس دوران وہ ان لڑکوں کی طرف جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جو کہ تازہ ترین اطلاع کے مطابق وادی نیلم کی طرف گئے تھے۔ ان کو پہچانا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ ان سب کی تصویریں داور کے پاس موجود تھیں۔ داور نے اس جگہ کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کیونکہ زیر نے بتایا تھا کہ جلد یا بدیر سب لڑکے آزاد کشمیر میں اکٹھے ہوں گے اور ہو سکتا ہے زمین بھی وہیں آجائے۔

☆☆☆

ملک ارسلان اپنے تینوں دوستوں کو ساتھ لے کر وادی نیلم آ گیا تھا۔ یہاں کا ہر راستہ اس کا دیکھا بھلا تھا، وہ میزبان کے ساتھ ساتھ گاڑی کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا کیونکہ آسمان پر کہیں کہیں آوارہ بادل کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے اور ساتھ ہی دھوپ بھی وادی کو روشن کر رہی تھی۔ ہر طرف سبزہ سبزہ ہی مزہ اور مبہوت کر دینے والے مناظر تھے۔ جمیل اور ملک ارسلان کے لیے تو کچھ نیا نہیں تھا مگر خاور اور اظہر قدرت کے اس حسن سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ وہ چاروں تصاویر بناتے اور سیر سیاحت میں مصروف تھے جب ایک جیب ان سے کچھ

فاصلے پر آ کر رکی۔ کیونکہ وہ ڈرامزک سے فاصلے پر چل رہے تھے اس لیے جیب کا وہاں تک آنا ممکن نہیں تھا۔ اس میں سے چار بندے اترے، جنہوں نے دھوپ اور ہلکے سے موسم کے باوجود گرم چادریں لی ہوئی تھیں۔ ان چاروں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ملک ارسلان سے کہا۔

”وہ سامنے جیب دیکھ رہے ہو؟ چپ چاپ جا کر اس جیب میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ ہی اپنے تینوں دوستوں کو بھی لے چلو ورنہ.....“ اس نے دانست اپنا جملہ ادھر اچھوڑ کر اپنی چادر کچھ دیر کے لیے ہٹائی جس کے نیچے ایک خطرناک آٹو بیک رائل نظر آ رہی تھی جو اس کے شوڈر بیلت کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے ہاتھ میں بھی ایک عدد پستول تھا جو بادی انفتر میں کوئی کھلونا نما چیز لگ رہی تھی مگر اس کی بھیاں ایک اور کالی بیرل موت کا خوف پیدا کر رہی تھی۔ ملک ارسلان کے لیے یہ بہت سبکی اور پریشانی کی بات تھی۔ ایک تو آج سے دو دن بعد اس کی شادی تھی اور دوسرا اس کے علاقے میں اسی کے مہمانوں کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔

”تم کون ہو اور کیا چاہیے تم کو؟“ اس کے جواب میں ارسلان کو اس آدمی نے جو کہ داور تھا ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ خاور، اظہر اور جمیل سے دونوں ڈرا دور تھے اس لیے گفتگو تو ان کی سمجھ میں نہیں آئی مگر ملک ارسلان کو تھپڑ پڑتے دیکھ کر وہ فوراً اپنے دوست کی مدد کو بھاگے۔

جیسے ہی وہ پاس آئے، داور نے ان پر پستول تان لیا۔ وادی میں اس وقت بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اس لیے دوسروں کی نظر میں یہ کارروائی آنے کا امکان بہت کم تھا۔ ان سب کے لیے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ ان تینوں کو یہی محسوس ہوا کہ ملک ارسلان کی کوئی ذاتی رجحان ہے جس کی زد میں یہ لوگ بھی آ گئے ہیں۔ ملک ارسلان ایک طرف نظر میں جھکا کر کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں اس تبدیلی پر چل رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اس آدمی کی کھوپڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا مگر فی الوقت وہ کسی بھی بے وقوفی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک تو اس کے دوست ساتھ تھے دوسرے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ داور نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔

”اب سیدھے اس جیب میں جا کر بیٹھ جاؤ تو اچھا ہو گا۔ ورنہ مجھے مجبوراً تم سب کی ٹانگیں تو ڈر لے جانا پڑے گا۔“ وہ چاروں بے بسی کا احساس لیے ہوئے جیب کی

کو گیت پر تعینات کر دیا۔ ریاض صوفے پر لیٹا لیٹا خوابوں کی وادی میں چلا گیا تھا۔ جبکہ داور سارہ کے ساتھ اپنے خاص کمرے میں آگیا۔ ان کے جانے کے بعد اظہر، خاور اور جمیل نے ملک ارسلان سے تقشیش شروع کر دی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں، انہوں نے ہمیں کیوں اغوا کیا ہے؟ ملک ارسلان کے پاس کوئی جواب ہوتا تو وہ دیتا۔ اس کی لاعلمی اور بھی تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ اتنے پریشان تھے کہ کمرے میں موجود دوسرے کونے میں دونوں لڑکیوں پر بھی توجہ نہ دے سکے جو مسلسل ان کو شک کی کیفیت میں غورے جا رہی تھیں۔ آخر سوا نے لڑکی زبان سے کہا۔

”ارسلان بھائی.....! کیا یہ آپ ہیں؟ یہ اظہر، جمیل اور خاور آپ کے ساتھ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ عائشہ نے بھی ہمت کر کے کہا۔ ”میں آپ سب کو جانتی ہوں۔“ ان چاروں کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا کہ وہ اتنی دور یہاں اجنبی لڑکیوں سے اپنا نام سن رہے ہیں۔ عائشہ اور سوا ان چاروں کے لیے اجنبی ہی تھیں کیونکہ انہوں نے بھی ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ چاروں ان دونوں کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ سوا اور عائشہ نے ان چاروں کی کئی تصاویر دیکھی ہوئی تھیں اس لیے وہ فوراً سے پہلے ان کو پہچان گئی تھیں۔ ملک ارسلان کو ابھی تک اپنی بے عزتی نہیں بھولی تھی مگر کمرے کی صورت حال نے فوری طور پر اس کو اس شک کی کیفیت سے نکال دیا تھا۔ اس نے سوا سے پوچھا۔

”آپ نے مجھے بھائی کہا ہے اور میرے دوستوں کے نام بھی لیے ہیں، آپ ہم سب کو کیسے جانتی ہیں؟“ جواب میں جب سوا نے اپنے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی عائشہ نے بھی اپنا تعارف کروایا تو ایک لمحے کے لیے وہاں سناٹا چھا گیا۔ یہ چھ کے چھ لوگ ایک دوسرے کے انٹرنیٹ پر دوست تھے اور ایک ہی گروپ کے ممبر بھی۔ سوا اور ملک ارسلان منہ بولے بہن بھائی بنے ہوئے تھے۔ یہ سارا گروپ ایک میٹلی کی طرح ہی تھا۔ لیکن ان کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر ان سب کو کس مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ یہ سب کسی بڑی منصوبہ بندی اور سازش کا شکار ہوئے تھے۔

اسی سوچ اور کنکشن میں ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا پھر چانک کمرے کا دروازہ کھلا اور داور اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ فائلیں تھیں اور سارہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں دروازے کے بالکل سامنے کھڑے ہو گئے۔ داور کی آنکھیں مسلسل عائشہ اور سوا پر جمی ہوئی تھیں۔

طرف چل پڑے۔ داور ان کے پیچھے پیچھے جموتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ سب خوف اور حیرت کے طے جلے تاثر لیے جیب میں جا بیٹھے۔ داور کے حکم پر جیب اسٹارٹ ہوئی اور واپسی کے راستے پر چل پڑی لیکن اس سے پہلے ان چاروں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ ایک گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو کے بعد وہ لوگ داور کے خفیہ ٹھکانے یعنی ریٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

☆☆☆

ریاض اور سارہ نے داور کی ہدایت کے مطابق ضمیر سے رابطہ کیا پھر وہ اس کے ٹھکانے پر پہنچ گئے جہاں اس نے سوا کو چمپا کر رکھا ہوا تھا۔ عائشہ پہلے ہی ریاض کی گاڑی میں موجود تھی۔ ضمیر کے پاس پہنچنے ہی انہوں نے جلدی سے بے ہوش سوا کو گاڑی میں منتقل کیا اور دونوں کو ایک بار پھر بے ہوش کا انجکشن لگا دیا تاکہ اگلے چار پانچ گھنٹے وہ ہوش میں نہ آسکیں۔ اس کے بعد ریاض اور سارہ آزاد کشمیر کی طرف نکل پڑے۔ ان کو راستے میں کافی چیک پوسٹوں پر رکنا پڑا، مگر گاڑی پر مہنی کے نام اور ریاض کی واقفیت اور سلام دعا سے وہ پتا کسی خاص پریشانی کے مسلسل سفر کے بعد آزاد کشمیر پہنچ گئے۔ وہ کہیں آرام کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ ریٹ ہاؤس پہنچنے ہی سارہ اور ریاض نے دونوں لڑکیوں کو گاڑی سے ایک کمرے میں منتقل کیا، پھر دونوں کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے۔ تب تک انہیں ہلکا ہلکا ہوش آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کمرے میں سوائے ایک قالین کے کچھ نہیں تھا، نہ کوئی کھڑکی نہ کوئی اور سامان کہ جس کی مدد سے وہ فرار ہونے کی کوشش کرتیں۔

سارہ نے دروازہ لاک کیا اور باہر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ اسے داور کا انتظار تھا جو کہ وادی نکیم گیا ہوا تھا۔ ابھی ان کو بیٹھے ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر جیب کے رکنے کی آواز آئی۔ سارہ باہر دروازے کی طرف بڑھی جبکہ ریاض اتنی لمبی ڈرائیونگ کے بعد لاؤنج میں لمبی تان کر لیٹ گیا تھا۔ داور چار لڑکوں کو گن پوائنٹ پر لے کر اندر داخل ہوا۔ سارہ کو دیکھ کر داور مسکرایا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکیاں بھی خیریت سے یہاں تک پہنچ چکی ہیں۔ داور نے بھی ان چاروں لڑکوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے باندھ دیے اور اسی کمرے میں جہاں پہلے دولڑکیاں موجود تھیں، بند کر دیا لیکن اس سے پہلے وہ ان کی آنکھوں کی پٹیاں ہٹا چکا تھا۔ اپنے دو آدمیوں کو اس نے ریٹ ہاؤس اور اندر گرد نظر رکھنے کی ذمہ داری سونپ دی اور ایک آدمی

وہ دونوں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ رہی تھیں اور ایک کراہت کا احساس ان کے اندر پیدا ہو رہا تھا۔ جبکہ داور کو دوبارہ دیکھ کر ملک ارسلان پھر سے اسی جذبائی کیفیت میں چلا گیا۔ اس کے چہرے پر سرخی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خاور اور جمیل خاموشی سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ اظہر نے اس دفعہ گفتگو کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ اظہر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ داور نے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس نے اظہر کو مخاطب کر کے کہا۔

”تم سب لوگ یقیناً یہ سوچ رہے ہو گے کہ تم کو یہاں کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے، تو میں بتاتا چلوں کہ مجھے کچھ معلومات چاہئیں ایک بندے کے متعلق اور میں جانتا ہوں تم لوگ اس کے بارے میں کافی جانتے ہو۔ اس لیے اگر تم نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا اور کوئی بات نہ چھپائی تو تم سب لوگ آرام سے واپس گھر جا سکو گے، اگر تم لوگوں نے تعاون نہ کیا تو پھر نتائج کے ذمے دار تم خود ہو گے۔“

اظہر نے فوراً کہا۔ ”آپ جو پوچھیں گے، ہم بتا دیں گے مگر آپ لوگ ہمیں یہاں سے جانے دیں، میرے اس دوست کی برسوں شادی ہے۔ اور یہ جو دونوں لڑکیاں ہیں پتا نہیں ان کے گھروالوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ پلیز آپ کو جو معلومات چاہئیں ہم بتانے کو تیار ہیں۔“

”شاہاں! تم کافی عقلمند لگتے ہو۔“ داور نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”تو مسٹر عقلمند..... بات یہ ہے کہ مجھے تمہارے دوست زین کے متعلق معلومات درکار ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا یا ہو سکتا ہے۔ اور کس کس جگہ اس کے ملنے کی امید ہے؟“

زین کا نام سننے ہی سب کے چہرے پر ایک دم حیرت اور بے یقینی کے تاثرات نظر آئے۔ تو گویا اس سارے مسئلے کا اصل محرک زین تھا۔ اظہر کو لگا کہ اس نے جلد بازی میں غلطی کی ہے، وہ زین کے متعلق اگر اس کو بتا دے تو یہ بندہ ضرور زین کو نقصان پہنچائے گا۔ کیونکہ اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ اس وقت سے مسلسل کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا جبکہ سارہ واپس لاؤنج میں چلی گئی تھی۔ اس کی خمار آلود آنکھیں بار بار جھپک کر کانٹہ اور سو با پر جا لگتی تھیں۔

اظہر نے داور سے کہا۔ ”ہم زین کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے، ہم بس انٹرنیٹ کے دوست ہیں۔ اس سے صرف سلام دعا کی حد تک گپ شپ ہے۔“

داور نے اپنے ہاتھ میں موجود فائلوں میں سے ایک کو

کھول کر اس میں سے ایک تصویر نکالی اور اظہر علی کی جانب پھینک دی۔ ”مجھے لگتا ہے تم لوگ گھر نہیں جانا چاہتے شاید۔“ داور غضب ناک آواز میں بولا۔

تصویر اظہر کے بالکل سامنے آ کر گر کر پڑی لیکن اس کا رخ نیچے کی جانب تھا، اس نے جھک کر تصویر اٹھائی اور اس کا رخ اپنی جانب کیا۔ تصویر دیکھ کر اب اس کے اپنے حواس پر بجلی گری تھی۔ یہ اس کی اپنی تصویر تھی زین اور جمیل کے ساتھ، ایک معروف ریسٹورنٹ میں جہاں وہ ایک دفعہ ملے تھے اور کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے تصویر بنائی تھی۔

”اب کیا کہتے ہو مسٹر عقلمند؟“ داور نے اظہر کا گریبان پکڑ کر کہا۔ ”تم لوگوں کے پاس صرف اور صرف ایک آخری موقع ہے، اگر تم لوگوں نے تعاون نہ کیا کوئی چالاکی دکھائی تو پھر میں اپنی مرضی کروں گا جو مجھے یقین ہے تم لوگوں کو پسند نہیں آئے گی خاص طور پر ان لڑکیوں کو تو بالکل پسند نہیں آئے گی۔ تم لوگ آپس میں مشورہ کر لو، میں دس منٹ بعد دوبارہ آتا ہوں۔“ داور یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

ان سب نے آپس میں سر جوڑ لیے مشورہ کرنے کے لیے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اظہر اور جمیل دونوں آنے والے حالات اور داور کی دھمکی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم جتنا بھی جانتے ہیں ہمیں بتانا چاہیے کیونکہ یہاں ہمارے ساتھ لڑکیاں بھی ہیں، ہماری کسی قسمی غلط بیانی یا بھوٹ سے وہ ان کے ساتھ برا سلوک کر سکتے ہیں جو کہ ہمیں ہرگز منظور نہیں۔ زین ابھی ان کی پہنچ سے دور ہے، ہو سکتا ہے جب تک یہ اس تک پہنچیں ہم کو یہاں سے جانے دیا جائے پھر رابطہ ہوتے ہی زین کو آگاہ کر دیں گے۔ جبکہ خاور اور ملک ارسلان محاذ آرائی کا سوچ رہے تھے۔ لیکن کانٹہ اور سوہانے خاور اور ملک ارسلان کو اس قسم کی بے وقوفانہ محاذ آرائی سے روک دیا تھا۔ آخر کار وہ سب ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ گئے۔ اس لیے جب دوبارہ داور آیا تو انہوں نے حتی الامکان جو کچھ جانتے تھے بتا دیا۔ داور زیادہ مطمئن تو نہیں ہوا مگر ان کو تھوڑا وقت ضرور مل گیا تھا اور بات مکمل پر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

بلال کو داور کی نیت پر شبہ تھا۔ وہ جانتا تھا داور اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی گیم ضرور کرے گا اس لیے اس نے زیر کو کہا تھا کہ داور کو جو بھی خرد سے ساتھ ساتھ اسے بھی بتائے اور ان سب لوگوں کے نمبر حاصل کرے جو اس وقت داور کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ زین، داور کی تحویل میں جتنی دیر زیادہ رہتا، اتنا ہی بلال کے لیے مسئلہ بن سکتا تھا۔ کیونکہ

زین کے پاس ایک تو بلال اور نادیر کی تصاویر اور وید یو ٹیوٹس اور دوسرا نادیر اس کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔ اس نے حتی الامکان نادیر کے قلیٹ سے اپنے ہونے کے آثار مناد دیے تھے مگر بقول زبیر بید نہیں تھا کہ زین کے پاس نادیر کے قتل کی وید یو بھی موجود ہو۔ کیونکہ جب بے پناہ تشدد کی وجہ سے نادیر کی موت واقع ہوئی، وہ اس وقت زین سے بات کر رہی تھی اور اس کا کیرا بھی آن تھا۔ اس کی تمام ریکارڈنگ زین کے پاس جاری تھی۔ بلال کے لیے یہ دونوں معاملات اپنی زندگی میں فی الحال سب سے زیادہ اہم تھے۔ اگر وہ تصاویر ایک ہو جاتیں تو اس کی تمام تر سیاسی سادھ ختم ہو جاتی اور قتل عہد کی وید یو بھی منظر عام پر آتی تو سیاست کے ساتھ زندگی بھی چلی جاتی۔ زبیر احمد نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے تھے کہ وہ داور کے کارندوں سے کس طرح رابطہ کر سکتا ہے اور ان سے ہونے والی ہر پیش رفت کا علم فوراً لگا سکتا ہے۔ خاص طور پر زین نامی لڑکے کے متعلق جو بھی معلومات ملتی جا سکیں، وہ پہنچاتے رہیں۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد آخر ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ اس نے داور کے نمبر کا ریکارڈ حاصل کیا۔ بلال کی وجہ سے اسے ان معلومات کے حصول کے لیے زیادہ تر دزد نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس نے اپنے موبائل سے داور کو کئی کالز کی تعداد اور وقت نوٹ کیا۔ خاص طور پر جب اس نے داور کو کوئی خبر پہنچانی تھی تو لازماً بات بھی داور نے اسی کال کے فوراً بعد اپنے کسی کارندے کو کال کی ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ دونوں لڑکیوں اور چاروں لڑکوں کو کامیابی سے ٹریک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس وقت وہ داور کے کسی خفیہ ٹھکانے پر موجود تھے۔ داور نے بلال غوری اور زبیر احمد دونوں کو اپنے اس ٹھکانے کے متعلق کوئی معلومات نہیں دی تھیں۔ زبیر احمد نے کافی غور و خوض کے بعد چار پانچ نمبرز نکال کر میٹریک ٹوٹ کر لیے تھے۔ اسے یقین تھا کہ یہ وہی لوگ ہوں گے جو اس وقت داور کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس نے بلال کو تمام تفصیلات کے ساتھ وہ نمبر مہیا کر دیے۔ بلال غوری نے اس سے نمبر لیے اور اپنے پرائیویٹ سبیل میں چلا گیا۔ وہ شاید اکیلے میں ان سب سے بات کرنا چاہتا تھا۔ زبیر احمد ابھی اس بات کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اسے داور کی کال آگئی۔ داور نے اسے بتایا کہ ان چھ افراد سے کوئی خاص کام کی بات نہیں معلوم ہوئی کیونکہ وہ سب اس کے متعلق بہت کم جانتے تھے صرف اس کی ایک دکان اور قلیٹ کا بتایا ہے جس کو میں نے پہلی فرصت میں چیک

★ ★ ★

وہ جانے کی تیاریوں میں مشغول تھا کہ ایک اجنبی نمبر سے کال موصول ہوئی۔ زین نے فی الحال یہ نمبر کسی کو نہیں دیا تھا سوائے اپنے گھر والوں کے تاکہ وہ پرانے نمبر کو بند پا کر کہیں پریشان نہ ہوں یا پھر خاور کو ایک دفعہ پیغام بھیجا تھا۔ اسی شش و پنج میں کہ یہ کون ہو سکتا ہے کال ڈراپ ہو گئی۔ گلے ہی لمحے دوبارہ اس کا موبائل منگنٹا نہ لگا۔ زین نے

اس نے زین سے پوچھا۔
”بھائی خیریت تو ہے نا؟ کوئی ٹینشن والی بات تو نہیں۔“

زین نے اسے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”نہیں یار، بس ایک لڑکی کا پکڑ ہے۔ وہ پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ذرا تھوڑے دن سائڈ پر رہوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔“

حیدر نے محسوس کر لیا تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے ورنہ زین لڑکیوں سے بھاگنے والا نہیں بلکہ ان کو ذلیل کرنے والا بندہ تھا مگر اس نے اصرار نہیں کیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں ایک مشہور ریستورنٹ میں کھانا کھانے چلے گئے۔ زین وہاں جانے پر کسی طور راضی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی فاسٹ فوڈ آرڈر کرتے ہیں، وہ یہیں گھر پر دے جائے گا۔ اور یہاں محل کے گپ شپ کرتے ہیں مگر حیدر بعد تھا کہ نہیں اسی ریستورنٹ میں جانا ہے پچھلی دفعہ بھی اس نے اسی جگہ کچا کھا تھا اور اس کو وہ ذائقہ ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ مجبوراً زین کو وہاں جانا ہی پڑا۔

حیدر اپنے موبائل پر بہت معروف نظر آ رہا تھا۔ زین نے ایک دفعہ پھر اسے یاد دہانی کروائی کہ میرے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ اس نے کہا۔

”آپ مطمئن رہیں آپ کے متعلق کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔“ اسی دوران انہوں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا تیار ہونے میں بیس سے تیس منٹ لگ جاتے تھے۔ کیونکہ ایک تورش بہت تھا دوسرا تازہ تازہ ڈشز تیار ہوتی تھیں جن میں وقت صرف ہوتا ہے۔ حیدر اپنی ایک بالکل نئی بی بی دوست کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا۔ اس لڑکی نے اسے خود ہی ایڈ کیا تھا اور اس کے متعلق چھوٹی مولی باتیں پوچھ رہی تھی۔ وہ اسلام آباد کی رہنے والی تھی، اس نے حیدر سے کہا کہ وہ کبھی اس کے شہر لاہور آئی تو ملنے کی کوشش کرے گی۔ حیدر کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے کہا۔

”اگر واقعی آپ ملنا چاہتی ہو تو حکم کرو میں خود اسلام آباد آ جاتا ہوں۔“ لڑکی نے جواب میں کہا۔
”بہت فرماں بردار ہیں آپ تو پھر لیکن اگر آپ آج ہی آئیں تو سوچا جاسکتا ہے۔“

حیدر نے خوشی سے جموٹے ہوئے اس پر ایک عظیم راز کھولا کہ وہ اس وقت راولپنڈی میں ہے اور تیس منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے پاس پہنچ سکتا ہے۔
لڑکی تھوڑا گھبرا کے بولی۔ ”اوہ نو..... آپ تو پہلے

ڈرتے ڈرتے وہ کال موصول کی تو بے اختیار ایک اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ وہ اس کا ماموں زاد کزن آذان حیدر تھا جسے عام طور پر وہ حیدر ہی کہتا تھا۔ اس نے وہ نمبر زین کے گھر والوں سے ہی لیا تھا۔ کیونکہ وہ آج صبح صبح ہی راولپنڈی کی طرف نکلا تھا، اپنی پولیس ٹریننگ کے آخری مرحلے کے لیے۔ اس کا پروگرام تھا کہ راستے میں زین سے ملتا ہوا جائے گا کیونکہ ایک تو ان دونوں کی آپس میں بہت جتنی تھی، دوسرا حیدر اور زین کے بہت سے شوق مشترک بھی تھے۔ اسی وجہ سے باقی تمام کزنز میں ان کی جوڑی کافی مشہور تھی۔ زین نے حیدر سے استفسار کیا کہ وہ راولپنڈی کیا کرنے آ رہا ہے؟ کیونکہ اس کو تو آگے آزاد کشمیر کی طرف لکھنا تھا۔ حیدر نے جوابا کہا۔

”بھائی آپ صرف ایک گھنٹا اور انتظار کریں میرا، میں بالکل نزدیک پہنچ چکا ہوں۔“ کوئی اور ہوتا تو زین اسے ٹال دیتا مگر حیدر کی وجہ سے وہ وقتی طور پر رک گیا۔ دیے بھی ملک ارسلان کی شادی دوسرے دن تھی۔ آج رات تک بھی وہ وہاں پہنچ جاتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ حیدر کو زین کے پاس پہنچنے پہنچنے ایک کے بجائے دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ ٹریننگ کے دوران چونکہ موبائل فون پر پابندی ہوتی ہے اس لیے حیدر کے لیے یہ چھینوں کے دن اور سفر اس لحاظ سے بہت کشش رکھتے تھے کہ وہ اپنے موبائل پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کر لیا کرتا تھا اور انٹرنیٹ پر بھی خوب آوارہ گردی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی زین اور اس کے مشترکہ دوستوں کے ساتھ گروپ میں ایڈ تھا۔ اس لیے اس نے زین کے پاس پہنچنے سے پہلے گروپ میں بتا دیا تھا کہ وہ زین کے پاس جا رہا ہے اور ہوسکتا ہے دوپہر کا کھانا ہم ساتھ ہی کھا لیں۔ زین اس بات سے بے خبر تھا کہ حیدر نے نادانگہی میں اس کے لیے کیا مصیبت کھڑی کر دی ہے۔

حیدر نے زین سے ملنے ہی لگہ کیا کہ آپ نے ایک تو فلیٹ تبدیل کر لیا اور دوسرا نمبر بھی نہیں بتایا اپنا۔ زین نے اسے وقتی طور پر یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ وہ فی الحال تھوڑا معاشی تنگ دستی سے نبرد آزما ہے اس لیے اسے یہ سب کرنا پڑا اور نمبر دینے کا بھی خیال اسی لیے نہیں آیا کہ وہ کچھ پریشان تھا۔ زین نے اسے سچی سے یہ بھی تاکید کی کہ ابھی کسی دوست کو یا سوشل میڈیا پر میرا نمبر نہیں دینا کسی کو اور نہ ہی بتانا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ حیدر کو دال میں کچھ کالا محسوس ہوا۔ وہ زین کو یہ بھی بتانا سکا کہ اس نے پہلے ہی خبر سوشل میڈیا پر سب کے گوش گزار کر دی ہے۔ لیکن تجھ سے مجبور ہو کے

سے یہاں موجود ہیں، یہ تو چیٹنگ ہے۔“ ابھی آپ راولپنڈی میں کس جگہ ہیں؟ کیونکہ میں بھی راولپنڈی میں مگر والوں کے ساتھ صدر تک آئی ہوں، شاپنگ کرنے، یہاں پاس ہی آئی رہتی ہیں ان سے بھی ملنا تھا ای کو آج۔“

حیدر نے اسے فوراً بتایا کہ وہ اس وقت کس مشہور ریسٹورنٹ میں کھانے کا انتظار کر رہا ہے اور وہ چاہے تو یہاں آسکتی ہے۔ اسے معلوم تھا ابھی اتنی جلدی اس نے آنا ہے نہ ہی وہ اسے بلائے گی مگر بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ ایک بوائے اسکاؤٹ تھا۔ پولیس میں بھرتی ہونے والا نیا نیا جوان..... اس لیے وہ ابھی زندگی اور لوگوں کے معاملے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا چن دیا گیا۔ حیدر نے اپنی دوست کو انتظار کا کہا کیونکہ وہ کھانے کو انتظار کروانے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ حسب معمول وہ کھانا بہت شاندار اور ذائقے والا تھا۔ زین نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی نظریں چاروں طرف گردش بھی کر رہی تھیں کہ کوئی شہساز چہرہ نظر نہ آجائے۔ حیدر نے کھانا کھانے کے دوران جی بھر کے تعریف کی اور خوب انصاف کیا کھانے کے ساتھ۔ آخر ان کا کھانا ختم ہوا اور وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ اب حیدر کو آگے کی بس پکڑنی تھی اور زین کو اپنے فلیٹ پر جانا تھا۔ اتفاق سے دونوں کی منزل کافی قریب تھی اس لیے دونوں نے سامنے کھڑی ایک ٹیکسی کو آواز دے کر بلایا۔ اسے بس اسٹیڈ سے ہوتے ہوئے زین کے فلیٹ تک جانے کا کرایہ پوچھا جو اس نے انتہائی مناسب بتایا، وہ خوش ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ان کے دل میں اس ٹیکسی ڈرائیور کے لیے مشکورانہ جذبات پیدا ہوئے جو عام لوگوں کی طرح مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ ایمانداری سے کام کرتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور عام راستہ استعمال کر رہا تھا اس لیے ان دونوں نے کسی بھی لمحے کے لیے اس کو مشکوک نہیں سمجھا۔ حیدر اپنے موبائل فون میں دوبارہ مگن ہو چکا تھا، جبکہ زین خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا جا رہا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا جناب جلدی تو نہیں میں پیٹرول ڈلوالوں آگے ایک پیٹرول پمپ آ رہا ہے۔ حالانکہ پیٹرول ان دنوں پاکستان میں کسی خوش نصیب کو ہی ملتا تھا لیکن اس طرف ان دونوں کا دھیان ہی نہیں گیا۔

”ہاں کوئی مسئلہ نہیں، ہمیں کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔“ حیدر فوراً ہی بول اٹھا۔

ساتھ ہی وہ دوبارہ اپنے موبائل کی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے آگے اٹھتے ہاتھ پر واقع ایک پیٹرول پمپ پر ٹیکسی روک دی۔

موسم خوشگوار تھا اس لیے دونوں نے اپنی اپنی سائڈ کے شیشے تھوڑے تھوڑے نیچے کیے ہوئے تھے۔ وہ دھوپ اور ٹھنڈی ہوا دونوں کے حسین امتزاج سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ حیدر موبائل فون پر مصروف ہونے کے سبب اور زین بے دھیانی میں یہ غور نہیں کر سکا کہ یہ پیٹرول پمپ فی الحال بند ہے اور تعمیر کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے۔ یہ ان کو تب احساس ہوا کہ کچھ تو گڑ بڑ ہے، جب دونوں طرف کے شیشوں سے کوئی انتہائی زود اثر مائع ان کے چہرے پر اسپرے کیا گیا۔ جس نے دس سینڈ سے بھی کم عرصے میں دونوں کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے وہاں موجود ایک اور شخص کی مدد سے ان دونوں کو ایک وین میں منتقل کیا۔ یہ ایک طاقتور ڈیل کین گاڑی تھی اور اس کے شیشے بھی کھڑے تھے۔ پھر وہی ٹیکسی ڈرائیور ان دونوں کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔ اس کا رخ آزاد کشمیر کی طرف تھا۔ کیونکہ آخری اطلاع کے مطابق سب کو وہاں موجود ایک خفیہ ٹھکانے پر بلایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سب سے اہم بندہ لگا تھا اس لیے اس کا چہرہ جوش اور طرمانیت سے لبریز تھا۔ یہ داور کے گینگ میں حال ہی میں شامل ہوا تھا اور منظور عرف موج کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس نے داور کو اطلاع دینے کی غرض سے فون نکالا ہی تھا کہ اسے کسی اور نمبر سے کال آنا شروع ہو گئی۔ اس نے کال انیڈی کی اور کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے سکرٹاتے ہوئے فون بند کر دیا۔ زین اور حیدر بچھلی نشستوں کے درمیان رسیوں میں جکڑے آڑے تڑخے پڑے تھے۔

☆☆☆

داور نے زین کے دوستوں سے لی ہوئی معلومات زبیر احمد تک پہنچا دی تھیں۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ معلومات کسی کام آسکیں گی۔ کیا زین کے دونوں کزنز جانتے ہوں گے کہ وہ کہاں ہوگا اس وقت؟

اس کے بندے اسلام آباد اور راولپنڈی میں نظر رکھے ہوئے تھے۔ اسے زین کو ڈھونڈنے کی جلدی بلال غوری کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کے پاس موجود معلومات یا کسی ایسی چیز کے لیے تھی جس کی وجہ سے بلال نے زین کو زندہ پکڑنے کے لیے کہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا داور کی بے چینی اور غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ریاض کو اس نے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، نیڈرلینڈز، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیالوں کے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیردن ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شریعہ عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63، فیز 111، سسپنشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

آج صبح ہی واپس بھیج دیا تھا کیونکہ اس کے پاس کوریئر کمپنی
کی گاڑی بھی وہ اسے دن میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔
باقی اس کے ساتھ تین سا بھی اور سارہ ابھی بھی موجود تھے۔
سارہ مسلسل اس کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی مگر داور کی بے
چینی کم نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک داور سارہ کے پہلو سے اٹھا
اور اسی کمرے کی طرف آگیا جہاں اس نے سب کو بند کر
کے رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پستول تھامتے ہوئے دروازہ
کھولا۔ کمرے میں موجود سبھی لوگ چونکا ہو گئے۔ داور کی
نظر دونوں لڑکیوں پر جمی ہوئی تھی۔ اچانک داور آگے بڑھا
اور جا کر عائشہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے پھینکے لگا۔ وہ مسلسل چلانے
اور ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ سوہا کا رنگ بھی ایک دم ہی پیلا
پڑ گیا تھا۔ اس کی زبان اور حلق دونوں خشک ہو گئے تھے۔
وہ کوئی آواز نہ نکال سکی۔ لیکن ملک ارسلان اور اس کے
تینوں دوستوں کے لیے یہ کوئی قابل قبول حرکت نہیں تھی۔ سب
سے پہلے اظہر نے کہا۔

”دیکھو تم جو بھی ہو، تم نے جو کہا ہم نے وہ کیا اور
ساری معلومات کبھی تم کو بتا دیں مگر تم اپنی زبان سے پھر
رہے ہو، لڑکی کو چھوڑ دو۔“ ملک ارسلان پہلے ہی ادھار
کھائے بیٹھا تھا، اس نے بھی کہا۔

”تم اس کمرے سے لڑکی کو نہیں لے کر جا سکتے، یہ
یہاں ہمارے ساتھ رہے گی۔“

داور نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور
استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ ”میں تم سے اجازت لینے نہیں
آیا، یہاں میں جو چاہتا ہوں، کرتا ہوں اس لیے تم
چوزوں کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اپنی چونچیں بند رکھو ورنہ
مجھے اچھی طرح سے بند کرنی آتی ہیں۔“

اس نے عائشہ کو دوبارہ باہر لے جانا چاہا تو اس دفعہ
جمیل اور خاور بھی درمیان میں آ گئے۔ وہ داور کی نیت کو سمجھ
چکے تھے اور ان سب کی غیرت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ
داور کو اس کے مکروہ عزائم میں کامیاب ہونے دیں۔ داور
کے ہاتھ میں پستول بدستور موجود تھا۔ وہ کل چھ افراد تھے
جن میں دو لڑکیاں بھی تھیں مگر داور کا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ
وہ کس قدر گھٹیا، خطرناک اور مکار شخص ہے۔ وہ صرف سارہ
اور داور کو ہی دیکھ رہے تھے۔ داور کے باقی تینوں ساتھیوں
میں سے ایک کی ڈیوٹی گیٹ پر تھی اور باقی دو ساتھی باہر
رہتے ہوئے مسلسل گیٹ ہاؤس کی نگرانی کر رہے تھے۔
یعنی ایک طرح سے فی الوقت تین افراد ہی گیٹ ہاؤس میں
موجود تھے اور ان میں سے بھی ایک گیٹ پر موجود تھا۔

دیا۔ ”بس۔ اب اور نہیں۔ تم ذرا بھی ملے تو سات کی سات گولیاں چھاری گردن میں اتار دوں گا۔“ خاور نے کانپتے لہجے میں کہا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک پیٹھ در پیٹھ سے سر پر پستول رکھ کر اسے ایسا حکم دے رہا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا مگر کوئی تجربہ کار شوٹر بھی نہیں تھا۔ داور کو لگ رہا تھا کہ اس کا کانپتے ہاتھوں سے کہیں ٹریگر نہ دب جائے اس لیے وہ سائڈ پر ہو کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی..... اس کی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ پستول چلاتا اس لڑکے کی بس کی بات نہیں۔ ہاں غلطی اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے گولی چلنے کے امکانات روشن تھے۔ خاور نے ملک ارسلان، انٹہ اور جیل کو کہا کہ دونوں لڑکیوں کو لے کر گیٹ کی طرف چلو۔ ملک ارسلان ابھی تک ہانپ رہا تھا اور اس کی سانس بشکل بحال ہوئی تھی۔ وہ داور کے ہاتھوں مرحوم ہونے سے بال بال بچا تھا۔

انہوں نے داور کو کمرے میں بند کر کے کمرالاک کیا۔ انٹہ اور جیل عائنہ اور سوہا کو لے کے آگے بڑھے جبکہ ملک ارسلان اور خاور سب سے پیچھے آ رہے تھے۔ ابھی وہ مین لائونج سے گزر رہی رہے تھے کہ خاور اور ملک ارسلان نے اپنی گردنوں پر لوہے کا ٹھنڈا اس محسوس کیا۔ انہوں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو دودھ دھونڈا آٹو بیگ رائفلز کا دبانہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ یہ داور کے وہ ساتھی تھے جو گیٹ ہاؤس کے باہر نگرانی کا کام سر انجام دے رہے تھے۔ اور ان کو غالباً سارہ ہی لے کر آئی تھی کیونکہ اس وقت وہ ان دونوں کے بالکل عقب میں موجود تھی۔ ان میں سے ایک کے کہنے پر خاور نے چپ چاپ پستول اس کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں کو رکتا دیکھ کر بانی چاروں نے بھی مڑ کر دیکھا تو انہیں اپنی جان بچھڑے شکنے میں نظر آئی۔ وہ بھاگتا بھی جانتے تو نہیں بھاگ سکتے تھے کیونکہ دس سے بارہ گز کا فاصلہ گولیاں پلک جھپکنے سے پہلے ہی طے کر لیتی ہیں۔ وہ ہارے ہوئے جوار یوں کی طرح دوبارہ سر جھکا کر کمرے کی طرف چل دیے۔ جہاں انہوں نے داور کو بند کر رکھا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی داور کو ان کی شکلوں پر مایوسی نظر آئی اور ساتھ ہی سارہ اور اپنے دونوں ساتھیوں کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی سمجھ میں فوراً ساری بات آگئی۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا اور اپنے ایک ساتھی سے پستول چھین لیا۔ اس کی خوشخوار نظریں ملک ارسلان پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ ملک ارسلان نے ہی اس پر حملہ کرنے کی جرات کی تھی۔ اس نے پستول کا رخ ارسلان کی طرف کر دیا۔ سب کا چہرہ خوف سے

ملک ارسلان نے کسی کو بتائے بنا ایک لائحہ عمل تیار کر لیا تھا اور وہ بہت بڑا رسک لینے جا رہا تھا۔ اگر اس بات کی بھینک بھی کسی کو پڑ جاتی تو وہ کبھی اسے ایسی حماقت نہ کرنے دیتے۔ داور نے پستول اہرا تے ہوئے کہا۔

”آخری دفعہ کہہ رہا ہوں، چپ چاپ پیچھے ہو کر بیٹھ جاؤ ورنہ دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔“ عائنہ اس کی گرفت میں مسلسل پکڑ رہی تھی اور اپنا بازو چھرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان سب کا داور سے فاصلہ سات فٹ کے قریب تھا۔ داور کی نظر ان سب کے چہروں پر تھی جو غصے اور جوش کے سبب سرخ ہونے لگے تھے۔ داور کو عائنہ کے چیختے چلاتے سے کوفت ہو رہی تھی اس نے ایک زوردار تھپڑ عائنہ کے گال پر دے مارا اور بولا۔

”خاموش ہو کر چپ چاپ ساتھ چلو ورنہ یہیں سب کے سامنے منور بجن شروع کر دوں گا۔“ عائنہ کو اپنے منہ میں ٹھیکین خون کا ذائقہ محسوس ہوا ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ جس لمحے داور نے عائنہ کو تھپڑ مارا تھا، اس کی توجہ وقتی طور پر ان سب سے ہٹ گئی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ملک ارسلان نے چنگاڑتے ہوئے داور پر چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ داور کو لیتا ہوا سامنے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہاں پر موجود سب لوگ مارے حیرت اور خوف کے ٹنگ ہو کر رہ گئے مگر پھر جیسے اچانک ہی انہیں ہوش آ گیا تھا۔

داور اور ملک ارسلان ایک دوسرے کی گردن دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ داور کی طاقت اور تجربہ ملک ارسلان سے کہیں زیادہ تھا اس لیے وہ ملک ارسلان پر حاوی آ چکا تھا۔ دیوار میں ٹکرنے سے پستول داور کے ہاتھ سے چھوٹ کے دور جا کر تھا۔ اس دوران سارہ پتا نہیں کہاں کھسک گئی تھی بجائے وہ داور کی مدد کرتی وہ غائب ہو چکی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر خاور کا ہونٹ بھی جوش مارنے لگا۔

اس نے ایک ہی جست میں داور کے ہاتھ سے نکلے ہوئے پستول کو اپنے قبضے میں کیا۔ انٹہ اور جیل نے بھی اس دوران میں عائنہ کو واپس سوہا کے پاس بٹھا دیا اور داور کے مقابلے میں ملک ارسلان کی مدد کرنے لگے۔ داور ایک ساتھ تینوں کو نہیں سنبھال سکتا تھا لیکن پھر بھی اس نے ان تینوں کو ابھی خاصی ضربیں لگا دی تھیں۔ خاور نے پستول ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اس کا میگزین چیک کیا اس میں سات عدد گولیاں موجود تھیں۔ اس نے دوبارہ میگزین چڑھا کر سیٹھی کیچ کھولا اور پستول لوڈ کر کے داور کی گردن پر رکھ

ہوش میں آنے سے پہلے ہی زین نے اس کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔ ”خاموش رہنا، ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔“ یہ سنتے ہی حیدر کو جیسے اچانک ساری باتیں یاد آ گئی تھیں کہ کس طرح وہ کھانا کھا کر نکلے تھے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھے تھے پھر اسی ٹیکسی میں ان پر کوئی اسپرے کیا گیا تھا جس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ پولیس کی ٹریننگ لے چکا تھا اور اب آخری سیشن کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کے اندر روایتی پولیس والوں کی طرح شکوک و شبہات اور اندیشے جنم لینا شروع ہو گئے۔ مگر یہ صورت حال زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی۔ زین نے اسے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ دانتوں سے اس کی رسی کھولنے کی کوشش کرو۔ موجود کا سارا دھیان اس وقت ڈرائیونگ پر تھا۔ کیونکہ گاڑی اب خطرناک چڑھائیوں اور ڈھلانوں سے گزر رہی تھی۔ دیے بھی اسے امید نہیں تھی کہ اگلے دو تین گھنٹے دونوں کو ہوش آئے گا اس لیے وہ پورے اطمینان سے گاڑی چلا رہا تھا۔

زین کا اشارہ سمجھتے ہی حیدر نے اثبات میں سر ہلایا اور زین کی طرف رخ کر کے اس کے ہاتھ کی بندھی ہوئی رسیوں پر دانتوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ نائیلون کی باریک رسی کی جوانی دونوں کے بازوؤں میں تقریباً چوبیس تھوڑی تھی۔ اور اس کی بندشیں اور بھی زیادہ مضبوط اور باریک تھیں۔ اس لیے حیدر تھوڑی ہی دیر میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ حالانکہ یہاں موسم کافی حد تک خشک تھا مگر وہ جس زاویے سے اُدھا ٹوٹتے ہوئے کوشش کر رہا تھا، وہ بہت دقت کا کام تھا۔ حیدر کو محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس کا کوئی دانت ٹوٹ جائے گا یا پھر ان میں سے خون رسنے لگے گا۔ لیکن وہ اپنی بقا کی جنگ سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک وہ رسیوں سے زور آزمائی کرتا رہا۔ پھر ان کو محسوس ہوا کہ گاڑی ذرا آہستہ ہوئی ہے اور موجود کا ہاتھ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر گیا ہے۔ وہ دونوں فوراً آنکھیں بند کر کے اسی حالت میں لیٹ گئے۔ یہاں تھوڑا رستہ سیدھا تھا اس لیے موجود نے ان پر ایک نظر ڈالنے کی تکلف کر لی تھی۔ کوئی غیر معمولی بات نہ پا کر اس نے دوبارہ گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ حیدر اور زین دونوں کو جب اطمینان ہو گیا کہ موجود پیچھے نہیں جھانک رہا تو انہوں نے دوبارہ سے اپنی کوشش شروع کر دی۔ زین کی رسی کافی حد تک ڈھیلی ہو چکی تھی لیکن کھلی ابھی تک نہیں تھی۔ دس منٹ کی مشقت کے بعد زین کے ہاتھ

آزاد ہو گئے۔ لیکن رسی میں بندھے رہنے کی وجہ سے اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ کسی کام کے نہیں رہے۔ کچھ دیر میں ہاتھوں میں خون کی گردش رواں ہوئی تو اس نے حیدر کی رسیوں کو لینے لینے کھولنا شروع کر دیا۔ اسے وہ رسیاں ہاتھ سے کھولنے میں اتنی مشکل پیش آرہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا حیدر کی کتنی ہمت ہے جو اس نے دانتوں سے وہ رسیاں کھول لی تھیں۔ آخر ان دونوں کے ہاتھ آزاد ہو گئے لیکن پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ اس کے لیے یا تو ایک بندہ دوسری طرف جاتا یا پھر پاؤں سیٹ کر اپنی طرف لائے جاتے۔ لیکن جگہ کی تنگی کے باعث یہ دونوں کام مشکل نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں نے فی الحال پاؤں کھولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ گاڑی میں بھاگنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

زین نے لینے لینے نظر دوڑائی تو سیٹوں کے نیچے پرانے اور رنگ آلود کچھ پرزے بڑے ہوئے تھے انہی کے درمیان اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ یہ ایک جیک ریٹج تھا جو جیک کی ایڈجسٹمنٹ کے کام آتا تھا۔ حیدر سمجھا کہ شاید زین یہ اس کے سر پر مارنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے اس نے زین کو آنکھوں میں تنبیہ کی کہ وہ ایسا نہ کرے ورنہ گاڑی بے قابو ہو کر سڑک سے نیچے پہاڑوں کی گہرائی میں جاسکتی ہے۔ زین نے اسے سمجھا دیا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ زین برق رفتاری سے اٹھا اور موجود کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ کر جیک ریٹج اس کی گردن سے لگا دیا اور کہا۔ ”چپ چاپ گاڑی روک دو ورنہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ تم لوگوں کو تو تلاش لینا بھی نہیں آتی ورنہ میرا پٹنڈلی پہ بندھا ہوا ہسپتال تم ایسے ہی نہ چھوڑ دیتے۔“

موجود نے ٹھنڈے لوہے کا کاس اپنی گردن پر محسوس کر لیا تھا۔ اس کے ہاتھ اس اچانک افتاد پر اسٹیرنگ پر بہک گئے اس لیے گاڑی پھر ایک دفعہ بے قابو ہوتے ہوئے فحش گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو زین نے ریٹج اس کی گردن میں کھسا دیا اور کہا۔ ”کوئی ہوشیاری نہیں۔“ موجود اپنے ساتھی کو کوس رہا تھا کیونکہ اس نے ہی ان دونوں کی تلاشی لی اور رسیوں سے باندھا تھا۔ اب نہ صرف وہ بندشوں سے آزاد تھے بلکہ ان کے پاس بظاہر ہسپتال بھی موجود تھا۔ زین کے کہنے پر موجود نے کافی سائڈ پر کر کے گاڑی روک لی۔ زین نے حیدر کو اشارہ کیا تو اس نے فوراً زین کے اور اپنے پاؤں آزاد کروائے۔ پھر حیدر دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ والی سائڈ پر آ گیا۔ اس نے موجود

کریڈٹ بھی تھا۔ اس نے اپنے سیکورٹی سپرائزر کو کال کر کے ساری کہانی بتائی کہ کس طرح وہ اغوا ہو کر آزاد کشمیر جا پہنچا ہے اور اس کے ساتھ اس کا کزن بھی ہے اور آگے مزید لوگ بھی ہیں جو ان کی راہ تک رہے ہیں۔

سپرائزر نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ وہاں کے مقامی پولیس تھانے یا پونٹ کو کال کرتا ہے وہ اس کی مدد کو کھینچ جاتے ہیں۔ یہ کافی حوصلہ افزا بات تھی کیونکہ یہ دونوں خود کو موجود اور اس کے نامعلوم ساتھیوں کے مقابلے میں کمزور محسوس کر رہے تھے اس کی ایک وجہ تو پورے ہتھیاروں کا نہ ہونا اور دوسری وجہ تعداد میں کمی تھی۔ انہوں نے موجود کو بالکل اسی طرح پابند رن کر دیا جیسے وہ پہلے خود تھے اور پھر پچھلی سیٹوں کے درمیان دھکیل دیا۔ اب زین اور حیدر دونوں کو مدد کا انتظار تھا۔ اس میں پتا نہیں کتنا وقت لگ جاتا: اس لیے انہوں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا دیا تا کہ گزرنے والوں کو یہی گمان ہو کہ کسی خرابی کے سبب کھڑے ہیں۔ گاڑی کے شیشے چونکہ کالے کیے ہوئے تھے اس لیے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ اندر بڑا ہوا موجود کسی اور کی نظروں میں آ سکتا ہے۔ اس کی آواز نکلنے کے بھی چانس صفر فیصد سے زیادہ نہیں تھے کیونکہ حیدر نے ڈیش بورڈ میں پڑا صفائی کرنے والا کپڑا موجود کے منہ پر باندھ دیا تھا۔ اب وہ غوں غاں کے سوا کوئی آواز نکالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ان کی توقع کے برعکس ایلینٹ فورس کے جوانوں کی ایک گاڑی ایک کھنٹے سے بھی پہلے ان تک پہنچ گئی۔ اس میں کل چار لوگ تھے ایک ڈرائیور اور باقی تینوں چاق و چوبند جوان جن کے پاس آٹو میک اسالٹ رائفلز، ماؤزر اور چھوٹے پنڈر گرینڈز بھی شامل تھے۔ انہوں نے بلٹ پروف بیگلس پہن رکھی تھیں۔ وہ بنا کسی تردد یا ہچکچاہٹ کے حیدر کی طرف آئے اور پوچھا۔ ”کیا آپ ہی آؤان حیدر ہو؟“ جواب میں حیدر نے ہاں میں سر ہلایا تو انہوں نے موجود کے بارے میں استفسار کیا۔ حیدر کے بتانے پر انہوں نے گاڑی میں دیکھا اور موجود سے مزید تفتیش کرنے لگے تا کہ وہاں کلاروائی کرنے کے دوران انہیں زیادہ سے زیادہ آسانی ہو۔ وہ بہت پروفیشنل انداز میں معاملات ہینڈل کر رہے تھے۔ موجود نے کچھ مزید انکشافات کیے تھے اور اپنے ساتھیوں کی تعداد اور اسلحے کا بتا دیا تھا حالانکہ اسے یہ سب معلوم نہیں تھا لیکن اندازاً وہ یہ سب بتا رہا تھا۔ ایک تو وہ مزید تشدد برداشت کرنے کے حق میں نہیں تھا اور دوسرا اسے وقت درکار تھا جو صرف تعاون کرنے کی صورت میں ہی مل سکتا

کی بیٹھے بیٹھے تلاشی لی اور اس کے پاس موجود موبائل فون، نقدی اور ایک عدد پستول اپنے قبضے میں لے لیا۔ پھر وہ اسی طرح واپس پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ زین نے موجود سے پوچھا۔

”اب بتاؤ ہمیں کہاں اور کس کے کہنے پر لے کر جا رہے ہو؟“

موجود خاموش رہا تو پیچھے سے حیدر کا ایک زبردست تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ حیدر کی سخت انگلیاں اس کے چہرے پر ثبت ہو گئیں۔ موجود کا پستول اب ان کے قبضے میں تھا۔ موجود بتانے میں پس و پیش سے کام لے رہا تھا جب حیدر نے دوبارہ اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا مگر وہ بدستور خاموش رہا۔ حیدر غضبناک ہو کر آگے والی سیٹ پر چلا گیا۔ موجود خوف زدہ نظروں سے حیدر کو دیکھ رہا تھا کیونکہ حیدر کے تیور انتہائی جارحانہ تھے۔ اگلی سیٹ پر آتے ہی حیدر نے موجود کا سر زور سے اسٹیرنگ ڈبیل سے دے مارا۔ موجود کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ حیدر نے اس کو بالوں سے پکڑ کر دو تین مزید جھٹکے دیے۔ موجود کی برداشت کمال کی تھی کیونکہ وہ ہنوز چپ تھا۔ زین کو کوفت ہو رہی تھی۔ وہ بے شک سڑک سے کافی ہٹ کر رہے ہوئے تھے لیکن کسی بھی وقت وہاں کوئی آ سکتا تھا اور وہ دونوں یہ معاملہ جلد ختم کرنا چاہ رہے تھے۔ زین سے رہا نہیں گیا۔ اس نے پستول کا سینٹی گنچ ہٹا کر موجود کی طرف نشان دیا اور کہا ”جو پوچھ رہے ہیں بتا دو ورنہ یہاں گولی مار کر نیچے کھائی میں پھینک دیں گے۔“ موجود اس سے پہلے کوئی جواب دیتا، حیدر نے اس کا الٹا ہاتھ پکڑ کر اس کی درمیان والی انگلی توڑ دی۔ درد کی شدت سے موجود کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

”مجھے صرف تم دونوں کو ایک جگہ پر پہنچانے کا کہا گیا تھا، کس کے حکم پر یہ مجھے نہیں بتایا گیا۔“

موجود نے ان دونوں کو داور کے متعلق بتا دیا اور یہ بھی کہ وہ کون سے گیسٹ ہاؤس میں لے کر جا رہا تھا لیکن اس نے ان دونوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے اس کی فون پر کس سے بات ہوئی ہے اس لیے وہ صرف داور اور اس کے نامعلوم ساتھیوں سے نمٹنے کا سوچنے لگے۔ اسی دوران حیدر کو خیال آیا کہ اسے اب تک اپنی ٹرینگ اکیڈمی میں پہنچ کر رپورٹ کرنا تھا ورنہ اس کو غیر حاضر تصور کیا جاتا جو کہ ناقابل معافی جرم تھا۔ اس نے موجود سے کہا ہوا موبائل دیکھا جس میں ابھی تک چار جنگ موجود تھی اور یقینی طور پر

تھا۔

پوچھا ہے کیا نئی خبر ہے۔ ”زین اور اس کا کزن شاید کسی اور ریسٹورنٹ میں تھے یا پھر وہ وہاں سے نکل گئے تھے۔ کیونکہ میرے آدمی جب وہاں پہنچے تو ان کو دونوں میں سے کوئی بھی وہاں نظر نہیں آیا۔“ داور کمال سادگی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ زبیر احمد نے جواب میں کہا۔ ”جیسے ہی کوئی اطلاع ملتی ہے یا پیش رفت ہوتی ہے، ہم کو فوراً بتایا جائے۔“ داور نے اثبات میں جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ وہ بلال کی بے چینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ زین اب سے صرف بیس منجیس منٹ کے فاصلے پر تھا لیکن اس نے جھوٹ بول کر ٹال دیا تھا۔ اسی دوران میں اسے باہر موجود ساتھیوں سے علم ہوا کہ ایک ڈیل کبجین جیب گیسٹ ہاؤس والے ذیلی راستے پر مزمی ہے اور یقیناً اس کی منزل گیسٹ ہاؤس ہی ہوگی کیونکہ اس ذیلی سڑک پر گیسٹ ہاؤس کے سوا کوئی اور عمارت نہیں تھی۔

داور اپنے طور پر چوکتا ہو گیا اور اس نے اپنے باہر والے ساتھیوں کو بھی اندر آنے کا کہہ دیا۔ مزید پانچ منٹ بعد پارکنگ میں موجود جیب کی پارکنگ کی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے نکل کر موجودے فوراً پچھلا دروازہ کھولا اور زین اور حیدر کو باہر نکال لیا۔ سیف سیٹوں کے درمیان چھپا بیٹھا تھا۔ اس لیے باہر سے دیکھے جانے کے امکانات نہیں تھے۔ زین اور حیدر دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے اور یہ بہت معمولی بندشیں تھیں جو کہ ایک جھٹکے سے کھل جاتیں۔

جب تک موجود، زین اور حیدر کو اندر کی طرف لے کر جاتا رہا اور والے دونوں آدمی بھی گیسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ گاڑی کو حکم دے دیا گیا کہ اب کوئی بھی اندر آنے کی کوشش کرے تو بے شک اسے گولی باردی جائے۔ لاؤنچ میں داخل ہوتے ہی زین کی نظر داور سے ٹکرائی اور اس کے پاس بیٹھی ہوئی سارہ سے بھی۔ داور نے خوش ہو کر موجود کو گلے لگایا اور کہا۔ ”واہ بھی جوان، دل خوش کر دیا تو نے تو۔ کوہ نور ہیرا لے کر آیا ہے قسم سے۔“ زین کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہاں بلال نظر نہیں آ رہا حالانکہ موجود نے بھی اس کا نام نہیں لیا تھا۔ اس نے صرف داور کے متعلق بتایا تھا مگر اسے علم تھا داور کے پیچھے کوئی اور نہیں بلال غوری ہی ہے۔

موجود کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے تھے، اسے علم تھا کہ وہ فورس کے جوان بھی کئی وقت یہاں ایکشن دکھا سکتے ہیں اور داور کو پتا لگتا کہ موجود نے ان کو کچھ بتایا ہے تو وہ ان کے اندر آنے سے پہلے اس کو جان سے مار دیتا۔ اسے منظر سے ہٹنے کی جلدی تھی اس لیے اس نے کہا۔ ”استاد میں ذرا ہولا ہو کر آتا ہوں۔“ اس نے اشارے سے واٹس روم جانے

ان چاروں نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔ زین اور حیدر کو انہوں نے کہا کہ آپ دونوں موجود کے ساتھ اسی کی گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ پچھلی نشست پر ان کے ساتھ سیف نامی جوان بیٹھ گیا اور باقی اپنی اسی جیب میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی موجود کو بٹھایا گیا تھا اور اسے بھی ظاہر کرنا تھا کہ وہ ان دونوں کو پکڑ کے لے آیا ہے۔ اس لیے بظاہر ان دونوں کے ہاتھ دوبارہ رسی سے باندھ دیے گئے تھے۔ گاڑی کے شیشے کالے ہونے کی وجہ سے امید نہیں تھی کہ سیف کو داور سے دیکھ لیا جائے گا۔ ویسے بھی دوسرے لوگ جیب پر ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ موجود کا ہاتھ خشک ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا اور وہ آنے والے لمحات کا سوچ کر فکر مند ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی پُر امید بھی تھا۔

☆☆☆

داور بڑی بے صبری سے موجود کا انتظار کر رہا تھا۔ ”اب تک موجود کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ سارہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر داور کی بے چینی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے فون اٹھا کر موجود کا نمبر لیا۔ موبائل کی گھنٹی پانچویں مرتبہ بجی تو موجود لائن پر موجود تھا۔ ”جی داور بھائی حکم کریں۔“ داور نے کہا۔ ”تمہیں اب تک یہاں میرے پاس ہونا چاہیے تھا، اتنی تاخیر کیوں کر دی؟“

”بس وہ راستے میں ٹریفک بہت بری طرح جام تھی اور گاڑی بڑی احتیاط سے چلائی پڑ رہی ہے اس لیے میں ذرا لیٹ ہو گیا۔ لیکن تیس چالیس منٹ تک میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ بے فکر رہو۔“ موجود نے رواں دواں میں تاخیر ہونے کی معقول وجہ بتائی تو داور کو تھوڑا سا قرا آ یا۔ فون بند ہوا تو موجود کی کینٹی پر رکھا پستول سیف نے ہٹا لیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ داور کا فون ہی وقت آیا تھا جب فورس کے بندوں نے سب معاملات اپنے ہاتھ میں لیے تھے ورنہ وہ سوسکتا تھا کہ زین یا حیدر کے ہوتے ہوئے موجود ادا کو کوئی اشارہ دے دیتا یا چالاکی دکھا جاتا اور وہ ہوشیار ہو جاتا۔

داور نے باہر موجود دونوں بندوں کو چوکنار ہٹنے کا کہا اور گیسٹ پر موجود گاڑی کو بھی۔ اپنے پاس بھی ہتھیار وغیرہ چیک کر چکا تھا۔ اب اسے موجود کا انتظار تھا۔ وہ اپنی کامیابی کے نشے میں دل ہی دل میں جھوم رہا تھا جب اسے زبیر احمد کی کال موصول ہوئی۔

زبیر نے اس سے پوچھا کہ بلال نے زین کے متعلق

بڑھی۔ داور حواس باختہ ہو گیا حالانکہ وہ ایک حتی الامکان محفوظ جگہ پر تھا۔ اس کے دونوں سامھی جولان میں موجود تھے، وہ کھات لگائے بیٹھے تھے کہ جیسے ہی کوئی اندر آئے اس پر فائر کھول دیا جائے۔ جیپ طوفانی رفتار سے گیٹ کے ساتھ ٹکرائی اور ایک زوردار دھماکا سنائی دیا جو کہ گیٹ کی ایک سائڈ مکمل طور پر ٹوٹ جانے کا تھا۔ اس کے علاوہ جیپ کے سامنے کا لکھہ بھی مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ پورا پونت مڑ کے ٹیڑھا ہو چکا تھا اور ہیڈ لائٹس کی جگہ اب صرف شیشے کی کرچیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ ونڈ اسکرین پر جیسے مڑی کا جالا سا بن گیا تھا۔ اس پر غالباً گیٹ کے ستون کا کوئی بھاری ٹکڑا ٹکرا رہا تھا جس کی وجہ سے اندر بیٹھے ہوئے لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ داور کے دونوں ساتھیوں نے جیپ پر فائرنگ شروع کر دی کیونکہ یہ بات تو طے ہو چکی تھی کہ یہ لوگ دوست نہیں ہیں اس لیے اب وہ لوگ بھر پور حملہ کر رہے تھے۔ اسی دوران جیپ کا ایک شیشہ نیچے ہوا اور شاٹ کن گرنی۔ داور کا ایک سامھی پیچھے دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور وہیں ڈھیر ہو گیا یہ غالباً ریئر ٹیڑھی، دوسرے نے فوراً دفاعی انداز اختیار کیا اور پیچھے کی طرف چلا گیا۔ داور کے لیے اب خاموش تماشائی بننا ہر ناممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس پہلے ہی نفری بہت کم تھی کیونکہ اسے اندازہ نہیں تھا اس طرح کے حالات پیش آ جائیں گے اور وہ ابھی تک اسی پریشانی میں تھا کہ یہ نگاہانی آفت کہاں سے آن ٹپکی ہے اور کون ہے جو اس کے بنے بنائے منصوبے کو خاک میں ملارہے ہیں۔ ادھر پارکنگ میں موجود دوسری جیپ کے اندر سیف و بکا میٹھا تھا لیکن اس شور اور فائرنگ کے سلسلے نے اسے پریشان کر دیا اور اسے لگا کہ اس کے سامنے ایکشن میں آگئے ہیں اور شاید جلدی یا کسی اور وجہ سے اسے بتائیں سکے۔ اس نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا جب اسے واچ ٹرانسمیٹر سے سنٹل موصول ہوئے اور اسے اندر کی صورت حال بتانے کا کہا گیا۔ کیونکہ اتنا تو ان کو باہر سے بھی نظر آ رہا تھا کہ نو وارد جو بھی تھے، ان کے ساتھ داور اور اس کے ساتھیوں کی ٹھن گئی ہے اس لیے وہ فی الحال زمین اور حیدر کی طرف سے بے فکر تھے۔ سیف نے بھی سمجھ کا سانس لیا اور نہ وہ ابھی نیچے اتر کر اکیلے ہی اس لڑائی میں کودنے جا رہا تھا اور بعید نہیں تھا وہ کسی گولی کا شکار ہو جاتا۔ اس نے جیپ کے سیاہ شیشوں سے ساری کارروائی دیکھی پھر اسے محسوس ہوا کہ چھت کی طرف سے اندر آنے والی جیپ پر فائرنگ ہو رہی ہے کیونکہ وقفے وقفے کے بعد جیپ سے شاٹ کن چھت کی طرف فائر کر رہی تھی۔ اب جیپ والوں کی پوزیشن ٹھوڑی خراب لگ رہی تھی

داور بستا ہوا بولا۔ ”جانبھی ہولا ہو یا بھاری۔ تجھے کون پوچھ سکتا ہے اب..... تو ہمارے لیے یہ دو ٹخنے جولا یا ہے۔“ داور کے ساتھیوں نے زمین اور حیدر کو داور کے سامنے لا کھڑا کر دیا جبکہ موجود داور کی بات سنتے ہی رفو چکر ہو گیا تھا۔

ادھر سیف نے جیپ میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ باہر کا جائزہ لیا تو اسے گیٹ پر موجود گاڑ اور داور کے وہ دونوں سامھی نظر آ گئے جو ابھی باہر سے اندر آئے تھے جیپ کے ساتھ۔ اس نے اپنے واچ ٹرانسمیٹر سے اپنے ساتھیوں کو اندر کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ ابھی ایکشن میں آنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ان کو رکتا پڑا، کیونکہ ایک اور چھاتی لینڈ کرورر گیٹس ہاؤس کی طرف آتی دکھائی دی۔ انجیل فورس (کیونکہ یہ ایلینٹ فورس نہیں لگ رہی تھی) کے جوانوں نے فوراً اپنی پوزیشن تبدیل کی اور دفاعی اور کیمو فلاج والے انداز میں چھپ گئے تاکہ آنے والے کے متعلق فیصلہ کر سکیں وہ دشمن ہے یا کوئی غیر متعلقہ شخص۔ انہوں نے سیف کو بھی محتاط رہنے کی ہدایت کی اور کہا کہ جب تک ہم کارروائی نہ کریں، وہ خاموشی سے جیپ میں ہی بیٹھا ہے۔

جیپ گیٹ پر پہنچ کر رک گئی تو ہارن کی آواز سنائی دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ گیٹ کھول دیا جائے مگر بجائے اس کہ گیٹ کھولا جاتا، اندر سے گاڑ نے باہر آ کر ڈرائیور سے بات چیت شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ یہ گفتگو بحث اور گمراہی میں تبدیل ہونے لگی۔ معاملہ کسی طور پر سلجھتا نہ دیکھ کر گاڑ اندر کی طرف چل پڑا مگر ابھی وہ گیٹ بھی کر اس نہیں کر سکا تھا کہ اس کی کھوپڑی ہوا میں اڑتی ہوئی نظر آئی۔ فائر کی آواز سنتے ہی داور کے دونوں سامھی جو کہ لان میں تھے اپنی اپنی آٹومیک گمر سنبال کر گیٹ کی طرف دوڑے۔ داور نے بھی فائر کی آواز سن لی تھی۔ وہ ابھی زمین کے متعلق شش و پنج میں تھا کہ اس سے تنہائی میں تفتیش کرے یا سب کے سامنے کیونکہ اس کے پاس جو بھی تھا، وہ بہت قیمتی تھا اسی لیے بلال کے لیے یہ بندہ اتنا اہم تھا۔ مگر فائر ہوتے ہی اس نے زمین اور حیدر کو دیکھ لیا کہ اسے میں بند کر دیا جہاں باقی سارے لوگ موجود تھے۔ اور خود اسلحہ لے کر سارہ کے ساتھ محفوظ کمرے میں منتقل ہو گیا جو کہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ یہاں سے باہر لان اور گیٹ تک کا سارہ منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ گیٹ کے باہر اسے ایک لینڈ کرورر جیپ ریورس ہوتی دکھائی دے رہی تھی اور پندرہ گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جیپ طوفانی رفتار سے گیٹ کی طرف

اس لیے سیف نے باقی تینوں ساتھیوں کو تمام تر صورت حال بتائی۔ یہ اب ان کے ایکشن کا وقت تھا۔

☆☆☆

نیم تاریک کمرے میں زین اور حیدر اندھوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے تھے ایک دم زیادہ روشنی سے کم روشنی میں آنے کی وجہ سے فوری طور پر ان کی بصارت پر اثر پڑا تھا۔ کمرے میں موجود تمام لوگ خاموشی اور حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے چونکہ ان کی آنکھیں اس روشنی سے بالواس نہیں اس لیے ان دونوں کو پہچاننے میں ان کو کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک شخص بے چینی سے آگے آیا اور زین کا بازو پکڑ کر بولا۔ ”زین..... آخر تم ان کے ہاتھ لگ ہی گئے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے ہم لوگ کل سے یہاں قیدی بنے ہوئے ہیں۔“ زین بھی کسی حد تک اب ان لوگوں کی شکلیں دیکھنے سے قابل ہو چکا تھا اور پرے اپنا نام سننے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اظہر کو شناخت کر لینے کے بعد اس کے رہے سہے حواس بھی جواب دینے لگے۔ اسی دوران جمیل، خادو اور ملک ارسلان بھی اٹھ کر پاس چلے آئے۔ ان سب کو ایک ساتھ دیکھ کر جہاں زین کو حیرت کے جھٹکے لگے وہیں حیدر کے لیے بھی یہ آسانی سے ہضم ہونے والا منظر نہیں تھا۔ زین اور حیدر نے کوئی منٹ بیٹھی ہوئی حیران و پریشان سوہا اور عائشہ کو کیسے نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ وہ ان کے لیے ہوز انجینی تھیں۔

وہ زین سے سوال پر سوال کرتے جا رہے تھے اور زین یوں کھلا ہٹ کا شکار ہو رہا تھا کیونکہ وہ اتنا تو سمجھ چکا تھا کہ یہ سب جو اس وقت یہاں موجود ہیں اس کی وجہ سے ہیں۔ آخر زین نے تمام سوالوں کے مصلحت آمیز جج اور جھوٹ پر مبنی جوابات دیے تو وہ لوگ تھوڑے پر سکون نظر آئے۔ زین کو چونکہ پتا تھا باہر انجینئرس فورس کے جوان موجود ہیں اس لیے اس کی ہمت بڑھی ہوئی تھی اور حیدر بھی گھبرایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ زین نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ سب بے فکر رہو، ان کا مسئلہ میرے ساتھ ہے، اور اب میں ان کے پاس ہوں تو آپ چاروں کو اپنے گھر جانے دیں گے بلکہ ہو سکا ہے ہم بھی آپ کے ساتھ ہی چلے جائیں اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

یعنی ہم گھر والوں کے پاس نہیں جا سکیں گی؟ صرف یہ چاروں ہی جائیں گے مسٹر زین؟ عائشہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔ سب نے ان دونوں کو کیسے فراموش کر دیا تھا..... کیونکہ ایک دم ہی زین کی آمد نے ان کو حواس باختہ کر دیا اور

وہ جلد از جلد اپنے سوالوں کے جوابات لینے لگے تھے۔ مگر عائشہ کی بات سننے ہی زین کے ماتھے پر ٹھٹھکیں ابھر آئیں۔ ”یہ کون ہیں؟“ اس نے سمیر لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ عائشہ احمد چوہدری اور سوہا اختر ہیں، اگر تمہیں بھول نہ گئیں ہوں تو۔“ اظہر نے زین پر حیرتوں کا ایک اور پہاڑ توڑتے ہوئے کہا۔ زین کو وہ کراکھوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ حیدر کی بھی حالت مختلف نہیں تھی۔ وہ سب ایک گروپ کے ممبر ہونے کے ناتے جانتے تھے کہ یہ دونوں کون ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ دونوں ہی بہت بااخلاق اور مہذب لڑکیاں تھیں..... لیکن اس وقت یہاں داد کی قید میں تھیں۔ مگر کیسے؟ زین کے دماغ میں پچھل چلی ہوئی تھی۔

”یہ دونوں یہاں کیسے؟ اور آپ سب لوگ بھی کس طرح یہاں آ گئے ہو، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا لگتا ہے جیسے کوئی طلسمی کہانی چل رہی ہے اور ابھی میری آنکھ کھلے گی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ زین نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے اس نے بھی ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا اور آج دیکھا بھی تو کس حال میں جبکہ وہ ایک درندے کے رحم و کرم پر تھیں اور وہ خود بھی زندگی داؤ پر لگا کر انجینئرس فورس کی آس پر داد کا سامنا کرنے چلا آیا تھا۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ انہیں باہر ایک بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ کسی گریڈ یا بم کا دھماکا نہیں تھا ورنہ اس کی آواز مختلف ہوتی۔ وہ سب اپنی پریشانی بھول کر باہر کی آوازوں کو سننے لگے جہاں اب فائرنگ کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ زین اور حیدر کو بھی لگا کہ فورس کے جوان ایکشن میں آ گئے ہیں اس لیے وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔ جبکہ ملک ارسلان اور خادو ایک مرتبہ بھرجم جوں کا توڑ ہو چکے تھے۔ وہ کچھ کرتے اس سے پہلے ہی حیدر نے ان کو منع کر دیا کہ ہمارے ساتھ انجینئرس فورس کے بندے آئے ہوئے ہیں اس لیے باہر کے معاملات وہیں ہینڈل کریں گے۔ جب تک ان کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملتی ہمیں اسی محفوظ جگہ پر چبے رہنا ہے۔ فورس کا سن کر دونوں لڑکیوں سمیت باقی سب کی جان میں جان آئی۔ اب ان کو امید ہو گئی تھی کہ خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے۔ حیدر کی چھٹی حس کچھ گڑبڑ کا احساس دل رہی تھی اتنا تو وہ جانتا ہی تھا کہ فورس کے بندے اتنے شور مچا رہے کے ساتھ ایکشن نہیں کریں گے کیونکہ وہ روایتی پولیس والے نہیں تھے۔ یہ کوئی اور معاملہ تھا۔ اس کے اندر کا پولیس والا پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ حیدر نے دروازے کو اندر کی طرف سے لاک کر دیا اور سب سے کہا کہ وہ دروازے کے

بھی نہیں تھا کیونکہ فورس نے ابھی ایکشن نہیں کیا تھا۔ پھر اسے اچانک سیف کا خیال آیا جو اس کی جیب میں چھپ کر یہاں آیا تھا۔ یعنی فورس کا ایک بندہ پہلے سے یہاں موجود تھا اور یقیناً باہر والوں کو مسلسل اندر کے حالات کی خبر دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ ابھری۔ اس نے سیف کو دکھا کر نہ کانپ کر مگر اہم بنایا تاکہ اندر سے معلومات باہر تک نہ جا پائیں اور فورس والوں کا پلہ بھاری نہ ہو سکے۔

☆☆☆

فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ یہ گیٹ ہاؤس چونکہ عام راستے اور آبادی سے کافی ہٹ کر تھا اس لیے بہت کم امکانات تھے کہ فائرنگ کی آواز کسی تک پہنچ سکے۔ مرکزی سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں میں سے شاید کوئی آواز سن پاتا۔ داور تمام تر احتیاط کے ساتھ اور بی بی تلی فائرنگ کر رہا تھا۔ لیکن جیب کی ٹینک کے مانند لان میں کھڑی تھی۔ داور کا اب صرف ایک ساٹھی گیٹ ہاؤس کی چھت پر موجود تھا۔ وہ وہاں پانی والی تنگی کے پیچھے سے جیب پر فائرنگ کر رہا تھا مگر جیب کی دونوں ساٹھ کے پچھلے شیشے ہلکے سے نیچے ہوتے اور ایک آدھ برسٹ مار کر خاموش ہو جاتے۔ اچانک داور کی عقل نے کام کیا۔ جیب کے شیشے ہلٹ پر دف تھے اسی لیے اتنی فائرنگ کے باوجود شیشے میں کھڑکی کے جالے بننے کے سوا کوئی خاص نقصان نہیں کر سکے۔ نہ ہی جیب میں موجود لوگوں کی تعداد کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس لیے داور نے فائرنگ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سارہ بھی ایک عدو پستول تھامے کرسی پر خوف زدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اب داور کو انتظار تھا کہ جیب سے کوئی اترے تو وہ اس کو نشانہ بنائے لیکن وہ کسی پراسرار مخلوق کی طرح لان میں جول کی توں موجود تھی۔ داور کی طرف سے مزید فائرنگ نہ کرنے پر داور کا ساٹھی جو چھت پر موجود تھا، محتاط ہو گیا اور فائرنگ میں وقفہ آ گیا۔ یہی وقت تھا جب موجو گن سنبھالتے ہوئے کارڈور میں آیا۔ کارڈور کے اوپر چھجا نما چھت ہونے کی وجہ سے وہ داور کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ موجو نے اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کارڈور میں آ کر جیب کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا پلا۔ اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ جیب کچھ لمحوں کے بعد چلتی ہوئی کارڈور میں داخل ہو گئی۔ داور اور اس کے ساٹھی نے ملاوچہ چار پانچ فائر کیے مگر کارڈور میں پہنچتے ہی جیب ان کے نشانے پر موجود نہیں رہی تھی۔ جیب کے اگلے دونوں دروازے بیک وقت کھلے پھر دو گن بردار اور جیم آڈی اترے۔ ”کیا رپورٹ ہے۔“ انہوں نے موجو سے استفسار کیا۔ جوابا موجو نے ان کو تمام

سامنے سے ہٹ کے دوسرے رخ پر بیٹھ جائیں اور چوکتا رہیں۔ کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس لیے تیار رہیں۔ خاور اور ارسلان کے لیے تو جیسے یہ پسندیدہ بات تھی۔ اس لیے حیدر، خاور اور ملک ارسلان دروازے کے قریب چوکس انداز میں کھڑے ہو گئے۔ اسلحے کے نام پر ان کے پاس خالی ہاتھوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موجو سے حاصل ہونے والا پستول بھی فورس کے جوانوں کے پاس تھا۔ جبکہ زین، اظہر اور جمیل دونوں لڑکیوں کے ساتھ کمرے کے دوسرے کونے میں دفاعی پوزیشن میں چلے گئے جو براہ راست دروازے کی طرف نہیں تھا۔ اب ان کو باہر سے فورس کی مدد اور ہدایت کا انتظار تھا۔

☆☆☆

منظور عرف موجود داور کو دواش روم کا بول کر سائڈ پر ہو گیا تھا۔ اس کے پاس جو پستول تھا وہ زین اور حیدر نے چھین لیا تھا۔ اب وہ خالی ہاتھ تھا مگر بی بی لاؤنچ میں اس نے داور کے اسلحے کے چھوٹے سے کوڈ لکھ لیا تھا جس میں سات آٹھ تعداد میں آٹھ ٹینک اور تین عدو دستی بم موجود تھے۔ یہ صوفے کے پیچھے خلا میں رکھے ہوئے تھے۔ داور کو گن تبدیل کرتے وقت موجو کی نظر ان پر پڑ گئی تھی ویسے بھی یہاں اس نے اسلحے کا یہ چھوٹا سا ذخیرہ چھپا کر نہیں رکھا تھا۔ موجود دواش روم سے نکل کر وہاں آ رہا تھا کہ اسے بھی گیٹ ٹوٹنے کا دھماکا سنائی دیا۔ پھر اس کے بعد فائرنگ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ وہ فوراً گھبرا گیا۔ اس لیے ایک اوٹ میں چھپ گیا۔ اسی لمحے اس نے داور کو سارہ کے ساتھ فرسٹ فلور پر جاتے ہوئے دیکھا۔ داور نے غالباً تین چار مزید بندوبست اٹھائی ہوئی تھیں اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ اسی ذخیرے سے لی گئی ہیں جس کے متعلق موجو کو علم تھا۔ داور اور سارہ کے اوپر جانے کے بعد موجو نے اپنی بٹا کی خاطر بی بی لاؤنچ کا رخ کیا اور صوفے کے پیچھے جھانکا۔ جہاں صرف ایک سیون ایم ایم پڑی تھی اور تین عدو ہینڈ گرنیڈز۔ داور ساری کمر اور دستی بم لے جاتا لیکن شاید وہ غلط میں چھوڑ گیا ہو گا۔ کچھ نہ ہونے سے یہ گن اور ہینڈ گرنیڈز کا ہونا بہت نذیمت تھا۔ اس نے ہینڈ گرنیڈ اپنے لباس کی ایک محفوظ جگہ میں چھپا لیے تھے۔ وہ ایک محفوظ پوزیشن لے کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف کم ہو گیا۔ اسے پہلے یہ محسوس ہوا تھا کہ فورس والوں نے حملہ کیا ہے لیکن لان میں موجود جیب اور وہاں سے چاروں طرف ہوتی ہوئی فائرنگ سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی مدد پہنچ چکی ہے۔ مگر وہ محفوظ ابھی

صورت حال بتائی اور یہ بھی کہ داور کے پاس اب ایک لڑکی سارہ اور چھت پر موجود ایک ساتھی کے سوا کوئی مدد نہیں ہے۔ اور یہی سچ بھی تھا۔ داور کی کو مدد کے لیے بلا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اتنا بوکھلا یا ہوا تھا کہ اسے کچھ سوچہ نہیں رہی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ موجود نیچے واٹ روم میں گیا تھا تو ابھی تک سامنے کیوں نہیں آیا..... پھر موجود نے گویا ان کو خبردار کرتے ہوئے بتایا کہ سامنے محکم میں کھڑی جیب میں ایک فورس کا بندہ موجود ہے اور کس طرح تین بندے باہر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

”کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ یہ بلال غوری کی آواز تھی جو جیب سے ابھی ابھی برآمد ہوا تھا اس کے ساتھ دوسرا زبیر احمد اور ایک مزید باڈی گارڈ ٹائپ کا شخص جو دوسرے دونوں آدمیوں کی طرح ہی طویل القامت اور قوی الجسہ تھا۔ ان تینوں کو بلال غوری نے خاص طور پر ہائر کیا تھا۔ زبیر احمد کے ہاتھ میں بھی آٹومیٹک گن نظر آ رہی تھی۔ صرف بلال ہی واحد بندہ تھا جو خالی ہاتھ تھا۔ ”سراپوں نے مجھے راستے میں ٹریپ کر لیا تھا۔“ موجود نے عاجزی سے بلال غوری کو بتایا۔

”تم کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ ہم کو اطلاع ہی کر دیتے۔ اب ہم یہاں بری طرح چھن گئے ہیں۔ دل تو چاہتا ہے تم کو ابھی جہنم رسید کر دوں۔“ بلال غضب ناک انداز میں موجود پر چلا رہا تھا۔ پھر وہ جیب کی طرف متوجہ ہوئے جہاں موجود کے مطابق سیف نامی جوان چھپا ہوا تھا۔ ان میں سے دو آدمیوں نے گورد یا دوتیرا آدمی برقی رفتار سے جیب کی اس سائڈ پر چلا گیا جو داور اور اس کے ساتھی کی زد میں نہیں تھی۔ اس نے جیب کا پچھلا دروازہ کھولے بغیر شیشے پر گن رکھ کر ایک طویل برسٹ فائر کیا..... ایک چمٹا کے سے شیشہ کرچی کرچی ہو کر گاڑی اور لان میں بکھر گیا اور بے شمار گولیاں جیب کی باڈی اور سیٹوں میں گھس گئیں۔

☆☆☆

سیف نے جب ٹراسمیٹر سے باقی ساتھیوں سے رابطہ کیا تھا تو اس کو نو راہدایت ملی تھی کہ وہ کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر گور لے اور پھر اطلاع دے تاکہ کارروائی کی جاسکے۔ یہ نئے مہمان ان کی پلاننگ کا حصہ نہیں تھے اس لیے اب وہ نئے سرے سے لائن آف ایکشن تیار کر رہے تھے۔ اسی دوران سیف کو موقع ملا جب لان میں کھڑی جیب کا ریڈور کی طرف تھنی تو سیف نے پھرتی سے جیب چھوڑ کر ایک محفوظ ٹھکانا تلاش کر لیا جو کہ گیٹ ہاؤس کی پشت پر تھا۔ داور اور اس کے ساتھی کا سارا دھیان بلٹ پروف جیب کی طرف تھا اس لیے سیف کی نقل و حرکت وہ محسوس نہیں کر سکے۔ سیف نے جیب چھوڑتے

وقت بلال اور اس کے تمام باقی ساتھیوں کو دیکھ لیا تھا لیکن چونکہ سب کی پشت اس کی جانب تھی اس لیے وہ کسی کو پہچان نہ سکا خاص طور پر بلال کو..... لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے ملے آنے والوں کی تعداد اور کسی حد تک اسلحہ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب محفوظ جگہ پر پہنچنے ہی اس نے تازہ ترین صورت حال کی اپ ڈیٹ دی۔ اس وقت باہر موجود تینوں ساتھیوں نے اپنے لائحہ عمل کو تھوڑا سا تبدیل کیا۔ بجائے سامنے سے گیٹ کی طرف حملہ کرنے کے وہ گیٹ ہاؤس کے عقب سے باؤنڈری وال پھلانگ کر احاطے میں داخل ہوتے۔ سیف وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ وہ ابھی اطلاع دے کر کسی محفوظ مقام کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ اسے ایک طویل برسٹ سنائی دیا۔ اور ساتھ ہی شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ باہر سے آنے والی جیب بلٹ پروف ہے۔ لہذا شیشہ ٹوٹنے کی آواز یا تو عمارت کے کسی حصے سے آئی ہے یا پھر جس جیب میں وہ موجود تھا اس کو شیشہ تم بتایا گیا ہے۔ یہ خیال کافی سہاں روح تھا، کیونکہ چند لمحات پہلے وہ وہیں موجود تھا۔ اگر یہ سچ تھا تو اس کے ٹک کے تصدیق بھی ہو گیا کہ منظور عرف موجود دو طرف سے کھیل رہا ہے۔ اور یہی آنے والی پارٹی کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔ ورنہ نئے آنے والوں لوگوں کو کیسے پتا چل سکتا تھا کہ سیف جیب کے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ ابھی سوچوں میں غلط تھا کہ اسے اپنے عقب میں دھپ دھپ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ بجلی کی سرعت سے مڑا اور اپنے ربوہ اور سے نشانہ لے کر فائر کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اسے اپنے ساتھیوں کی جھلک دکھائی دی۔ وہ ایک طویل اور مضبوطی آہ بھر کر رہ گیا۔ سیف نے اب نیا لائحہ عمل سوچ لیا تھا اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوسرے راستے سے داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔

اپنی تیاری مکمل ہوتے ہی کمانڈر جس کا نام صہیب تھا، اس نے آرڈر کیا۔ ”کوائڈ شوٹ ٹوکل بوائز“..... سب نے بیک وقت کہا۔

”ییس سر۔“ اور اگلے ہی لمحے وہ اپنی منزل کی طرف چل دوڑ پڑے۔

☆☆☆

جیب کے شیشے پر فائرنگ کرنے کے کچھ دیر بعد جیب کا دروازہ کھولا گیا تو خالی جیب ان سب کا منہ چڑا رہی تھی۔ خالی جیب پا کر بلال اور موجود کا چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا۔ عین ممکن تھا سیف نامی اہلکار گیٹ ہاؤس کے اندر ہوتا یا پھر وہ کہیں محفوظ مقام پر منتقل ہو گیا تھا۔ دونوں طرح سے ہی

☆☆☆

داور مارے حیرت کے لنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ نیچے کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ اس نے پریشانی کے عالم میں سارہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں خوف کے سائے گہرے نظر آرہے تھے۔ سارہ اب تک داور کی سب سے چپیتی اور لمبا عرصہ تک رہنے والی محبوبہ تھی لیکن داور کی خواہش اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ سارہ کو قربانی کی بکری بنا کر خود کی طرح موت کے گھبرے سے نکل جائے۔ اس نے سارہ کو تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ نیچے جو دو طرفہ فائرنگ سن رہی ہو، یہ میرے لوگ ہیں جو مدد کو پہنچ گئے ہیں۔ اب جلد ہی بازی ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔“

سارہ بے شبہی کے عالم میں داور کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ داور نے کہا ”تم بس کی طرح نیچے کمرے میں موجود قیدیوں میں سے زین نامی لڑکے کو اوپر لے آؤ تو ہماری پوزیشن بہت اچھی ہو جائے گی۔ یہ لوگ ابھی آپس میں الجھے ہوئے ہیں اس طرف کسی کا دھیان نہیں ہوگا۔ ویسے بھی لادزج اور اس کمرے کا کافی فاصلہ ہے۔ میں تم کو کور کروں گا تم زین کو لے کر اوپر آجانا۔“

سارہ ابھی تک تردد کا شکار تھی..... مگر اسے یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی کیونکہ مرنے کا فی الحال اس نے بھی کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا۔ وہ اس وقت کوکوس رہی تھی جب داور کے ساتھ یہاں پہلی آئی تھی مگر داور نے اسے چوائس نہیں دی تھی ایک طرح سے حکم دیا جو اسے ہر حال میں پورا کرنا تھا۔ وہ چارواں چارہ پتول ہاتھ میں تھا اسے اپنے محفوظ مسکن یعنی کمرے سے باہر نکلی جبکہ داور اسے بظاہر کور دیتے ہوئے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اصل میں گراؤنڈ فلور پر قابض پارٹی کا ڈومل دیکھنا چاہ رہا تھا۔ سارہ احتیاط سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آ رہی تھی۔ سارہ کمرے کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کی سانسیں دھونکی کے مانند چل رہی تھیں اور ہاتھوں میں واضح لرزش تھی۔ اس نے دروازے کے ہینڈل لاک میں چابی کھما کر دروازہ ان لاک کیا اور ہینڈل پوری قوت سے کھمایا۔

☆☆☆

فوس کے دو جوان چھت کے راتے سے نیچے آ رہے تھے مگر دوسری منزل پر کھٹکا ہونے کی وجہ سے وہ محتاط ہو گئے۔ یہ کسی دروازے کے کھلنے کی آواز تھی۔ وہ مزید محتاط ہو

صورت حال ان کے حق میں نہیں تھی۔ موجو نے بلال کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اندر سے آ رہا ہوں۔ اوپر والی منزل پر داور ہے اور نیچے اس نے تمام قیدیوں کو رکھا ہے۔ اگر وہ ابھار اندر ہوتا تو مجھ سے ضرور ٹکراتا۔ اس کا مطلب ہے وہ گیسٹ ہاؤس سے باہر ہی ہے۔“ بلال نے موجو کی اطلاع پاتے ہی سب کو اشارہ کیا اور اندر چلے گا کہا۔ موجو کے ساتھ بلال اور دو باڈی گاڑڈ ٹائپ آڈی اندر کو چل دیے۔ تیسرے باڈی گاڑڈ جو جیب پر فائرنگ کرنے گیا تھا وہ ان سے ذرا فاصلے پر تھا۔ جب تک وہ دروازے کے قریب پہنچتا۔ ادھر سے سیف اور اس کا ساتھی صہیب نمودار ہوئے۔ چونکہ اس کی پشت ان کی جانب تھی لہذا وہ نہ دیکھ سکا۔ اسی لمحے صہیب کی سیون ایس ایم جی رائفل کا سنگل شاٹ فائر ہوا اور وہ عقب سے اس کی کھوپڑی میں بہوست ہو گیا۔

وہ چلرا کر گیسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کے سامنے گر گیا۔ بلال سمیت دوسرے لوگ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پہلے ان کو یہ محسوس ہوا یہ داور یا اس کے ساتھی کی کارروائی ہے مگر جب اوپر چھت کی طرف سے بھی ان کو فائر کی آواز آئی تو انہیں کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ فورس کے جوان ایکشن میں آچکے ہیں۔ وہ فوراً اندر کی طرف بھاگے۔

چھت پر موجود داور کے ساتھی نے فائر کی آواز سنی اور ساتھ ہی کسی کے گرنے کی بھی۔ یقیناً کوئی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس پلیس نے ٹیکسی کی اوٹ لے کر فحش میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اور اپنی موجودگی کی دلیل کے لیے ایک فائر کیا۔ یہی لمبائی غفلت اسے بہت چھٹی پڑ گئی۔ جب تک اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب پہنچا ہے تب تک اس کی گردن ایک آہنی کھنچے میں کسی جابجی تھی۔ اس کے حلق سے خرخر کر کے آوازیں آنے لگیں۔ کمانڈر نے اس کی گن اپنے قبضے میں لی اور اس کو زندگی کے قید سے آزاد کر دیا۔ وہ سب یہاں معمول کے ریڈ پر آئے تھے کہ انما کاروں کو گرفتار کر کے لے جاتے۔ مگر گیسٹ پر موجود چوکیدار کے ساتھ ہونے والی کارروائی اور سیف کی خبروں نے ان کو انتہائی حدوں پر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر اب ابھی کسی کے ساتھ زنی سے پیش آتے یا گرفتار کرنے کی کوشش کرتے تو بہت زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا۔ اسی بنا پر ان کو شوٹ ٹوکل والی صورت حال پر عمل کر رہے تھے۔ چھت خالی ہوتے ہی کمانڈر اور اس کے ساتھی گیسٹ ہاؤس کی پہلی منزل کی جانب چل دیے۔ نیچے سے ان کو تسلی بخش آوازیں آ رہی تھیں۔

گئے کیونکہ اب ان کو گراؤنڈ فلور سے پہلے بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ کمانڈر نے جھانک کر بیچے دیکھا تو اسے سیزھیوں سے ایک پستول بردار لڑکی بیچے جانی دکھائی دی۔ جبکہ دروازے میں ایک شخص کھڑا تھا۔ یہ یقینی طور پر داور تھا۔ کیونکہ یہ ان کے ریڈار پر کافی عرصے سے تھا مگر کوئی واضح ثبوت یا گواہ نہ ہونے کی بنا پر ابھی تک آڑا دکھوم رہا تھا۔ داور کے متعلق ویسے بھی موجودان کو کافی بریف کر چکا تھا اس لیے ان کو ڈراسی بھی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ جیسے جیسے داور بیچے سیزھیاں اتر رہا تھا، وہ بھی آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ لڑکی یعنی سارہ کے گراؤنڈ فلور تک جاتے جاتے داور ایسی پوزیشن میں آ گیا کہ وہ دوبارہ اپنے ٹھکانے پر آنے کے لیے اسے فورس کے جوانوں سے دو دو ہاتھ کرنے پڑتے۔ داور فورس والوں کے نشانے پر تھا مگر وہ فی الحال اس حق میں نہیں تھے کہ داور یا لاؤنچ میں موجود لوگوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا جائے اس لیے وہ خاموشی سے داور کی کالروائی ملاحظہ کر رہے تھے۔ اچانک انہوں نے داور کو پلٹتے دیکھا، ساتھ ہی ایک خوفناک قسم کے برسٹ سے گیسٹ ہاؤس کو بج اٹھا۔ ان کو لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ یقیناً لڑکی براہ راست گولیوں کا نشانہ بنی تھی۔ داور نے اسے چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ساتھ ہی داور ایک جھلک میں سرکاری اہلکاروں کو شناخت کر چکا تھا۔ اس کے آگے کھائی اور پیچھے کھڑے جیسی صورت حال تھی۔ اس نے خود کو محفوظ اوٹ میں چھپاتے ہوئے ان پر فائر کیا۔ اور ساتھ ہی اس نے سیزھیوں کے نیچے بھی فائر کر کے اوپر آنے کا خیال لانے والوں کو تنبیہ کی۔ لیکن سیزھیوں میں اپنی محفوظ آڈیو سن رہی تھی کہ وہ دونوں جانب سے بھرپور دفاع کر سکتا۔

فورس کے جوانوں پر جب داور نے فائر کیا تو وہ فوراً دیوار کے ساتھ لگ گئے اور کسی بھی قسم کے نقصان سے محفوظ ہو گئے تھے۔ لیکن داور اب بالکل غیر محفوظ صورت حال سے دوچار تھا۔۔۔۔۔ جوانی کا ردوائی کرنے کے لیے وہ اوٹ سے ذرا سا باہر نکلا ہی تھا کہ فورس کا جوان جوتاک میں بیٹھا تھا اس کی گن سے نکلنے والا تھپہ داور کے لیے قیامت ڈھا گیا۔ دس بارہ گولیوں کا برسٹ داور کے جسم کے زیریں حصے میں لگا۔ اس کو اپنے کو لمبے کی ہڈی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی اپنی جان نکلتی دکھائی دینے لگی۔ وہ مزید مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس لیے دونوں اہلکار ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے اسے اٹھا کر کمرے میں لے آئے جو کہ داور کی کمین گاہ تھی۔ داور کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ انہوں نے

فوری طور پر بستر کی چادروں کی پریشر بینڈج بنا کر داور کو تین چادروں میں لپیٹ دیا۔۔۔۔۔ لیکن ایک فیصلہ بھی امکان نہیں لگ رہا تھا وہ بیچ پائے گا۔ اس فائرنگ سے گراؤنڈ فلور والے یقیناً آگاہ ہو چکے تھے کہ اوپر داور بھی لوگ ہیں اس لیے اب وہ مزید رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی گرفت اپنی آئوٹریک راکٹفلز پر مضبوط ہو گئی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں چٹانوں کی سختی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ اب ان کا فیصلہ کن معرکہ تھا۔ انہوں نے داچ ٹراسمیٹر پر سیف اور اس کے سامنے کو آپ ڈیٹ کیا پھر وہ سیزھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

کمرے میں انتہا کی خاموشی تھی۔ سب کی سانسوں کی تھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ باہر ہونے والی فائرنگ سے وہ سبکی شش و پنج میں مبتلا تھے۔ حیدر نے سکوت کو توڑتے ہوئے زین سے کہا۔ ”بھائی موجود کو تو پتا ہے کہ فورس کے جوان ہمارے ساتھ ہیں۔ اس نے کہیں داور کو بتانہ دیا ہو اور داور نے مزید مدد حاصل کر لی ہو۔“

زین نے فہمی میں سر ہلایا۔ ”نہیں یہ کوئی اور چکر لگ رہا ہے۔ داور نے کسے سامنے ہوتے تو وہ اب تک ہماری طرف ضرور آتے۔ ان کا نہ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ داور اور فورس والوں کے علاوہ کوئی تیسری پارٹی ہے۔ تم نے آگے دھماکا نہیں سنا۔ یہ آپس میں دوست نہیں ہیں۔ لیکن پریشانی یہ ہے کہ ہمارے حق میں ایسے ہیں یا برے، یہ ہم کو علم نہیں۔“

زین کی باتیں سن کر باقی لوگوں کو بھی تشویش لاحق ہو گئی۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے صورت حال کافی حوصلہ افزا تھی کہ فورس والے ایکشن لے کر داور اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرتے اور یہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔۔۔۔۔ مگر اب معاملے کا رخ یکسر ہی تبدیل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ دروازے پر آہٹ سنائی دی، خاور اور ملک ارسلان ایک دم سے چوٹے ہو گئے۔ وہ کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔ ان کو دروازے کے لاک میں چابی کھونسنے کی آواز سنائی دی۔ جیسے ہی ہینڈل گھوما ایک برسٹ فائر ہوا اور ان کو دروازے پر لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ حیدر ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ داور کے ساتھ نظر آنے والی طرح دار حسینہ سارہ کی چیخ ہے۔ برسٹ چونکہ سائڈ سے فائر کیا گیا تھا اس لیے دروازہ براہ راست نشانہ بننے سے محفوظ رہا۔ حیدر اور زین دونوں نے دروازے کے نیچے سے خون کا چھوٹا سا تالاب بننے ہوئے دیکھا تھا مگر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ لڑکیوں کو مزید

بلال نے بھرپور محنت کا ارادہ کیا، اس نے اپنے دو پاؤں گاڑ ڈال کر دیکھا کہ کسی بھی طرح کمرے میں موجود لوگوں میں سے اس کا مطلوبہ بندہ یا کوئی ایک دو رغبتی اٹھا لیے جائیں تاکہ محفوظ راستہ مل سکے، اس کے لیے بھرپور حوصلہ کرنا ہوگا۔ جبکہ موجود آؤج کے مین گیٹ کی طرف سیف اور اس کے ساتھی کی پیش قدمی روکتا۔

دونوں گاڑ ڈالنے کمرے کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ بہت محتاط تھے لیکن موت ان کا مقدر بن چکی تھی۔ جیسے ہی ان میں سے ایک بندے نے دروازہ کھولنا چاہا تو اسے اندر کی جانب سے قتل پایا۔ دونوں گاڑ ڈالنے پیچھے ہٹ کر کندھے کی ایک زوردار ضرب لگا لی۔

دروازہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ایک برست طے کی آواز آئی۔ یہ صہیب تھا جو پہلی منزل پر داخل ہوا پہلی گولیوں کا نشانہ بنا چکا تھا جب وہ سارہ کو کور دینے کی خاطر پیچھے جھانک رہا تھا۔ وہ اس وقت ان کی کارروائی دیکھ رہا تھا جب دونوں گاڑ ڈال کر دروازہ توڑنے کے لیے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس نے سیزھیوں پر کھڑے کھڑے ان دونوں کو نشانہ بنایا لیکن مرنے سے پہلے ایک گاڑ کی گن سے گولیوں کی ایک بو جھاڑ نکلی جس کے نتیجے میں اندر سے بے شمار چٹخیں سنائی دیں۔ صہیب اور نعمان داور کو بری طرح زخمی حالت میں چھوڑ کر اس کمرے کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

اس کمرے سے آنے والی چٹخیں لڑکیوں کی تھیں کیونکہ انہوں نے ایک تو اتنے قریب سے فائرنگ سنی تھی دوسرا انہوں نے ملک ارسلان کو ہوا ہو کر لپٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی فورس کے جوان صہیب نے ایک نو جوان کو دیکھا جس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور اس کے ارد گرد سب لوگ جمع تھے۔ صہیب ان سب میں صرف حیدر اور زین کو ہی پہچانتا تھا۔ اس لیے اس نے سرکاری بندے یعنی حیدر سے پوچھا ”کیا صورت حال ہے؟ اور یہ زخمی کون ہیں؟“

”سر سب ٹھیک ہے صرف ان کی ٹانگ پر بلیٹ ہٹ ہوئی ہے“ حیدر نے زخمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

اس نے گویا یہ سمجھ لیا تھا کہ اس وقت کمانڈنگ آفیسر صہیب ہی ہے۔ حیدر اور باقی تمام لوگ صہیب اور اس کے بلیک یونیفارم کو دیکھ کر اطمینان محسوس کرنے لگے لیکن اگلے ہی لمحے ان کو زخمی ملک ارسلان کا خیال آیا جس کی ٹانگ گاڑ

دہشت زدہ نہیں کرنا چاہتے تھے جو کہ پہلے ہی فائرنگ کی آواز سن کر سہمی ہوئی ہر نیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ حیدر کے مطابق اب وہ پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ کیونکہ دروازے کا لاک کھل چکا تھا۔ بے شک انہوں نے اندر سے چٹخی لگائی تھی مگر وہ صرف ایک زوردار دھکے کی مار تھی۔ خادور ملک ارسلان کی کسی ممکنہ مہم جوئی کے پیش نظر انہیں اور جیل سے ان دونوں کو دروازے کے سامنے سے ہٹا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ان کو پیر فائرنگ کی آواز سنائی دی جو کہ اوپر والی منزل پر ہو رہی تھی۔ حیدر کو طمانیت کا احساس ہوا۔ حیدر کو یقین ہو گیا کہ یہ خفیہ ایجنسی کے لوگ ہیں جو براہ راست ان کی مدد کر رہے ہیں۔

حیدر نے زین کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔ زین کو اس اطلاع نے پرسکون کر دیا تھا مگر زین نے فی الوقت دوسرے ساتھیوں کو بتانا مناسب نہ سمجھا تا کہ جب تک کوئی واضح برتری یا ان کے حق میں صورت حال نہیں ہوتی یہ محتاط رہیں۔

☆☆☆

موجودہ بلال کے کہنے پر آؤج میں پوزیشن سنبھال کر بیٹھا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ کمرے میں سارے قیدی موجود ہیں۔ وہ بلال سے کہہ کر اپنی پوزیشن تبدیل کرنے ہی والا تھا کہ اسے سیزھیوں پر سایہ لہرانے کا شبہ ہوا۔ وہ کھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی پوری توجہ اس وقت سیزھیوں سے نیچے اترنے والے شخص پر تھی۔

اس نے دیکھا سارہ ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں چابی لیے نمودار ہوئی ہے۔ اس نے ٹریک پر دباؤ بڑھایا تب ہی تھا کہ کسی خیال کے تحت رک گیا۔ یہ بہترین لمحہ تھا کہ سارہ دروازے کا لاک کھول دیتی اور ان کے اندر جانے کی راہ ہموار ہو جاتی۔ جیسے ہی سارہ نے دروازے کا لاک کھولا اور پینڈل اٹھایا موجودہ گن کا رخ سارہ کی طرف کر کے ایک طویل برست مار دیا۔ سارہ تڑپتی ہوئی فاختہ کے مانند فرش پر گر گئی اور کچھ جھٹکے کھانے کے بعد زندگی کی قید سے آزاد ہو گئی۔ اس نے بلال کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا کہ کمرے کا لاک کھل چکا ہے اور داور کی ساتھی لڑکی اس کا نشانہ بن گئی ہے۔ بلال غوری نے مزید ہدایات دینے کا ارادہ لیا تھا کہ اسے اوپر تلے سنگل شاٹ فائر سنائی دے اور پھر ایک طویل برست۔ ساتھ ہی داور کی کریہہ چٹخیں بھی۔ یہ ان سب کے لیے الارم تھا۔ اب یقینی طور پر فورس کے بندے داور اور اس کے ساتھی پر قابو پا کر یا ان کو ختم کر کے۔۔۔۔۔ ان کی طرف آرہے تھے۔

کے برست کی زمیں آگنی تھی۔ صہیب نے فوراً سے پیشتر ملک ارسلان کی زخمی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ گولی نے ملک ارسلان کی ہڈی کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ صہیب نے اپنے طور پر ابتدائی طبی امداد کے تحت زخم پر پریشر بینڈیج کر دی۔ لڑکیاں ابھی تک سبھی ہوئی ہر نیوں کی طرح بیٹھی تھیں۔ زین اور حیدر اب سوالیہ نظروں سے صہیب کی طرف دیکھنے لگے۔ گویا وہ اس سے آگے کا لائحہ عمل پوچھ رہے تھے۔ صہیب نے دائر لیس سیٹ نکال کر احاطے میں موجود سیف کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ سیف کے مطابق اب صرف تین ہی مزید آدمی رہ گئے ہیں۔ تمام مغوی باز باہر ہونے کے بعد وہ زیادہ آزادی اور آسانی سے آپریشن مکمل کر سکتے تھے۔

☆☆☆

بلال پر صورت حال آشکار ہو چکی تھی کہ اب فرار کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ اُس نے موجودہ بہت بے چینی سے کہا ”موجودہ مسلسل فائرنگ کرتے ہوئے جپ کی طرف جا کر اس کا دروازہ کھولو، میں تم کو وردیہ ہونے ساتھ ساتھ نکلوں گا۔“ وہ زبیر احمد کو سیکر فراموش کر چکا تھا۔ موجودہ نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک عدد پستول بلال غوری کے ہاتھ میں تھا دیا۔ بلال کے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی مگر اب یہ سب چیزیں اس کے لیے قہر پارینہ ہو چکی تھیں۔ اس لیے پستول پر اس کی گرفت کمزور تھی اور اس کے ہاتھوں میں لرزش واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ مگر فی الحال یہ مسئلہ ان کی بقاء کا تھا اس لیے وہ ایک جوش اور دلولے سے لاؤنچ کر اس کر کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔ موجودہ نے اپنی آٹومیک گن جو کہ جس ساختہ سیون ایم ایم تھی پوری طرح تیار رکھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا۔ ان کا استقبال پانچ گولیوں کے چھوٹے سے برست سے ہوا۔ یہ سیف کے ساتھی صائم خان کی طرف سے وارننگ تھی۔ اس کا نشانہ بالکل سچا اور بے داغ تھا۔ موجودہ نے پیش کے عالم میں ان کی طرف رخ کر کے اپنی گن کا دہانہ کھول دیا۔ حالانکہ وہ ایک محفوظ آڑ میں تھے۔ ساتھ ہی وہ بھاگتا ہوا جپ کی طرف بڑھا۔ زبیر احمد نے بھی حتی المقدور اپنا حصہ ڈالتے ہوئے فائرنگ میں حصہ لیا۔ موجودہ کے ہاتھ میں دائر کے اسلحے سے نکالا ہوا ایک بینڈ کرینڈ موجود تھا جو اس نے پن نکال کر اس کو نے کی طرف اچھال دیا جہاں سیف اور صائم خان آڑ لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بلال پستول تھا سے اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ان دونوں کی پیش قدمی محسوس کر

کے صائم خان نے فائرنگ کے لیے پوزیشن لی اور موجودہ کے سر کا نشانہ لے کر فائر داغ دیا۔ فضا میں سب مشین گن اور وہلہ گرینڈ کے دھماکے کی آواز ایک ساتھ آئی۔ سیف جو کہ صائم کو گوردینے کے لیے اس سے چھوٹ کے فاصلے پر موجود تھا، دھماکے کی شدت سے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ذہن پر تار کی چھار ہی تھی، اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے جو آخری منظر دیکھا، وہ صائم خان کا خون میں لت پت جسم تھا جو اس سے چند میٹر کی دوری پر پڑا ہوا تھا۔ صائم خان نے جاتے جاتے بھی اپنے نشانے کی لاج رکھی تھی۔ موجودہ کے سر سے مغز بہہ کر فرش کو آلودہ کر رہا تھا جبکہ بلال موجودہ کے ہاتھ سے چابی لے کر جپ کا دروازہ کھولنے میں مصروف تھا۔ اس دوران زبیر احمد مسلسل گن پکڑے ہوئے چاروں طرف محتاط نظروں سے کسی ممکنہ حملہ آور سے نمٹنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ہلکی سی ٹھٹھکی کی آواز آئی اور جپ کا دروازہ کھل گیا۔ اس آواز نے اسے جہاں جپ کی طرف متوجہ کیا، وہیں اس کی خوشی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ اب یہاں سے نکلنے کے آثار بہت روشن نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

صہیب نے نعمان سمیت حیدر اور زین کو ساتھ لیا، جبکہ باقی سب کو پیچھے آنے کا کہا۔ ملک ارسلان اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے خاد کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔ صہیب نے حیدر کو ایک نانن ایم ایم پستول تھا دیا تھا، یہ غالباً موجودہ والا پستول ہی تھا۔ اس کے پاس اور بھی اسلحہ تھا جو کسی اور کو دیا جاسکتا تھا۔ مگر وہ صرف ایک سرکاری، ملٹری ٹرینڈ ہندے اور اس کی پروفیشنل تربیت پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اسلحے کے معاملے میں۔

”آپ لوگ تب تک آگے نہیں آئیں گے جب تک ہم سب ایریا کلیئر نہ کر لیں۔“ صہیب نے حیدر اور زین کو چھوڑ کر باقی سب کو مخاطب ہو کر کہا۔ زین کو اس لیے شامل رکھا تھا کیونکہ پرائم ٹارگٹ وہی تھا۔ وہ ابھی لاؤنچ کی طرف محتاط انداز میں بڑھ ہی رہے تھے کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے محتاط انداز میں پوزیشن لی تھی کہ دھماکے کی آواز سنائی دی۔ صہیب کو پچھاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ایک وقتی بم کا دھماکا تھا۔ اس نے تازہ ترین صورت حال کے لیے سیف کے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کیا۔ مگر سیف کی طرف سے کوئی مکمل موصول نہیں ہوا۔ پھر اس نے صائم خان سے بھی رابطہ کی کوشش کی مگر وہاں سے جواب نہ ملا۔ یہ صورت حال کافی تشویش ناک تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور

تھا۔ اس کے تائن ایم ایم سے ٹکلی ہوئی دونوں گولیوں نے زبیر احمد کے چہرے میں روشن دان بنادیا۔ صہیب نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو زبیر احمد کے ہاتھ میں گن اور حیدر کے تائن ایم ایم سے ٹکلا ہوا دھواں اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔ اس نے سراہنے والے انداز میں حیدر کو کچھ کمر ہلایا۔

”سب کو باہر لے آؤ“ صہیب نے زین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یعنی وہ حیدر کی یہاں موجودگی چاہتا تھا۔ اسی دوران صہیب کی آہنی گرفت میں موجود بلال نے اپنا تعارف کروانے کی کوشش کی۔ ”تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں، میں ایک معزز سیاستدان ہوں، مجھے کچھ غنڈے پکڑ کر یہاں لے آئے تھے۔ میری کسی سے بات کرواؤ، ورنہ تم بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“ وہ تکلیف کے عالم میں یوں چلا جا رہا تھا۔ صہیب کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ وہ اسے بلال غوری کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔ لیکن اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

”سر..... ادھر آئیں۔“ لان کی دوسری طرف سے نعمان کی تاسف بھری آواز سنائی دی۔ صہیب نے بلال غوری کو حیدر کے سپرد کر دیا اور خود نعمان کی طرف چل پڑا۔ اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ وہ ایک سپاہی تھا اور اس کی یہ ٹیم ایک بہترین ٹیم تھی جس میں وہ سب کو دوستوں نہیں بلکہ بھائیوں کی طرح محسوس کرتا تھا۔ نعمان کے لہجے سے اسے یقین تھا اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں۔ وہ ابھی تک نفا میں موجود دتی بم کے بارود کی مہک محسوس کر رہا تھا۔ لان کا دوسرا حصہ سامنے آتے ہی جیسے کوئی تاریک چادر اس کی آنکھوں کے آگے آگئی تھی۔ صائم خان کا غون میں لت پت جسم اس کے سامنے تھا جس کے قریب نعمان کھڑا تھا۔ شدت غم اور غصے سے اس کی آنکھیں سرخ انگارا لگ رہی تھیں۔ اپنے ساتھی کی موت نے سب کو غمگین کر دیا تھا۔ اس کے بعد تمام کارروائی نہایت تیزی سے ہوئی۔ صہیب نے حیدر سے کہا۔

”حیدر، تم سب لوگوں کے گھر کا پتا اور ان کے سرپرستوں کے فون نمبرز لے لو تاکہ ان سے رابطہ کیا جاسکے“ صہیب نے اپنی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بات ختم کرتے ہی اسے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد سیف اس کے سامنے تھا۔ ”سر اس نے میری گن چھین کر بھاگنے کی کوشش کی اس لیے مجھے اسے ہٹ کرنا پڑا۔“ سیف نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔ اس کی

حیدر کو کور دینے کے لیے کہا۔ جبکہ نعمان کو لے کر وہ اسالت پوزیشن میں لاؤنچ کی طرف بڑھ گئے۔ لاؤنچ میں نیم تار کچی تھی۔ لیکن وہاں کی خاموشی اس بات کی غماز تھی کہ لاؤنچ میں فی الوقت کوئی نہیں۔ صہیب اور نعمان دونوں نے فوراً گیٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کی طرف پیش قدمی کی۔ زین اور حیدر دونوں خاموشی سے ان کے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے چاق و چوبند تھے لیکن اب اس بات کا کوئی احتمال نہیں رہا تھا۔ صہیب نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ نصف سے زیادہ کھل گیا اور اس کے بالکل سامنے صہیب کو چپ کھڑی نظر آئی۔ جس کے سامنے دو آدمی تھے ایک کے ہاتھ میں گن جبکہ دوسرا اس کے دروازے میں چابی لگا کر دروازہ کھول چکا تھا۔ اب وہ دونوں اس میں سوار ہونے والے تھے۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو پھر عین ممکن تھا وہ دونوں یہاں سے فرار ہو جاتے۔ صہیب نے تمام خدشات و خیالات کو بالائے طاق رکھا اور اپنی گن سیدھی کی اور چپ میں سوار ہونے والے پہلے شخص یعنی بلال پر فائر کر دیا۔ عین اسی لمحے زبیر احمد نے خود کو بلال کی ڈھال بنالیا۔ گولیوں کا رخ نکل دھڑ کی جانب تھا اس لیے گولیاں ٹکٹے ہی زبیر احمد دھرا ہو کر نیچے گر گیا۔ بلال اپنی چھینی ہار دیکھ کر بے دم ہو کر سیٹ پر جا گر۔ اس کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا۔ صہیب بجلی کی رفتار سے آگے آیا جبکہ نعمان اسے مستقل کور دیتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا۔

”تم جا کر سیف اور صائم کو دیکھو۔“ صہیب نے بلال کو کالر سے ٹھیکٹ کر باہر نکالتے ہوئے نعمان سے کہا۔ ”نیس سر۔“ نعمان نے فوراً جواب دے کر لان کی دوسری سائڈ کا رخ کیا۔ جہاں سیف اور صائم دونوں مورچا بنا کر بیٹھے تھے۔

زین نے حیدر کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ باہر صہیب کی کارروائی ان کی آنکھوں کے سامنے ہی انجام پائی تھی۔ صہیب بلال کو چپ سے باہر نکال چکا تھا اور اس کی جامع تلاش لے رہا تھا۔ جبکہ بلال کے چہرے پر اذیت اور شکست کے تاثرات نمایاں تھے۔ زبیر احمد کو کئی گولیاں لگی تھیں۔ لیکن وہ اس کے نیچے والے دھڑ میں گئیں۔ اس لیے اس میں فی الحال جان بانی تھی۔ حیدر کو اس کا گن والا ہاتھ سیدھا ہوتا دکھائی دیا۔ اس کا نشانہ صہیب کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ حیدر جو کہ کافی ریلیکس ہو گیا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کے وجود میں کرنٹ ۱۱ لگا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو صہیب کو ناکامی طاعن لٹکانے کا سہارا

آکھوں میں کرب کے سائے کچھ مدھم ہو گئے تھے۔ صہیب کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کے منہ سے صرف یہی نکل سکا ”ٹھیک ہے، فائل رپورٹ میں یہ شامل کر دینا۔“ وہ جانتا تھا کہ سیف نے اسے کیوں مارا۔ کیونکہ شاید وہ بھی یہی چاہتا تھا۔

☆☆☆

دو لمحے کا لباس اس کے جسم پر خوب بیچ رہا تھا۔ وہ واقعی آزاد کشمیر کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ اس کی خوشی اس لحاظ سے بھی دو بلالھی کہ اس کے تمام دوست اس کی شادی میں شریک تھے۔ بس اسے ذرا چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی کیونکہ اس کی ٹانگ کا ڈھانچہ ابھی بھرا نہیں تھا۔ ملک ارسلان پھر بھی خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کر رہا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ اس کی مہندی والے دن ہی ان سب کو پاک فوج کے انجیل پونٹ کے چار کمانڈوز نے رہنسیج کر لیا تھا۔ اور وہ شام تک ان سب کو ملک ارسلان کے گھر چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ باقی ساری ضروری کارروائی وغیرہ انہوں نے دوسری نمشا دی تھی۔ سب کے بیچ جانے کی خوشی اپنی جگہ تھی لیکن وہ بھی صائم خان کی شہادت کا غم دل سے نہیں نکال پائے تھے۔ حالانکہ انہوں نے اسے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا نہ اس سے بات ہوئی تھی مگر وہ صرف ان لوگوں کی رہائی کے لیے ان درندہ صفت اور مفاد پرست لوگوں کی سفاکی کا نشانہ بن گیا تھا۔

بلال کے بیل فون سے اہم معلومات ملی تھیں اور اس واقعے میں ملوث باقی لوگوں یعنی ضمیر اور یاس کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ داور بھی دھنوں کی تاب نہ لاتے ہوئے زندگي کی بازی ہار گیا تھا۔ جبکہ زین کی دی دی ہوئی ویڈیو سے نادیہ کے دل کا معاملہ بھی سامنے آ گیا اور اس کے قلب کی آتشزدگی کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ یوں جو سیاسی پارٹی بلال غوری کی موت پر داویلا کر رہی تھی اس کو بریک لگ گئے تھے۔ تمام دوست اب ملک ارسلان کو چھوڑ رہے تھے جو کبھی ہا بن کر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر افریقہ کی سرخی نمودار ہوئی نظر آتی تھی۔ دونوں لڑکیاں یعنی سوہا اور عائشہ لڑکی کی طرف سے شریک ہوئی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملک ارسلان کا سر اچل چند گھنٹہ ہی دور تھا۔ لڑکیوں سمیت تمام لوگوں کے گھر والوں کے اطلاع دے دی گئی تھی اور سب کی اپنے گھر والوں سے بات بھی ہو گئی تھی۔ نکاح کی رسم سادگی سے ادا کی گئی اور پھر ایک پُر تکلف کھانے کا دور چلا۔ تمام تقاریب جب احسن طریقے سے انجام پائیں تو تمام لوگ زین کو لے کر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ ملک ارسلان

بھی اپنی نئی فوجی دلہن کو کچھ دیر انتظار کا کہہ کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ زین کو لگتا تھا وہ شاید شادی کے ہنگامے میں بھول جائیں گے لیکن وہ بالکل نہیں بھولے تھے اور زین سے اصل کہانی سننا چاہ رہے تھے۔ زین نے حالات دیکھے تو اسے لگا یہی بہتر ہوگا کہ سب کچھ بتا دیا جائے تاکہ کوئی اور بھی کسی وجہ سے سماجی رابطوں کے آن دیکھے جال میں قید ہو کر ایسی صورت حال سے دو چار نہ ہو۔

زین نے شروع سے لے کر اب تک کی تمام باتیں تمام تر جزئیات کے ساتھ ان کو بتا دیں۔ سب کے منہ مارے حیرت کے کھلے رہ گئے تھے۔ خاص طور پر سوہا اور عائشہ کی حالت دیدنی تھی کہ وہ کس قدر خطرناک لوگوں کے چنگل سے بیچ نکلی ہیں۔ اور وہ خود کو جتنا محفوظ تصور کرتی تھیں یہ بالکل اس کے برعکس نظر آ رہا تھا اور وہ چند ہی منٹوں میں ٹریس ہو گئیں۔ حیدر نے بھی اصل معاملے کی شراکت کو دیکھا تو زین سے شکوہ کیا ”بھائی آپ نے مجھے کیوں لالہ رکھا۔ اسی طرح بھیل اور اظہر بھی زین سے تالاں نظر آئے۔ جبکہ خادو اور ملک ارسلان، زین کی حمایت میں تھے، ماحول پھر سے خوشگوار ہو گیا تھا، اسی دوران حیدر کا بیل فون گنگنا یا۔ وہ موبائل لے کر ذرا قافلے پر چلا گیا تاکہ شور کی وجہ سے آواز میں مسئلہ نہ ہو۔ ”السلام علیکم، کیا آپ آذان حیدر بول رہے ہیں؟“ فون میں سے ایک باتوں آواز آئی۔

”وہ کون؟“ حیدر نے ذرا غماز انداز میں کہا۔ ”میری ٹیم میں ایک آدمی کی جگہ ہے۔ کیا آپ جوائن کرنا چاہو گے؟ میں صہیب بات کر رہا ہوں۔“ حیدر نے فرط جذبات سے موبائل فون کو زور سے جکڑ لیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا جہاں سب دوست آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ اس کی نظر زین پر پڑی جو اب اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک زین کی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے حیدر کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ یہ اثبات کی دلیل تھی اور زندگی کے ایک اہم فیصلے کی گھڑی۔ زین کا سر ہلا جو اس بات کی دلیل تھا کہ وہ اس کا دل کرنے والے کے مقصد کو جانتا تھا اور یہ بھی کہ حیدر کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔ زین کیسے جانتا تھا حیدر نے یہ نہیں سوجا۔

”سر میں کب سے جوائن کر سکتا ہوں؟“ حیدر کے لہجے میں چٹانوں کی سختی عود آتی تھی۔ یہ اس کے آہنی عزم کی ایک نئی داستان کا آغاز تھا۔